

پاکستان کی سب سے بڑی ویب سائٹ

سنگرز گزشت

ست 2014

عکس میلا

WWW.PAKSOCIETY.COM

انٹرنیٹ کی سب سے بڑی ویب سائٹ
پاکستان کی سب سے بڑی ویب سائٹ
پاکستان کی سب سے بڑی ویب سائٹ

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں ستمبر 2014ء

ماہنامہ
سرگزشت
کا ایک معرکہ الآرا
خاص نمبر

خط نمبر

خطائے اول
انسانی تاریخ کی پہلی خطا، ایک سیر حاصل تحریر

خطائے سیاست
سیاست دانوں کی خطائیں جس نے نقشہ بدل دیا
سائنسی خطائیں

سائنس کی وہ خطائیں جنہیں سچ سمجھا جاتا تھا
فحش خطا

برصغیر کی اس لڑائی خطائی اور امریکا اور سپر ایٹم شخصیات سے چھپائے زلیں
خطائے ہوا باز

یونان کے ساتھ پوری دنیا میں ہلچل مچا دینے والی کتھا

گزشتہ تمام خاص

شماروں سے اہم شمارہ

اس کی وجہ سے

بہت سی خطا کی حیرت انگیز، دلچسپ اور دہلا دینے والی

کتھائیں۔ سچ بیانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

نزدیکی بک اسٹال پر آج ہی اپنا شمارہ مختص کرا لیں



ایک۔ یہسا در وطن پرست کا زندگی نامہ



آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے شوق اور آپ کے سوال



ایک صفحہ میں مکمل مختصر مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف



دو آدم خور شیرینوں نے تبسائی محپادی



14 یا 15 اگست ہمارا یوم آزادی کون سا ہے



پاک۔ افغان سرحد پر جس کے تیلے کا تذکرہ



نامیسی کے گروہ میں پھنسے لوگوں کے لیے مشغلہ رہا بھی



فلسفی خیالے خدمت انساں تک کے سفر کی دواد



منہ صحت کی کدیں کہی نہاںیاں منہ صحت کی باتیں یادیں



بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان



عیسوی مہینوں کے ایک نام مہینے کا تذکرہ حنا ص



لی آئی اے کے ایک ریشہ نژاد افسر کی خود نوشت

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے بعد حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں کسی بھی ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ کوئی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات ٹیکسٹ کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح سے ذمہ دار نہ ہوگا۔



آزادی آتش: اس مضمون و شیراز کے پاس ایک ہی راستہ ہے پکارتا
 علمی آزمائش: ذہن قارئین کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے منفرد و انحصاری سلسلہ
 بیت بازی: شعروادوب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ



راز داں اپنا: راز داں اپنی رقیب روسیہ بن گیا
 مجبور: سحابی بننے کے جبر میں وہ حوالات میں پہنچ گیا
 مردناواں: دور حاضر میں ایسی ہی نادانی سرزد ہوئی ہے



چھپا تم: ملک کے خلاف سازشیں کرنے چاہیں
 چھوٹا آدمی: وہ عشق کے ہاتھوں کہاں سے کہاں پہنچ گیا
 علاج: ڈاکٹر نے علاج کے لیے نادر طریقہ دھوٹا



پاپے: دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافی پاپے
 ڈگڈگی: میاں جی کے تجربے سے ایک اور سچ بیانی
 بازی گر: لوگ ٹھٹھنے کے لیے کیسے کیسے راستے نکال رہے ہیں

قرآن حکیم کی مفید آیات و احادیث نصوص عربی کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جس صفحہ پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق برحرمہ سے محفوظ رکھیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قارئین کرام!
السلام علیکم!

رمضان المبارک کا مہینا اس بار عالم اسلام کوڑلانے آیا ہے۔ غزہ میں جس طرح انسانیت کی تزییل ہوئی، ظلم و ستم کا بازار گرم کیا گیا، جس طرح چنگیزیت کا مظاہرہ ہوا اور اس پر عالم اسلام کی خاموشی سرشرم سے جھکانے کو کافی ہے۔ صرف ترکی کے صدر نے تھوڑا سا لہجہ تبدیل کر کے اسرائیل کو لٹکارا ہے یا پھر ایران نے اور آج پاکستان نے، باقی اسلامی دنیا نے اب تک ہونٹ سی رکھے ہیں۔ ایران نے بھی اس لیے زبان کھولی ہے کہ "حماس" کی پیٹھ پر اس کا ہاتھ رہا ہے۔ گویا ترکی کے علاوہ کسی میں حجرات نہیں کہ وہ اسرائیل کو لٹکارے۔ لگتا ایسا ہے کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے ساتھ مسلمانوں کی حمیت کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ گر یہی صورت حال رہی، مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہر مسلم ملک کا حشر یہود و نصاریٰ ایسا ہی کر دیں گے۔ فلسطین میں تین دن سے مسلسل چھ نمازیں ہو رہی ہیں فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشا اور نماز جنازہ۔ ہر روز چالیس پچاس قبریں بن رہی ہیں اور عرب دنیا بشمول پاکستان عالمی فٹ بال ٹرائی دیکھنے میں مشغول ہے کیونکہ بے کسی نے ہمیں گھیر لیا ہے اور ہم گلوں میں بٹ گئے ہیں، عربی، انجی، شیعہ سنی، حنفی و ہابی، افریقی ایشیائی۔ اسی پر تو علامہ اقبال نے لٹکارا تھا

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم بھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

معراج رسول

جلد 24 • شمارہ 89 • اگست 2014ء

ماہنامہ
پاک سوسائٹی

مدیر: علی: نذر رسول
مصور: شاہ حسین

شعبہ اشتہادات

نمبر اشتہادات: 0333-2298788
لہارہ: 0333-2168381
پتہ: 0323-2895528
نور: 8300-4214408

♦♦♦

قیمت: پ 80 روپے • ڈیزائن: 700 روپے

پبلشر: پرویز اختر: نذر رسول

مقام اشاعت: 63-62 فیروز ٹاؤن ایسٹ
پتہ: 75500
کراچی

پرنٹر:

مطبعہ:

پتہ: 75500

فون: 742800

Phone: 3580-4200 Fax: 3580-2551
E-mail: info@cpne.com



ادب کا بابا آدم

سرگزشت

اس کا نام ایما ایم تھا اور وہ ان لوگوں میں سے ایک تھا جسے ٹیل کے پانی سے مشق ہوتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت دریائے ٹیل پر گزارے۔ اس کی بڑی سی کشتی دن رات ٹیل کے پانی پر تیرتی رہتی۔ یوں بھی مصر اور ایسے ممالک جس کے ساحل ٹیل سے متصل ہیں۔ وہاں کے لوگ اس دریا کو بہت محترم خیال کرتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنا رزق بھی ٹیل ہی سے حاصل کریں۔ زیادہ سے زیادہ وقت ٹیل میں گزاریں، ایما ایم بھی اسی سوچ کا حامل تھا۔ اس کی ایک بڑی سی کشتی تھی جس پر وہ اپنا وقت گزارتا۔ ساتھ میں اس کی بیوی بھی ہوتی۔ 1879ء کی بات ہے۔ ٹیل کی آغوش میں تیرتی اسی کشتی پر اللہ تعالیٰ نے اس کی بیوی کی گود میں اس کا وارث دے دیا۔ اولاد دینے پر اس کا وہ خوشی سے پھولے نہ سہا رہا تھا۔ اس خوشی میں اس نے اپنے تمام واقف کاروں کو کشتی پر جمع کیا اور ایک چھوٹی موٹی سی تقریب کا اہتمام کر لیا۔ اسی تقریب میں اس نے بچے کا نام حافظ رکھا۔ عطا حافظ ماں باپ کی محبتوں کے درمیان پروان چڑھتا رہا۔ ابھی حافظ چار سال کا ہی ہوا تھا کہ اس پر مصائب کا کوہ گراں بار لوٹ پڑا۔ ایما ایم کو اجل نے ناک لیا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد وہ ماں کے ساتھ ماسوں کے گھر منتقل ہو گیا۔ اس نے کچھ عرصہ قاہرہ میں گزارا پھر وہ طحطا چلا گیا۔ شہر طحطا قاہرہ جیسا بڑا شہر نہ تھا مگر یہاں زندگی کی جملہ ضروریات پہ آسانی حاصل ہو جاتی تھیں۔ اس کے ماسوں نے طحطا والا گھر اسے دے دیا تھا۔ وہ اسی گھر میں رہنے لگا تھا۔ اسی شہر میں رہتے ہوئے وہ عربی شاعری سے روشناس ہوا اور اشعار کہنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہاں سر چھپانے کے لیے مکان تھا۔ وقتاً فوقتاً ماسوں کچھ نہ کچھ اداسال کر دیا کرتے تھے مگر ہر قاعدہ روزگار کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بے روزگاری دور کرنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس نے وزارت دفاع میں ملازمت کر لی مگر فوجی زندگی اسے اس نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اپنا جادو ٹھکر داخلہ میں کر دیا۔ اس نے ایک عہدے دار کی حیثیت سے مشرقی سوڈان میں لارڈ کیو کی ہم میں بھرپور حصہ لیا۔ 1906ء میں واپس قاہرہ آ گیا اور مطلق عہدہ سے وابستہ ہو گیا۔ یہاں پر اس نے خود کو ادب و شاعری کے لیے وقف کر دیا۔ شاعری میں نیا پن تھا، اس لیے اس کی شاعری مقبولیت حاصل کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مصر کا ہر دل عزیز شاعر کہلانے لگا۔ اسی دور میں سعد زکریا، مصطفیٰ کامل اور قاسم امین جیسے سیاسی قائدین سے اس کی قربت ہو گئی۔ اس کا سیاسی شعور پختہ ہوتا گیا۔ 1911ء میں اس کی سیاسی بصیرت سے استفادہ کی خاطر اسے سول سروس کا رکن بنادیا گیا پھر اسے کتب خانہ خدیو کے ادبی حصے کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس کی شاعری میں جدیدیت کا عنصر اتنا زیادہ تھا کہ اسے جدید شاعری کا استاد کامل کہا جانے لگا جبکہ اس فکر کا قائد سامی البارودی تھا۔ اس نے اس زمانے کے مصر کی سیاسی و معاشرتی زندگی کے کئی پہلوؤں کو اپنی شاعری میں سمویا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی شاعری الازہر کے علمی حلقوں میں پسند کی جا رہی تھی۔ اس نے وکٹر ہیوگو کی MISERABLES میں سے کئی غنائی قصوں کا ترجمہ بھی کیا۔ اس نے طویل مطراں سے مل کر PAUL-LEROY-BEAULIEU کی تصنیف کا ترجمہ المرحوم جونی علم الاقتصاد کے نام سے شائع کرایا۔ عربی ادب کے اس جدید ہوا آدم کا انتقال 21 جولائی 1932ء کو ہوا اور یہ حافظ ایما ایم کے نام سے مشہور ہے۔



محمد ایاز راعی نے ہمسوہ سے لکھا ہے "اس بار کا شہدہ بڑی محنت سے ترتیب دیا گیا ہے۔ پہلی سرگزشت داغ دہلوی کی، دوسری ہر ادب شناس کا دل خوش ہوا ہوگا۔ وہ باتیں جو سولی موتی کتابوں میں نہیں اسے آپ نے نہایت خوبصورتی سے صرف ایک صفحے میں سمودیا۔ یہ کارنامہ صرف سرگزشت کا خاصہ ہے۔ شیر خیال کے دوست و عید کی مبارک یاد کیونکہ عید کی اصل خوشیاں تو روز و راتوں کا حق ہے۔ اس بار پورے مہینے میں اللہ تعالیٰ کے حضور ایک ہی دعا کی ہے کہ یہود و جنود نے جو چاہا ہے۔ مسلمانوں کی جانیں کا سامن کیا ہے۔ ایک کے بعد ایک مسلمانوں کے ملک کو کھنڈر بنا رہے ہیں۔ مسلمانوں کو مسلمانوں سے ہی قتل کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس القاد سے نجات دلا دے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ ہماری بہادر فوج جاگ رہی ہے جو اس نے اس ملک کو جان سے بروقت بچالیا۔ ہم لاکھ گنتہ گارسی مگر وہ غور و فکر ہماری ملک کی حفاظت کرتا ہے۔ اسی کی امداد ہے کہ ہم سب محفوظ ہیں۔ اب چلتے ہیں دوبارہ شہر خیال میں۔ رانا محمد بہادر کا شہرہ بہت اعلیٰ تھا۔ اعجاز حسین شہزاد پور رسل اور طاہر و گلزار و شمس عزیزی کے شہر سے تھیں ان کا احوال کا منظر ہا۔ اعجاز حسین لدھیانہ اور محمد عمران جوہانی کا کتب و خیال نامہ ان دنوں کے لیے تقویت کا باعث بنا، مسرت کا سامان، بیم کا پتلا۔ باقی اصحاب نے بھی خوب لکھا ہے لیکن میں نے اگر فردا فردا جواب دینا شروع کیا تو یہ طویل ہو کر دیکھنا اصحاب کا حق ٹھس ہو جائے گا۔ اس لیے مضامین و مباحث کی جانب رخ موڑ لیتا ہوں۔ رہنما ایک حوصلہ بخش سوانح حیات تھی۔ ایک اہمیل رہنما کسی طرح قلمی قوم ہونا ضروری ہے۔ تارکی کا آسیب بھی ایک ہمسوہ معنی کا سوانح تھا۔ خالماں برہنہ کے بارے میں کیا کہیں، یہی ایک مضمون پرے سے تار سے پر حاوی ہے۔ اسرائیلیوں نے فلسطینیوں پر کم مقام نہیں توڑے۔ ایسے لاتعداد واقعات ہیں جو مسلمانوں کے من پر طمانچہ ہے۔ اب تو اسرائیل نے اسلام دشمن طاقتوں کے اتحاد سے پورے عالم اسلام میں ایسی آگ بگڑا دی ہے جو ہر مسلمان تک کو خفا کھتر گئے جا رہا ہے، کھنڈر بنانا جا رہا ہے۔ جنگ و محبت کے باب میں مذکور واقعہ میرے لیے بالکل نیا ہے۔ غی الف لیلہ اور برفانی رات مع النوادر اچھی رہی۔ سبیل نمبر 14 و تارکی کی دائم گزار سے واقف تھی۔ جولائی میں بیان کردہ واقعات انصاف کی وجہ سے اچھے مکرشت ثابت ہوئے۔ سچ بیانیوں میں پھر وہی غلطی اڑی لے گئی۔ کال علم اور نہیں انکل نہیں بہت زیادہ پسند آئی۔ درد بھی بہتر رہی۔ بے حس نے تو ذہن کو چھوڑ دیا۔ وارث بھی پسند آئی۔"

ہذا سرگزشت کے ایک پرانے قاری امتیاز حسین نے ٹیڈ جان محمد میر پور خاص سے "پھر وہی غلطی، کے بارے میں کہا ہے کہ اس سے بہتر سچ بیانی میں نے نہیں چڑھی۔ جو کام نہاں سے لیا جاتا وہ کام اس کہانی سے بے آسانی لیا جاسکتا ہے۔ میری بیگم نے بطور خاص یہ کہانی بچوں کو پڑھوائی ہے۔"

اشفاق سید نے سکھر سے لکھا ہے۔ "اس شمارے میں میری پسندیدہ شخصیت چوہین ائی کو دیا۔ یہ مجھ پر ایک احسان ہے۔ ہم سب کو ان کی حالات زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ غربت میں پرورش پانے والے لو جو ان نے کس طرح ایک نئے میں ڈوبی قوم کو دنیا کی ترقی یافتہ قوم کے صف میں لاکڑا کیا۔ رہنما ایسے ہوتے ہیں کہ بہتر حالات پر بھی قوم کی ترقی کے لیے کام کرتے رہیں۔ اسپتال کو بھی دفتر بنادیا۔"

سیدہ بانو ناگوری کا غلو میں نامہ کراچی سے "ہلکے اور سادہ رنگوں سے سجا سورتی لگا ہوں کو بے حد بھلا لگا۔ اودا بے کے صفحے پر پہنچو انکل کی فکر انگیز باتیں دل میں اتر گئیں۔ واقعی اس مہم قدس کا احترام میرے دھیرے دھیرے قائم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ محبتیں اور نغمہ دلی جو اس ماہ کا حصہ ہو کر تھیں اب ان کا قد ان ہو چلا ہے۔ پہلے تھا لوں میں کھانا سجا کر کھلے کے غریب اور نادار لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا تاکہ کوئی بھی رب تعالیٰ کی نعمتوں سے محروم نہ رہ سکے لیکن اب وہ سب تو اک خواب ہو چلا ہے لکھ اب شوبازی عروج پر ہے۔ ہمارا شمار تو ان لوگوں

میں ہوتا ہے جو ہنگامی کارروائی بھی دیتے ہیں لیکن اگر ہم کسی مارکیٹ میں چلے جائیں تو ہمیں وہاں کل دھڑنے کو جگہ بھی نہیں ملتی۔ ان حالات میں ادھر دھڑ دیتے تو کسے دیں؟ انوار ام دھڑ میں تو کس کے سر دھڑیں؟ بس خدا ہمارے حوالوں پر دھڑ فرمائے۔ دانا محمد سہاؤ کا تہجد پہلے نمبر پر دہا اور بے حد شاعر اور ہا۔ قصیدہ احمد تبسم، اپنے لیوں پر تبسم سہا لیتے کہ آپ کو شہر خیال میں جگہ مل چکی ہے، مٹی عزیز مٹے اپنے خوبصورت تہجد کے ساتھ حاضر ہوئے۔ عزیز، ہماری آپ کی مٹی اور ہماری ہم نام سین کو ہمارا سلام کہنے گا۔ طاہرہ گلزار، بکھڑا ہوا مٹی ہنگامی ہو گئیں۔ ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں کہ پاکستانی آدمی سے اگر آپ محبت کرتی ہیں تو ہمارا بھی دھڑ دہا ان مٹیوں کے لیے دعا گو رہتا ہے۔ دانا محمد شاہد، طاہرہ الدین بیگ اور سعید احمد چاند غیر حاضر رہے۔ مٹی الف لیلہ میں مسکراہٹ کا موضوع اس قدر بھایا کہ ہم انہی صفحات پر قصیدہ کر آگے بڑھنا ہی بھول گئے، خاص کر جنرل آجمن آباد کے قہر نے ہمیں بھی مسکرائے پر مجبور کر دیا۔ اگر بڑوں کی ترقی میں ان کی مسکراہٹ کا بہت بڑا کردار ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ آپ اپنی مسکراہٹ سے پوری دنیا ناسخ کر سکتے ہیں۔ جنگ و محبت میں تیمور کی محبت کا ہلوکا ٹاپ اچھا لگا۔ انہی کبیری تحریر مقام نے ہمیں لرزایا دیا۔ جیری نامی شخص اپنے ماضی پر کتنا ہی پردہ ڈال رہا لیکن بالآخر اسی ماضی کی پرچھا نہیں اس کی کم مٹی میں اس کی موت کا سبب بن گئی، مضر امام کا مصلوات سے بھرا "جولائی" دلچسپ رہا۔ بہت بڑی مٹی صلیف سلطان کا قصہ بڑی لے گیا۔ پہلی جگہ بیانی میں اسل نے مناسب طریقے سے اپنی بیٹی کو برائی سے بچالیا۔ شاید دنیا کی کوئی بھی ماں ہوتی تو وہ بھی اپنی بیٹی کے لیے یہی کرتی۔ نہ جانے یہ ساری مٹی آخر ایک جیسی کیوں ہوتی ہیں؟ دھڑل اور مہربان سادھو لے۔ جولائی کے نقشے میں جھوٹی اولادیں کی عمر بھری مٹیوں کو بھلا کر کسی انہماں شخص کے لیے خود کو بڑا دیکھ کر لیتی ہے؟ کاش کوئی تو اس تحریر سے سبق لے لے تاکہ ایک مریجہ پھر بھی مٹی دہرائے ہے فک جائے (اس تحریر کی اس بار مٹی پڑی ہوئی کسی حیران ہوں۔ ایک صاحب نے ای میل کر کے بتایا کہ اس بچ بیانی کی فوٹو اسٹیٹ کر کے انہوں نے پورے ماسٹر (الکھنڈ) میں تقسیم کیا ہے) اولاد بڑا کر دل دھڑکے بھر گیا، جانے کیوں لوگ وارث کی خواہش میں اپنے رب کی نافرمانی کر جاتے ہیں وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ خود بھی تو ایک عورت کے سطن سے پیدا ہوئے ہیں۔"

محمد کلیل حیدر دھڑ جگ سے لکھتے ہیں "میں شہر خیال میں پہلی دفعہ حاضر ہو رہا ہوں لیکن سرگزشت سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ 1992ء میں جب میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا تو ایک دوست نے سرگزشت پڑھنے کے لیے دانیس پھر وہ دن اور آج کا دن۔ درمیان میں بہت کچھ بدلا ہے بڑے بڑے حالات دیکھے مگر سرگزشت سے میری محبت میں ذرا بڑا بڑا فرق نہ آیا۔ جو ثارہ میں نے پہلی دفعہ پڑھا اس میں حبیب جالب صاحب کی سرگزشت اور مٹی الف لیلہ میں تو اب صاحب کی حالات زندگی بھی۔ میری آمد کا مقصد فی الحال کہانوں پر تہجد نہیں بلکہ چند فرمائشیں ہیں۔ امید ہے ضرور۔ پوری کریں گے۔ مجھے بعد دستان کا سفر نامہ پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ذہنی شاہ صاحب "سیر پاکستان" کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ اگر دھڑی کا خان اور نارائن کے ساتھ ساتھ بھیل سیف اہلوک کے حوالے سے معلومات دیں تو مزہ آجائے، اگرچہ یہ سب مقامات میں کئی دفعہ دیکھ چکا ہوں مگر معلومات کے حوالے سے کنگل پاتی ہے (ذہنی صاحب داوی کا خان و نارائن پر لکھ چکے ہیں) عشق نامہ کام اور دھڑا دھڑا نمبر کی طرح جیتا خطا نمبر بھی لا جواب ہوگا۔ (آپ قارئین کا اعتماد حاصل ہے گا) ایک دیر پہلے فرمائش آقا فی صاحب سے ہے۔ آپ کی مٹی الف لیلہ میں سب اداکاروں کا تذکرہ ہوتا ہے، ہمارے مہربانی پاکستان سے نظام مٹی الدین اور ہندوستان سے اسکواڈ اسٹریٹس چکر دہتی کے بارے میں بھی مفصل لکھیں کیونکہ یہ دونوں ہوا کا تقریباً 40 سال سے فلموں میں کام کر رہے ہیں۔ (اتفاق ہے کہ ان دونوں کا تذکرہ کئی بار ہو چکا ہے پھر بھی فرمائش پوری کی جائے گی) آخر میں شہر خیال کے سب دوستوں سے ایک گزارش ہے کہ اسی طرح سرگزشت سے اپنی محبتوں کا سلسلہ جاری رکھیں۔ سب احباب کو دوبارہ کے عام سے عام اور خاص سے خاص کارکن کو میری طرف سے عید الفطر کی دانیس مبارکباد!"

بشری افضل بھٹو پور سے لکھتی ہیں "افضل کی باتیں سنیں ایک مٹی سرگزشت پڑھ کر بہت کچھ معلوم ہوا۔ اپنی محفل میں پہنچے تو دانا محمد سہاؤ کو کرسی صدارت پر بیٹھے پایا، بڑے کردار سے براجمان ہیں۔ غرور تو آقا جاتا ہے اچھا فتح پر بشری افضل خیر سے ڈاک کی کارکردگی کی نذر ہو گئیں جس میں مٹی محمد عزیز میں تو دانا ادیب کی جلالا مٹی، احوط کر چک گئی۔ افضل اگر آپ کے اسٹاک میں مٹی 2005ء کا شمار ہے تو مجھے ہائی ڈاک بھیج دیں میں رقم ارسال کر دوں گی (انہوں صدمہ انہوں سب یہ ممکن نہیں) طاہرہ گلزار جی آپ کا تہجد تو ایک سوال ہے۔ ہے۔ پہلا یہ کہ اگر ہمارے عکراں کر پٹن ختم کر دیں تو ہمارا ملک تمام ملکوں کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ دوسرا شوہر کی ذات تو واقعی گزشت کی طرح رنگ بدلتی ہے۔ اگر یہ مٹی شوہر اپنی بیوی کو نچا دکھائے، اپنی ماں سین کے سامنے اس سے بھی بڑا کر، اولاد کو ہی اپنی بیوی کے خلاف استعمال کرے کہ یہ اولاد ماں کی نہ بن کر رہے۔ اولاد دوا کی ہے عزتی کرے اور اس سے شوہر کو تسکین ملے۔ ایسے مردوں کے لیے حکومت کو کوئی نہ کوئی سزا ضرور دینی چاہیے اور آپ لوگوں پر قصہ کرنا چھوڑ دیں۔ اپنی ہی دل چاہیں گی۔ دھان تنگ صاحب خدا آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ سب قارئین اور اسٹاف کو روزوں کی مبارکباد۔ میری کہانی "خطا نمبر" میں لگ مٹی ہے (فیصلہ لیلہ و میریل پورڈ کرے گا)۔ شاہ حسین آرٹسٹ کو خدا صحت کاملہ عطا فرمائے۔ دانا سہاؤ اُمید پر تو دنیا قائم ہے۔ کالاطم، اس کہانی نے تو مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ واقعی دنیا میں اس علم کا وجود ہے لیکن کچھ لوگ چادوٹنے کو نہیں مانتے چادو برحق ہے۔ آنحضرت کو دشمنوں نے نہیں بٹھا! بے چاری طاہرہ اشکر ہے کہ

www.paksociety.com

www.paksociety.com

دھیرلی بی نے اس کا علاج کیا اور شفا ملی۔ کرنے والا تو خدا ہے زمین پر تو خدا نے دیئے گئے ہیں جتنا جاہ و کھ پر کیا جا رہا ہے اسے کھوں تو ایک محل کتاب بن جائے۔ اسکول کی جاب سے ہٹانے کے لیے مجھ پر عمل کروانے جا رہے ہیں۔ خدا سے بڑا تو کوئی نہیں ہوتا۔ خدا میرا بہت ساتھ دے رہا ہے لیکن دشمن بھی بچے جہاد کر میرے پیچھے ہیں، میری تو کچھ کچھ نہیں آرہا ہے۔ کرسی حاصل کرنے کے لیے انسان اتنا گر سکتا ہے میرے تصور سے باہر ہے۔ انشاء اللہ خدا آگے بھی مجھے ان کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ بدلہ میں جو ساپ ہے دراصل وہ ناگ تھا جو عورت دکھائی ہے وہ ناگ، ناگ کے بچوں کو لاکھی میں مارا تھا اس کا بدلہ لینے کے لیے ناگ انسانی روپ میں سو سال کے بعد آ جاتا ہے یہ سنا تو تھا آج چڑھ بھی لیا۔ درد، میں بہو کا بہت بڑا طرف تھا کہ اپنی دشمن کی اتنی خدمت کرتی رہی۔ ٹیبل جیسے بھیلر یا کے روپ میں ایک ماں کو اولاد کی خاطر بیک میل کرتا رہا۔ پھر ظلم کی انتہا اس کی اولاد کو ماں کے ظلم میں لانے لپھر کر دیا۔ بیت بازی، میں ٹیم صدیقی کا شعر بازی نے کیا۔ علی سفیان آفاقی نے ترکی کی سیر کر لی۔ نہیں انگل نہیں، مغربی معاشرے میں بھی غیرت پائی جاتی ہے حیرت ہے۔ وہ تو آزاد معاشرہ ہے۔ بولان، میں لڑکیوں سے بچ کر رہنے کی تحقیر کی بدایت ہے۔

عظمیٰ شکور سرگودھا سے لکھتی ہیں "سرگزشت میں پیلا خط ہے میرا۔ اُمید ہے خوش آمدید کہیں گے۔ میں لکھتی ہوں۔ بہت سے رسالوں میں تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ خط لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ میں بکری کہانی لکھ کر بچوں کو کیا شائع ہو جائے گی (بچنے کے بعد فیصلہ ہو سکتا ہے) میں اپنی کہانی بھی تو دوں مگر رگلا ہے کہ منظور ہو جائے تو اس طرح تو دل ٹوٹ جائے گا میرا مگر پھر بھی میں کہانی بھیج دوں گی۔ تم سے بہت ہی شوق ہے کہ میری کہانی سرگزشت میں شائع ہو جائے۔"

قیصر عباس خان کا دربار خان بھر سے خط "ادارے میں کچھ کتابت نہیں تھی، جس کمزوری و زبانی کی شکایت تھی۔ وہ اب معمول بن گئی ہے۔ دانا محمد سہو کرکئی حیدرآباد میں تھے، بہت سادہ گھر، اور ساتھ آٹا پھر گھر، کچی من مٹے لڈو، نصیر اشرفی، عمران اور عباس شاہ، حاجی احمد حسین، بشری افضل، ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ بھی اپنے گھر پر تھیں۔ کے ساتھ حاضر تھے۔ ڈاکٹر صاحبہ بہت اچھے تھیں۔ کے ساتھ حاضر ہوئیں ہیں لیکن ادارے سے حلق نہیں تھیں جین رائے بھی نہیں دی۔ جو کہ حیرت انگیز ہے کیونکہ وہ بہت اچھی رائے دیتی ہیں۔ ہمیں انتظار ہے گا۔ باقی سب کے تھیں۔ پسند آئے۔ جو لوگ فیر حاضر ہیں وہ حاضر ہوں، ہماری انتہا اس ہے۔ ساری کہانیاں اچھی تھیں۔ پھر وہی عظمیٰ پر نصیر افضل نے بہت اچھے طریقے سے اپنی اپنی کوڈز پر کے جال سے نکالا جو کہ اس بات کی دلیل ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ غلطی نہیں کرتا۔ کاش افضل کے ماں باپ بھی ایسا کرتے تو انیل بھی ہونہار اور ہاشور پر نصیر کی زندگی یوں نہ ہوتی والدین کو فورا دست نہیں ہارنی چاہیے بلکہ طریقہ سے مسئلہ کا حل تلاش کریں، دوسرا آج کل اولاد کو بھی اللہ تعالیٰ ہدایت دے رہا ہے۔ دوسرا کہانی کو بڑھنے کے بعد محسوس ہوا فرشتہ صفت لوگ دنیا میں موجود ہیں۔ درد جب بھی پر ہے کا مطالعہ کیا ہر کہانی اپنی زندگی یا سچ اور درد بھری کہانی لکھتے ہیں جو کہ حقیقت پہنی ہوتی ہے لیکن میرا تو جیسے کردار بہت کم بڑھنے کو ملتے ہیں۔ بہت طرف کی بات ہے کہ درد دینے والے کو راحت پہنچانا جو کہ بہت مشکل ہے اللہ تعالیٰ سب کو ایسا ملے آمین! پھر یاد رکھیں کیا انسان تھا۔ مرد تھا، آخر کیا تھا بہت ہی بڑا شخص اور بے غیرت شیطان تھا۔ انسانیت کی تو ہیں کی ہے، مقدس رشتہ کی تو ہیں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے ایسے انسانوں کو ہدایت دے یہ دنیا سے اٹھالے۔ آمین۔ کالاطم، آج کل کے دور میں لوگوں نے ایمان کو مذاق بنا رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر مانی کو کچھ سمجھتے نہیں۔ لوگوں کا سکون دیکھا نہیں جاتا اور اپنے مقصد کو پانے کے لیے سب کچھ کر جاتے ہیں۔ اب ظاہر بھی محسوس ہونے لگا کہ اللہ کرے بر باد ہو جائیں گے کالاطم والے آپ سب لوگوں کو ایسے واپس عید سارک قبول ہو۔ کیونکہ جب گستاخ کا چہرے لے گا تب عید ہوگی یا ہونے والی ہوگی اللہ کرے عید کی خوشیاں سب لوگ اپنے چاروں کے ساتھ منائیں۔ ایک بات کروں گا اور رائے بھی مانگوں گا تب زرخیز و باغوں سے۔ سو ہاں فون پر نہیں ایم نہیں اور کال ٹیپ پر بھی باتیں کرنا اور بکری بہت کے ساتھ گھر سے بھاگ جاتا وہ فیر، ہمارا معاشرہ کس سمت جا رہا ہے، کیا ترقی ہے یہ یا کچھ اور۔ میرے چھوٹے سے گاؤں میں ایسے واقعات بہت دور ہے ہیں۔ ہم اپنی ٹیکنالوجی کا استعمال کس طرح کر رہے ہیں؟ تمام جھگڑا، لی وہی کے ساتھ سوائے عشق، محبت، بھلی بھنوں، ہیرا پھانک کے علاوہ کیا پیش کر رہے ہیں جس ادا سے میں دیکھ صرف لڑکی کی بات ہے، مجھے وہ پسند نہیں وہ پسند ہے۔ شادی محبت کے علاوہ آدھے کپڑے، کٹے ہال، پردہ نہ کرنا اور پردہ کرنے والے کردار کی اسلف کرنا کہ یہ لہا لہا پا کدا سن بن رہی ہے۔ ہم کہاں جا رہے ہیں مجھے رائے چاہیے۔ اس کا حل بھی مل جائے تو بہتر ہے۔"

وحید ریاست بھٹی، بکری سداں راولپنڈی سے لکھتے ہیں "ماؤں کی کے شارے میں محترمی شہد جہانگیر شاہ کا انتقال مضمون شاعر اعظم، دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ یقیناً انہیں ایک ناقابل فراموشی گریہ صرف اور صرف آپ کے سرگزشت کا ہی خاصہ ہو سکتی ہے۔ پھر ماہ جون میں شاہ جہانگیر شاہ صاحب کو کرکئی حیدرآباد پہنچا کر آپ نے ۲۴ بت فرما دیا کہ اگر ہم اپنے آپ کو بچان جا نہیں تو شاہ جہانگیر بن سکتے ہیں۔ وہ واقعی اس اعزاز کے قابل تھے انہیں میری جانب سے اتنی کامیابی پر بڑھیر سادی سادہ ادھر میں کر رہے تھے۔ ۱۴ جولائی کا شمار 28 جون کو معمول ہو گیا۔ سب سے پہلے ایک کئی سرگزشت میں عظیم شاعر داغ دہلی کی کا زیست نامہ ملاحظہ فرمایا، بہت لطف محسوس ہوا۔ پھر ہم آگ برساتے موسم میں شہر خیال میں داخل ہوئے۔ پرانے اور نئے دوستوں سے محفل کو سہا ہوا پایا۔ دانا محمد سہو کرکئی حیدرآباد پہنچا۔

اگست 2014

تھرنے کے ساتھ براجمان پایا۔ مہارکاں جناب، دست مہارکاں۔ حلقی انکار حسین سٹار بھی پیش کی طرح خوبصورت خیالات کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ اپنی طاہرہ نگراں کو آپ نے شامی اشاعت لرمایا، خوشی ہوئی۔ انجم قادری ساطی صاحب کا پی حرم سے بعد میری طرح موجود پائے گئے مگر مختصر مختصر۔ بشری افضل اور محمد عمران جو بانی کی کمری کمری اور نچ و لاکل تحریر نے کافی متاثر کیا۔ سعدہ بانو ناگوری اور انور عباس شاہ بھی پیش کی طرح زینت شہر خیال پائے گئے مئی خوش ہوا۔ ڈاکٹر قرآن امین تو اب پاکستانی سے لکھنے پر کمر بستہ نظر آتی ہیں۔ خوشی ہوئی جب ان کی کوئی تحریر روٹی سرگزشت ہوئی، چاہے بلورانی و ہمدانی کے حلق ہی کیوں نہ ہو۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی و کے دل کے ساتھ حاضر تھے۔ بہت دور بھرے اور ہمدانی کے ساتھ انہوں نے اپنی تحریر کے حرم میں جکڑے رکھا۔ اسے کاش وہ بھی کوئی ماہنامہ تحریر ہم قریب کار نہیں کے لیے لکھ دیں تو از حد نو اڑش ہوگی۔ شہر خیال کے بعد عظیم جی لہڑ چوایین لائی کی سرگزشت پڑھی، ڈاکٹر ساجد احمد صاحب نے کمال لہن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارے نالائق حکمرانوں کو خوب دھوت ٹھروئی کہ اگر لہڑ غلط ہو تو سوسال کا سطر 10 سال میں کٹ سکتا ہے۔ ہمارے حکمران سوئی ہوئی قوم کو کیا چاہیں گے وہ تو اسے اہدیٰ خند سنانے کے لیے بچتے رہتے ہیں۔ سانحہ مال ڈاؤن مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے گزارش ہے کہ اردو اور پنجابی کی مشہور شاعر و شاعرہ گلت کے حوالے سے بھی کچھ تحریر فرمائیں تو مہرانی ہوگی مرحومہ نے 4 جون 1984ء کو خودکشی کر لی تھی ان کی شخصیت کے حوالے سے امرتا پریم نے "ایک جی سارہ" اور انور سن رائے نے "ڈنٹوں کے اسیر" کے نام سے کتابیں تحریر فرمائیں اور پاکستان لٹریچر وین نے ایک ڈراما سیریل "آمین تک دیوانہ" بھی مرحومہ کے حوالے سے پیش کیا تھا (سرگزشت کے خودکشی فہر میں مفصل مضمون چھپ چکا ہے) قلمی الف لیلہ بھی سامان دلچسپی لیے ہوئے تھی خاص کر نازہ حسن اور جہیں تو لہاش کے حوالے سے کافی کچھ جاننے کا موقع ملا۔ اللہ پاک آفاقی صاحب کو حفظ و امان میں رکھے۔ جی جیائیں میں کالاطم ہیرت انگیز جی بیانی بھی مگر مجھے اس کے نام سے بہر حال اختلاف ہے۔ معراج انگل، عظم تو ایک مدہنی ہوئی ہے۔ نور ہوتا ہے۔ روٹی اور نور کو کالک اور سیاسی کو مٹانے کے لیے دہ ب ڈاؤن لٹل نے پیدا فرمائے ہیں، اگر اس جی بیانی کا نام کالا چادر ہوتا تو نہ ہارہ مناسب تھا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ جناب سطر نام صاحب، جولا کی کے نام میں مجھے واقعات صغر قرعاس پر پیش کرنے میں انگٹ محنت کرتے نظر آئے سب کچھ ٹھیک تھا مگر جب سے خطا خبر کا اعلان ہوا ہے ان سے بھی ایک خطا سرزد ہوگی۔ جی ہیں 31 جولائی 1980ء عظیم گلوکار محمد رفیع کا یوم وصال ہے۔ سطر صاحب نے اس اہم واقعہ کا اشارہ نہیں فرمایا آپ کیا کہتے ہیں معراج انگل، میں نے درست سمت میں رہنمائی کی؟ معراج انگل یہ تقریر بھی خطا فہر کے لیے ایک آرٹیکل سر دیو، نام کے نام سے جناب کی بارگاہ میں پیش فرما رہا ہے۔ میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں یہ آپ نے ہی فیصلہ فرماتا ہے۔ اگر آپ نے حوصلہ افزائی فرمائی تو عظم کو پروا نہ رہے گا۔ میرے کھسے آرٹیکل کو خطا فہر کا حصہ بنا کر مضمون احسان ہونے کا موقع ایک بار پھر حمایت لرمایے گا۔ اس آرٹیکل کے ساتھ کچھ پارچہ ہات بھی ارسال کر رہا ہوں جو اس آرٹیکل سے Related ہیں۔ (مہم محذرت خواہ ہیں کہ عظم رفیع پر مفصل مضمون شائع ہو چکا ہے)"

لوہس شیخ نے لوہے لک سے لکھا ہے "مجھے عزم و ہمت سے کسی ایسے جرم سے کی تلاش تھی جس میں آپ بیتیاں، سفرائے وغیرہ مثال ہوں جس کی تحریر میں دستاویزات کا وجود ملتا ہو ان میں سرگزشت سرلہرست ہے جنبر 2013ء کو جب میں اخبار لینے گیا تو مجھے سرگزشت میں اوپر لکھے گئے ہار یک الفاظ لگی کھپیاں، آپ بیتیاں جگ بیتیاں نظر آئے تو میں نے فوراً رسالہ خرید لیا مگر چاکر پڑا۔ قارئین کے تجویزوں سے پتا چلا کہ وہاں ڈاکٹر بھٹیلے، ماہ شائع اور تھا خوش سستی وہ بھی مل گیا۔ یقین کریں چھ کر کا لطف آپ کا الفاظ میں جان نہیں کر سکتا۔ ایک ماہ میں وہ جرم میرے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھے۔ شاعرہ مٹی بھی جلد مل گیا۔ جی بیٹوں کو سب سے پہلے پڑھا ہوں۔ مجھے جس آپ جی نے متاثر کیا وہ موت و حیات تھی اس میں ایک سنی موجود تھا کہ کسی کی موت و حیات کا فیصلہ انسان کو ہرگز اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ کے زندہ رہنا ہے، کس نے زندہ نہیں رہنا، یہ دہب کے فیصلے ہیں۔ موت و حیات میں ہے ایک سنی یہ بھی ملتا ہے جو کسی کے لیے گڑھا کھودے خود ہی اس میں جا کر سے دوسری جی بیانی "اعتزال گناہ" تھی۔ مذاق کو کبھی بھی اس تک نہیں آتا چاہے کہ جس میں خدا کی تخلیق کو کھنڈہ جا کر اس کا مذاق اڑایا جائے۔ آج کل ہمارے ہاں یہ بدیہ عام ہو چکا کہ جب جس کو چاہے کچھ بھی کہہ دیں، نہیں اپنی کوئی جھوٹا سنا جرم نہیں بلکہ قرآن نے اس کی سخت وعید فرمائی ہے۔ تیسری جی بیانی ان میں کھاسودا، جی بیج بیانی بھی دل کو لگی لیکن ہادی نو جوان نسل کو کون سمجھائے۔ خود کی تلاش میں بہرہ گوارہ ہے۔ جی ہیں ان ہر کھسے سوروں میں بھی کچھ ہوتا ہے۔ بھوک بھی کافی پسند آتی ہے۔ تھا ہمارا تہرہ۔ آپ سے ایک بات پہنچنی ہے اگر کوئی تحریر سمجھوں تو سنے کے ایک جانب گھسوں یا دونوں جانب، یا پھر ایک سطر چھوڑ کر گھسوں (ایک جانب، ایک سطر چھوڑ کر)"

سید احمد چاند کی آدھ کراچی سے "معراج رسولی کا ادارہ" پڑھا حالانکہ حاضرہ کے مطابق تھا۔ شعر بھی مسہر حال تھا۔ یک مٹی سرگزشت میں جی صاحب کے متعلق پڑھا۔ گو ان کا نام تو بھین سے سنتے آئے تھے مگر مکمل آگئی اب ہوئی۔ اب آتے ہیں شہر خیال کی طرف۔ ہمارا ہمدور سے فہر پر تھا۔ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سندھ صدارت پر شاید جاگیر شاہ بدلمحان تھے۔ ان کا طویل تہرہ، داغی لا جواب تھا۔ انہوں نے کوزہ میں مسعدہ بند کر دیا۔ پڑھ کر دل داغ داغ ہو گیا۔ جن کے طویل تہرے پسند آئے ان کے نام یہ ہیں۔ انجمن حسین سٹار، سعدہ بانو ناگوری، ڈاکٹر قرآن امین، انور عباس شاہ، رانا سجاد محمد عمران جی، رانا محمد شاہد یور، والا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی، احمد خان تو حیدی، شہانہ طیف، شٹی محمد مزین، ان کے تہرے داخلی دل میں اتر جانے والے تھے۔ مختصر تہروں میں عہدہ منظور خاں اور بھٹی

سے اسلم عالم کے تہرے بھی خوب تھے۔ جرنی افضل بہادری اور طاہرہ نگار پٹا اور رادیر سے بچلی مگر یہ کیا کم ہے کہ ان کا نام لیٹ کر میں آگیا۔ اب کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا چراغ ادب، برہنہ ست رہا۔ محترم آزاد صاحب کی دو کون تھے، ماضی کے جہر و کون سے اچھی تحریر تھی۔ امین کبیر کی تحلیلات، کامیابی جواب نہیں تھا۔ علی سفیان آقائی کی ترکیبی وراثت، بکھر چکی تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی جرم و قاتل، جس شیف کا انجام بد نہ کر دل طول ہو گیا۔ علی سفیان آقائی بھی افسانہ لکھنے میں پھولیں راجیجہ کی بھٹی کر رہے۔ خود دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ پٹا اور کے فنکاروں کا حال بھی بد حال پٹا اور کی سنگلاخ زمین میں ایسے نامور فنکاروں نے قلم لیا۔ جہت پائی کی محفلوں میں چٹا جواہر گل شہر بھی شامل تھے۔ جگ پائی میں شائستہ کسی لعل آباد کی، موت یا حیات، اچھی تھی۔ اشرف لاہوری کی ان دیکھا سوا، پسند آئی۔ محمد ظفر حسین کی اعتراف گناہ، پائی زیر مطالعہ ہیں۔ ڈاکٹر دہلی اس دفعہ قاتل ہیں۔

حکیم سید محمد رضا شاہ، نورنگہ مہالوئی سے لکھتے ہیں "مرصعہ شہر خیال میں شرکت کر رہا ہوں۔ ورنہ بے سندھ نے ہمارے گاؤں نورنگہ کو لنگل بلایا ہے اور ہم نقل مکانی کر کے وہ کھڑی موز آگئے ہیں۔ جہت سنت رسول اکرم ہے۔ قارئین اور آپ ہمارے لیے دعا فرمادیں کہ جی جگ ہمارے لیے راس آئے۔ قارئین کے محبت سے سامنے ہیں شاہد جہا نگیر شاہ کا طویل خط پڑھا۔ وائی ڈاؤن کا نظریہ ارتقاء لفظ مفروضہ ہے پتی ہے لیکن پھر بھی ہم نے یورپ والوں کے لفظ نظریات کو پیش کیجنا ہے۔ ایجاز حسین مسعود اور پودھل کے تیکنی سرگزشت کے مستقل لکھاری ہیں۔ سردار ناگوری، ڈاکٹر فرحان امین۔ انور عباس شاہ، بکھر۔ مانا محمد سجاد، مانا محمد شاہد، احمد خان توہیدی، خشی محمد عزیز سے کے خواہر صورت خطوط پڑھے۔ محمد عمران جہانی ماپ کا نمبر ڈیلیٹ ہو گیا ہے۔ ان خطوط میں اپنے طبع کے ملک رحمت، طاہرہ نگار اور اپنے خاص دوست احسان عمر شامل تھے۔ ایک اور دوست ساہوال کے راجیجہ قاتل بھی مرے سے محفل سے غائب ہیں۔ بکھڑوں پہلے لاہوری کی عدالت میں فرزند لپی لپی کو اپنے شوہر اور قانون کے دھوکا لوں کے سامنے بیٹھوں سے مار مار کر ہلاک کر دینے والے اچھے پر دل بہت دینی ہوا۔ محفلت اسلام میں یہ واقعہ اکل دل کے من پر طمانچہ ہے۔ کہہ رہا ہوں ہیں، پولیس اور عوام سب خاموشی مٹا ثانی بنے رہے یہ ظلم دیکھتے رہے۔ یہ واقعہ بد نہ کر (انجیل میں) ہمارا سر شرم سے جھک گیا۔ یہ سب جہالت کا نتیجہ ہے۔ اور ہم پاکستانیوں کی بے بسی کو اجاگر کرتا ہے۔ اب آتے ہیں سرگزشت کے مضامین کی طرف۔ سرگزشت ایک شاہکار ادبی رسالہ ہے۔ چراغ ادب میں مرزا جعفر علی خان کی زندگی کے حالات کو احاطہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی عمدہ کاوش ہے۔ وہ کون تھے؟ ایک تحقیقی مضمون ہے۔ حق را آزاد صاحب نے زمانہ قدیم کی پراسرار ٹیکنالوجی سے ہمیں روشناس کرایا ہے۔ ماہرین آثار و بات نے اب تک جو کچھ بھی دریافت کیا ہے وائی اس نے ہمیں درطرحت میں ڈال دیا ہے۔ امین کبیر کی تحلیلات، ماضی امریکا کی تین بیویوں کی عمدہ کہانی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی جرم و قاتل جنگ عظیم دوم کا انوکھا واقعہ ہے۔ جناب علی سفیان آقائی کی لکھی افسانہ لکھنے کا تسلیم رضا کے حالات زندگی پڑھے وائی وہ ایک اچھے نگار تھے۔ مگر انہوں کی بے پروائی اور انسانی غفلت کا شکار ہو گئے کہ ذوال میں ہم لوگ اچھے اچھوں کو بھول جاتے ہیں۔ خوشنیت سنگھ افسانہ تاریخ کا عجیب کردار ہے۔ لکھی افسانہ میں ایک بات ہے کہ سفیان صاحب بار بار ایک ہی واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ طویل سلسلہ میں شبیاز ملک کو پھر اٹھایا میں پھنسا دیا گیا ہے۔ بہر حال مار و حاکم ایک مقبول سلسلہ ہے۔ گدا آپ ختم میں موت یا حیات میں موت ذات کو لکھی تو کس کیا گیا ہے۔ سب نزلہ ہے چاری عورتوں پر ڈال کر مرد حضرات پر تر ہو جاتے ہیں۔ استادی اچھی تحریر ہے۔ اندھی سوچ ایک معاشرتی البہ کو ظاہر کرتی ہے۔ نام نہاد پورہ نے اپنے اڑے چلانے کے لیے جو بھی عورتوں کو ذلیل بنا رکھا ہے۔ بے چاری شریف جوہر میں دولت کے ساتھ ساتھ اٹلی عزت لگی گنوا بکھتی ہیں۔ یہ ایسے لوگ معاشرہ میں ماسور ہیں۔ آخری کہانی اعتراف گناہ ہے جس میں ایک معاشرتی لفظ کو جان کیا گیا ہے۔ کچھ صاحب کا لے تھے ان کی محبت بھی کالی تھی تو ان کو عظیم مصور اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ وائی صاحب مضمون بکھر گئے تھے۔ اور پھر اعتراف گناہ کر کے اپنی لفظی کی معافی کے طالب ہوئے۔ معاشرہ میں قاتل اور مفذ و لوگ ہماری توجہ کے طالب ہوتے ہیں لیکن معاشرہ ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس معاشرہ کی برائی سے بچائے آمین۔"

ملک جاوید محمد خان سرکافی، برہنہ زنی مجھ سے آئے ہیں "جناب شاہد جہا نگیر شاہ شہر خیال کی صدارت اور مرزا احمد القادر بیدل پر لکھے گئے تحقیقی مضمون کی اشاعت پر جہاں اتنی بڑی بڑی مبارک بادیں آپ کو ملی ہیں ان میں ایک بھی کسی مبارک باد ہماری بھی شامل کر لیں۔ ایک بد سے کام کو آپ نے مختصر مگر جامع اور موثر انداز میں قلم بند کیا۔ اگر سوئے ادب نہ ہو تو یہ کہوں گا کہ اس سند کو کوڑے میں بند کر دیا۔ حق یہی ہے کہ آپ نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ ناصر حسین صاحب نے مرزا بیدل کو شاعر دی یعنی دلی نہیں بلکہ شاعر دی لکھا تھا۔ ولی اور صوفی عموماً مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فرحان امین صاحب احساس کتری تو ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے جو آپ کہہ رہی ہیں یہ احساس محرومی اور احساس شرمندگی ہے۔ اگر یہ احساس امت سلسلہ کے ناخاندانوں کے دلوں میں بھی پیدا ہو جائیں تو حالات بدلنے میں حد اس نہیں لگس گی کیونکہ ہائی ہے انہی رنگ ہمارے خون جگر میں۔ آپ جائزہ لے لیں تمام مذہبی وسائل مسلمانوں کو بھٹا کیے گئے ہیں لیکن ہمارے پیرکار وہاں ان نعمتوں کو مسلسل بھٹا رہے ہیں۔ حکیم محمد سعید شہید نے پاکستان کے بارے میں کہا تھا کہ سورہ رحمان کی تفسیر ہے۔ طاہرہ قمر لکھی صاحب شاہیر مہالوئی کے سلسلے میں ایک مشورہ ہے کہ مولانا اللہ یار خان اور مولانا احمد اللہ چکڑالوی کے نام بھی اپنی تحقیق میں شامل کر لیں۔ مولانا اللہ یار خان ایک ممتاز عالم دین، عظیم مناظر، کئی کتابوں کے مصنف اور سلسلہ نقشبندیہ اور سید کے شیخ طریقت

تھے۔ ۱۹۸۹ء کو لاہور میں ۱۸ فروری ۱۹۸۴ء کو وفات پائی اور گاہکس پیکرال میں دفن کیے گئے

رائٹ محمد شاہد کی پورے عرصہ سے آمد و آمد یہ فوج کی محبت میں گذر چکا تھا۔ وہ جسے بھی فوج ہی ہر ملک کا آخری معتبر ادارہ ہوتی ہے۔ جو آپ کی حفاظت کچھ یوں کرتی ہے کہ آپ مٹی خندق کے حوض لے رہے ہوتے ہیں اور یہ فوج سرحدوں پر بھر دے دیتی ہوتی ہے۔

بھارت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لیے آج ہمیں 65 سالے مذہبی کی ضرورت ہے۔ جب فوج سے محبت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنی فوج کے لیے جان و مال سب کچھ دینے پر تیار تھے۔ شہر خیال میں شاہد جہاگیر شاہد کا طویل خط دلچسپ رہا۔ جہاں ان کے کراچی میں گزارے بچپن کے ایام کا ذکر ہوا، وہیں ان کی عمر کا اعتراف بھی ہو گیا۔ ہاں! ایمان حسین شاہد اگلے بیانیوں پر تبصرہ خوب فرماتے ہیں۔ کسی عجیب جوانی کے ساتھ خود بھی میدان میں اتریں نا۔ سدودہ بانو ناگوری! جس معاشرے میں تعلیم کو کاروبار بنایا جائے۔ وہاں بچوں کو تعلیم کم دی جاتی ہے اور گھروں کے کام زیادہ کروائے جاتے ہیں۔ اگلی گل، محلے محلے میں کل یہ ٹیوشن اکڑیں ہاں اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ خوب کاروبار ہے تعلیم بھی۔ پھر یہ بھی دیکھیے کیا اگر غریب کے بچے بھی تعلیم حاصل کرنے لگے تو سردار احمد چندی پور ڈیرے کہاں جائیں گے۔ کس پر حکومت کریں گے؟ ہمارے معاشرے کا ایک بڑا طبقہ ہے اور اکثر قریب الصحن نے کنگ لکھا کا پانچ فیصد نہیں کے ساتھ ساتھ سال بھر مختلف تقریبات و تاویلات کے ذریعے غریب والدین سے لاکھوں روپے وصول کیے جاتے ہیں جو بالکل اپنے بچوں کو تعلیم دلا پاتے ہیں۔ محمد عمران جروانی باغی میں اگر ماہرین ہوتا تو ساتھ ساتھ دو اداری وضع داری بھی ہوتی تھی جو کہ آج منقوع ہوئی جا رہی ہے۔ آلاب احمد صبر اشرفی! ابھی حال ہی میں کہیں پڑھا تھا کہ امریکی مظالم ہمارے سامنے قیامت کی نشانی کو لب کر لیا ہے۔ قیامت کی نشانی ہے کہ سورج مغرب سے نکلے گا۔ ناسا کی تحقیق کے مطابق 30 جولائی کو اس سیارے کی مشرق کی سمت گردش رک گئی تھی جبکہ آگست اور ستمبر کو سرخ نے اسے راستے کی سمت تبدیل کر لی تھی۔ باہرین کے مطابق سورج سیارے میں گردش میں تبدیلی اس امر کی نمائندگی کرتی ہے کہ تمام سیاروں کی گردش میں ایک دفعہ تبدیلی ضرور آئے گی۔ جہاں تک زمین کا تعلق ہے۔ اس کی گردش بھی مخالف سمت میں ہوگی اور سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور ایسا جلد ہوگا۔ اسلام عالم کای سبل پڑھ کر خوشی ہوئی کہ بھارت میں سرگزشت جاتا ہے اور وہاں بھی شرق سے پڑھا جاتا ہے۔ (فیس بک پر اعلان اس پر ہے) کتنی تعریف کرتے ہیں وہ کہہ کر خوشی ہوتی ہے) فطرتی طور پر سرگزشت کو حاصل کرنے کی تک وہ خاص دلچسپ ہوتی ہے۔ سرگزشت سے ان کی محبت ان کے شوق کا پتا دیتی ہے۔ ویسے ڈاکٹر مساجد احمد کو اس بات کی داد ملتی ہوگی کہ وہ اکثر ان شخصیات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں جن سے عام آدمی بالکل ناواقف ہوتا ہے۔ پس ڈاکٹر صاحب ادب کی خوب خدمت کر رہے ہیں اور چراغ ادب روشن کیے ہوئے ہیں۔ مختار آزاد کی وہ کون تھے ایک تحقیقی و مطولاتی مضمون تھا۔ یہ سچ ہے کہ تاریخ میں سب کچھ حقیقت نہیں ہوتا، مگر یہ کہ بہت سی باتیں مجھ سماعت لیے ہوئے بھی ہوتی ہیں۔ تمن۔ بہنو کی جدوجہد آزادی کی داستان امن کبیری زبانی پڑھنے کو ملی۔ یہ سچ ہے کہ آزادی کی قدردان احساس وہی لوگ پاسکتے ہیں جو غلامی کے غم آشوب دور سے گزرے ہوں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی دوسری جنگ عظیم کا واقعہ جرم و قاء ایک مفروضہ دلچسپ تحریر تھی۔ فسی الف لیلہ میں اس بار خوشونت سنگھ پر جملی سفیان آبادی نے لکھا، وہ خاصے کی چیز تھا۔ خطر نام جون کے صفحے کی مناسبت سے معلومات بخوبی پہنچا رہے تھے۔ محمد لیا راہی کی کہانی بھوک آج کے دور کی حکایت تحریر تھی۔ مغربی تہذیب نے مشرقی نوجوانوں کے دلوں کو مفلوج کر کے دکھایا ہے اور آئے روز ہوس کے مارے بہ بد بخت جو جرائم کرتے نظر آتے ہیں، وہ بھی اغلیات و افلیات پر نظر آتے رہتے ہیں اور ان جرائم کے پیچھے بھی بنیادی وجہ وہ فسادِ فطریاتی ہی ہے جو مغرب سے ہمارے معاشرے میں تقریباً مراعت کر چکی ہے۔ اس میں ہمارا ملک ٹاپ پر ہے۔ مفروضہ بیانیوں کی سرگزشت کی پہچان ہیں۔ ایک تجویز ہے کہ ڈاکٹر مساجد احمد، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، کاشت زہراء، امین کبیر اور دوسرے معروف دانشوروں کی سرگزشت بھی شائع کیجئے۔ ایک مختصر ہی ہو (آپ کی تجویز نوٹ کر لی ہے)

فشی محمد عزیز مئے کالڈن سے آخری وقت میں موصول خط "سب سے پہلے آلہ دی ریکا رڈ ایک بات کا جواب ہاں یا نہ میں دے دیتے گا کہ میری کہاں غلامی میری ہے آپ میرے ڈاک فریہ پر ہوا جس مجھے بھیج سکتے ہیں (بہت مشکل ہے اس لیے کہ مستر و کہانیاں ردی میں اہل دی جاتی ہیں، ہر روز 10، 15 کہانیاں مستر دہتی ہیں اس لیے رکن ممکن نہیں) آپ تجا نے کب محترم شہانہ حنیف کے ساتھ رابطہ کروائیں گے، کسی بھی خواتین اپنے پر کا نمبر ہم کسی کو نہیں دیتے بلکہ خواتین کو نمبر دے کر کہہ دیتے ہیں کہ آپ اپنے طور پر رابطہ کریں۔ ادارہ ذمہ دار نہیں ہے) لہرست کو سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد ادارہ بے تک پہنچے، جی ہاں اہل محترم اشیتان تو مفید ہے لیکن اس کے خیلے اس کی جگہ بڑے اسسٹریٹ سے ڈیوٹی نبھا رہے ہیں۔ شاعر جادو حیاں میں داغ و دہلی کی داستان حیات پڑھنے کوئی۔ شہر خیال کی صدارت دانا محمد سہاد صاحب کے حصے میں آئی۔ مبارکباد۔ دانا محمد شاہد اس مرتبہ غیر حاضر رہے۔ ظہیر احمد جسم عالم نڈھ کر ہیں، وہ یکم گی۔ اعجاز حسین سخاوا کیسے ہیں پیارے بھائی؟ آپ کی بات سے میں بھی شوق ہوں کہ شہر خیال کا رتبہ بڑھا دیا جائے۔ چوہدری مدثر حسین اس مرتبہ تھرے کی بجائے کلچر کرتے ہوئے نظر آئے۔ لڑکی چلتے چلتے ہم طاہرہ گلزار کے قریب پہنچے تو انہوں نے میٹرو اپ کرادیا۔ محترمہ آپ کا نام کبھی میں دواصل ادب مانع تھا۔ ادا تھا کہ کہیں "بے دہلی" نہ کر بیٹھوں وگرنہ اور تو کوئی وجہ نہ تھی۔ ویسے ماشاء اللہ گستا ہے پٹاور میں سارا "کوئلہ" قی ہے یعنی شاہد جہا ظہیر شاہد، شوکت رحمن شنگ اور طاہرہ گلزار۔ تینوں کے نام بھی زبردست ہیں، کام بھی۔ سدرہ بانو!

آپ کو خوش دیکھ کر ہم خوش ہیں، اللہ آپ کو سد اخوش و غم نہ کئے آمین۔ آپ کی پُر غلوں محبت کے لیے مشکور ہوں۔ قیصر عباس خٹان مغلطی
پسندیدگی کا شکر یہ قرۃ العین نے نبی احمد شکر کر لیت کر دینا تو آپ کا نام پھر آیا۔ مدونہ نقیص بہا کی طرف سے پڑھائی ہے ملاحظہ کر سہ
خیریت سے ہوں۔ اہم اے خالق بخت۔ وحید بیست بخت! آپ صاحبان کہاں قاعب ہیں؟ آراء سجاد کے علاوہ طاہرہ نگرار و مسدودہ مالو
ناگوری، انور عباس شاہ اور آفتاب احمد نصیر اشرفی کے خطوط بھر پور تھے۔ مقابلہ بیت ہاڑی میں نورین اسلم، نورین مجسم، نورین، احقر و مسجد
احمد چہاں اور مانا حبیب الرحمان کا انتخاب پسند آیا۔ ڈاکٹر ساجد صاحب نے مکتب کے عظیم رہنما چار آئن لائی کے حالات زندگی کا خوب
احاطہ کیا۔ فکیل صدیقی صاحب غوثی ک اور ڈرائونی کہتوں کے مصنف آسٹین انیون گنگ کی داستان سار ہے تھے۔ ویسے اسٹینٹن کی
بیوی بہت اچھی تھی مگر اپنے شوہر کو مثنیات سے باز رکھنے کے لیے اتنے جتن کیے۔ خالداں براد اگرچہ جاسوسی نامی کہانی تھی لیکن اس میں
یہودیوں کے فلسفین پر ڈھانچے جانے والے عقالم کے متعلق بھی بہت اچھے انداز میں لکھا گیا ہے۔ محبت و جنگ کا غور و انہام چڑھ کر
خوشی ہوئی اور اس بات پر حیرت بھی کہ تیمور، حبیب کی بابت پہلے دن ہی سے سب کچھ جانتا تھا۔ فکیل الفیل میں نارچ حسن و حدیث کیانی
کے بعد میرے پسندیدہ شاعر ناصر کاظمی کا تذکرہ خوب رہا اس کی "پیکل پارش" مجھے بہت پسند ہے۔ سبکل نمبر 14 انتہائی مکررہ اور سٹاک
کامل کی کہانی جسے حدالت بھی اتنے سنگین جرائم کے باوجود کوئی سزا نہ دے سکے۔ انیسویں، صد انیسویں۔ ترکی کا سطر انعام کو بیچا۔ اب آفاق
صاحب کہیں لیے چلتے ہیں؟ پھر وہی فکیل پیکل کا کیانی میں عباد کا کردار حیرت انگیز تھا کہ اس نے ایمل کو ہاڑت طریقے سے اپنا یا کیوں،
جب یوں چھوڑ دیا تھا، اپنی بیٹی کے لیے عباد کا مکمل قابل غور ہے کہ اپنی بیٹی اسے کئی عزیز تھی۔ بے مس، میں شکر کی سٹاک کا چڑھ کر رو گئے
کھڑے ہو گئے استغفر اللہ۔ درد میں مہر انور کی اہل طرہی کو سلام۔ عظیم ایڈوکیٹ صاحب۔ بھیل و انسانوں کے رویہ میں چھپے دردوں
کی کہانی جو ہر قسم کے جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔ ان کا مطبع پھر صرف اور صرف دولت ہوتی ہے۔ وارث میں زندگی کو وارث تو مل گیا
لیکن اس کی ساس بے جاری تو بڑے کو گود میں کھلانے کی حسرت دل میں لایے کر قبر میں چلی گئی۔"

ڈاکٹر روینہ نقیس کا ہنکڑے لٹ "نقیس صاحبہ کی طبیعت خراب ہے تمام احباب سے دعا کی اپیل"

[illegible]

تاخیر سے موصول خطوط:

آفتاب احمد نصیر اشرفی، لاہور۔ مظفر علی خان، ملتان۔ حصہ احمد، احمد خان توحیدی، کراچی۔ امتیاز حسین، لاہور۔ نقیس حسن، گوجرانوالہ۔ سیدویشان ندیدی، ملتان۔ شبیب مظفر کاظمی، جنگ صدر۔ رانا محمد سجاد، مظفر گڑھ۔ احمد باقر، قری، چنیوٹ۔ ناصر سجاد، الحمن، بھالائی۔ ادیب خان، چشام۔ محمد سراج، لدینہ۔ واسطہ جازی، ملتان۔ انجاز حسین، شجاع پور، رحمت۔ طاہرہ، گنڈاپور۔ رانا محمد شاہد، پورہ۔

انتقال پر ملال

قارئین سرگزشت کو ہم لہجہٴ مذکر کے ساتھ اطلاع دے رہے ہیں کہ ادارے کے مدیرینہ ساجی معروف مصور شہزادہ حسین طویل عیالات کے بعد خالص حقیقی سے جا ملے تمام قارئین سے درخواستوں کے لیے اہتمام ہے۔

۱۰ اگست ۲۰۱۴ء کے پاکستان کا خصوصی عید نمبر بے شمار نیاں سہنے

پاکینہ

کراچی ماہنامہ



رفعت سراج کی امانت میں عیاں ہوئے کئی راز

ترک وفا میں نایاب جیلانی نے اٹھائے کئی سوال

من مونی سی مومل شنید

کے ساتھ رضوانہ پرنس نے

رکھی ایک خوبصورت نشست

عزیزہ سید کے قلم کار

ناول شام شمع یاران

پہرہ پہن کر ان کا

دس نمبر کا سوال ناہید سلطانیہ اختر کے قلم کا ایک اور شاہکار



شائستہ عزیز، شیریں حیدر، عقیلہ حق اور سمیرا حمید کے

وکش افسانوں کے ساتھ ساتھ پڑھیے ام ثمامہ، نیرانی شفق،

عذرا فردوس، ام مریم اور حمیرا خان کی چونکا دینے والی خوبصورت تحریریں

بے حد حسین، دلکش اور متحرک مستقل رتوں کا پیشکش سراج آپ جیسے باریک اور با ذوق قارئین کے لیے

نشانِ حیدر

ڈاکٹر ساجد امجد

ہر سو دہشت گردی کی فضا ہے اور خون شہداءں کو ہے توقیر کرنے کی سازشیں ہیں۔ کئی سو سال کی غلامی کے بعد حاصل کردہ آزادی کے خلاف مفاد پرستی کو پران چڑھایا جا رہا ہے۔ ایسے نازک وقت کی ہیکار ہے کہ نئی ہود کو جذبہ حب الوطنی سے سرشار افواج پاکستان کے کارنامے بتائے جائیں۔ جنہوں نے اپنا آج ہماری کل کے لیے قربان کیا ہے۔ قوم کے انہی مجاہدین میں ایک اہم نام راشد منہاس شہید کا بھی ہے۔ اس کم سن شہید نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا یہ سب کو پتا ہے مگر کس وجہ سے اس نے قید ہو کر جان بچانے کی بجائے موت کو گلے لگایا اس بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

ایک اٹن پرست کمرانے کے ہوا تو شہید ڈاکٹر ساجد

اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔
"آٹھویں کیا حرکت ہے۔ کتے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔"
آٹھویں کتے کے پاس سے ہٹ گیا۔ کتے نے بھی
اسی میں حافیت جانی کہ دم دبا کر کیا ڈنڈ سے باہر نکل
جائے۔ ڈھائی سالہ آٹھویں نے باپ کی انگلی تھامی اور گھر میں
چلا آیا۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک دن پھر مجید صاحب کیا ڈنڈ
میں داخل ہوئے تو آٹھویں کتے سے کھیل رہا تھا۔ باپ کو
دیکھتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ لیے کیونکہ
مجید صاحب نے کہا تھا کتے کو ہاتھ نہیں لگاتے لیکن اس کے
ساتھ ہی اس نے عجیب و غریب حرکت کی۔ اس نے اپنے
ہونٹ کتے کی تھوٹی سے دگڑ ڈالے۔

"ارے ارے۔ یہ کیا کر رہے ہو۔"
"آپ نے کہا تھا کتے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ میں کتے
کو ہاتھ تو نہیں لگا رہا۔"

ڈھائی سال کے بچے سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی
کہ وہ اپنی شرارت کا جواز اس طرح پیش کرے گا۔ انہوں

کا لے رنگ کا ایک کتا کیا ڈنڈ میں داخل ہوا اور
زمین سونگتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ پھر وہ رک گیا جیسے اس کی
مطلوبہ چیز اسے نہ مل سکی ہو۔ اس نے آسمان کی طرف منہ
کر کے ایک مخصوص آواز نکالی اور ایک طرف بیٹھ کر اپنے
بلاؤں کا اثر دیکھنے لگا۔

آٹھویں یقین نہیں تھا کہ آج اس کا دوست اس سے
میلے اتنی جلدی آجائے گا۔ اس نے جوبہ آواز سنی تو کیا ڈنڈ کی
طرف بھاگا۔ اس کا دوست کیا ڈنڈ میں آگے جنگلی گھاس پر
لیٹا ہوا تھا۔ آٹھویں دیکھتے ہی کتا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دم ہلا کر
اس کا استقبال کرنے لگا۔ اس کے منہ سے اس وقت بھی کچھ
آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کہہ رہا ہو یا رقم اتنی دیر سے
آئے۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ آؤ بیٹھو۔

آٹھویں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ
پھیرنے لگا۔ اسی وقت اس کے والد کیا ڈنڈ میں داخل
ہوئے۔ آج سب کام وقت سے پہلے ہو رہے تھے۔ اس
کے والد مجید صاحب بھی کچھ پہلے گھر آ گئے تھے۔ انہوں
نے یہ لگاؤ دیکھ لیا تھا کہ آٹھویں کتے کے قریب بیٹھا ہے اور



اس کی پیشانی پر پڑے ہوئے بال ہوا میں لہراتے
رہتے۔

ابن دلوں اس کے دو ہی مشاغل تھے۔ اس کالے
کتے سے کھیلتا جو کپاؤ ٹیڑھی آکر بند جاتا تھا اور اس سے اس
کی دوستی ہو گئی تھی یا ایئر فیلڈ پر اترتے ہوئے جہاز کو دیکھتا۔
کچھ دنوں کے لیے ایک کھلونا اور اس کے ہاتھ آگیا
تھا اور وہ بھی جیسور کے قیام کے ساتھ لڑائی پیدا ہونے والی اس
کی چھوٹی بہن جسے وہ کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا۔

ابھی اس کے یہ مصوم مشغلے جاری تھے کہ مجید
صاحب کا تہاولہ بہاول پور (مغربی پاکستان) ہو گیا۔
یہ خاندان مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کے شہر
بہاول پور آ گیا۔

راشد کی عمر ابھی بہت کم تھی لیکن اس نے بہت جلد چلنا
سیکھ لیا تھا اور عمر سے پہلے ہی خوب بولنے لگا تھا۔ ہاتھیں بھی
ایسی ذہانت کی کرتا تھا کہ بہاول پور پہنچتے ہی مجید صاحب نے
سوچا "اے اسکول میں داخل کر دیا جائے۔ والدہ کی محبت
ابھی اسے اسکول جیتے میں مانع تھی لیکن اسے اسکول بھیج دیا
گیا۔

ملازمت کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ مجید صاحب کو ایک
بکھڑا لکھا لکھا نہ ہوتا تھا۔ بہاول پور میں رہتے ہوئے چند ہی
ماہ ہوئے تھے کہ تہاولے کے احکامات آ گئے۔

"کیا بات ہے آپ پریشان بھی نہیں ہیں، دیکھی بھی
نظر نہیں آتے بلکہ لگتا ہے کہ کھانسی دے رہے ہیں۔" بیوی نے
پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ میری نوکری کی
نوعیت ہی ایسی ہے لیکن لگ رہی ہے کہ آشو (راشد) کو
اسکول میں داخل ہوئے چند ماہ ہوئے ہیں۔ اگر کچھ اور
وقت مل جاتا تو اس کی بنیاد مضبوط ہو جاتی۔"

"نوجیوں کا مقدمہ کیا ہے۔ اب آپ کا تہاولہ لاہور
ہو رہا ہے۔ وہ ایک بڑا شہر ہے۔ راشد کی تعلیم کا وہاں اور بھی
اچھا انتظام ہو سکے گا۔

"ہاں یہ تو ہے۔ اب تم تیاری کر لو۔ ہمارے پاس
زیادہ وقت نہیں ہے۔"

اس خاندان نے ایک مرحلہ پھر سامان اٹھایا اور لاہور
آ گیا۔ یہاں راشد کو کوئین میری کالج کے "گے" سیکشن
میں داخل کر دیا گیا۔

وہ ذہین بھی تھا اور اسے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ اس

نے یہ واقعہ گھر میں جا کر بتایا تو... سب ہی اس پڑے۔
کئی دن تک گھر میں اس کی لہانت کے چہرے
ہوتے رہے۔

مجید صاحب فوج میں سول انجینئر تھے۔ وہ راجپوتوں
کے قبیلے "منہاس" سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ دوسری جنگ
عظیم کے زمانے میں فوج میں شامل ہوئے تھے۔ انہوں
نے کچھ عرصہ عراق اور ایران میں بھی گزارا تھا۔ پھر برما اور
بنگلہ دیش کے محاذوں پر بھی خدمات انجام دیں جہاں
جاپانیوں کی تباہ کن افواج کا سامنا تھا۔ جنگ کے اختتام پر
انہیں انڈیا میڈل برما میڈل اور عراق میڈل دیے گئے۔
دنیا کے نقشے پر ایک آزاد مملکت پاکستان کے نام
سے وجود میں آئی تو وہ اپنے وطن خاندان کے ساتھ کراچی
آ گئے۔ جہاں ان کا قیام ڈرگ روڈ پر واقع "ایم ای ایس"
کے بنگلوں میں ہوا۔

وہ اپنی تین لڑکیوں کے ساتھ کراچی پہنچے تھے۔ ابھی
تک ان کے گھر میں کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں ان
کے گھر... ایک لڑکا پیدا ہوا۔ تین لڑکیوں کے بعد پیدا ہوا
تھا اس لیے فطری طور پر بے انتہا خوشی منائی گئی۔ اس لڑکے
کا نام راشد منہاس رکھا گیا۔ مجید صاحب اسے گھر میں
"آشو" کہہ کر پکارتے تھے۔

کراچی میں انہیں پاکستان ایسٹلٹ کوآپریٹو ہاؤسنگ
سوسائٹی (پی ای سی ایچ ایس) میں ہزار گز کا پلاٹ بھی ملا
تھا۔ اس پلاٹ پر انہوں نے تعمیر شروع کر دی۔ اس کا نام
انہوں نے "منہاس دہلا" رکھا تھا۔

جب یہ بنگلا تیار ہو گیا تو ان کی پوسٹنگ اس وقت کے
مشرقی پاکستان کے شہر "جیسور" میں ہو گئی۔ راشد منہاس
اس وقت دو سال کا ہو چکا تھا۔ مجید صاحب نے بنگلا کرائے
پر دیا اور خود جیسور پہنچ گئے۔

مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) اپنی دلچسپ
جھیلیں اور بہتر ذراؤں کے باعث دیکھنے سے تعلق رکھتا
تھا۔ جیسور کا علاقہ خوبصورت جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ مجید
صاحب کو جوہر ہائش ملی تھی اس کے کپاؤنڈ میں بھی جنگلی گھاس
اُگی ہوئی تھی۔ کپاؤنڈ سے باہر بھی دور تک جتنا میدان تھا وہ
گھاس سے لکھا ہوا تھا۔ میدان میں ایک چھوٹی سی ایئر فیلڈ
بھی تھی جہاں کبھی کبھی کوئی سامان بردار جہاز گمن گرج کے
ساتھ اتر جاتا تھا۔ راشد جب بھی جہاز کی آواز سنتا دوڑتا
ہوا آتا اور کپاؤنڈ کے جنگل سے لگ کر جہاز کو دیکھتا رہتا۔

کر دیے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے اس کی ایک کمزوری گھردلوں اور خاص طور پر بہنوں کے ہاتھ آگئی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل تھا۔ وہ اکیلے بیٹھے بیٹھے بے اختیار ہنسنے لگتا۔

”تم زور زور سے ہنس کر دوسروں کو کیوں ڈسٹرب کرتے ہو۔ چپ چاپ کیوں نہیں بیٹھتے ہو۔“

”ہنسی کیا کروں۔ ہنسی کی باتوں پر مجھے تو ہنسی آجاتی ہے۔“

”دیکھنا ابو کے ہاتھوں کی روز خوب پڑے۔“

”مجھے اس وقت بھی ہنسی آجائے گی اگر انہوں نے اگلے سہ ماہی ہاتھ مجھ پر اٹھائے۔“

وہ واقعی موقع بے موقع ہنسی پڑتا تھا۔ ہنسی کو ضبط بھی کرنا تھا تو اس کی آنکھیں ہنسنے لگتی تھیں۔ ہنسی کو ذخیرہ کرنا نہیں سکتا تھا۔ یہ تو وہ دولت تھی جسے لٹانے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اس کی یہ عادت ہمیشہ اس کے ساتھ رہی۔ اس کی اس عادت نے اسے کئی مرتبہ مشکل میں پھنسا یا لیکن وہ ہنسنے ہی رہا۔

اسے سب سے آگے بڑھنا اور بڑا ہنسنے کا شوق تھا۔ وہ چاہتا تھا سب اسے بڑا سمجھیں اور اس کی اہمیت کو تسلیم کریں۔ وہ ایسا سب کچھ کرے جو دوسرے نہ کر سکیں۔ وہ صوف کہتا ہی نہیں تھا بلکہ جیسے عمل قدم بھی اٹھاتا تھا جس سے اس کی برتری ثابت ہو چاہے اس میں کتنے ہی خطرات ہوں۔

اس کے ماموں غلام سرور کے پانچ بچے تھے۔ وہ جب ملازمت کے سلسلے میں لاہور آئے اور مجید صاحب کے گھر میں کچھ دنوں کے لیے ٹھہرے تو راشد کو سناجھی مل گئی اور ان پر رعب بھانے کا موقع بھی خوب ملا۔ شرارتوں کے نئے دروازے کھل گئے۔

ایک دن تمام بچے گمن میں گئے جہاں کے بڑے کے بچے جمع تھے اور اوپر کی طرف تک رہے تھے جس پر بچے ہوئے جہاں گئے تھے۔ اوپر جائے بلجیر یہ جہاں اتر نہیں سکتے تھے اور درخت پر چڑھنے کی ہمت کسی کی نہیں تھی۔ درخت کی اونچائی اتنی تھی کہ کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا کزن نورمال کا تھا لیکن وہ بھی ہچکچاہٹا تھا۔ راشد کی عمر اس وقت سات سال تھی لیکن اسے اونچائی سے لڑا بھی خوف معلوم نہیں ہوا۔ اس نے اعلان کیا کہ درخت پر وہ چڑھے گا۔ سب بچے خوش ہو گئے کہ اب جہاں کھانے کو نہیں گے۔ وہ درخت پر چڑھ گیا اور اس کی شاخیں ہلاتا رہا۔ جہاں ٹپ

اگست 2014ء

معمولی کلاس سے وابستہ بچے عموماً نصاب کی کتابوں تک محدود رہتے تھے لیکن وہ گھر میں آنے والے اخباروں کی ورق گردانی کرتا رہتا اور ایک دن اس نے سب کو حیرت میں ڈال دیا جب اس نے انگریزی اخبار ”ڈان“ کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ اور پھر یہ اس کا معمول ہو گیا۔

ہوائی جہازوں سے اس کی دلچسپی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ شوق اسے اس وقت بھی تھا جب وہ گھر میں تھا اور گھر کے قریب مال بردار جہازوں کو اترتے اور اڑتے دیکھتا تھا۔ لاہور میں یہ سہولت تو نہیں تھی لیکن لاہور کا آسمان ان جہازوں کی گزر گاہ ضرور تھا۔ وہ ان جہازوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا تھا اور اپنی بڑی بہنوں سے اس عزم کا اظہار کرتا تھا کہ وہ بھی ایک دن ایسا ہی ایک جہاز اڑائے گا۔

”تو تم پائلٹ بنو گے۔“

”جی نہیں۔ مجھے ٹرک چلانے کا کوئی شوق نہیں۔ میں تو فائربول گا۔ اپنا طیارہ اڑاؤں گا اور دشمن کا طیارہ مار گراؤں گا۔“

”تم نے خود کو دیکھا ہے؟“ دونوں بہنیں ہنسنے لگیں۔

”تم بھی کہنا چاہتی ہونا کہ میں چھوٹا ہوں۔ میرے چہرہ دیکھ لو گی کہ میں چھوٹا نہیں ہوں۔ میں تم دونوں سے بڑا ہوں۔ دیکھ لیتا تم۔“

وہ بڑی شان سے کہتا اور دوبارہ آسمانوں میں جھانکنے لگتا۔

اس کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے مجید صاحب نے اسے طیاروں سے متعلق چند فلمی مٹی کتابیں لا کر دے دیں۔ اب اسے ایک اور مشغلہ ہاتھ لگ گیا۔ ان کتابوں کو بار بار پڑھتا رہتا۔ اب اس کے ارادوں میں ایک نئی چیز کا اضافہ ہو گیا۔ وہ سید پھلا کر کہا کرتا تھا کہ میں نے کئی ترکیبیں سیکھ لی ہیں۔ میں اپنا طیارہ خود بناؤں گا۔

اس کی بہنیں اس سے بڑی تھیں اور ظاہر ہے تعلیم میں بھی آگے تھیں۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی اس سے آگے ہو اور وہ بھی نہیں جو ہر وقت اس پر رعب بھانے رہتی تھیں۔ وہ نہ تو عمر میں ان سے آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ تعلیمی کلاسوں میں۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ وہ خود کو ان سے زیادہ کچھ دلالت کرے اور یہ کچھ بلو بھ کتابوں ہی سے آسکتی تھی۔ اسے سب سے زیادہ دلچسپی آتے تھے۔ اس کے لیے اس نے مزاج سے بھرپور کاک پڑھنے شروع

ماہنامہ سیرگشت

بپ بچے کر رہی تھیں اور وہ خوشی سے نعرے لگا رہا تھا۔
”کھاؤ بچہ خوب جاسن کھاؤ۔“

گھر والوں نے جب سنا کہ وہ درخت پر چڑھا تھا تو اس پر خوب ڈانٹ پڑی۔

”میں یہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ میرے گھر میں جاسن کا درخت ہوا اور بچے جاسن سے محروم ہوں۔“

”اگر تم گر جاتے اور بڑی پیل لوٹ جاتی تو کیا ہوتا۔ آجہ سے تم درخت پر نہیں چڑھو گے۔“

”چلو ہم کوئی اور کھیل کھیل لیا کریں گے۔“ اس نے ”کھیل“ نے یہ شکل اختیار کی کہ راشد نے

اپنی چہرے والی بندوق نکالی۔ اپنے کزن شاہد کو ساتھ لیا اور گھر کے گن میں چڑھوں کا شمار کرنے لگے۔ جب کچھ دیر

گزر گئی تو ان کے دل میں ایک الٹو کھاتھیل آیا۔
”چلو صفائی کرنے والی کے کواٹر پر اٹھک کریں۔“

دلوں نے پوزیشن سنبھالی اور ملازمہ کے کواٹر کی طرف بڑھے۔ راشد کے اچھ میں چہرے والی بندوق تھی۔

وہ اس کا رخ کواٹر کی طرف کیے ہوئے دبے قدموں آگے بڑھ رہا تھا کہ جیسے ہی دشمن سامنے آئے وہ اس پر اٹھک

کر دے۔ اسی وقت ملازمہ باہر نکل اور راشد کی اٹلی ٹریگر پر دب گئی۔ گن سے چہرہ نکلا اور ملازمہ کے چہرے کو چھوٹا ہوا

گزر گیا۔ فیر ہو گئی تھی لیکن ملازمہ نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ بڑوں نے راشد اور شاہد کی اچھی طرح خبر لی۔ مجید

صاحب کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تو انہوں نے چھ ماہ تک راشد کو شاہد کے ساتھ کھیلنے پر پابندی لگا دی۔

یہ پابندی برقرار رہتی لیکن انہی دنوں اس کے ماموں غلام سرور جو ہر آباد سے لاہور آ گئے۔ ان کی ٹیلی لاہور میں

تھی لیکن وہ خود جو ہر آباد میں تھے۔ پندرہ دن بعد آئے تھے۔ بچوں کے اسکول کی چٹیاں تھیں لہذا یہ پروگرام بنا کہ

سب لوگ جو ہر آباد چلیں اور وہاں سے سکس کے مل اسٹیشن چلیں۔ بچے پہاڑی مقامات کی سیر کر لیں گے۔ راشد اور

شاہد بھر یک جا ہو گئے۔
جو ہر آباد پہنچ کر مل اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔

راستے بھر راشد اور شاہد کی شوخیاں سب کا دل بہلاتی رہیں۔ راشد کی ہنسی یہاں بھی اپنا کام دکھا رہی تھی۔ وہ ہنسنے

پر آتا تو ہنستا ہی چلا جاتا۔ یہ تفریح کا موقع تھا اس لیے اس کی بے جا ہنسی پر کسی کا اعتراض نہیں تھا۔

بچے مکلی مریجہ کی پہاڑی سلسلے میں سڑک کر رہے تھے

اس لیے یہاں کے دلفریب مناظر ان کی دلچسپی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ہر طرف پہاڑیاں ہی پہاڑیاں تھیں۔ گاڑی کا

شور سن کر خرگوش اور جیر پہاڑیوں میں ادھر ادھر چھپتے بھر رہے تھے۔ راشد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گاڑی سے کود کر

ان کا پیچھا کرنا۔ اس وقت تو صرف تیسروں پر ہی گزارا ہو سکتا تھا۔

دوبی سون میں داخل ہوتے ہی سڑکیں ٹھیب کی طرف اترنے لگیں۔ وہ ڈر بھی رہا تھا اور لطف اٹھوا بھی

ہو رہا تھا۔ اس نے بچے جھانک کر دیکھا۔ دادیوں میں سلیڈ دھواں نظر آ رہا تھا۔ اس کے بڑوں نے اسے بتایا کہ وہ

بادلوں کے اوپر سڑک کر رہے ہیں۔ یہ اطلاع ہی اس کے لیے بڑی دلچسپ تھی۔

”ایک دن دیکھنا میرا طیارہ بھی ان بادلوں سے اوپر سڑک رہے گا۔“

”تم اپنے طیارے کا ذکر ضرور بیچ میں لے آنا۔“ اس کی بہن نے کہا۔

”کیوں نہ گاؤں۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں۔ طیارہ اڑا سکتا ہوں۔“ اس نے کہا اور دوبارہ دادی میں ہما ٹگنے

لگا۔
”کاش! میں بچے چلا جاؤں اور یہاں کے لوگوں کو دیکھوں۔“

اس کی دعا قبول ہوئی۔ جب گاڑی مل کھاتی سڑکوں سے ہوتی ہوئی بچے دادی میں آئی تو دونوں گاڑیاں بھرے

بازار میں رک گئیں۔ راشد کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ یہاں کے لوگ نہایت مہمان نواز ہیں۔ یہاں کے لوگ

زیادہ تر فوج میں جاتے تھے۔ کئی ریتا تفریحی انہیں ملے جو اب دکانیں چلا رہے تھے۔ مجید صاحب کا حلق بھی فوج سے

تھا اس لیے بھی ان کی خوب آواز بھگت ہوئی۔
سکس پہنچ کر کئی دلچسپی کی چیزیں نظر آئیں جو اس کے

لیے ظاہر ہے بالکل نئی تھیں۔
یہ سڑاں کے لیے مطالعاتی سرٹاٹ ہوا۔ وہ ایک

ایک چیز کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتا رہا۔ مجید صاحب کو پہلی مریجہ کی اس خوبی کا علم ہوا کہ وہ ہر بات کی

گہرائی تک جاننے کا فخر رہتا تھا۔ بچوں میں یہ ”ماہہ“ ہوتا ہے لیکن اس کی تنہید کی پر سب کو حیرت ہو رہی تھی۔

واپس آنے کے بعد بھی وہ اس سفر کے حقائق باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کی زیادہ تر نشست اپنی دادی کے ساتھ

حرکت بھی کرتے تھے۔ وہ اپنی دادی کو تو یہ سنا تا رہتا تھا کہ جیسے ہی وہ بڑا جہاز بنانے میں کامیاب ہو گیا، انہیں اپنے جہاز میں بٹھا کر مکہ اور مدینہ لے جائے گا۔

اسی جہاز سازی کے شوق نے اسے یہ شعور دے دیا تھا کہ دشمن کو مار دیا جاتا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ مگر میں ایک طوطا بنا ہوا تھا۔ ایک گھبرائی اس کے پیچھے پڑ گئی تھی اور اکثر اسے تنگ کیا کرتی تھی، راشد کے نزدیک وہ دشمن تھی اور دشمن کو مار دینا چاہیے۔ ایک دن اس نے غلیل اٹھائی اور اس کا کام تمام کر دیا۔ وہ اپنی اس کامیابی پر خوش ہوا اور اپنے بچا کے پاس پہنچ گیا۔

”بچا جان! یہ گھبرائی میرے طوطے کی دشمن تھی۔ میں نے اسے مار دیا۔ دشمن کو مار دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔ مگر یہ بات لڑکوں کو بتائیے، ورنہ مجھے ڈانٹ پڑے گی۔“

”جب گھبرائی کو دشمن کہہ ہی رہے ہو تو ڈانٹ سے ڈرتے کیوں ہو؟“

”چلو نہیں ڈرتا۔ بتا دیتا۔“

”نہیں تم ڈرتے ہو۔ میں نہیں بتاؤں گا۔“

اس نے گھبرائی کو ایک گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔

اس کے بہن بھائی اس کے ان افعال کو دیکھ کر سمجھتے تھے کہ اس کا دھیان مکمل کوہ پر ہے۔ جہازوں کے ماڈل بنانے کے سوا اسے کچھ آتا ہی نہیں۔

اس کی دوستی اپنے خالہ زاد مظہر سے بہت زیادہ تھی۔ اس کے خالو پنڈی ہی میں تھے لہذا مظہر سے اکثر ملاقات رہتی تھی، یہ دوستی بھی عجیب تھی۔ مظہر اس سے دس بارہ سال بڑا تھا۔ مظہر کو الیکٹرانکس سے شغف تھا۔ غالباً اس کا یہی شغف راشد کو اس کے قریب لے گیا تھا۔ وہ الیکٹرانکس کے بارے میں ان سے معلومات لیتا رہتا تھا۔

ایک روز وہ خالو کے گھر گیا۔ مظہر کا ایک ہم جماعت آیا ہوا تھا۔ دونوں اپنی کتاب میں شامل سرکوائر اسکاٹ کی ایک نظم پڑھ رہے تھے لیکن اس کے بعض حصے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ راشد کچھ دیر تو ان کی بے بسی کو دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ غل دے غلیر نہ دے گا۔

”اگر آپ لوگ کہیں تو اس کی تشریح میں کروں؟“

”تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تم ابھی یہاں تک کہاں پہنچے ہو گے۔“

”جو کچھ آپ پڑھ رہے ہیں وہ میں سن رہا ہوں اور میرے خیال میں اس کی تشریح میں کر سکتا ہوں۔“

جتنی تھی۔ وہ فارسی پر عبور رکھتی تھیں اور ادب کا اچھا ذوق بھی تھا۔ ان کے پاس بچوں کو سنانے کے لیے بہت سی کہانیاں تھیں۔ ان میں سے بیشتر اسلام کے ان بہادر فرزندوں کے کارناموں پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ راشد ان کہانیوں کو سننا تھا اور جیتنا سوچتا بھی ہو گا کہ وہ بھی وطن کے لیے اپنی جان قربان کر دے گا۔

اس کی تعلیم کا سلسلہ لاہور کے کوئٹہ میری اسکول کے پرائمری سیکشن میں ہو رہا تھا۔ یہ ادارہ بہت اعلیٰ درجے کا تھا لیکن اساتذہ اگر بڑے تھے جبکہ راشد کے گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ اس کی اس کی کو دیکھتے ہوئے مجید صاحب کے بڑے بھائی عبدالرشید منہاس نے فیصلہ کیا کہ وہ راشد کو اسلامیات اور اردو کی تعلیم دیں گے لیکن جلد ہی مجید صاحب کا تبادلہ کراچی اور پھر راولپنڈی ہو گیا اور پھر راشد کی اردو ہمیشہ کمزور ہی رہی۔

وہ پنڈی میں تھا کہ اسے نامیٹا ٹھہر گیا۔ علاج کے لیے اسے کہانڈہ شری ہسپتال (سی ایم ایچ) میں داخل کرانا پڑا۔ اتفاق سے انہی دنوں صدر ایوب بھی بیمار ہوئے اور اسی ہسپتال میں داخل ہوئے۔ ان کی عیادت کے لیے ایئر مارشل اسفرخان اسپتال آئے۔ اس بیماری میں بھی راشد کا طبیاروں کا شوق نمودار آیا۔ صدر ایوب کو دیکھنے کی خواہش تو نہیں جاگی لیکن وہ یہ ضد کرنے لگا کہ وہ ایئر مارشل کو دیکھے گا۔ ایئر مارشل تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ اس کا تایا زاد بھائی منظور منہاس اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے اسے کدھوں پر اٹھایا اور ایئر مارشل کی جھلک دکھالایا۔

”ایک دن میں بھی ایئر مارشل بنوں گا۔“ اس نے ہستر پر لیٹتے ہی کاٹتی ہوئی آواز میں کہا۔

اس کا یہ شوق زہانی نہیں تھا۔ جہازوں سے اس کا عشق جنوں کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ ہر آنے جانے والے سے وہ جہازوں کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جہازوں کے بارے میں اس کی معلومات بھی بہت وسیع ہو گئی تھیں۔ اس نے کہیں سے جہازوں کے بارے میں بہت سی معلوماتی کتابیں حاصل کر لی تھیں جن کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔

ان کتابوں میں طیارہ سازی پر بھی کئی کتابیں تھیں۔ ان کو دیکھ دیکھ کر طیاروں کے ماڈل بنانے لگا اور بہت جلد اسے گٹھڑی کے چھوٹے چھوٹے جہاز بنانے کے فن پر عبور حاصل ہو گیا۔ اس کے بنائے ہوئے جہاز آہستہ آہستہ

ماہنامہ سرگزشت

اس نے کتاب ہاتھ میں لی اور تشریح کر دی۔

”جو شخص اپنے وطن سے محبت نہ کرے اسے اذیت و رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ جب وہ مرتا ہے تو اس پر ماتم کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، خواہ وہ زندگی میں کتنا ہی بارسوخ کیوں نہ رہا ہو۔“

اس دن مظہر کو معلوم ہوا کہ اس کا مطالعہ اس کی عمر سے کہیں آگے ہے۔ اس کی عمر تیرہ سال تھی اور وہ ایسی شکل نظم کی تشریح کر سکتا تھا۔

وہ مظہر کے دل میں اپنی کامیابی کا سکہ بٹھا کر گھر واپس آیا ہی تھا کہ اس کی بہن نے اسے بتایا کہ خالہ حمیدہ بھی اب پڑھی آگئی ہیں۔ ان کا مستقل قیام دارسک میں رہے گا۔

خالہ حمیدہ کے شوہر ونگ کمانڈر تھے۔ ان کی وردی اور ٹوپی براشڈ کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ بھی سوچا کرتا تھا کہ اگر بھی اس نے لٹرائی جوائن کی تو ایسی ہی وردی اسے بھی ملے گی۔ وہ والدہ کے ساتھ خالہ کے گھر گیا اور یہ سوچ کر خوش ہوا کہ دارسک اور پڑھی کا درمیانی فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ وہ یہاں تک پڑائی آسکتا ہے۔

وہ ان کے گھر پابندی سے جانے لگا تھا۔ جہازوں اور لٹرائی کے ماحول کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ خالو کے یہاں کوئی بیٹا نہیں تھا لہذا وہ اسے اپنا بیٹا سمجھنے لگے تھے اور گھنٹوں بیٹھ کر طیاروں اور جنگوں کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ کس طرح کیڈٹس کی تربیت ہوتی ہے۔ دوران تربیت انہیں کن کن باتوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس گھر کی محبت نے اس کے دل میں یہ عزم پختہ کر دیا کہ وہ ضرور لٹرائی جوائن کرے گا۔

ٹامپا بڑا کا مرض اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ حیرہ برس کی عمر تک کھینچے کھینچے وہ مرتا۔ ٹامپا بڑا کا شکار ہو چکا تھا جس نے اسے دہلا پٹلا اور کمزور کر دیا تھا لیکن اس کے عزم اور حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ آرام طلب نہیں بن گیا بلکہ ہمیشہ متحرک رہنے لگا، ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا ہوا۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ سوچتا ہوا۔

فوج میں جانے کا اس کا شوق برابر ترقی کر رہا تھا۔ اس کی عمر بھی اب چودہ سال ہو گئی تھی جو یقیناً ہوش مندی کی عمر ہوتی ہے جبکہ وہ ضرورت سے زیادہ سمجھدار تھا۔

لٹرائی اور جنگ اس کے محبوب موضوع تھے کہ

۱۹۶۵ء میں جنگ کو قریب سے دیکھنے کا عملی تجربہ ہوا۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔ اس کے دل میں اٹھایا کی طرف سے غارت کا جو جذبہ موجزن تھا اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

اس کا گھر راولپنڈی میں شہری کے جرنل ہیڈ کوارٹر کی حدود میں واقع تھا۔ اس کے گھر سے پہاڑی ڈھلوانی سوگڑ کے قافلے پر طیارہ شکن تو جیں نصب تھیں اور ان سے ڈرا آگے پاکستان کے فوجیوں کے مورچے قائم تھے۔ اس نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو ساتھ لیا اور مورچوں پر پہنچ گیا۔ فوجیوں سے جنگ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا اور ان کی جرأت و حوصلے کی تعریف کرتا رہا۔ اس عزم کا بھی اعہاد کرتا رہا کہ اگر اب بھی جنگ ہوئی تو وہ اپنا طیارہ لے کر جائے گا اور دشمن کے طیاروں کو مار گرائے گا۔

وہ ان مورچوں پر تو اتار سے جانے لگا۔ فوجیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی متحرک زندگی کو دیکھ کر سخت متاثر ہوا۔

ان دنوں ملک کی لٹرائی دوسری تھی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے جنگی ترانے نشر ہو رہے تھے۔ بلیک آؤٹ کے اندھیرے میں یہ ترانے گونجتے تو دلوں میں بہو جوش مارنے لگا۔ وہ گھنٹوں ریڈیو کے سامنے بیٹھا رہتا اور یہ لٹے سٹا رہتا۔

اے وطن کے بچے جہانوں میرے تھے تمہارے لیے ہیں۔

فوجیوں کی شان میں جس طرح غلے گائے جا رہے تھے اور جس طرح ہودی قوم ان کی مدح سرائی کر رہی تھی اس سے اس کے دل پر نقش ہوتا جا رہا تھا کہ جو لوگ وطن کے لیے لڑتے ہیں وہ خاص عزت کے مستحق ہوتے ہیں اور جو اس راہ میں شہید ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جاتے ہیں۔

اگر سترہ دنوں کی یہ جنگ نہ ہوتی تو اس کا یہ احساس اس قدر پختہ نہ ہوتا۔ اس جنگ نے اس کی ذہنی تربیت میں زبردست حصہ لیا۔ اس جنگ کی یادگاریں زندگی بھر اس کے ساتھ رہیں۔

اس جنگ کے دوران میں اس کی نظریں خاص طور پر لڑاکا طیاروں پر رہیں۔ مزید بھنی کے کارنامے بھی اسے متاثر کرنے کے لیے کم نہیں تھے لیکن ایم۔ ایم عالم کا تو وہ دلیوانہ ہو گیا تھا۔

جنگ ختم ہو گئی تھی۔ اب ان بہادر سپاہیوں کے کارنامے بیان ہو رہے تھے اور ان پر تہرے کیے جا رہے تھے۔ تفصیلات سامنے آ رہی تھیں کہ ان سپاہیوں نے کیا کارنامے انجام دیے۔ راشد ان تہروں کو غور سے سن رہا تھا۔

”اسکو اڈرن لیڈر سرفراز احمد رفیقی اس دسے کی قیادت کر رہے تھے جو بلواؤہ کے بھارتی فضائی اڈے کو تباہ کرنے روانہ ہوا تھا۔ یہ دستہ صرف تین پرانے سپر طیاروں پر مشتمل تھا۔ ہدف کو نشانہ بنانے سے پہلے ہی بھارتی فضا سے کے ایک دو جن ہنٹر طیارے اس پر ٹوٹ پڑے۔ رفیقی نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہنٹر مار گرایا اور دوسرے کا نشانہ لے کر ٹوٹ پڑے مگر میں اسی وقت ان کے طیارے کی مشین گنز جام ہو گئیں۔

”یوں اب قیادت تمہارے تمہارے چہرہ پر ہے۔ میری مشین گنز کام نہیں کر رہی ہیں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے یوں کے صوبہ میں دفاعی پوزیشن لے لی۔ وہ اس وقت اپنے طیارے کا رخ پاکستان کی طرف موڑ سکتے تھے لیکن انہوں نے خود کو ساتھیوں کے دفاع کے لیے ان کے ساتھ رکھا اور ہوا بازی کے داؤ بیچ آزما کر دشمن کی صفوں میں ابتری پھیلاتے رہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ساتھیوں نے تین ہنٹر طیارے مار گرائے مگر اس عدلان میں خود رفیقی کا طیارہ بھی دشمن کی زد میں آ کر چھلکی ہو گیا اور وہ شہید ہو گئے۔ اس صحرے میں یوں بھی شہید ہو گئے۔ لائٹ لیفٹیننٹ سلیل چوہدری نے ایک اور ہنٹر شکار کرنے کے بعد باقی ماندہ بھارتی ہوا بازوں کو چکر دیے اور بخیر و حالت واپس آ گئے۔“

اسکو اڈرن لیڈر ایم ایم عالم اپنے پرانے سپر میں سرگودھا کے نزدیک پرواز کر رہے تھے۔ ان کا اسکو اڈرن بھی ان کے ساتھ تھا اور یہ لوگ سرگودھا کے دفاع پر مامور تھے۔ بھارت کے پانچ ہنٹر طیارے فضا میں نمودار ہوئے۔ ایم ایم عالم نے مشین گن کے تین پرواہ ڈالا اور کے بعد دیگرے پانچوں ہنٹر مار گرائے۔ یہ ہوا بازی کی تاریخ میں ایک عالمی ریکارڈ ثابت ہوا۔

ایم ایم عالم کے اس واقعہ نے راشد کے دل میں شدید تڑپ پیدا کر دی تھی۔

”میں ایم ایم عالم سے بھی زیادہ جہاز گراؤں گا۔“ وہ اکثر کہتا تھا۔

خود راشد کے گھر میں عزم و ہمت کے کئی فسانے دہرائے گئے تھے۔ اس کے والد کے جانے والوں میں نوجوان کیپٹن نصیر احمد تھے جن کا راشد کے گھر میں آنا جانا تھا۔ بعد میں کیپٹن نصیر احمد کی شادی راشد کی بہن فریدہ سے ہوئی۔

کیپٹن نصیر احمد نے بھی جنگ خیر میں حصہ لیا تھا۔ سا لکھوٹ کے نزدیک غنروال کے گاؤں میں وہ اپنی جان پر کھیل گئے اور نہایت دلیری سے دشمن کا مقابلہ کر کے اس علاقے کو بچا لیا۔ اس دوران میں وہ زخمی بھی ہوئے۔ انہیں ستارہ جرأت کا اعزاز عطا ہوا۔

جب وہ اسپتال میں تھے راشد اکثر ان کی عیادت کو جاتا تھا اور جنگ کے واقعات سنا کرتا تھا۔ اس کے دل میں یہ بات ایٹھ گئی تھی کہ وطن کی حفاظت کے لیے جان کو کھلی پر رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن ہے یہ جنگ نہ ہوئی ہوئی تو اس کے دل میں وطن پر جان قربان کرنے کی حتمی جلدی بیدار نہ ہوتی۔

یہ جنگ اس کی جذباتی زندگی میں ایک اہم موڑ بن گئی۔ اس کے بعد اس کی زندگی اسی جنگ کے عہد پر گھومتی رہی۔

جنوری 1966ء میں مجید صاحب کی پوسٹنگ کراچی ہوئی۔

وہ چھ سال پہلے کراچی آ چکا تھا۔ دھندلی دھندلی یادیں اب بھی اس کے دل پر نقش تھیں مگر اب یہ شہر بہت بدل گیا تھا۔ سوسائٹی کا علاقہ بھی پہلے سے زیادہ آباد ہو گیا تھا مگر اب بھی خالی زمین کے ٹکڑے دیکھے جاسکتے تھے۔

مجید صاحب نے ڈارگ روڈ پر سوسائٹی کے قریب انگریزوں کے زمانے میں بنائی گئی بڑی کون میں قیام کیا۔ اس وقت تک وہ بے شہر کتابیں پڑھ چکا تھا۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ اس کی معلومات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا بلکہ یہ احساس بھی فزوں ہو گیا تھا کہ اب اس کے ساتھ بچوں جیسا برتاؤ نہ کیا جائے۔ اس کی سمجھ داری اور ہوشیاری کو تسلیم کیا جائے۔ اس احساس نے اس لیے سر اجمار تھا کہ اس کی نازک جسامت اور بھولی بھالی صورت کی وجہ سے سب اس کے ساتھ بچوں جیسا برتاؤ کرتے تھے۔

بڑی بہنوں کی موجودگی اور ان کے ساتھ کھیلنے کی وجہ سے اس کے مزاج میں لڑکوں کا اکثر پن نہیں بلکہ لڑکیوں جیسی ملاصحت آ گئی تھی۔ اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے وہ

بننے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شرمیلا واقع ہوا تھا لیکن خوش
مراہمی نے اس کا ساتھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ دوستوں کے
دورمیان اس کی شخصیت رنگا رنگ اور لطیف ہر نظر آتی تھی۔
بزرگوں کے سامنے منجید رہتا تھا لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ
کوئی ہنسی کی بات ہو جاتی تو اسے اپنی ہنسی پر قابو نہ رہتا۔

ایک روز گھر میں ایک تقریب تھی۔ تمام بچے جواب
بڑے ہو چکے تھے ایک گوشے میں جمع ہوئے۔ انہوں نے
کوئی ایسا کھیل کھیلا جس میں کرسیاں درکار تھیں۔ لڑکوں کے
ڈرتے کرسیاں لانے کی لاپرواہی تھی۔ راشد بھی ایک کرسی اٹھا
لایا اور خاندان کی ایک لڑکی کو پیش کر دی۔ اس لڑکی نے کرسی
قبول کی اور نہایت دل پذیر انداز میں اس سے کہا "تم اب
کافی ہوشیار ہو گئے ہو۔ راشد کو یوں محسوس ہوا جیسے بالآخر
اسے تسلیم کر لیا گیا ہو۔ عمری ایسی تھی کہ اس کے لطیف
جذبوں میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ گھر آ کر اس نے اپنی
ڈائری میں لکھا۔

"عمری زندگی کا عظیم ترین دن۔ اب یہ بالکل بدل
گئی ہے۔" یہ لڑکی بہت دن تک اس کے اعصاب پر سوار
رہی۔ پھر مصروفیات کا انہار آیا آیا کہ وہ اس کے نیچے دب
کر رہ گیا۔ کبھی بھی خیال آ جاتا تھا کیونکہ وہ لڑکی اس کی
زندگی میں پہلے ہوا کے جوہر کی طرح آئی تھی۔
وطن اس کی پہلی محبت تھی۔ اس کی ڈائری میں ایک
جگہ لکھا ہوا تھا۔

ہم ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتے
ہمیں ایک دفعہ تو مرنا ہے
تو پھر کیوں نہ اپنے وطن کو دے دیں
اپنی جان جو ہم پر آسانی دے سکتے ہیں
ایک جگہ لکھا

"میں نے سوچ لیا ہے کہ ہوائی جہازوں کے نقشہ
جات حاصل کروں گا اور پھر ایک حیرت انگیز جہاز بنائوں گا۔"
وہ عمر کی ایسی منزل سے گزر رہا تھا جہاں متقی اور رقت
روئے ایک ساتھ چلتے ہیں۔ بہت سی لائیں ایک ساتھ چلتی
ہیں اور ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں۔ جذبات اور عقل ایک
دوسرے سے جنگ کرتے ہیں۔ "اس لڑکی" کا خیال اسے
بار بار آ رہا تھا لیکن وہ اس خیال میں ڈوب کر اپنے مقاصد
سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے اس سے
بڑے بڑے مقاصد تھے۔ اس کی یہ جھنجھلاہٹ خطہ عروج پر
پہنچ چکی تھی۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ذاتی مفاد کا حصول

جس نئے طریقے سے ایجاد کر لیتا تھا تاکہ اسے نہ صرف بڑا لڑکا
بلکہ مستعد اور متحرک تسلیم کیا جائے۔ کھیل کود سے وہ ہمیشہ دور
رہا تھا۔ اس کی کوہ کتا یوں میں غرق رہ کر دوڑ کر رہا تھا۔ اس
کی کھلی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات
دوسروں تک پہنچا کر اپنی اہمیت منوانا چاہتا تھا۔

وہ ایک روز اپنے خالو کے گھر گیا اور اپنے خالو زہر
بھائی مظہر سے ڈائری کی فرمائش کی۔

"بھائی جان! آپ کے پاس کوئی ڈائری ہے کار
پڑی ہو تو مجھے دے دیں۔"

"جہیں ڈائری کا کیا کرنا ہے۔"

"میں جو کچھ سوچتا ہوں، جو کچھ چھتا ہوں اس
ڈائری میں نوٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس سے کیا ہوگا۔"

"اس سے یہ ہوگا کہ جو میرے خیالات ہیں وہ
دوسروں تک پہنچ سکیں گے۔ انہیں معلوم ہو کہ میں کیا سوچتا
ہوں۔"

مظہر نے بھی زیادہ جملہ و جھٹ مناسب نہ سمجھی۔ ان
کے پاس پی آئی اے کی ایک ڈائری رکھی ہوئی تھی وہ
انہوں نے راشد کو دے دی۔

کچھ دنوں بعد اس نے وہ ڈائری مظہر کو دکھائی بلکہ
مظہر نے خود دیکھنے کی فرمائش کی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس
ڈائری میں بڑی بڑی شخصیتوں کے اقوال درج ہیں۔ یہ
اقوال زیادہ تر حب الوطنی سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک جگہ عمر خیام کی چھ باغیات کا ترجمہ درج تھا:

میری شکل بڑھتی جا رہی ہے

اسے بھجایا نہیں جاسکتا

نہ یہ اب مجھے معاملہ پر رہنے دے گی،

میرے دل میں یہ آرزو ہے

کہ میری آرزوؤں کے بندوں سے

بیڑیاں اُتار دی جائیں

کیونکہ یہ قید مجھے کانٹے کی طرح تکلیف دیتی ہے

1966ء میں اسے سینٹ پیٹرک اسکول کے کیمبرج

سیکشن میں داخل کیا گیا۔ یہ اسکول اس کے گھر سے قریب تھا
اور دونوں چھوٹے بھائی راحت اور انجم بھی اسی اسکول
میں تھے لہذا تینوں بھائی پیدل اسکول پہنچ جاتے تھے۔ اس
کے دوستوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن ہر ایک سے
دوستوں کی طرح خوش اخلاقی سے ملتا تھا۔ گہرے دوست نہ

اس کی زندگی کا مقصد نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔
 "..... میں اس خیال کو ذہن سے نکال دینا پسند
 کروں گا۔ میں جہاز بنانے کے خواب دیکھتا رہتا ہوں۔
 پھر ادل چاہتا ہے کہ میں بہت سی چیزوں کے خواب دیکھوں
 لیکن میں کوشش کروں گا کہ یہ بیماری چھوٹ جائے۔"
 وہ اس میں کامیاب رہا اور اپنی زندگی کو متحرک کرتا
 رہا۔

وہ ایک دن اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک خبر پر اس کی نظر
 پڑی اور وہ اچھل پڑا۔
 "کراچی میں طیارہ سازی کا پلانٹ لگایا جائے گا۔
 اور اگلے سال اس منصوبے پر عمل شروع ہو جائے گا۔"
 اس نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ اب اس کے مستقبل
 کا لیبل ہو گیا ہے۔

وہ کئی دن تک طیارہ سازی کے خواب دیکھتا رہا لیکن
 پھر اسے احساس ہونے لگا کہ طیارہ سازی اس کی منزل
 نہیں۔ پھر وہ کیا کرے؟ ایک بے نام تنہائی میں جو اس کے
 ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو زندگی کے
 رنگین گوشوں کی طرف دیکھ لیا۔ یہ رنگین گوشے خوب
 لکھیں دیکھنا اور لکھنے والیوں میں گانے سناتے تھے۔ شام کا
 وقت اسکول کے بچے گراؤں میں گزرتا۔ وہ اچھا کھانا ڈی
 نہیں تھا۔ یہ شامیں سوشل ایکٹیویٹی کے طور پر گزرتی تھیں۔
 رات ہوتی تو کچھ وقت بہنوں کے ساتھ مل سہانے میں گزر
 جاتا۔ پھر وہ اپنے خوابوں کو اوڑھ کر سو جاتا۔ اس کی چٹنے کی
 عادت اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی اس لیے کسی پر ظاہر نہ ہوتا
 تھا کہ وہ کتنا ادا ہے۔ یہ سہانے کزنز کے ساتھ بھی ہوتے
 رہتے تھے۔ وہ اپنی ڈائری میں ان مباحثوں کی تفصیل لکھتا
 رہتا۔

"آج ماموں سرور کے یہاں اس موضوع پر بحث
 ہوتی رہی کہ لڑکیوں کو نام عمل ہوتی تھا۔ اکثر حساب کے
 مضمون میں بھی کمزور پائی جاتی ہیں۔ ہم ہمارے ماموں
 سرور کے گھر سے لوٹے۔ وقت خوب گزرا۔"

طیارہ ساز ایرونائیکل انجینئر بننے کا خواب دیکھنا اس
 نے چھوڑ دیا۔ اب وہ کیا کرے گا؟ یہ اضطراب اس کے
 ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس بے چینی سے نجات پانے کے لیے اس
 نے اپنے کزن شاہد کو ساتھ لیا اور کوئٹہ چلا گیا جہاں اس کے
 بہنوئی کیپٹن نصیر قیسات تھے۔ اس سفر کا مقصد بھی شاید یہی
 تھا کہ شاید کسی خواب کی تعبیر مل جائے۔ بھروسے پر ہاڑوں

ملہنا مسرور گزشت

میں گھرا ہوا کوئٹہ شہر اسے بہت اچھا لگا۔ چھاؤنی کا ماحول شہر
 سے زیادہ خوبصورت تھا۔ صاف ستھری سڑکوں کے کنارے
 خوبصورت درخت قطار اندر قطار باہر کھڑے تھے۔ یہاں پہنچ
 ہی اس کی اداسی نے ایک فرحت بخش انگڑائی لی۔ وہ اسٹال
 کالج کے میڈیم میں گیا اور جدید اسلحہ دیکھا تو اس کے
 خوابوں نے ایک نئی شکل اختیار کی۔ بہنوئی کے فوجی
 دوستوں سے ملا۔ ان سے دفاع وطن کے موضوع پر خوب
 باتیں کرتا رہا۔ اس کے خواب اسے بار بار بیدار کرتے
 رہے کہ اسے بھی دفاع وطن کے لیے کچھ کرنا ہے۔ صرف
 طیارے بنانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وطن کا دفاع تو طیارے
 اڑانے سے ہو سکتا ہے۔ شہیدوں کے قصے اسے یاد تھے۔
 وہ ذاتی طور پر تیار ہو رہا تھا کہ اس براہ میں وہ بھی شہید ہو سکتا
 ہے۔ یہاں رہ کر اس نے اپنا فوٹو گرافی کا شوق بھی خوب
 پورا کیا اور بہن بہنوئی کے ساتھ بیٹھ کر فلمیں بھی دیکھیں۔

وہ کراچی لوٹا تو ہشاش بشاش تھا۔ اسکول مکمل تھے۔
 زندگی دوبارہ اپنی آگ پر آ گئی۔ ماموں سرور کے گھر اس کا
 آنا جانا بڑھ گیا تھا کیونکہ ایڈمیشن ٹیسٹس میں اپنی کمزوری
 دور کرنے کے لیے وہ شاہد سے پڑھنے کے لیے جانے لگا
 تھا۔ ایک دن وہ ماموں کے یہاں گیا تو اتفاق سے "اس
 ٹری" کے گھر والے آئے ہوئے تھے۔ وہی لڑکی جسے اس
 نے مکمل کھانا میں کرسی چیش کی تھی۔ ان لوگوں سے مل کر
 وہ ایک عجیب ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گیا۔ جسے بھلائے
 ہوئے تھا وہ یاد آ گئی۔ مجھے کیا کرنا ہے؟ وہ ایک مرتبہ پھر
 سوچنے لگا۔ میری منزل "اس" کے گھر تک ہے یا کچھ اور بھی
 ہے؟ اس رات گھر آنے کے بعد اس نے ڈائری میں لکھا۔

"ہم آج ماموں سرور کے گھر گئے۔ آج ان کے گھر
 میں مجھے کافی عجیب بات محسوس ہوئی اور مجھے خیال آیا کہ
 میں ایک بڑی فطرتی کرہیٹا ہوں اور اب میں اس کے لیے
 تیار ہوں۔ آج میں نے اپنے دل میں پکا وعدہ کر لیا ہے
 کہ میں تین میں سے کسی ایک فوج میں جاؤں گا اور
 کبھی نہیں چاہے کچھ ہو جائے۔"

امتحانات ختم ہو گئے۔ فراغت کی فراغت تھی۔ اس کا
 کزن شاہد بھی سینئر کیمبرج کا امتحان دے کر فارغ تھا۔
 دونوں خوب محوم پھر رہے تھے۔ لیکن پارک ان کی
 مرخصیوں کے لیے بہترین جگہ تھی۔ ایک دن نسیم بھائی نے
 اسے دیکھ لیا۔ قالہا ایک آدمی مرتبہ اور بھی دیکھا ہوگا۔ نسیم
 بھائی اس کی بڑی خالہ کے بیٹے تھے اور عمر میں اس سے ہیں

اگست 2014ء

"جیسا بھی تو تمہارے سینٹر کیمبرج کا رزلٹ بھی نہیں آیا۔"

"درخواست تو دے دیتا ہوں۔ اس وقت تک رزلٹ بھی آ جائے گا۔"

"میں تمہارے شوق سے واقف ہوں۔ تمہیں جہاز اڑانے کا شوق ہے تو پی آئی اے میں پائلٹ بن سکتے ہو۔"

"فرک (فریئر) رہ نہ بن جاؤں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ایسے موقعوں پر وہ بھی کہتا تھا۔ پھر اس نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی "بات صرف جہاز اڑانے کی نہیں ہے۔ میں دشمن سے لڑنا چاہتا ہوں۔ دشمن کا دفاع کرنا چاہتا ہوں۔ زندگی میں اپنے دشمن کو تو پھر زندگی ہی کیا۔ بے مقصد زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ میرا دشمن یہ ہے کہ میں دفاع دشمن میں حصہ لوں۔ اس کے لیے فطرتیہ مناسب ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ مجھے وہاں جانے سے نہیں روکیں گی۔"

"میں تمہیں جس روکوں کی مگر تم اپنے ابو سے سب بات کرلو۔"

"مجھے ان سے ڈرگنا ہے۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو پھر میرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے گا۔ آپ پہلے انہیں اچھی طرح سمجھا دیں بلکہ راضی کر لیں پھر وہ مجھے بلا کر پھینک دے تو میں بات کر لوں گا۔"

اس کی ماں نے بیٹے کی یہ خواہش باپ تک پہنچا دی۔ حمید صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"جیسا میں تو تمہیں اچھی تر بتانا چاہتا تھا۔"

"پہلے میں بھی کیا سوچا کرتا تھا لیکن اب میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔"

"کل کو یہ ارادہ بھی بدل دو گے۔"

"نہیں۔ یہ فیصلہ میں نے سوچ بچ کر کیا ہے۔ میں برسوں اپنے آپ سے لڑتا رہا ہوں تب اس فیصلے پر پہنچا ہوں۔"

"دیکھ لو اس میں خطرے ہی خطرے ہیں۔"

"آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ اپنے دشمن کے پھر زندگی نہیں۔ آپ خود بھی زندگی بھر خطروں سے کھیل رہے ہیں۔"

"میں تمہیں روک نہیں رہا ہوں۔ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اتنی پسند کو تمہاری پسند پر ترجیح نہیں دے

سہاں بڑے تھے اس لیے پورا حق رکھتے تھے کہ اس سے پوچھ بچھ نہ کرے۔"

"میں کئی سرحد تک چکا ہوں کہ تم یونہی بے کار محوم پھر کراہت و فتنہ خالق کرتے رہتے ہو۔"

"بھائی جان کیا کروں۔ اسکول جانا ختم ہو گیا ہے۔ وقت ہی وقت ہے۔"

"اس وقت کو استعمال کیوں نہیں کرتے۔"

"کچھ کتابیں ہیں مگر پر ان کا مطالعہ کرنا رہتا ہوں۔"

"اس وقت کا بہترین استعمال یہ ہے کہ کسی کالج میں داخلہ لے لو" انہوں نے کہا اور پھر کچھ سوچے ہوئے ہوئے "تم کسی دن میرے ولٹر آؤ۔ میں کسی کالج میں تمہارے واسطے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

وہ ایک دن شاہد کو لے کر ان کے ولٹر چلا گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ نسیم بھائی ابھی آئے نہیں ہیں۔

"کیا خیال ہے کبسی پتہ کر جائے لی لیں۔ اس وقت تک نسیم بھائی بھی آ جائیں گے۔"

وہ دونوں اگلے روز پر ایک پتھان کے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیتے گئے۔ چائے کے دوران میں پتھانک اس کے دل میں ایک خیال آیا اور پھر جیسے وہ بے چین ہو گیا۔

کوئی قوت بھی مجھ سے ایسی ملے گی کہ میں اس طرف سے قافلے پر

لیٹر فورس سلیکشن ایڈ انفارمیشن سینٹر ہے۔"

"ہاں ہے تو پھر"

"وہاں تک چلتے ہیں۔ مجھے ایک انفارمیشن لین ہے۔"

"دیکھ لو۔ نسیم بھائی سے بھی ملتا ہے۔"

"ہیں ہوں گے اور یوں آئے" اس نے چائے کے کپ کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

انہوں نے چائے کے پیے لدا کے اور سینٹر کی طرف چل دیے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ سلیکشن کے لیے درخواستوں کی وصولیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کا مطلب تھا وہ درخواست دے سکتا ہے۔

وہ ایسا خوش تھا کہ جیسے اس نے درخواست بھی دے دی اور اس کا سلیکشن بھی ہو گیا۔ نسیم بھائی سے ملنا بھی بھول گیا اور دوڑ دوڑا گھر چلا آیا۔ مگر کچھ ہی دنوں میں اس نے ماں سے

ڈر کر لیا۔

اپنی جاں نذر کروں.....

میر محمد اکرم حمید 14 اپریل 1938ء کو ضلع کمرات کے قصبہ ڈنگہ میں پیدا ہوئے۔ 13 اکتوبر 1963ء کو وہ (سابقہ) شرقی پاکستان میں شہین ہوئے اور یہیں پر انہیں فرانکفر رینٹ فورس کی کمان سونپی گئی۔ 1971ء کی جنگ چھڑنے کے وقت وہ ملی حملہ کے اگلے علاقے میں جہاں ہندوستان نے زبردست اور مسلسل دباؤ ڈال رکھا تھا اپنی کمپنی کی قیادت کر رہے تھے دشمن کی ہتھیاریہ اس کے قریب خانے اور بہتر بند رستوں کو روکے رکھا اور اسے پاکستان کی سرزمین پر ایک ایچ بھی آگے بڑھنے نہ دیا۔ ایک موقع پر تو دشمن بھرپور حملے کے ارادے سے پورے پریگیڈ کی نظری لے کر جس کے ہمراہ ٹینکوں کا ایک اسکواڈرن بھی تھا اس کمپنی پر چڑھا آیا مگر تعداد اور اسلحہ کے لحاظ سے دشمن کی برتری کے باوجود میر اکرم اور ان کے جیالے جوانوں نے دشمن کو نہ صرف دو مہینے تک وہیں روکے رکھا بلکہ بھاری جہتی نقصان پہنچاتے ہوئے اس کے ہر حملے کو ہٹا دیا۔ 24 دسمبر 1971ء کو کٹان حیدر کے حق دار ٹھہرے۔

دیا گیا جہاں ہماری پارٹنر میں پر ان کا طبی معائنہ ہوا۔ یہ گویا آخری مرحلہ تھا جو اسے طے کرنا تھا۔ اس طبی معائنے کا معیار بہت سخت ہوتا تھا۔ وہ اپنی مختصر عمر میں تین بار ہسپتال کا شکار ہو چکا تھا، جسمانی اعتبار سے بھی دبا چلا تھا۔ اس کی والدہ ڈر رہی تھیں کہ کہیں اس سے یہ نہ کہہ دیا جائے کہ وہ طبی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ راشد کو یہ سن کر کٹا دھچکا لگے گا۔ وہ بچپن سے یہ تمنا لیے بیٹھا ہے کہ وہ لٹھائی میں جائے گا۔ اے اللہ! اس کی تمنا پوری کر۔

جنگ نے اسے گھر بھیج دیا کہ محل بنایا گھر کے پتے پر اور سال کر رہے جائیں گے۔ وہ تاج آنے کے انتظار میں دن گنتے لگا۔ پھر ایک دن اس کی بے پناہ خوشی نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا۔ خوشی کے احساس سے گھر گھر کانپنے لگا۔ وہ کیڈٹ منتخب ہو گیا تھا اور اب اسے رسالہ پور جانا تھا جہاں ایک اور ٹیسٹ سے گزرنے کے بعد یہ طے ہونا تھا کہ اسے کس گریڈ میں رکھا جائے۔ وہ پی ایف ایف کیڈی رسالہ پور بھی گیا جہاں تربیت سے پہلے کامیاب ہونے والے نئے کیڈٹوں کا ٹیسٹ لے کر ان کی درجہ بندی کی جاتی تھی کہ کون کس قابل ہے۔ وہ کیڈٹ بھی بلائے گئے جو سینئر تھے۔

اسے اس کے گزرتے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ جو سینئر کیڈٹ ہوتے ہیں اپنے جونیئر کے ساتھ نہایت سخت رویہ رکھتے ہیں۔ لہذا ان سے بچ کر رہنا۔ ان کے ہاتھ میں اپنی کوئی کمزوری نہ دینا ورنہ بڑی دھمکتے ہوئے گئی وہ ہلکا سا گرا دیں گے کہ یاد رکھو گے۔ یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ سینئر کو وہاں دیکھ کر وہ سمجھا گیا تھا لیکن بہت جلد اپنی اصل حالت پر لوٹ آنے کی اسے عادت تھی۔ وہ پھر

سکتا۔ تم نے ہماری کبھی کوئی بات نہیں مانی پھر میں تمہاری بات کیوں مانوں۔ تم شوق سے درخواست دے دو لیکن ایک شرط پر کہ اگر درخواست منظور نہ ہوئی تو پھر تمہارا دوسرا آپشن انٹرنگ ہوگا۔

”مجھے یقین ہے کہ میری درخواست منظور نہیں ہوگی۔“

اجازت ملنے ہی اس نے درخواست دے دی۔

سینئر کیمبرج کا رزلٹ آیا تو وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ اس کا رزلٹ شائد ہر رہا تھا لیکن درخواست کا جواب اب تک نہیں آیا تھا۔ اس نے اس ایم سائنس کالج میں داخلہ لے لیا تاکہ پل اسے ایف کی جانب سے درخواست کا جواب آنے تک اس کا وقت ضائع نہ ہو۔

مجید صاحب ریٹائر ہو گئے اور یہ قائدانہ اپنے ذاتی جنگی منہاس دلا میں منتقل ہو گیا۔

اس نے اس ایم کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ کالج میں اردو کا مضمون بھی نصاب میں داخل ہے۔ اب وہ اپنی کمزور اردو کو درست کر لے گا لیکن اسے یہ موقع نہ مل سکا اور لٹھائی کی جانب سے انٹرویو کال آگئی۔

اس نے انٹرویو دیا۔ اعلیٰ جنس ٹیسٹ کے علاوہ میڈیکل بھی ہوا۔ ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد اسے اس قابل سمجھا گیا کہ وہ انٹر میڈیٹ سائنس بورڈ (آئی ایس ایس بی) کا سامنا کرنے کو پاٹ جائے۔ وہاں دوبارہ انٹرویو ہوا۔ آئی کیو اور جسمانی اہلیت کے علاوہ کاتھانہ صلاحیتیں بھی جانچی گئیں اور پھر بورڈ کے سامنے پیش ہونے والے دوسرے لڑکوں کے ساتھ اسے بھی داخل کر اپنی بھیج

ماہنامہ سمر گزشت

کئی سینئر ذی ہمتی اسے قحام کے پاس لے گئے۔ وہاں سے وہ اس سخت میں اپنے کمرے تک واپس آ چکا کہ اس کے ہال کئے ہوئے تھے۔ اس کا دم میٹ طارق اچھل پڑا۔

"میرا رجسٹر لکٹنگ لائٹ اے مکی۔"
"اذا لو میرا مذاق۔ جب تم مکی سینئر کے ہتھے چڑھو گے تب پوچھوں گا۔"
"جیسا یہ طارق ہے طارق۔ میرا سینئر کچھ نہیں ہگاڑ سکتے۔"

دوسرے ہی دن طارق ڈانٹنگ ہال میں کھانا کھا رہا تھا۔ ایک سینئر نے اسے دیکھ لیا۔ وہیں سے پکڑ کر قحام کے پاس بھیج دیا۔ کھانا مکی اور حورہ گیا اور ہال بھی آدھے چلے گئے۔

راشد کھانا کھانے کے بعد کمرے میں آیا تو طارق کو بندر بنا بیٹھا دیکھا۔

"کیوں طارق صاحب۔ تم تو طارق تھے۔ تمہارا سینئر کچھ نہیں ہگاڑ سکتے تھے۔ پھر یہ کیا ہو گیا۔"
"یاد آکر ہم کامیاب ہو گئے تو سینئر کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ بس یہ سوچ کر چپ ہو گیا۔"

"دیے ایک بات ہے تم مجھ سے بڑے بعد رنگ رہے ہو۔"

دلوں کے تہوں سے کمرہ کو بچنے لگا۔
فلاننگ ٹیسٹ کا آغاز ہوا۔ طیارہ انٹر کٹری چلاتا تھا اور امیدوار لڑکوں کو یہ ثابت کرنا ہوتا تھا کہ وہ ہوا کے دباؤ کو برداشت کر سکتے ہیں۔ سب لڑکوں کے لیے اس دباؤ کو برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ راشد کو کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔

تمام مراحل مکمل ہونے کے بعد انہیں واپس بھیج دیا گیا۔ راشد بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ واپس کراہی آ گیا۔

اب اسے حسی باؤے کا انتظار تھا۔
گھر پہنچ کر اپنے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے سوال سے کوئی کام نہیں تھا۔ زیادہ تروتھیں دیکھنے اور مطالعہ میں گزارتا تھا۔ اس کے پاس ڈائری لکھنے کے لیے بھی بہت دقت تھا۔ مکی بھی وہی سوچ کر اس میں بھی ہوجاتا تھا کہ اگر لیل ہو گیا تو کیا ہوگا لیکن حالات کے مطابق جلد ہی اپنی اصل حالت پر لوٹ آتا تھا۔

سے نارمل ہو گیا اور اکیڑی کی خوبصورتی میں کھو گیا۔ اس کے خوابوں کی تعمیر اس کے سامنے تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں ایئر لائن موجود تھی۔ طیارے تھے۔ اسے یہاں چار پختے مسلسل قیام کرنا تھا۔ وہ گھر والوں کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

"یہاں مجھ کو پاس ہونے کے لیے سخت محنت کرنی ہوگی اس لیے شاید آپ کو اتنے خط نہ لکھ سکوں۔"

اب انہیں ایک ہفتہ خصوصی کلاسوں میں جہاز کی ساخت اور مشینری کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھیں اور پھر دس ہفتہ لکھنے کی اذان کا دورانیہ چھوٹے چھوٹے وقفوں میں پورا کرنا تھا۔

وہ سمجھتا تھا جہاز کی ساخت اور مشینری کے بارے میں جاننے کے لیے اسے زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی لیکن اس کا یہ خیال جلد ہی لفظ ثابت ہو گیا۔ اس نے بھیج سے اب تک جہازوں کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں، عملی تیاری اس سے کہیں زیادہ دشوار تھی۔ ایسی سینکڑوں اصطلاحات تھیں جن سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ اس نے سخت محنت کی اور جب ایک ہفتے بعد امتحان ہوا تو وہ تمام لڑکوں سے بازی لے گیا۔

اب پروگرام کے مطابق لکٹنگ کا آغاز کرنا تھا لیکن موسم کے تیز بدل گئے اور یہ پروگرام کچھ دلوں کے لیے تاخیر کا قار ہو گیا۔ تمام لڑکے لکٹنگ لائن کے پاس جاتے اور دن بھر وہیں بھرتے رہتے۔

اس نے ابھی تک کیڈٹ کٹ ہال نہیں کھوائے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ لیل ہو گیا تو خواہ تو وہ کراچی جا کر بندر بن کر گھومنا پڑے گا اور اگر پاس ہو گیا تو بیش پائلٹ کٹ رہنا پڑے گا لہذا کچھ دن پیش کے ہیں وہ گرے۔ جو نیئر زچہ تک ابھی تک ختم نہیں ہوئے تھے اس لیے انہیں بہت سی رہائشیں حاصل تھیں۔ اس لیے بھی کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن ایک روز وہ ایک سینئر کے ہتھے چڑھ گیا۔

"ہوے ابھی تک تم نے ہال نہیں کھوائے۔"
"میں ابھی منتخب نہیں ہوا ہوں۔ اس لیے میری مرضی۔"

"یہاں تمہاری نہیں جاری مرضی چلتی ہے۔"
"جب تک میں منتخب نہیں ہو جاتا۔ تمہاری مرضی نہیں چلے گی۔ تم مجھے وارننگ دے سکتے ہو مگر نہیں۔"
"یہ تم ابھی دیکھ لو گے۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ ایسا نہ ہو کہ سینئر ذرات کسی وقت دوبارہ آ جائیں اور ہمیں دوبارہ رگڑا دیں، ابھی ان کا دل بھر نہیں ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"تو بھائی تمہاری تم جانو۔ میں تو پنگ کے نیچے سونے جا رہا ہوں تاکہ سینئر ذرات آئیں تو خالی پنگ دیکھیں۔ میری جان تو ٹنگ جائے گی۔"

طارق سمجھا تھا وہ مذاق کر رہا ہے لیکن راشد کی جگہ پنگ کے نیچے چلا گیا۔ بستر جیسی نیند نکلے فرش پر کہاں آنے والی تھی۔ کچھ دیر گزریں بدلتا رہا۔ نیند آنکھوں میں چھو دی تھی لیکن فرش سونے نہیں دیتا تھا۔ بالآخر رہا نہیں گیا۔ وہ دوبارہ بستر پر آ گیا۔

لوئر ٹوپ میں یہ اس کا پہلا دن تھا جو نہایت تھا کا دینے والا ثابت ہوا۔

دوسرا دن طلوع ہوا تو تمام لوگوں کو دو اسکوڑوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ طارق سے اس کا ساتھ چھوٹ گیا کیونکہ طارق اسکوڑوں نمبر ۱ میں تھا لہذا اسے دوسرے کمرے میں جانا پڑا۔

اس کے بعد انٹری ٹیسٹ بھی دینا پڑا جس سے ان کی اہلیت کا اندازہ لگانا مقصود تھا۔ راشد نے اس ٹیسٹ میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔

پہلی ٹرم کا آغاز ہوا۔ اس ٹرم میں انہیں جسمانی طور پر مضبوط کرنا تھا۔ اس کے لیے ڈرل کے علاوہ شام کے وقت پانی بھی ہوتی تھی۔

ڈرل بہت سخت مرحلہ تھا۔ اگر کسی کیڈٹ کی آنکھ کی پتلیاں بھی مل جاتیں تو اسے پکڑ لیا جاتا اور سزا کے طور پر اسے تین میل دوڑنا پڑتا تھا۔ راشد اس صورت حال سے سخت پریشان تھا۔ اس کی بچپن کی کمزوری ابھی تک برقرار تھی یعنی وہ اپنی فہمی پر قابو نہیں پاسکتا تھا۔ اسے ڈرل سارجنٹ کی حرکات و سکنات پر اکڑا ہی آ جاتی تھی۔ اسے تقریباً دو سزا بھگتنی پڑتی تھی۔ سینئر ذرات اس کی کمزوری معلوم ہو گئی تھی اس لیے اس پر خاص طور پر نظر رکھی جاتی تھی اور وہ پکڑا جاتا تھا۔ شامت تو اس وقت آئی جب سزا کے بعد اسے دوبارہ قطار میں کھڑا کر دیا جاتا اور حکم دیا جاتا کہ اب سب خاموش رہیں گے اور کوئی نہیں سکرائے گا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی پہلے اس کی آنکھیں چمکتیں اور پھر ایک جاندار سکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی اور وہ پھر سزا کا

چیمپی اور بے چیمپی کے بدن بھی گزر گئے اور حتیٰ آباد آ گیا۔ اس کا نام تربیت حاصل کرنے والوں میں شامل کیا جا چکا تھا۔ اسے "لوئر ٹوپ" جا کر ایک سال کی تربیت حاصل کرنی تھی۔ پھر رسالہ پور جا کر تیسری، چوتھی اور پانچویں ٹرم کے امتحانات دینے تھے۔ پھر کہیں جا کر اسے بی ایس سی کی ڈگری اور تھانہ کی گریجویٹیشن کا اعزاز ملتا اور وہ پائلٹ مسٹر بنتا۔ اسے اپنی قابلیت پر پورا اعتماد تھا۔ اسے چیمپی تھا کہ اب اس کا خواب پورا ہو جائے گا۔

لوئر ٹوپ پہنچے ہی اس کا دل بار بار ہوا گیا۔ گرد و پیش میں پہاڑی جنگل کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ اتنی پر کشمیری برک پوش چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دور تک بے شمار ندی نالے اور پہاڑی چشمے بکھرے نظر آتے تھے۔ ان دنوں بارشیں ہو رہی تھیں، لہذا تمام ندی نالے جو کافی پر تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں کیڈٹوں کا ابتدائی ٹریننگ مرکز قائم کیا گیا تھا۔

وہ نہ جانے کب تک ان مناظر سے لطف اندوز ہوتا لیکن جلد ہی نئے کیڈٹوں کو سینئروں نے آدھو چا، کیڈٹوں کے ہاتھوں میں بڑے بڑے بکس تھے۔

"اپنے اپنے بکس سروں پر رکھ لو اور فراگ چپ (میٹنگ کی طرح اچھلتے ہوئے) لگاتے ہوئے سامنے والی پہاڑی پر چڑھو۔"

ان سب نے حکم پر عمل کیا۔ راشد نے بھی اپنا بکس اپنے سر پر رکھا اور فراگ چپ لگاتے ہوئے اوپر چڑھنے لگا، یہ تقریباً 72 ڈیڑے تھے جنہیں طے کر کے اوپر پہنچنا تھا۔ وہ اوپر پہنچے پہنچے کئی مرتبہ گرا اور اچھی طرح کچھڑ میں لت پت ہوا۔ یہی حال دوسرے کیڈٹوں کا بھی تھا۔ سینئر بھی ان کے ساتھ اوپر آئے اور ان سے کئی دردناک مشقیں کرائیں۔ بقول فطیے جوڑ جوڑ اٹھایا کر دیا۔

اللہ اللہ کر کے سینئر سے جان چھوٹی تھکن سے برا حال تھا اب اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو جایا جائے۔ کمرے میں پہنچ کر اس میں اتنی سخت نہ رہی تھی کہ کپڑے تبدیل کیے جاتے۔ صرف جوتے اتارے اور بستر پر دراز ہو گیا۔ بدن کا ایک ایک جوڑ درد کر رہا تھا۔ یہ ابرو والے پنگ پر اس کا روم میٹ طارق لیٹا تھا۔

"طارق۔"

"ہوں۔"

ماہنامہ سرگزشت

اگست 2014ء

[37]

مستحق قرار پاتا۔

سنا کہ بھی ایک طلب سے کم نہیں تھا۔ وہاں جو تے تھیں غرض ہر شے اس کی زد میں آ جاتی۔ وہاں پر ذرا سی بھی مٹی ہوتی تو بس شامت آ جاتی۔ کالروں والا حیلہ ہوتا تو اگلے اہل کرپشن توڑ دیا جاتا۔ شیونگ پرش اچھی طرح دھلا ہوا ہو۔ سیٹھی ریج میں ایک ہال بھی نظر نہ آئے۔ راشد البتہ ان بکھیزوں سے آزاد تھا کیونکہ راشد کے ابھی شیونگ نہیں آئی تھی مگر وہ یہ سوچتا ضرور تھا کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

تفریحات کے مواقع بھی ٹلنے رہتے تھے لیکن تکلفات یہاں بھی تھے جسے راشد پسند نہیں کرتا تھا۔ خاص طور پر سینئرز کی برتری اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی لیکن وہ ان کی حکم دہولی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ اس سخت گیر ماحول کا عادی ہوتا گیا۔ برسات شروع ہوئی تو انہیں کچھ آرام مل گیا۔ یہ عرصہ خوب بٹے گلے میں گزرا۔ البتہ فرصت ہوئی تو گھر بہت یاد آنے لگا جسے وہ سچ یا دلوں کی طرح ذہن سے جھینکتے لگا۔ اکیلے میں خوب ہنسا اور اپنا دل خود بہلاتا رہتا۔

اسے پہلی ٹھوکر ملی تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ یہ اس کی پہلی ذاتی کمائی تھی اور بڑی محنت کی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس میں سے کچھ پیسے بچا کر اپنے گھر بھیجے گا لیکن MESS (میس) کا مل اتنا ہو گیا تھا کہ مل ادا کرنے کے بعد گھر بھیجنے کے لیے پیسے باقی نہ رہے۔

جیسے جیسے وہ پرانا ہوتا جا رہا تھا سینئرز کے رگڑوں کی شدت میں کمی آنے لگی تھی۔ شام کے وقت باہر جانے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ وہ ساتھیوں کے ساتھ کھونٹے نکل جاتا تھا۔

تلف ٹیسٹ ہوتے رہے، ان میں جسمانی ٹیسٹ بھی تھے اور قلبی بھی۔ اس کی کارکردگی شاندار رہی۔ وہ گاہے گاہے پنڈی جا کر رشتہ داروں سے بھی مل آتا تھا۔

اسی دوران میں اسے معلوم ہوا کہ اس کی والدہ لاہور آ رہی ہیں۔ ٹریننگ ونگ میں دو دن کی چھٹی بھی تھی لہذا وہ جاسکتا تھا۔ فضائی سفر کا انتظام بھی ہو گیا لہذا وہ لاہور پہنچ گیا۔ والدہ سے بہت دلوں بعد مل رہا تھا۔ ان کا دل بڑھانے کے لیے اپنی کامیابیوں کے قصے سناتا رہا۔

وہ صرف دو دن کے لیے آیا تھا یہ دونوں یوں گزر گئے کہ پتا ہی نہ چلا اور وہ ٹریننگ ونگ واپس آ گیا۔ سردی

کی شدت میں اضافہ ہونے لگا تھا۔

انہی دنوں سینئر کورس اپنی ختم ہو دی کر کے سالیہ چلا گیا۔ ان کی جگہ نئے کیلٹ آ گئے۔ اب نئے آنے والے جو نیئر ہو گئے اور راشد اور اس کے ساتھی سینئر ہو گئے۔

سینئر ہو جانے کے بعد راشد کو نئی پریشانی لاحق ہوئی۔ اس کے ہنسنے مسکرانے کی عادت ابھی تک قابو میں نہیں آئی تھی۔ جس وقت وہ اپنے جو نیئر زکور گزرا دے رہا ہوتا تھا اچانک اس کی ہنسی نکل جاتی۔ اس کے ساتھی بے حد جھلاتے تھے۔ اور پھر یہ ہوا کہ رگڑا دیتے وقت راشد کو وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔

راشد نے مشکلات پر قابو پالیا تھا لیکن یہ احساس اسے ستاتا رہتا تھا کہ وہ اب بھی کم عمر نظر آتا ہے کیونکہ اس کے چہرے پر رواں تو آ گیا تھا شیونگ نہیں آیا تھا۔ اس نے گھبرا کر شیونگ کرنا شروع کر دیا تاکہ جلدی ہال نکل آسکے لیکن اس کا اثر اٹھا ہوا۔ وہاں بھی صاف ہو گیا البتہ مزید کم عمر نظر آنے لگا۔ وہ پھر بھی شیونگ کرتا رہا۔

پہلی ٹرم ختم ہوئی تو وہ چھٹیاں گزارنے کراہی آ گیا۔ پانچ ماہ بعد اپنے گھر میں قدم رکھتے ہوئے اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ کامیابی کا نشہ بھی تھا اور اپنے بڑے ہونے کا احساس بھی۔ مگر کی ہر چیز بھی بدلی بدلی نظر آ رہی تھی۔ جس طرح کی زندگی وہ گزار کر آ رہا تھا وہ گھر کی زندگی سے مختلف تھی۔ اس کے دوسرے بھائی اسے غیر مستعد اور اچیلہ حالے نظر آ رہے تھے۔ لیکن اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ سینئر بن کر انہیں رگڑا دیتا۔

عزیز و اقارب اسے پچھلے سے زیادہ اہمیت دے رہے تھے۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ اب اس کی باتوں کو اہمیت دی جا رہی ہے۔ اس سے کیلٹ لائف کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے اور جو کچھ وہ بتا رہا ہے اسے سب غور سے سن رہے ہیں۔ کوئی اس کا مذاق نہیں اڑا رہا ہے۔

چھ ہفتوں کی چھٹیاں پلک جھپکتے گزر گئیں اور وہ دوبارہ لوہڑ لوہڑ پھٹنے لگا۔

اب وہ اٹھارہ برس کا ہو چکا تھا۔ اسے زیادہ وقت نہیں ملتا تھا لیکن پھر بھی مطالعے کے لیے وقت نکال لیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی بہن کو خط لکھا۔

"کچھ عرصے سے میں خامے متنوع موضوعات کے بارے میں پڑھتا رہا ہوں۔ میں اب کہانی کے طور پر نہیں پڑھتا جیسے میں پہلے کیا کرتا تھا۔ بلکہ اب میں ذاتی

قابلیت بڑھانے کے لیے پڑھتا ہوں۔ میں اسلام کے بارے میں پڑھنا چاہتا ہوں کیونکہ میرا ان چیزوں پر کیسے ایمان ہوگا جن کے بارے میں مجھے علم نہیں ہے۔ ادبیات میں پہلے ہی ڈیڑھ سو روپیہ ادب کو پڑھ چکا ہوں....."

سیکڑوں فرم میں وہ تقریباً ہر مہینے ایک نظمیں دورے کے لیے رہولپنڈی جاتے تھے۔ اس مہینے وہ مجھ کا گلی پہنچے۔ کیپ میں پہنچے ہی انہیں چھ چھ لڑکوں میں بانٹ دیا گیا۔ رات کے وقت ہر کیڈٹ جاگ جاگ کر دو تین گھنٹے پہرا دیتا۔ انہی جنگلوں میں زندہ رہنے کے گڑ بتائے جاتے تھے۔ اندھیرے میں پیش قدمی کرنا کہانیوں کے مثل رنگ کرا کے بڑھنا اسلواستھل کرنے کا طریقہ۔

جنگلوں میں سانپ بھی موجود تھے لہذا انہیں حفاظتی خدشوں کھودنا پڑیں۔ پھاڑی علاقوں کو کھودنا اتنا دشوار تھا کہ رات کو جب سونے کے لیے لیٹتے تو ہاتھ اٹھانے کی سکت بھی باقی نہ رہتی۔

جب یہ دوسری لڑم بھی مکمل ہوئی تو وہ ایک مہینے کی تعلیمات گزارنے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد انہیں رسالہ پورہانا تھا۔

اس مرحلے پر پہنچا تو اسے اتفاق سے اس "لوکی" سے ملاقات کا موقع ملا جس نے تین برس پہلے راشد کی تحریف کی تھی۔ اسے یہ بھی موقع مل گیا کہ وہ اس لڑکی کو فون کرے۔ اس کے دونوں بھائی راحت اور انجم اس کے پاس بیٹھے تھے اور وہ اس لڑکی کو فون کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

"راحت کو مارا جائے تو بیٹاؤ۔"

"بھائی جان میں نے وی دیکھ رہا ہوں۔"

"جو کہا جا رہا ہے وہ کرو اور انجم کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ تمہاری مدد کرے گا۔"

ان کے جاتے ہی اس نے ریسورڈ اٹھایا۔ شاید وہی فون اٹھائے۔ اس نے دل میں سوچا اور فیملی ملایا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ فون اسی نے اٹھایا۔

وہ ابھی بات کر رہا تھا کہ دونوں بھائی خاموشی سے اندر آ گئے اور غالباً کچھ باتیں انہوں نے سن بھی لی تھیں اور انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کس کو فون کر رہا ہے۔ یہ ان دونوں بھائیوں کی سکراہٹ سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"یار کسی کو بتانا نہیں۔" راشد نے گھبرا کر

بھائیوں سے کہا۔

"ریسورڈ رکھ کر وہ خاصا مطمئن ہو گیا۔ وہ خوش تھا کیونکہ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے جس کی پردہ ہے اس کا دل بھی اس کی طرف سے صاف ہے۔"

9 اگست 1969ء کو راشد نے زندگی میں دوسری مرتبہ رسالہ پورہا کیڈی میں قدم رکھا۔ یہاں جہاز تو تھے لیکن اسے اسوں یہ تھا کہ تیسری لڑم میں فلائنگ شامل نہیں تھی۔ پھر بھی وہ جہازوں کو دیکھ کر بہل سکتا تھا۔

تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اردو کا مضمون نصاب سے خارج کر دیا گیا مگر فلائنگ سے متعلق بے شمار مضامین کا اضافہ ہو گیا تھا۔ الیکٹرانکس ان میں دشوار ترین تھا لیکن دلچسپ تھا پاراشد کھاس میں دیکھی تھی۔

ہوائی جہاز اس کے سامنے اڑتے تھے لیکن وہ ان سے محروم تھا۔ یہ بہت بڑی محرومی تھی۔ کب اسے جہاز اڑانے کا موقع ملتا ہے۔ یہ اس کے لیے پورے انتظار کی طرح تھا۔ وہ سخت اداس رہتے لگا تھا۔

اداسی کی دیوار میں ایک دن اچانک دراڑ پڑ گئی۔ اسے چند ساتھیوں کے ساتھ ہی 37 جیٹ تربیتی طیارے کا چارہ لینے کا موقع ملا۔ ان طیاروں پر صرف غیر ملکی سینئر کیڈٹوں کو ان پر تربیت دی جاتی تھی لیکن یہ انہوں بھی گرم تھی کہ آجندہ پاکستانی کیڈٹوں کو بھی ان پر تربیت دی جا رہی ہے۔ یہ پاکستانی وہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے دل میں ایک نئی آہنگ محسوس کی۔ اداسی کی ہر طرف بکسریاں کھلی گئی۔ اس نے اسی روز اپنی بہن کے نام خط لکھا۔

"اگر کچھ پاکستانیوں کو یہ موقع ملا تو میں اس بات کو یقینی بنا کر رہوں گا کہ میں ان میں شامل ہوں۔ کم از کم اگر یہ امتحان نصابی قابلیت کی بنا پر ہو۔"

وہ اپنی قابلیت بڑھاتا جا رہا تھا۔ تیراکی کے مقابلے ہوئے تو اس نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ الیکٹرانکس میں اسے نمبرون تسلیم کیا گیا۔

اپنے چھوٹے بھائیوں کو پابندی سے خط لکھتا رہتا تھا جو نصیحتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس سے اسے یک گونہ خوش محسوس ہوتی تھی۔ اسے لگتا تھا وہ اب واقعی بڑا ہو گیا ہے۔ اس کی ذمہ داریاں میں شامل ہے کہ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں انہیں نصیحت کرتا رہا۔

اس کے بھائی ان خطوں کو وصول کر کے بہری سے پڑھ بھی لیتے۔ نصیحتوں سے کون خوش ہوتا ہے۔ بارہ تیرہ

راشد کو اس گھڑی کا شدت سے انتظار تھا بلکہ یوں کہاں جائے کہ بچپن سے انتظار تھا۔

وہ لٹانگ کو آسان سمجھ رہا تھا لیکن یہ اتنی آسان ثابت نہیں ہوئی۔ کچھ دنوں کے لیے پڑھائی کو پس پشت ڈال کر ساری توجہ ہوا پڑائی پر مرکوز کرنی پڑی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض کیتھولوں کو بالائی قرار دے کر قضائے رخصت کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب بڑا الیہ تھا کہ اسے مراحل طے کرنے کے بعد کسی کو بالائی قرار دے دیا جائے۔ اسے خود پر اعتماد تھا لیکن پھر بھی وہ کانپ اٹھا۔ اگر وہ اس مرحلے پر گھر چلا گیا تو کس منہ سے جائے گا۔ یہ پروازیں انٹرکٹر کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اس لیے خوف کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ بعض عوارض ایسے تھے جن سے قوت امدادی ہی سے قابو پایا جاسکتا تھا۔ وہ پہلے دن تربیت کے لیے روانہ ہوا اور جہاز نے ٹک آف کیا تو اسے پکڑ آ گیا۔ بکے پن کا احساس ہونے لگا۔ تیزی سے کوئی چیز زمین سے آسمان کی طرف جائے تو اس کیفیت کا ہونا لازمی ہے۔ بعد میں پائلٹ اس کا مادی ہو جاتا ہے لیکن اسے پائلٹ کو اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس کیفیت پر وہ کتنی جلدی قابو پایا ہے یا پکڑ آنے کی شدت کتنی ہے۔ راشد کا سر ہلکا ہوا ضرور لیکن یہ کیفیت اس کے قابو سے باہر نہیں ہوئی اور وہ انٹرکٹر کے منہ سے بھاڑا۔ آٹھ آٹھ دس منٹ کی چند پروازوں کے بعد اس نے اس کیفیت پر قابو پایا۔

لٹانگ کے دوران ملتا ہوا جانا بھی بالائی کا بڑا سبب تھا۔ بعض کیتھول اپنی اس کمزوری پر قابو نہ پاسکے اور بالائی ہو گئے۔ راشد نے اس سے بچنے کے لیے یہ ترکیب وضع کی کہ پرواز کے وقت خالی پیٹ رہنے لگا حالانکہ انٹرکٹر کی ہدایت تھی کہ کوئی کینڈا خالی پیٹ پرواز پر نہ جائے۔

تفصیلات میں 180 گھنٹے لٹانگ کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد انہیں "سولو" یعنی تنہا پرواز کی اجازت مل گئی۔

وہ دن اس کی زندگی کا یادگار دن تھا جب اسے پہلی مرتبہ تنہا پرواز کے لیے روانہ ہونا تھا۔ انٹرکٹر کی موجودگی کے بغیر وہ اکیلا جہاز اڑائے گا۔ یہ خیال ہی اسے خوش کرنے کے لیے بہت تھا۔ دوسرے کیتھولوں کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ پہلی مرتبہ جب تنہا پرواز کی جاتی ہے تو سخت گھبراہٹ ہوتی ہے۔ عقل بھی کبھی کبھی کہ کچھ نہ کچھ گھبراہٹ ضرور ہوتی ہوگی لیکن اسے ذرا بھی ڈر محسوس نہیں ہوا۔ ہدایت کے

سہل کے بچے کیسے خوش ہو سکتے تھے۔ پڑھ کر ادھر ادھر ڈال دیتے تھے۔ بڑے اس لیے خوش ہو جاتے تھے کہ ان کا بیٹا انہیں بھولا نہیں ہے۔ اتنی مصروفیات میں بھی انہیں یاد رکھتا ہے۔ ان غلوں سے انہیں یہ عقل بھی ہوتی تھی کہ ان کا بیٹا ان کا نام روشن کر رہا ہے۔ اس کی ماں نے اسے ایک خط میں لکھا تھا۔

"جے" اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو اور پوری ایمانداری سے کام کرو تو ہمارے پاس بھی نہیں بٹکے گی اور جس شوق سے تم ایئر فورس میں گئے ہو مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے فضل و کرم سے اتنا اعلیٰ اور کامیاب افسر بنائے گا جس پر پورا خاندان ہی نہیں بلکہ پورا پاکستان فخر کرے گا۔"

یہی تھیں وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کو کر رہا تھا۔ "ایک ایسا انسان بنو کہ لوگ تم پر فخر کریں۔ رقیق" میر عزیز بھائی! چہ چل! قاعدہ عظیم کی طرح تم پر فخر کر سکیں۔" جو کچھ وہ اپنے لیے سوچ رہا تھا واصل دی اپنے بھائیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کیونکہ وہ اس سے چھوٹے تھے اور بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے انہیں سمجھانا اپنا حق سمجھتا تھا۔ جو صفات خود اس میں تھیں وہی اپنے چھوٹوں میں بھی دیکھنا چاہتا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ بھی خود فرضی یا او مجھے پن کا مظاہرہ مت کرو۔ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے کبھی مکاری سے کام مت لو۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی اس خوبی سے محروم مت ہونا جو تم دونوں میں موجود ہے۔ یعنی دو ٹوک ہونے کی صفت۔ اگر تم سے کوئی غلطی سرزد ہوگی ہے تو ہوتی ہوگی۔ بھلا کوئی تمہارا کیا بکاڑ سکتا ہے لیکن اگر تمہیں اس پر شرمندگی کا احساس ہو جائے تو اس کا اظہار بھی کرو اور معافی مانگ لو۔"

اس وقت ان غلوں کی اہمیت کا احساس کسی کو بھی نہیں تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ صرف یہ خط ہی رہ جائے گا۔

دس جنوری 1970ء کو تیسری ٹرم کا بھی اختتام ہوا۔ اس مرتبہ اسے صرف دس دن کی پیمانی تھی۔ یہ دس دن اس نے بڑے بھائی کی حیثیت سے کراچی میں گزارے اور چھوٹے بھائیوں کو زندگی کے نشیب و فراز سمجھا دیا۔

فورتحہ ٹرم میں لٹانگ بھی شروع ہونے والی تھی۔

مطابق آٹھ دس منٹ فٹنٹس دینے کے بعد اسے بچے آنا چاہیے اس قسم کی چھوٹی چھوٹی پردازوں کے بعد اسے پورے ایڑیوں کا چکر لگانے کا موقع دیا گیا۔ اسے "سرکٹ" کہتے تھے۔

جب وہ سیدھی سیدھی کئی پردازیں کر چکا تو اسے مختلف کریم سکھائے گئے۔ یہ بھی تربیت کا حصہ تھا۔ کس طرح جہاز کو تھکا ہوا کی کھلائی ہے۔ چلتے چلتے کس طرح ایک طرف کو مڑ جانا ہے۔ کس طرح بچے آنا ہے، کس طرح اچانک اوپر چلے جانا ہے۔

فوری طور پر ٹرم ہو چکی تھی۔ گویا اب منزل بہت قریب آگئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اسے گھر جانے کا موقع مل گیا۔ اسے لڑکھانہ کی رخصت ملی تھی۔

اس مرتبہ زیادہ دن رہنا تھا اس لیے اس نے رسالہ پور کی یاد تازہ کرنے کے لیے فوج اور فضا نیے کے نامور سپاہیوں کی تصویریں اس کمرے کی دیواروں پر چسپاں کر دیں جو تینوں بھائیوں کا مشترکہ کمرہ تھا۔ اس کی والدہ نے دیکھا تو بہت خفا ہو گئی۔

"راشد! کوئی دیواروں پر تصویریں چپکا تا ہے۔ اب انہیں اکھاڑ دے تو سب چنٹ خراب ہو جائے گا۔ تمہارا بچپن ابھی کیا نہیں ہے۔ یہ تمہیں آخر سوچنی پڑے گی۔"

"ای جان یہ میں نے بلا وجہ نہیں کیا ہے۔ یہ میں نے راحت اور انجم کے لیے کیا ہے۔ یہ دونوں مکمل کود میں پڑے رہتے ہیں ان تصویروں کو دیکھیں گے تو ان کے دل میں بہادری کے کام کرنے کی خواہش پیدا ہوگی۔"

وہ جب یہاں تھا تو اپنی بہنوں فرزانہ اور رخسانہ پر اپنی طبیعت کا رعب ڈالنے کے لیے ان سے جھگڑتا رہتا تھا۔

اس مرتبہ وہ آیا تو اس میں یہ تبدیلی آئی کہ اپنی راتہ دار یوں کو محسوس کرنے لگا۔ اسے یہ احساس شدت سے ہونے لگا کہ بہت جلد یہ دونوں اپنے اپنے گھروں کو چلی جائیں گی۔ یہ تو مہمان ہیں ان سے کیا لڑا۔ مجھے تو ان کی شادیوں کے لیے بہت سارا دیا کھانا ہوگا۔ لڑکا بوجھ ہلا کرنا ہوگا۔ اس دورے میں وہ اکثر ماں کے پاس بیٹھ کر فرزانہ اور رخسانہ کی شادی کی باتیں کرتا رہتا تھا۔

اس نے ایک دن باتوں باتوں میں والدہ کے سامنے "اس لڑکی" کا ذکر پھیر دیا۔ "اس لڑکی" کے گھر والے راشد کی والدہ کے لیے اچھی نہیں تھے۔ ان گھرانوں کا عرصے سے آپس میں جھگڑا چلتا تھا لیکن والدہ کو یہ معلوم نہیں تھا

کہ راشد اس لڑکی کو پسند کرنے لگا ہے۔

"تم اسے کب سے پسند کرنے لگے ہو۔"

"ایک قریب میں اس نے میری تعریف کی تھی اور مجھے لائیت دی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کوئی مجھے اہمیت نہیں دیتا تھا۔"

"پس اتنی ہی بات پر تم نے یہ سمجھ لیا کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہوگی۔ اس نے رسالتہاری تعریف کر دی ہوگی۔"

"نہیں ای جان وہ جب بھی ملی ہے میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی دیکھی ہے۔"

"یہ تمہارا اندازہ ہو سکتا ہے جو ممکن ہے غلط ہو۔"

"میرا اندازہ غلط ہو سکتا ہے لیکن میں غلط نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے لیے ایک مناسب لڑکی رہے گی۔"

"کیا تم سنجیدہ ہو راشد؟"

"میں ہر وقت لڑائی نہیں کرتا۔"

"تم ابھی ٹرینگ پر ہو راشد۔ تم یہ خواب ابھی سے دیکھتے لگے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔"

"مجھے جلدی نہیں ہے۔ شادی تو میں فضا نیے کا امر بننے کے بعد کروں گا۔ ابھی آپ لوگ کوئی بات دات تو کر سکتے ہیں ورنہ اس کی شادی نہیں ہو رہی ہو جائے گی۔"

"اچھا دیکھتے ہیں۔ لڑکی تو وہ مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔"

اس وقت اتنی ہی بات ہو سکتی تھی۔ راشد نے غصہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں بڑوں کو سوچنے سمجھنے کا موقع دینا چاہیے۔

اس کی والدہ نے سنجیدہ صاحب سے تذکرہ کیا۔ اس کی سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آگئی۔

"اس عمر میں سارے لڑکے اسی طرح سوچتے ہیں۔ یہ کم عمری کا جنون ہے اور کچھ نہیں۔"

"وہ بہت سنجیدہ ہے۔"

"گھر پر خالی بیٹھا ہے اس لیے سنجیدہ ہے۔ ٹرینگ پر جائے گا تو سب بھول جائے گا۔"

"آپ اسے جانتے ہیں۔ جس بات کی ضمان لیتا ہے ضرور کرتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ جارا فرماں بردار ہے۔"

"پھر بھی اس کی خوشی اگر پوری کر دی جائے۔"

"میں نے کب انکار کیا لیکن اسے کسی قابل تو ہونے

کہ راشد اس لڑکی کو پسند کرنے لگا ہے۔

"تم اسے کب سے پسند کرنے لگے ہو۔"

"ایک قریب میں اس نے میری تعریف کی تھی اور مجھے لائیت دی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کوئی مجھے اہمیت نہیں دیتا تھا۔"

"پس اتنی ہی بات پر تم نے یہ سمجھ لیا کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہوگی۔ اس نے رسالتہاری تعریف کر دی ہوگی۔"

"نہیں ای جان وہ جب بھی ملی ہے میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی دیکھی ہے۔"

"یہ تمہارا اندازہ ہو سکتا ہے جو ممکن ہے غلط ہو۔"

"میرا اندازہ غلط ہو سکتا ہے لیکن میں غلط نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے لیے ایک مناسب لڑکی رہے گی۔"

"کیا تم سنجیدہ ہو راشد؟"

"میں ہر وقت لڑائی نہیں کرتا۔"

"تم ابھی ٹرینگ پر ہو راشد۔ تم یہ خواب ابھی سے دیکھتے لگے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔"

"مجھے جلدی نہیں ہے۔ شادی تو میں فضا نیے کا امر بننے کے بعد کروں گا۔ ابھی آپ لوگ کوئی بات دات تو کر سکتے ہیں ورنہ اس کی شادی نہیں ہو رہی ہو جائے گی۔"

"اچھا دیکھتے ہیں۔ لڑکی تو وہ مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔"

اس وقت اتنی ہی بات ہو سکتی تھی۔ راشد نے غصہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں بڑوں کو سوچنے سمجھنے کا موقع دینا چاہیے۔

اس کی والدہ نے سنجیدہ صاحب سے تذکرہ کیا۔ اس کی سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آگئی۔

"اس عمر میں سارے لڑکے اسی طرح سوچتے ہیں۔ یہ کم عمری کا جنون ہے اور کچھ نہیں۔"

"وہ بہت سنجیدہ ہے۔"

"گھر پر خالی بیٹھا ہے اس لیے سنجیدہ ہے۔ ٹرینگ پر جائے گا تو سب بھول جائے گا۔"

"آپ اسے جانتے ہیں۔ جس بات کی ضمان لیتا ہے ضرور کرتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ جارا فرماں بردار ہے۔"

"پھر بھی اس کی خوشی اگر پوری کر دی جائے۔"

"میں نے کب انکار کیا لیکن اسے کسی قابل تو ہونے

”وہ“

”وہ کہہ رہا ہے بات یہی کر لی جائے۔ شادی بعد میں ہو جائے گی۔“

”یہ قبل از وقت ہو گا۔ اگر وہ کسی قابل ہو گیا اور پھر اس کا معیار بدل گیا تو ہم خواہ مخواہ بھولنے پڑیں گے۔ وہ اپنی ٹریننگ مکمل کر کے گھر آ جائے پھر دیکھا جائے گا۔“

اس کے گھر والوں نے اس کی سنجیدگی کو کم عمری کا جنون سمجھا اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔ وہ پھر بھی مطمئن تھا کہ گھر والوں نے اس طرحی کو بے پند نہیں کیا تھا۔ وہ جب آفسر بن جائے گا تو پھر اس قصے کو اٹھائے گا۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں اور وہ پانچویں فرم پوری کرنے کے لیے رسالہ پڑھنے لگا۔

اس فرم میں زیادہ تر وقت فٹنگ میں گزارتا تھا۔ مصروفیت اتنی بڑھ گئی کہ کچھ سوچنے یا غلط کھینے کا وقت کم ہی ملتا تھا۔

1970ء کے آخری مہینے چل رہے تھے۔ ایک دن راشد اپنی تنہا پرواز کے لیے تھا میں بلند ہوا۔ اس منٹ گزر گئے۔ سب کچھ ٹھیک تھا کہ چل رہا تھا۔ اس کا طیارہ مستقر سے کالی دور نکل آیا تھا کہ اچانک اسکرین پر کوئی چیز نظر آئی۔ وہ سمجھا کوئی چیز یا اسکرین سے ٹکرائی ہے۔ چند لمحوں بعد یہ یوں ہی پھٹنے لگیں۔ یہ چیز یا نہیں ٹکرائی تھی بلکہ انہی آئل ٹینک ہو رہا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں اسکرین چل سے اٹک گئی۔ سامنے کچھ خطر نہیں آ رہا تھا۔ یہ اس کے اصحاب کا امتحان تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس نے سوچا۔ اس نے کنٹرول ٹاور کو آگاہ کیا۔ وہاں سے حکم ملا کہ طیارے کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور پیراشوٹ کے ذریعے نیچے کود جاؤ۔ اسے لمحوں میں لیپ لے کرنا تھا کہ حکم کے مطابق عمل کرے یا نہیں۔ اگر وہ کود گیا تو طیارہ تباہ ہو جائے گا۔ وہ طیارے کو اپنی آسانی سے تباہ نہیں ہونے دے گا۔ اس نے سوچا اور کنٹرول ٹاور سے رابطہ کیا۔

”میں طیارہ تباہ نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے طیارہ واپس لانے کی اجازت دی جائے۔“

اس کی درخواست منظور ہوئی اور ٹاور سے اسے ہنگامی لینڈنگ کے لیے ہدایات ملنے لگیں۔

”اے اللہ اگر میں دن اے پر بھی سلامت اتر گیا تو وہ چل ٹھکانے کے ادا کروں گا۔“

وہ بالکل ہدایت کے مطابق پیراشوٹ کے ذریعے پہ

آسانی سے اتر سکا تھا۔ ہنگامی لینڈنگ میں خطرہ تھا۔ اس نے یہ خطرہ مول لیا اور نہایت شاندار لینڈنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے دن دے پر اتر گیا۔

وہ جہاز سے باہر نکلا تو اس کے جوتوں میں تیل لگا ہوا تھا۔ وہ چند قدم چلا تھا کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ حزام سے نیچے گر گیا۔ دوست اسے سنبالنے آ گئے۔

”یاد رہے کہ تو سب ٹھیک تھا۔ نیچے آئے اور یہی ہو گئی۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور دل میں کہنے لگا ”کوئی بڑی مصیبت اس چھوٹی مصیبت سے ٹل گئی۔“

اس نے اپنی جان پر گھٹیل کر اپنے جہاز کو بچا لیا تھا اور ساتھ ہی اپنے مضبوط اصحاب کا ثبوت بھی دیا تھا۔ وہ اگر طیارے کو تباہ ہونے دیتا تو کوئی اس سے بچنے والا نہیں تھا کیونکہ یہ ایک فنی طرالی تھی لیکن اس نے خود کو بھی بچا لیا اور طیارے کو بھی محفوظ رکھا۔ اکیڈمی میں اس کے اس کارنامے کی بہت تعریف ہوئی اور اسے تعریفی سند ملی۔

اس نے اپنے اس کارنامے کا گھر والوں سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ وہ سن کر پھٹان ہوں گے اور اس لیے بھی کہ وہ اپنے کسی کارنامے کا ذکر کرنے کو شرمی سمجھاتا تھا۔

اس کی تربیتی پروازیں چل رہی تھیں کہ ملک میں کئی سیاسی تبدیلیاں آئیں۔ صدر ایوب رخصت ہو چکے تھے اور جنرل یحییٰ صدر تھے۔ الیکشن ہوئے تو اس کا بھی جی چاہا کہ ووٹ ڈالے لیکن اس کی عمر کم تھی۔ ووٹ ڈالنے کے لیے کم سے کم عمر اکیس برس تھی جبکہ اسے بیس سال کا ہونے کے لیے بھی مزید دو ماہ درکار تھے۔

الیکشن تو یہ خیر وغیرہ ہو گئے لیکن انقلاب اقتدار میں پس و پیش ہونے لگی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھیلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں شاندار کامیابی حاصل کی تھی جبکہ مشرقی پاکستان میں عجب الرحمن کی قومی لیگ جیت گئی تھی اور مجموعی طور پر کامیابی حاصل کی تھی۔ بہر حال یہ سیاسی معاملات تھے کہ عجب الرحمن کو حکومت کیوں نہیں دی جا رہی ہے۔ اکیڈمی میں چہ میگوئیاں ضرور ہو رہی تھیں لیکن مکمل کر کوئی کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ یہ اندیشے ضرور ظاہر کیے جا رہے تھے کہ یہ مسئلہ اگر طویل کشمکش کیا تو کثرت و غوغا پر ختم ہو گا۔ یہ اندیشے اس لیے زور پکڑ رہے تھے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان دشمن ملک بھارت تھا جس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے مشرقی پاکستان میں خود مختاری کے

نعرے بلند ہونے لگے۔ انہی دنوں اس نے سنا کہ اس کے والد نے ٹویوٹا گاڑی خریدی ہے جس کا رنگ سرخ ہے۔ اس کی پانچویں فرم ختم ہونے والی تھی۔ وہ خوش ہو گیا کہ گھر جا کر اس گاڑی میں خوب سیر کرے گا لیکن یہ خوشگامی ثابت ہوئی۔ رام میں دو ماہ کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اب دو ماہ اور انتظار کرنا پڑے گا۔

گاڑی کا تو بہانہ تھا۔ اسے یہ بھی جلدی ہو رہی تھی کہ فاضل فرم مکمل ہو گئی ہے اب وہ گھر جانے کا اور گھر والوں سے اپنی شادی کی بات کر سکے گا لیکن اب دو ماہ مزید انتظار کرنا تھا۔ اس پر چٹائی کا شہ پڑ چلا ہوا۔ وہ سہل اور صیب کی محنت کی گائی ہوئی غزلوں میں پتا لینے لگا۔ اس نے اپنی ڈائری میں غالب کے یہ اشعار درج کر دیے۔

پہنچے ہماری قسمت کو دو سال پار ہوتا

اگر اور جیتے رہتے بھی انتظار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے میرے حیرت کش کو

وہ غلط کہاں سے ہوئی جو جگر کے پار ہوتا

اس کی سادگرہ بھی لڑیکہ کے دوران میں آ گئی۔ گھر والوں کی جانب سے برقعہ لے کر مارا موصول ہوا تو اس کا دل بھرا آیا۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں انسانی زندگی میں کتنی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس نے لیکن دشمنانہ کونہایت جذباتی خط لکھا۔

یہ اس کی آخری ساگرہ اور آخری خط ثابت ہوا۔

دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس نے اپنی تربیت مکمل کر لی۔ جب اس نے تربیت کا آغاز کیا تھا اس کے ساتھ 35 لاکے تھے اور اب صرف سولہ خوش نصیب تھے جو یہاں تک پہنچے تھے۔

13 مارچ 1971ء کو پاکستان آؤٹ ہوئی۔ اس موقع پر اس کے والدین اور دونوں بیٹیاں بھی آئیں ان کی آمد نے اسے سرور کر دیا۔

وہ کراچی آیا تو کراچی کا سرور میں اس کے لیے ایک نئی دنیا ثابت ہوا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا دہائیوں پرانی لڑائی کے لیے عارضی طور پر تیار کیا گیا تھا۔ جنگ کے بعد برطانوی حکمرانوں نے اسے مستقل صورت دے دی تھی۔ آزادی کے بعد یہ پاکستان لڑائی کی اولین تربیت گاہ ثابت ہوا۔

راشد یہاں پہنچا تو بے انتہا خوش تھا۔ اس لیے کہ اب وہ کیڈٹ نہیں رہا تھا اور اس لیے بھی کہ یہاں رسالہ

سے کہیں زیادہ آزادی تھی اور شاہ اس لیے بھی کہ اب وہ پرنٹنگ کی تمام گھر جاسکتا تھا اور انوار کا دل چھٹی کے طور پر گھر گزرا سکتا تھا۔ رسالہ میں وہ کیڈٹس میں کھانا کھاتا تھا۔ یہاں آفیسرز میں بہ حیثیت آفیسر کھانا کھا سکتا تھا۔ خود کو آفیسر ظاہر کرنے کے لیے اس نے سوچیں بھی دیکھ لی تھیں اور پس کر کہا کرتا تھا "اب میرے دن میں سوچوں کا اضافہ بھی ہو جائے گا" پاکستان آفیسر کی حیثیت سے اس کی تنخواہ میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ تنخواہ ملنے کے بعد اس نے گھر کی کئی ذمہ داریاں بھی سنبھال لی تھیں۔ چھٹی کے دن بھائیوں کو لے کر نکل جاتا اور ان کی پسند کی چیزیں انہیں دلاتا۔ اس کے اپنے اخراجات بھی تھے۔ کتابوں کا شوقین تھا اور گراموفون ریکارڈ خریدتا تھا۔

شرقی پاکستان میں حالات غراب سے غراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اس وقت موضوع ہی یہ تھا کہ انقلاب اقتدار کیسے ہو۔ اس کے گھر میں بھی یہ بحث اکثر چل جاتی تھی۔ اس کے بہن بھائی فریدہ اور کینٹن نصیر کراچی آئے تو یہ بحثیں تو اس سے ہونے لگیں۔ راشد کا خیال تھا کہ اقتدار عیب الرحمن کے حوالے کر دینا چاہیے۔

فریدہ اس سے اکثر کہا کرتی تھی۔ "تم بنگالیوں کے بڑے حمایتی ہو حالانکہ اگر کبھی تم ان کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں دے سکیں گے۔"

یہ لہجہ کی لہجہ گھڑی تھی کہ بعد میں بھی ہوا۔

قلائد یونیٹس ملحق الرحمن ایک تیس سالہ نوجوان تھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم ڈھاکہ میں ہوئی تھی۔ اس کے بھو مطری پاکستان آ کر اس نے سرگودھا (مطری پاکستان) میں بی اے ایف کے پبلک اسکول سے بارہویں جماعت پاس کی اور پھر لڑائی میں شامل ہو کر رسالہ سے کیشن حاصل کر لیا۔ کراچی سے جیت طیاروں کا کورس مکمل کرنے کے بعد اسے پشاور بھیج دیا گیا تھا۔ شرقی پاکستان کے حالات ٹھیک نہیں تھے لہذا وہ شرقی پاکستان گیا اور اپنی بیوی اور دو شیرخوار بچوں کے ساتھ واپس آ گیا۔

شرقی پاکستان کے حالات غراب ہونے اور بنگالیوں کی ولاداری پر شک ہونے کی وجہ سے لڑائی کے بنگالی افسروں کی فضا کی خدمات واپس لے لی گئی تھیں اور انہیں زمینی ذمہ داریوں تک محدود کر دیا گیا تھا لہذا مطیع الرحمن کو بھی سرور میں ڈپٹی سیکرٹری آفیسر کر دیا گیا۔

وہ سرور میں میں دوستوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں کہ ایک دوست نے اس کی جسامت کی طرف اشارہ کیا۔
"یار تم فائٹر پائلٹ ہو؟ اپنا قد دیکھو۔ اپنی عمر دیکھو۔"

راشد کے بولنے سے پہلے اس کا دوست صلاح الدین بول اٹھا۔ "یہ مت کہو۔ جب ایم ایم عالم پشاور گئے تھے اس وقت بھی اسے دیکھ کر لوگوں نے یہی کہا تھا۔ یہی آدمی ہے جو پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کرے گا؟ اور پھر تم نے دیکھا کہ اسی عالم نے ایک ساتھ پانچ جہاز گرائے۔ دیکھ لیا منہاس کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔"
اب راشد کی باری تھی۔ اس نے سید پھلا کر کہا۔
"اٹھا ماشا ایسا ہی ہوگا۔"

"ان دنوں وہ دوسری جنگ عظیم میں جاپانی فضا بیہ کے کار: ہوں کے متعلق ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ ایک ایسے دستے کی تاریخ پر مبنی تھی جس کے پائلٹ اپنے ملایہ ۱۰۰ کو دشمن کے بحری جہازوں سے ٹکرا دیتے تھے۔ جیسے جیسے۔۔۔ کتاب پڑھتا جا رہا تھا اس کے غول میں حدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ کئی عمارتیں اتنی بھرپور تھیں کہ وہ انہیں بار بار دہراتا رہا۔ کتاب پر جا بجا اپنے ریمارکس بھی لکھتا رہا۔ یہ کتاب کئی دن سے اس کے زیر مطالعہ تھی۔ آخری باب میں ہوا بازوں کے وہ خطوط شامل تھے جو انہوں نے اپنے گھروالوں کو لکھے تھے۔ وہ ان ہوا بازوں کی جگہ خود کو کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ان کی قربانیاں۔۔۔ سے جاپان نے ایک تباہی مچا لیا ہے۔ میں بھی ایک ہوا باز ہوں۔ میرا بھی ایک وطن ہے۔ وقت آیا تو میں بھی اپنے وطن کی اسی طرح حفاظت کروں گا۔ موت کی پروا کیے بغیر۔ ایک ہوا باز کی ٹھیں ہوتی یہ عہدہ اس کے سامنے تھی۔

"انسان تو فانی ہے۔ موت زندگی ہی کی طرح ایک اتفاق امر ہے۔ کل کی ہم کے لیے مجھے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔"

راشد نے یہ سطرین نشان زد کر دیں۔ گویا یہی اس کا مشن بھی ہے۔

۱۴ اگست کی چھٹی ہوئی تو وہ مقرر آ گیا۔ یہ فتح کا دن تھا۔ اس کے بعد اتوار کی بھی چھٹی تھی۔ یہ دونوں دن اس نے بڑے بھرپور گزارے، بیشتر رشتہ دار اس وقت کراچی میں رہائش پزیر تھے۔ ان سب سے ملاقاتیں ہوئیں۔

وہ کچھ وقت شرقی پاکستان میں گزار کر آیا تھا۔ اس کے خیالات بالکل تبدیل ہو گئے تھے۔ اب اس کی ہمدردیاں بنگالی تلک کی پسندوں کے ساتھ ہو گئی تھیں۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ شامل ہونا چاہتا جن کا مقصد شرقی صوبے کو پاکستان سے الگ کرنا تھا۔ وہ ایک بہترین پائلٹ تھا اور اس ہنر کو کام میں لاتے ہوئے تلک کی پسندوں کی مدد کرنے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ کئی باہنی (بگلر) دیش قائم کرنے کی کوشش کرنے والی فوجی تنظیم نے بھارت میں ایک قیام کیے ہیں۔ اس نے سوچا تھا کہ پاکستان کا طیارہ ان کو بھارت لے جائے۔ اس سے دو فائدے اس کے پیش نظر تھے۔ اگر طیارہ بھارت پہنچ جاتا تو پاکستان سے اپنے مطالبات منوائے جاسکتے تھے اور دوسرے وہ کئی باہنی میں شامل ہو کر پاکستانی فوجیوں سے نہروا زبا ہو سکتا تھا۔ دنیا کو یہ تاثر بھی ملتا کہ پاکستانی فوجی بھی پاکستان کے خلاف ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے ارادے کئی مرتبہ اپنی بیوی پر بھی ظاہر کر چکا تھا اور اب موقع کی تاک میں تھا۔

راشد کو جیٹ لریئر 33 اڑانے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس کی دو تنہا پروازیں کامیاب ہو چکی تھیں۔ اب تیسری پرواز باقی تھی اس کے بعد اسے پاس آؤٹ کر کے پشاور جانا تھا۔

پشاور جانے سے پہلے اس کے گھروالوں نے ہانس بے پر ایک پتک ارجح کی۔ یہ گویا اس کے لیے الوداعی دعوت تھی۔ بہت سے عزیز واقارب اود جانے والے اکٹھے ہوئے۔

پتک کے بعد اس نے اپنے بڑوں کو اپنی فرمائش یاد دلائی۔ وہ ابھی "اس لڑکی" کو بھولا نہیں تھا اور اس کی ابھی ٹھیں اور شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ پائلٹ آفیسر بن چکا تھا۔ یہی اس کا مشن تھا۔ یہی اس کا عہدہ کہ وہ آفیسر بننے کے بعد اپنا گھر بسالے گا۔ گھروالوں کو اس کی پسند کا علم تو تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ لڑکی اب بھی اسے ایسی شدت سے یاد ہے۔ انہیں اس کی فرمائش پر حیرت ہوئی۔ وہ جسے لڑکپن کا جنون سمجھ رہے تھے وہ اس کے بارے میں اس قدر سنجیدہ ہے۔ انہیں بھی اب سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔

اس کے پشاور جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ اسے فائٹر پائلٹ بننا تھا۔ اس لوہے کے جواب میں اس کے بے تکلف دوست اسے چھیڑتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی

"جیسی تمہاری مرضی۔ یہ تمہاری آخری پرواز ہے۔ اس کے بعد تو تمہیں پشاور چلے ہی جانا ہے۔ آج کیا تاریخ ہے 20 اگست۔ خبر کے شروع میں تم پشاور چلے جاؤ گے۔"

"اس آخری فلائٹ کے بعد گھر والوں کے ساتھ خوب وقت گزاروں گا۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک پائلٹ آفیسر وہاں پہنچا۔

"راشد تمہاری باری آگئی ہے۔"

"اچھا یاد طاری۔ یومل آدمی رہ گئی ہے۔ میری دوا ہی تک گرم ہو جائے گی۔ کیا یاد کرو گے یہ آدمی یومل تم ہی لیتا۔"

راشد فلائٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ کئی لڑکے اور بھی تھے جنہیں پرواز پر جانا تھا۔ راشد نے بھی ایک طیارے کی بک اٹھائی اور اس طیارے میں جا بیٹھا۔

مطیع الرحمن دودھ کھڑا دیکھ رہا تھا کہ راشد کس طیارے کی "بک" اٹھاتا ہے۔ جب راشد اپنے طیارے میں بیٹھ چکا تو مطیع الرحمن نے طیارے کا نمبر نوٹ کیا۔ وہ اپنی اولیٰ کار میں بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ جیسی انک لڑیکہ کی طرف تھا۔ ٹریڈر طیارے کو جیسی کلیرنس حاصل کرنے کے بعد جیسی انک لڑیکہ سے گزر کر دن دے پر آنا تھا۔ جیسی انک کا ایک گوشہ جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہاں مطیع الرحمن نے اپنی گاڑی روک دی۔ مطیع الرحمن زبردستی پچھلے کاک پٹ میں داخل ہوا۔ طیارے کے کنٹرول پر قبضہ کیا اور ٹھیک آف کر کے طیارے کا رخ بھارت کی طرف موڑ دیا۔ راشد نے کنٹرول ٹاور کو ریزلٹس پر بیٹھا مہدیا۔

"دن سکس سکس انخوا کیا جا رہا ہے۔"

راشد نے اپنا پیغام بار بار دہرایا۔ طیارے نے ٹھیک آف کیا اور پھر طیارہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"اے لڑکے طیارے کو انڈیا کی طرف جانے دو۔"

مطیع الرحمن فرمایا۔

"یہ خبر ارمی ہے۔ میں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

"تم کنٹرول ٹاور کو پیغام دے چکے ہو۔ تم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔"

"میں اپنے لیے نہیں اپنے وطن کے لیے تم سے لڑوں گا۔"

"اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔"

جب وہ جانے لگا تو خلاف معمول یہ فیصلہ ہوا کہ والد اور والدہ اسے چھوڑنے سے سرور نہیں رکھیں گے۔ شام کے وقت جب روانگی ہونے لگی تو اسے قرآن شریف کے نیچے سے گزرا گیا۔ یہ بھی عجیب بات ہوئی کہ اس نے دونوں پہنوں کو باری باری خدا حافظ کہا۔ وہ اس قسم کی برکت رخصتی کا قائل نہیں تھا۔ دونوں پہنوں کو "توجہ ہول" شکر ہے اس کو اتنے آداب تو آئے۔ "رخسانہ نے فرزند سے کہا۔

سرخ لوبہ نا تیار کھڑی تھی۔ والد اور والدہ اس کے ساتھ بیٹھے۔ وہ خود ڈرائیو کرنے لگا۔ راحت اور انجم 7۔ وقت گھر پہ نہیں تھے۔ گلی میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ انہوں نے بھائی کی بس ایک جھلک دیکھی اور سرخ لوبہ نا گزر کر گئی سرور میں پہنچ کر اس نے می اور ایڈ کو خدا حافظ کہا اور اپنا بیگ اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

20 اگست کو اس کی تیسری سولہ فلائٹ تھی۔

مطیع الرحمن اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ راشد منہاس اکیلی پرواز پر جانے والا ہے تو اسے اپنی منزل قریب نظر آنے لگی۔ راشد منہاس جسمانی طور پر بہت کمزور اور دہلا پتلا ہے۔ اسے آسانی سے قابو کیا جاسکتا ہے۔ ابھی زیر تربیت ہے۔ زیادہ دواؤں پہنچ آتے نہیں ہوں گے۔ میری مہارت کے سامنے بہت جلد بار مان لے گا۔ ابھی تو جوان ہے، کم عمر ہے۔ بہت سی خواہشیں اور ارمان دل میں ہوں گے۔ ان سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرے گا اور زیادہ حراست نہیں کر سکے گا۔ اس نے سوچا اور فیصلہ کر لیا کہ وہ اسی کے جہاز کو اغوا کر کے بھارت لے جائے گا۔ اس سے اچھا شکار اور کوئی نہیں مل سکتا۔ ایک لمحے کو یہ بھی خیال آیا کہ بے چارہ کم سن ہے لیکن دوسرے ہی سے وہ قدرت غالب آگئی جو مغربی پاکستان والوں کی طرف سے اس کے دل میں تھی۔

سولہ فلائٹ کے روانہ ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ راشد کیٹین چلا گیا۔ اس کا دوست طاری تریشی بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ راشد نے کوکا کولا کا آمڈ دیا۔

"یار اس وقت یومل مت بیا۔ پرواز میں وقت ہوگی۔"

طاری نے اس سے کہا۔

"کوئی نہیں۔ مجھے سرکٹ سے باہر نہیں جانا ہے اس لیے کوئی مسئلہ پیش نہیں آئے گا اور زیادہ اونچا اڑنا بھی نہیں ہے۔" راشد نے کہا۔

بندر کے علاقے میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کا نام "جٹ" تھا۔ گاؤں کے باہر درختوں کے جھنڈ تھے اور چاول کے کھیت تھے۔ یہاں کے لوگوں نے بڑی حیرت سے ایک چھوٹے سے طیارے کو دیکھا جو قلابازیاں کھارہا تھا۔ کبھی ایک طرف جھٹکا تھا کبھی دوسری طرف مڑتا تھا کبھی اوپر اٹھتا تھا کبھی نیچے جھٹکا تھا۔ پھر یہ طیارہ آخری دلدھ جھٹکا اور گاؤں سے دو میل باہر بڑی تیزی کے ساتھ پہلے کی طرف آیا اور زمین سے ٹکرا گیا۔

سرور میں کی میس طیارے کی تلاش میں روانہ ہوئیں۔ جٹ کے قریب طیارے کا ٹپل گیا۔ مطیع الرحمن کی لاش بھی مل گئی۔ راشد کا جسم طیارے کی کاک میں پایا گیا۔ مطیع الرحمن کی لاش کا وہاں ملنا اور جیسی انگ کے قریب اس کی گاڑی کا پایا جانا یہ حقیقت واضح کر رہا تھا کہ طیارے میں ہوا کیا لیکن ابھی کچھ کہنا تھا۔ اس وقت تھا۔ تحقیق کے بعد ہی کچھ کہا جاسکتا تھا۔

سرکاری اعلان میں تحقیقات کا خلاصہ پیش کیا گیا۔ "اس نوٹ کا ایک انٹرکنٹر پائلٹ زبردستی چھٹے کاک ہٹ میں داخل ہوا۔ طیارے کے کنٹرول پر قبضہ کیا اور ٹھک آف کر کے طیارے کا رخ بھارت کی طرف موڑ دیا۔ پاکستانی علاقے کے صرف 40 میل رہ جانے پر منہاس کے سامنے طیارے کو بھارت میں داخل ہونے سے روکنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ پھر کسی ناگیاہٹ کے اور پاک فضائیہ کی اہل ترین روایات کا پاس رکھتے ہوئے راشد منہاس نے اپنے طیارے کا کنٹرول واپس لینے کی کوشش کی مگر اپنے انٹرکنٹر کی برتر صلاحیت کی وجہ سے اسے ناممکن پانے پر بھارتی سرحد سے 32 میل دور ایک مقام پر زمین سے ٹکرا دیا۔ ایسا کرنے میں پائلٹ آفیسر منہاس نے جانتے بوجھے ہوئے پاکستان اور جس فوج سے اس کا تعلق تھا اس کی آپر کی خاطر عظیم ترین قربانی پیش کر دی۔ فرض کی پکار سے بڑھ کر اس شہادت کے کارنامے پر صدر پاکستان پائلٹ آفیسر راشد منہاس کو "ان حیدر" پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆

جس روز راشد کی لائٹ تھی اور اس کا طیارہ قاعب ہوا تھا، مجید صاحب دوپہر کے وقت سرور میں آئے ہوئے تھے تاکہ جب وہ واپس آئے تو اسے لے کر گھر چلے جائیں۔ اس وقت تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ راشد پر کیا حثیت

"مجھ سے جو کچھ ہر سکا میں کروں گا۔"

"بے وقوفی مت کرو۔ تم انڈیا کی قتل میں دو تین ماہ سے زیادہ نہیں رہو گے لیکن اگر تم نے نادانی کی تو اپنی جان سے ہاؤ گے۔"

"مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہوگی۔"

کاک ہٹ کے دونوں حصوں کے درمیان ایک دیوار تھی اور ان کا رابطہ صرف باؤتھ ہیں اور وینڈ فون کے ذریعے ممکن تھا۔ راشد کے دل میں کئی خیال آئے اور چلے گئے۔ اسے گھر والوں کا خیال آیا۔ وہ لڑکی یا دالی۔ چھوٹے بھائیوں کا خیال آیا۔ اس نے ہر خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کے سامنے صرف پاکستان تھا۔ اس بنگالی کے نہ جانے کیا حزام تھا۔ طیارے کو انڈیا لے جانے کے بعد نہ جانے وہ کس قسم کی شرائط پاکستان کے سامنے رکھے۔ پاکستان کو بلیک میل کرے، میں اسے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ اس نے مطیع الرحمن کو ایک مرحہ پھر سمجھانے کی کوشش کی اور تاکام ہو کر اپنے طیارے کا کنٹرول واپس لینے کی کوشش کرنے لگا لیکن مطیع الرحمن کی برتر صلاحیت اور تجربے کی وجہ سے وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔

اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ طیارے کو انڈیا کی سرحد میں ہرگز داخل نہ ہونے دے۔ پاکستانی علاقے ہی میں اسے زمین سے ٹکرا دے۔ اس کی موت جیٹنی تھی مگر وہ اپنے دشمن کو بھی تو مار دے گا اس نے سوچا۔ موت کو سامنے دیکھ کر اسے گلے لگا لینا بڑے حوصلے کی بات ہوتی۔ وہ صرف بیس سال کا تھا۔ اس عمر کا بڑا حصہ ٹریننگ میں گزر گیا تھا۔ جو درخت اس نے لگایا تھا اس کے پھل کالنے کا وقت اب آیا تھا۔ وہ آسانی سے سر ہٹ کر سکتا تھا۔ انڈیا میں وہ فوجی قیدی ہوتا اور واپس آسکتا تھا۔ قتل تو یہی کہتی ہوگی لیکن مشق کا نصاب کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کی قتل پر وطن کا مشق غالب آ گیا۔ وہ مشق جو اس کی رگ رگ میں سایا ہوا تھا۔ اس کی حدت خون میں بڑھ رہی تھی۔ وطن کی آپر کا سوال تھا۔ اس نے سوچا میں تو واپس آسکتا ہوں لیکن وطن کی عزت واپس نہیں آسکتی۔

بھارت کی سرحد صرف 32 میل دور رہ گئی تھی۔ طیارے کے لیے یہ فاصلہ کچھ نہیں ہوتا۔

دریائے سندھ اور پھر عرب کے سنگم کے قریب شاہ

مکئی ہے۔ مجید صاحب سے کہا گیا کہ راشد کی پردازی ہوئی ہے۔ آپ اس وقت گھر چلے جائیں۔ وہ جیسے ہی واپس آئے گا اسے گھر بھیج دیا جائے گا۔ مجید صاحب مطمئن ہو کر واپس آ گئے۔

..... دوپہر گزر گئی۔ شام ہوئی اور بھر رات آ گئی۔ راشد اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

"راشد اب تک واپس کیوں نہیں آیا۔ پردازی کتنی لمبی ہو گئی۔" رشیدہ بیگم (راشد کی والدہ) نے کہا۔

"بچی میں سوچ رہا ہوں۔ وہ اتنا غیر ذمہ دار نہیں۔ اسے گھر آ جانا چاہیے تھا۔"

"میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔ آپ اس کے اسکوادرن لیڈر سے فون کر کے معلوم تو کریں۔ کہیں وہ بیمار تو نہیں ہو گیا۔"

"الگزمند ہونے کی بات نہیں۔ کل ہفتہ ہے۔ اس نے سوچا ہوگا ویک اینڈ پر گھر جائے گا۔ انشاء اللہ کل دوپہر کے کھانے تک وہ گھر آ جائے گا۔"

رشیدہ بیگم اس وقت تو خاموش ہو گئیں لیکن ماں جیسی۔ وہ وہ کر رہی تھی کہ غیال آ رہا تھا۔ پوری رات بے چینی میں گزری۔ صبح ہوئی۔ مجید صاحب نے بیگم سے پوچھا۔

"راشد دوپہر کا کھانا گھر آ کر کھائے گا۔ آپ آج کیا بکوار ہی ہیں۔"

"میں نے ملازمہ سے پوچھا تھا۔ وہ کر لے گوشت پکا رہی ہے۔"

"تم نے یہ کیا بکوار لیا۔ راشد کو کر لے گوشت بالکل پسند نہیں۔ کچھ اور بکواؤ۔"

"اسے تو پلاؤ اور آلو گوشت پسند ہے۔ میں ملازمہ سے کہتی ہوں وہ ان چیزوں کا اہتمام کرے۔"

کھانا وقت سے پہلے ہی تیار ہو گیا۔ بس اب راشد کا انتظار تھا کہ وہ آئے اور کھانا شروع کیا جائے۔ کھانے کا

وقت نکلا جا رہا تھا۔ اس دوران میں مجید صاحب سرور میں پرکٹی بار فون کر چکے تھے لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہیں آ رہا تھا۔ اس صورت حال نے سب کو لگزمند کر دیا تھا۔

"میں خود ہانا ہوں اور شریر کو گھڑے کر آ جاؤں۔"

پہلی کا دن بھی دوستوں میں گزار رہے ہیں صاحبزادے۔ وہ ابھی جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔

یہ اسکوادرن لیڈر کا فون تھا۔
"آپ گھر پر لگنا۔"
"جی ہاں۔"

"گھر پر ہی رہیے۔ میں آ رہا ہوں راشد کے بارے میں کوئی بات کرنی ہے۔"

یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ مجید صاحب نے اس وقت بھی سوچا تھا کہ راشد سے ڈسچارج کی کوئی فطرتی ہو گئی ہے۔ اسی لیے اسے گھر بھی نہیں بھیجا اور اسکوادرن لیڈر خود اس کی اطلاع دینے میرے پاس آ رہا ہے۔

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ صرف اسکوادرن لیڈر ہی نہیں۔ اس کے ساتھ چند دوسرے افسر بھی جنہاں دلائف گئے۔ انہوں نے یہ خبر سنائی کہ راشد اب بھی واپس نہیں آئے گا۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ آسانی سے من لی جاتی۔ اسکوادرن لیڈر کی زبان سے الفاظ اور بھی نہیں ہوئے تھے کہ مجید صاحب کے اصحاب جواب دے گئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"ہم تو یہ سمجھے تھے کہ اس سے ڈسچارج کی کوئی فطرتی ہو گئی ہے۔"

"فطرتی کیسی۔ اس نے تو وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ تاریخ اسے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ آپ کو ایسے بیٹے پر فخر ہونا چاہیے۔"

"کیا میں تفصیلات دریافت کر سکتا ہوں۔"

"میں اس وقت صرف اتنا بتا سکتا ہوں جتنا بتانے کی مجھے اجازت ہے یا اب تک جتنا معلوم ہو سکا ہے۔ ایک سینئر افسر طیارہ ہائی جیک کرنا چاہتا تھا مگر ماسے میں طیارہ کریش ہو گیا۔ باقی تفصیلات تحقیق کے بعد سامنے آئیں گی۔"

"میرے بچے کی لاش؟"

"تھوڑی دیر میں تائید آ جائے گا۔ لاش مل گئی تھی۔"

اتنی دیر میں منہاں دلا کے درو دیوار سوگاری کی چادر بوڑھ چکے تھے۔ سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ کیا حادثہ گزر گیا ہے۔ اس کے بھائی اداسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ بہنوں کا برا حال تھا۔ رشیدہ بیگم ہسکت تھیں۔

"کیا میں اپنے راشد کا چہرہ دیکھ سکوں گی؟"

اسکوادرن لیڈر سوچ میں پڑ گیا۔

"عام طور پر ایسے واقعات میں ہلاک ہونے والے

زیادہ تفصیلات ابھی آپ کو نہیں بتا سکتے لیکن جب وہ آپ کو بتاتی جاگیا گی تو آپ اپنے بیٹے کے کارنامے پر غور کریں گی۔

راشد منہاس کے لیے ابتدا میں سارے برات تجویز ہوا تھا لیکن 29 اگست کو ریڈیو ٹیلی ویژن پر اعلان ہوا کہ صدر بینک خان نے شہادت کا سب سے بڑا اعزاز نشان حیدر اس کی نذر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

دوسرے دن کے اخبارات ان خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ تفصیلات سامنے آئیں تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ منہاس نے لٹا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور ملک کو کتنی بڑی رسوائی۔ چاہا ہے۔ عوام میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ منہاس در میں تعزیت کرنے والوں کا تاجا بندھ گیا۔ اب راشد کوئی خیر و خیر تھا۔ طیارے کا گرنے کا حادثہ نہیں تھا۔ لوگ طرح طرح سے اپنی عقیدت کا اظہار کر رہے تھے۔ دن بھر انہوں نے اپنے لہو سے ایک خط مجید صاحب کے نام لکھا۔

”انشاء اللہ پاکستان کا ہر شہری راشد منہاس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دے گا۔ اگر ہمارے ملک پر کسی نے جہنمی کی نظر اٹھائی ہم اس کو نیست و نابود کر دیں گے۔ انشاء اللہ۔“

اس کی قربانی پر شہر نے نذرانہ ہائے عقیدت پیش کیے

دوستو آج کہہ نام و نسب ہی نہیں
عیش و عشرت یہ زرو مال پدم ہوتی ہیں
آؤ ہم جشن منائیں کہ ہماری ماں کی
اب بھی راشد سے سپوتوں کو جنم دیتی ہیں (رحمان کیانی)

اے مری ملت کے شہرے مثال
تیری قربانی رہے گی لازوال
کام تیرا بے نیاز صبح و شام
نام تیرا اور اے ماہد سال (صہبا اختر)
اخباروں نے کالم لکھے۔ راشد منہاس پاکستان سے
نکل ہو کر تاریخ پاکستان کے قصہ دوام میں داخل ہو گیا۔
اس عمر میں نائن حیدر پانے والا پہلا سپاہی۔

ماخذ: راشد منہاس
از..... حرم علی شعیق

اگست 2014ء

پائلٹس کی لاشیں دکھائی نہیں جاتیں۔ آپ کے لیے خصوصی اجازت کا انتظام کیا جاسکتا ہے لیکن میرا مشورہ پھر بھی یہی ہوگا کہ آپ نہ دیکھیں۔ اس نوعیت کے حادثوں میں لاش اور اس کا چہرہ اتنا بدل جاتا ہے کہ آپ اس کی تاب نہ لائیں گی۔ آپ تو بس یہ سوچیں کہ آپ ایک شہید کی والدہ ہیں اور یہ آپ کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔“

رشید بیگم نے آنسوؤں کی چمکن سے مجید صاحب کی طرف دیکھا۔ کیا یہ آفیسر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کیا ہمیں اپنے بیٹے کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہیے۔

”نہیں۔ میں اپنے بیٹے کا آخری دیدار نہیں کروں گی۔ میرا بچہ ہر وقت ہنستا مسکراتا رہتا تھا۔ میں اس کے اسی چہرے کی یاد کو اپنی آنکھوں میں تازہ رکھوں گی۔“ ان کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

عزیز واقار ب سے کمر بھر گیا۔ ”وہ لڑکی“ بھی آتی ہوئی تھی اور پائی پائی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رشید بیگم اپنے بیٹے کی موت کا سن کر اتنا نہیں روئی ہوں گی جتنا اسے گلے لگا کر رو گیا۔ یہ راشد کی پسند تھی جسے وہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد تابوت آ گیا۔ دیکھنے کو تھا کیا۔ بس ایک رسم تھی جو لدا کر دی گئی تھی۔ یہ بتانا تھا کہ ایک ایجنڈ پر راشد کھرا گیا ہے۔ اب دور جا رہا ہے۔ کبھی نہ آنے کے لیے۔

منہاس وہاں میں کھرام چلا ہوا تھا۔ مجید صاحب منجیل گئے تھے۔ ایک ایک کو تسلیاں دے رہے تھے۔ شہید کی میت پر رو دیا نہیں کرتے۔ تابوت دکھایا تو تسلیاں پھر بے کار چلی گئیں۔

اس شہید کو کوئی قبرستان میں پورے اعزاز کے ساتھ دفن کروایا گیا۔

جس وقت تابوت قبر میں اتارا جا رہا تھا رشید بیگم اچانک ضبط ہو گئیں۔

”بیٹا میں نے تمہیں نصاب میں بھیجا تھا کہ تم نے کہا تھا دشمن کے جہاز گراؤ گے۔ یہ تم نے اچھا ہی جہاز کیوں گرا دیا۔“

ایک مرتبہ پھر اسکا اردن لیڈر کے بڑھا۔
”آپ کے بیٹے نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا ہے اور اس کی موت وطن کی خاطر واقع ہوئی ہے۔ اس سے

منہاس مصر گزرت

واخان خان

مختار آزاد

پھرنا، اور پھرتے رہنا، وادی وادی چکراتے رہنا ہی پنجابوں کا مقدر ہے، خانہ بدوشوں کی زندگی ہے۔ اس علاقے سے اس علاقے تک محو سفر ایک خانہ بدوش قبیلے کے بارے میں چشم کشا تحریر جسے بڑی تحقیق کے بعد ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ ایسی تحریریں صرف سرگزشت کا خاصہ ہیں۔



برف پوش پہاڑوں کے دامن میں پھرنے والے ایک قبیلے کا تذکرہ

خان کا خواب ایک کار خریدنا ہے۔ اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا پتا پورا ہوا تو بھی کار چلانے کے واسطے وہاں سڑک نہیں ہے۔ اُس کے والد علاقے کے پچھلے خان تھے جو ساری عمر وہاں سڑک کی تعمیر کے لیے کوششیں کرتے رہے۔ تبا خان بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہی سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ مجھے بھی گودلی سرکار کا کوئی السر سمجھ کر سڑک کی تعمیر پر اس طرح قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جیسے میں مان گیا تو اگلے ہی لمحے وہاں سڑک موجود

ہوگی۔

"ایک سڑک ہی اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہاں بسنے والوں کے علاج و معالجہ کے لیے ڈاکٹر اور دوا میں پہنچائی جاسکیں۔ یہاں پیادوں سے لوگ مرتے چلے آ رہے ہیں۔ آج نہیں، بعد میں سے یہ سلسلہ جاری ہے مگر اب دنیا بدل چکی لیکن پھر بھی لوگ علاج و معالجہ کے بنا ہی مر رہے ہیں۔ یہ مرنے سے بچنا سکتے ہیں لیکن نہیں جانتے ہو کیوں۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر خود ہی جواب دیا۔ "اس لیے کہ یہاں سڑک نہیں ہے۔ ڈاکٹر اور دوا انہیں اس علاقے میں پہنچ ہی نہیں پاتے۔" یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "ایک سڑک یہاں کے پیادوں کو مرنے سے بچا سکتی ہے، صرف ایک سڑک۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔

"صرف پیادوں کی ہی بات نہیں۔" اس نے جذباتی لہجے میں دوبارہ بات شروع کی۔ "سڑک نہ ہونے کی وجہ سے ہی تو استاد یہاں کا رخ نہیں کرتے، بچے لگن پڑھتے، ان چڑھ ہیں اور سڑک دستی تو عادی آنے والی تسلیں بھی ان پڑھ اور یہ علاقہ اسکول کے باقی رہے گا۔" اس نے توقف کر کے بخور میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ "ہات صرف صحت اور تعلیم تک ہی محدود نہیں، سڑک نہ ہونے کے سبب یہاں نہ تو سوداگر آتے ہیں اور نہ سیاح، حتیٰ کہ بھری فردوس بھی یہاں کا رخ نہیں کرتے۔۔۔۔۔ ہے نا یہ عادی زندگیوں کا البیس؟"

انگلستان کے انتہائی دور دراز پہاڑی علاقے کے ان کرفز خانہ بدوشوں کو بھی دوسرے انسانوں کی طرح ترقی کے فرائض سے استفادے کا پورا پورا حق ہے اور تو جو ان خان اس سڑک کی تعمیر کے حق میں دلائل دے رہا تھا جس پر وہ اپنے خوابوں کی کارروائی کرے۔

"تو یہ ہے ہمارا البیس۔۔۔ ایک سڑک تو بہت سے مسئلے حل کر سکتی ہے۔" اس نے مجھے سے منہ دوسری طرف کر لیا۔

ماحول خاصا رنجیدہ ہو چکا تھا، سب خاموش تھے۔ میں نے موضوع بدلنا چاہا۔ "ویسے خان۔۔۔ تمہیں کس قسم کی کار چاہیے؟"

پتہ نہ کر اس کی اوپر کوئل کھاتی موچوں میں ابھی سی قرقر رہا تھا، قاتلہ وہ موچوں تلے سکر رہا تھا۔ "ویسے، تم مجھے کس قسم کی کار دینا چاہتے ہو؟" اس نے سوال کے

جواب میں سوال لوٹا دیا تھا۔

میں اسے کسی بھی قسم کی کار نہیں دینے والا تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہاں کوئی سڑک نہیں اور سفر کے لیے کار کی بجائے پاک ضروری ہے اور یہ سہولت صرف اسی کو نہیں، وہاں کے تمام کرفز خانہ بدوشوں کو حاصل تھی اور اس وقت ہم انہی کے پاس کھڑے تھے۔ ایک پاک کی ٹیکل کا سراخانہ کے ہاتھ میں تھا، دوسرے کے برابر کھڑے تھے۔ وہ رو آگئی کا دن تھا۔ خان کا جو بھی سامان تھا، اسے باندھ کر، پاک کی پشت پر لادنا چاہا تھا۔ خان کے ہاں دستار میں پاک اور بھیلروں کے علاوہ، چند سلور کی کیتیاں، ایک اسٹو، کچھ مگ، ایک کار بیٹری، دو سولر پنل، جینا لیس کپل اور ایک چڑے سے بنا اور لوہے سے گندہ ناخیر شامل تھا۔ یہ خیمے تھے کہلاتا ہے اور وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں میں اس کا استعمال عام ہے۔ یہ گرائی چراگاہ کی طرف نقل مکانی کا وقت تھا۔ اس کے بھائی اور کچھ دیگر ساتھی سامان ہانہ منے اور لادنے میں مدد کر رہے تھے۔

چلتا ہی خانہ بدوشوں کا کام ہے لیکن جہاں تک افغانستان کے کرفز خانہ بدوشوں کا تعلق ہے تو وہ سال میں چار بار نقل مکانی کرتے ہیں لیکن اس کا زیادہ تر دہرہ دار موکی حالات اور بھیلر بکریوں پر مشتمل گائے کے لیے چراگاہوں میں چارے کی فراوانی پر ہوتا ہے۔

افغان کرفز خانہ بدوش اپنے علاقے کو 'ہام دنیا' کے نام سے پکارتے ہیں جس کا مطلب ہے 'دنیا کی سمیت'۔ بلاشبہ یہ نام سننے میں نہایت دھڑکیب اور شاعرانہ ہے لیکن 'ہام دنیا' کا قدرتی ماحول نہایت سخت اور غیر شاعرانہ جبکہ وہاں انسان کی ماحولیت جو کسم سے بھری ہے۔

کرفزیوں کا 'ہام دنیا' بدلتی دنیا میں 'واخان' کی پٹیا کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ دو بہت بڑے اور طویل گلیشیروں کے تل سے جنم لینے والی وادیوں کی سرزمین پر مشتمل ہے۔ یہ گلیشیر وسط ایشیا سے تعلق رکھنے والے پہاڑی سلسلے پامیر میں واقع ہیں اور اس علاقے کی سطح سمندر سے بلندی چودہ ہزار فٹ کے اریب قریب ہے۔ یہاں چلنے والی انتہائی سرد ترین ہوا رگوں میں بوجھا رہی ہے اور زمین ایسی کہ جس پر فصل کاشت کرنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتے۔ سال کے تین سو بیسٹھ میں سے تین سو چالیس دن، یہاں کا درجہ حرارت مستقل طور پر نقطہ انجماد سے نیچے رہتا ہے۔ کچھ نہیں، ہریالی اور جنگل کا تو تصور ہی نہیں۔ بہت سے کرفز تو ایسے ہیں

ماضی حال میں بھی رندہ ہے۔ بالادستی کے لیے مالی طاقتوں کی تکمیل سب کی ختم ہو چکی۔ افغانستان بیسویں صدی کی آخری دہائیوں سے لے کر اکیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں تک، سعودیت قسط سے شروع ہونے والے عدم استحکام اور خانہ جنگی کا شکار ہے اور علم نہیں کہ یہ کب تک جاری رہے مگر الگ تنگ واضح 'افغان' و 'افغان' کی پٹی ان تمام تر اثرات سے کہیں دور ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو واقعی گرفتاریوں کے لیے افغانستان 'غیر ملک' ہے۔

تنگ اور پُر پیچ پہاڑی وہ گزراؤں سے، یہاں کی قریب ترین سڑک بھی تقریباً تین دن کی پیدل مسافت پر ہے۔ ان راستوں سے ہوتے ہوئے وہاں تک پہنچنا کسی طور خطرے سے خالی نہیں۔ پہاڑی راستوں پر ایک طرف بلند و بالا پہاڑ تو دوسری طرف گہری کھائیاں اور تنگ درے ہیں۔ اگر چلنے والے پاؤں اور سارا گنگا یا تو کھائی میں گرنا چاہیے اور زندگی نہ بچنے کی کوئی امید نہیں ماسوائے اللہ کے!

یہ وہی سڑک ہے جسے توسیع دلو کر خان اس علاقے تک لانے کی کوشش کر رہا ہے جہاں یہ آباد ہیں۔ اگرچہ موسم کے ساتھ ہجرت اب بھی اس قبیلے کا مقدر ہے لیکن وہ جہاں بھی جائیں، لوٹتے نہیں ہیں۔ اب ہن کے قدم بھی زمین پکڑنے لگی ہے۔ شاید اسی لیے سڑک بھی اس کے لیے اتنی زیادہ اہم ہو چکی ہے۔

سڑک میں توسیع کی جستجو خن کو باپ سے تر کے میں ملنے والی میراث ہے۔ موجودہ خان سے پہلے اس کا والد قبیلے کا خان تھا۔ اس نے بھی سڑک میں توسیع کرانے کے لیے بہت کوشش کی۔ وہ دنیا سے اٹھ چکا ہے۔ مگر جستجو اور کوششیں، دونوں جاری ہیں۔ خان کے مرنے سے امید نے دم نہیں توڑا۔ حالات دیکھ کر تو یہی گتا ہے کہ موجودہ خان بھی یہ میراث اپنے بڑے بچے اور اس قبیلے کے مستقبل کے خان کو سونپ کر ہی دنیا سے سکندر کی طرح خالی ہاتھ ہی لوہے پر جائے گا۔ 'فانج سڑک' ہونا نہ جانے کس خان کا مقدر ہے۔

خان کے گاؤں سے قریب ترین قصبہ بھی سڑک سے حرید ایک روز کی دشوار گزار پیدل مسافت پر ہے۔ اس قصبے کی اہمیت، وہاں کا ایک چھوٹا سا اسپتال اور چند دکانیں ہیں۔ صحت عائد کی سہولتوں تک رسائی سے انتہائی دور، نہایت اگلی تھک سڑک میں پرہٹے والے گرفتار خانہ بدوشوں میں اصوات کی شرح بہت زیادہ ہے۔ نہ ڈاکٹر نہ اسپتال،

جنہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی درخت کو دیکھا تک نہیں۔

افغانستان کے انتہائی شمال مشرق میں واقع پربتوان، سرترین اور خوف زدہ کردہ والی سرزمین دو بڑی گلخیز پانی سلسلے کے درمیان چمنے کی مانند ہے۔ اسی لیے شاید پٹی اس کے نام کا حصہ بن۔

'واخان کی پٹی'..... اس خطے کا یہ نام انیسویں صدی کے دور میں روس اور برطانوی سلطنتوں کے درمیان وسط ایشیا پر تسلط کے لیے لڑی گئی اُن جنگوں کی دین ہے، جسے نام نہاد کریٹ گیم کہا گیا تھا۔ اُس وقت کی دنیا کی ان دو عظیم طاقتوں نے، 1873ء سے لے کر 1895ء کے درمیان طے شدہ معاہدوں کے ایک سلسلے کے نتیجے میں اس وہ گزر کو بطور 'غیر زون' درجہ دیا۔

ان معاہدوں کے ذریعے دراصل تاج، برطانیہ، روس کو ہندوستانی سرحدوں سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس سے قبل، ماضی میں واخان کی یہ پٹی بھی اُس شاہراہ ریشم یا سنک روٹ کا حصہ تھی جو اُسے چین سے ملاتا تھا جبکہ مغربی قسطنطنیہ پر یہ فوجوں، سیاسی مبلغین اور بہت سی جہاز افغانی کھوج کرنے والے ہم جہازوں کا راستہ تھی۔ سن بارہ سو کے اواخر میں تاریخ کے معروف ہم جو مار کو پھولنے بھی واخان کی پٹی عبور کی تھی لیکن 1917ء میں روس کے کیونسٹ اور 1949ء میں چین کے سرخ انقلاب کے بعد سے یہ سرحد اور راستہ تقریباً متروک ہو چکا ہے۔

بیسویں صدی ختم ہونے سے بہت پہلے دنیا سے لو آباد پانی دور گزر چکا، جہیز کا ایک باب مکمل ہو کر بند ہوا اور اب نیا دور ہے۔ آج کی دنیا میں واخان کی پٹی کی سرحدیں شمال میں تاجکستان، جنوب میں پاکستان اور مشرق میں چین سے متصل ہیں۔ اس سرزمین کا بلحاوی حصہ افغانستان ہے جو پٹی کے مغرب میں واقع ہے لیکن اس سے کہیں دور گھسوتا ہوا ہے۔ لگ بھگ دو سو میل طویل اس افغان پٹی کو بعض گرفتاری پٹی گنگو میں بطور حوالہ 'غیر ملک' قرار دیتے ہیں۔

آج کے واخان کی یہ پٹی ماضی کی طرح شکار گریز پُرش اور دشوار گزار پہاڑوں، بیا پالوں اور گلخیزوں کی ہمسائی وہ سرزمین ہے جو تاریخ میں سیاست اور جہاز افغانی تسلط کے تنازعات کے بوجھ سے وہی لیکن اس کا ماحولیاتی

صرف چند دوائیں ان کی رسائی میں ہیں۔ جس سخت اور شدید موسمی اثرات میں یہ گرفتاری زندہ ہیں، وہاں بڑی آسانی سے معمولی نزلہ اور سردی بھی وہاں کی صورت کھیل جاتا ہے۔ یہاں کے حالات دیکھتے ہوئے اس پر کوئی شک نہیں کر سکتے کہ اکثر یہ بھی اموات کی وجہ بن جاتی ہے۔

واخان کی پٹی کے گرفتاریوں میں بچوں کی اموات کی شرح، شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ نومولود بچوں کی بمشکل نصف تعداد ہی پانچ سال کی عمر تک پہنچ پاتی ہے۔ پانچ، چھ یا پھر سات بچوں کا شیر خوار ہی پاکستان میں مرجانا گرفتاری والدین کے لیے غیر معمولی بات نہیں۔ زرگی کے دوران میں ماؤں کی اموات کی شرح خطرے کی گھنٹی سے کسی طور کم نہیں۔

میں ایک جوڑے ہلچہ خان اور عبدالغالب سے ملا، جن کے گیارہ بچے تھے۔ عبدالغالب کا کہنا تھا کہ ہر سال اس کا ایک بچہ مرجاتا ہے۔ اس کے بچے زیادہ تر شیر خوار ہی یا کھنوں کے بل چلنے کی عمر میں فوت ہوئے۔ یہ بچے جن معمولی بیماریوں کا شکار ہو کر دنیا سے جانے پر مجبور ہوئے، ان کا علاج نہایت آسانی سے ممکن تھا۔ ہلچہ کا کہنا تھا کہ بچوں کی موت نے انہیں جیتے جی مار دیا ہے۔ ان کا صرف ایک بیٹا پانچ سال کی عمر تک جیا اور اس کے بعد وہ بھی قبرستان میں جا سوا۔ بچوں کی موت کا غم بھلانے اور لپٹاؤ دکھ بھلانے کے چکر میں یہاں بچی المیوں کے عادی ہو چکے۔ غیبات، پکھوس المیوں کی با آسانی دستیابی کے سبب گرفتاریوں میں المیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

گرفتاریوں کی زندگی بہت محدود ہے۔ زیادہ تر کے لیے پوری دنیا صرف وہی ہے، جہاں تک ان کے قدم پہنچے ہوں مگر خان کی بات دوسری ہے۔ اس نے واخان کی اس پٹی کے باہر کی دنیا بھی کسی حد تک دیکھی ہے۔ وہ دوبار اس علاقے سے باہر کا سفر کر چکا۔ وہ کاروہاری موافقوں کی تلاش میں گرفتاری سرزمین پر آنے والے تاجروں سے بھی ملتا رہا ہے۔ یہ وہ تاجر ہیں جو زیمبر، المیوں، دھوپ کے جھٹے، جوتے، کپڑے، کالین اور اب موہاگل فون تک بچنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔ واخان سرزمین پر سر اٹھا کر کھڑے بڑے بڑے بریلے پھاڑوں کو موہاگل فون کے کمزور سیگنل سنکڑا دیکر نہیں کر پاتے لیکن اس کے باوجود یہاں موہاگل فون فروخت ہوتے ہیں اور وہ بھی اچھی خاصی تعداد میں۔ یہاں موہاگل فون سے بات نہ کی جاسکے تو کوئی

بات نہیں۔ موسیقی سننے اور قصہ گوئی کے لیے ٹی سی ڈی اور کمرے والے موہاگل فون اچھی خاصی تعداد میں بک جاتے ہیں۔ یہاں موہاگل فون کا صرف یہی استعمال ہے۔ خان کو اس تکلیف دہ حقیقت کا احترام ہے کہ دنیا روز بروز اس کے لوگوں کو پیچھے، بہت پیچھے چھوڑتی چلی جا رہی ہے۔ تیزی سے بڑھتی آبادی والی دنیا میں، تیزی سے سخت گرفتاری خانہ بدوشوں کی کل تعداد گیارہ سوہ کی ہے اور ان کا تعلیمی نظام نہایت ہی بنیادی اور سینہ بہ سینہ چلنے والے علوم پر مشتمل ہے۔ خود خان بھی لکھنے اور چمکنے کی صلاحیت سے عادی ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ اب دنیا بھر میں ہر شخص نواری طور پر صحت کی سہولتوں تک رسائی رکھتا ہے اور اس کا بنیادی سبب، خان کے مطابق، کار اور کمپیوٹر کے ناتے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگوں کا باہم منسلک ہو جانا ہے۔

وہ اس حقیقت سے بھی ناخبر ہے کہ اب صحت کی سہولتیں عام ہونے کے باعث دنیا بھر میں عام سی بیماریوں سے اتنے زیادہ بچے نہیں اور نہیں مرتے جتنے گرفتاری خانہ بدوشوں کے۔ "اگر ہمیں بھی صحت کی سہولتیں ہیں تو ہمارا قبیلہ بھی بہت بڑا ہو گا۔ اب تو ہم معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔" اس روز وہ نہایت حسرت بھرے لہجے میں مجھ سے کہہ رہا تھا لیکن میرے پاس ہنسوس کرنے اور خاموش رہنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔

گرفتاریوں کے اس غلطے میں بہت کچھ ہیما ہے جسے قبیلے کے اس نوجوان رہنما کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ خان کی عمر تیس برس ہے لیکن وہ اپنے لوگوں کی حالت اور ان کے مسائل پر کڑھتا رہتا ہے۔ وہ ترقی کا خواہشمند ہے مگر اس دشوار گزار سرزمین تک ترقی کا پہنچنا بھی کم دشوار بات نہیں۔ اس کی ذات اپنے خواہیوں کی تعبیر نہ ملنے کے ہنسوس سے مالا مال ہے۔ واقعی، کم عمری میں ہی نوجوان سردار بہت کچھ جان چکا ہے۔

پانچ فٹ سات انچ لمبا خان مضبوط کسرتی جسم کا مالک ہے۔ اس کی آنکھیں گہری گھٹکی، ہال سیاہ اور ہنکریا لے، رنگت زرد مالک ہے۔ اس کے ہاتھ مضبوط لیکن سخت صحت کے باعث کھردرے ہوئے۔ جب وہ مصافحہ کرتا ہے تو جوش اور صحت سے ان ہاتھوں کی گرفت اور سخت ہو جاتی ہے۔

خان کی سرزمین پر حمل کرنا کسی تہوار سے کم اہمیت کا

حاصل نہیں۔ وہ ہر وقت فری موٹی جیکٹ، موٹے کپڑے کی جھون لور دستانے پہنے دکھتا ہے ماسوائے اپنے نرٹ کے۔ خیسے کے اندر ہر وقت دیکھتے چھپے کی حرارت سے موسم اتنا خوشگوار ہوتا ہے کہ فری جیکٹ اور دستانوں کے بغیر بھی انسان کو کچھ خاص ٹھنڈ محسوس نہیں ہوتی۔ اندر بیٹھ کر یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ باہر کا موسم نقطہ نما دہی نہیں بلکہ اس سے ڈیڑھ دو درجن ڈگری نیچے ہوگا۔

خان اپنے لوگوں کے حالات لور انہیں درپیش مسائل کے باعث اکثر افسردہ رہتا ہے لیکن بڑا ہی زندہ دل بندہ ہے۔ جب وہ لطیفے سناتے پر آئے تو سناتا ہی چلا جاتا ہے۔ خود بھی ہنستا ہے دوسروں کو بھی ہنساتا ہے۔ کبھی اس وقت وہ سارے فلوں سے دور رہتا تھا کہ سڑک اور کار، دونوں کے خیال سے بھی بہت دور بچتی چکا ہوتا ہے۔

خان کا اصل نام حاجی روشن خان ہے۔ یہاں حاجی سے مراد وہی ہے جو برصغیر میں اس نقطہ سے لی جاتی ہے اور نسبت منہ سے سچ کر کے لیتے کی ہے۔ خان کی بیوی کا نام طوٹی لگ ہے اور وہ چار بیٹیوں کے والدین ہیں۔ لقمی اعتبار سے کفرزئی مسلمان ہیں۔ سن دو ہزار آٹھ میں روشن خان نے اپنے والد کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی تھی۔ وہ اپنے چودہ بچوں کے ساتھ سفر مبارک پر گئے تھے۔ ہر وہی دنیا سے خان کے دایلمے کا یہ سب سے پہلا موقع اور اس کی زندگی کا سب سے طویل سفر تھا۔

دوسری بار اس نے گزشتہ موسم بہار میں واخان کی سرزمین سے باہر قدم رکھا تھا۔ اس سفر میں خان کی منزل کامل تھی، جہاں اس نے ایک وزیم کے علاوہ افغان صدر حامد کرزئی سے بھی ملاقات کی تھی۔ افغان صدر سے ملاقات میں خان کی درخواست تھی کہ اس کے علاقے میں ایک اسپتال، چند اسکول اور یقیناً ایک سڑک تعمیر کی جائے۔ سڑک کو وہ بھلا کیسے بھلا سکتا تھا۔ کار اس کا خواب ہے اور سڑک اس کے پورا ہونے کی بنیادی ضرورت۔

روشن خان کا والد بھی قبیلے کا سردار تھا۔ یہاں سرداری کا لٹریٹ روایت نہیں، جو خان کا فیصلہ وہ پورے قبیلے کا۔ سن دو ہزار نو میں جب عبدالرشید خان کا انتقال ہوا تو سب ہی یہ جانتے تھے کہ اب نیا خان کون ہوگا، سردار کا سب سے بڑا بیٹا۔

وہ موسم گرما کا ایک خوشگوار دن تھا جب کفرزئی خانہ بدوشوں کی نہایت معزز لور بزرگ شخصیت ایر علی بھائی نے

قبیلے کے تمام نمائندین کو اپنے نہایت میں آنے کی دعوت دی۔ وہ مرحوم سردار کے ہم عمر اور ان کے قریبی ساتھی تھے۔ نرٹ کو کفرزئی باشندوں کی ساتھی زندگی میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔ دو تین خانہ بدوش خاندان اکٹھے نقل مکانی کرتے ہیں۔ ان کے مال بردار پاک لور پالتو مویشیوں کے گھنے، سب سا بچے ہوتے ہیں۔ ایک اعاطے کے اندر ان کے الگ الگ نرٹ ہوتے ہیں، جنہیں کمپ کہا جاسکتا ہے۔ دراصل یہ ایک طرح سے محلہ بن جاتا ہے۔ اس دن ایر علی بھائی نے نمائندین کو اپنے کیمپ پر بلایا تھا۔

اگرچہ کفرزئیوں میں کاغذ کی کرنسی کا رواج نہیں لیکن اس کے باوجود یہ غریب نہیں۔ ان کے پالتو بھیڑ بکریوں کے ریڈ، گھوڑے، پاک، مال بردار گدھے اور پھر دراصل خاصی بھادی مالیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کفرزئی خانہ بدوشوں میں کرنسی کی بنیادی مالیت ایک بھیڑ ہے۔ اس کی تعداد جتنی بڑھاتے جاؤ، قیامت میں اضافے کا قصین ہوتا جائے گا۔

یہاں ایک بڑا نسل کی قیمت ایک بھیڑ جیکٹ یا بے کی مالیت دس بھیڑیں تھیں۔ اعلیٰ نسل کا ایک گھوڑا چھاس بھیڑوں کے عوض بڑا جاسکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ کفرزئیوں میں یہی ن مالیت بھی ملے شہہ ہے۔ شادی کے لیے دلہن کے میوٹ ڈالہا کو سو بھیڑیں لڑکی والوں کو پیش کرنا ہوتی ہیں۔

یہ روزمرہ زندگی میں شے کی مالیت کا قصین ہے لیکن جب کسی کی امارت کا قصین کرنا ہو تو اس کی نشانی لونٹ ہے، وہ بھی دو کو بان والا۔ جس خاندان کے پاس یہ ہے، وہ سب میں مالدار تصور ہوتا ہے۔

دو کو بانی اونٹ یہاں ہاتھری کہلاتا ہے۔ ستاون سالہ ایر علی کے پاس چھ عدد دو کو بانی اونٹ تھے۔ ان کے گلے میں مثل سے بنی گھنٹیاں لگتی ہیں، جب وہ کہیں سے گزرتے ہیں تو یہ آواز سننے والا سمجھ جاتا ہے کہ ایر علی کا قافلہ گزر رہا ہے۔ پہلے یہ گھنٹیاں ایر علی کی آمد کا اعلان کرتی تھیں لیکن اب ایک سے دوسرے کیمپ تک دایلمے کے لیے واکی ٹاکی متعارف ہو چکی ہیں۔ یہ بھی لونٹ کمانے کے لیے ہام دنیا کا رخ کرنے والے چالاک تاجروں کی دین ہے۔ اب ایر علی بھی واکی ٹاکی کا استعمال کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔

نقل مکانی کے سفر میں، واکی ٹاکی سے حیر دلدار اور

فوری رابطے کے باعث آسانیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ شاہ
راخانہ خانہ بدوشوں کے لیے اس کی اہمیت اُس موہاں سے
کسی طور کم نہیں جنہیں دنیا بھر کے زیادہ تر حصے میں، شہری ہو
یا دیہاتی زندگی کا لازمی جزو مان لیا گیا ہے۔

اگر علی بھائی کی ایک اور خوبی بھی ہے۔ اُن کے پاس
دنیا کی انتہائی منفرد سرخیوں کا جوڑا تھا۔ یہ نسل کرغزیوں کی
پہچان تھی۔ مرغا ہو یا مرغی، ان کی صرف ایک ٹانگ ہوتی
ہے۔ ایک مرغ شہیدہ شہد کے باعث مرچکا، دوسرے کی
حفاظت وہ دل و جان سے کرتے ہیں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی اگر علی کے یکم پر کرغز ہمارے
کے دعوت کی۔۔۔۔۔ سب کو علم تھا کہ دعوت کیوں ہے اور کوئی
ایسا نہ تھا کہ جو آنے سے انکار کرتا۔ اگلے ملتے یہاں وہ سب
موجود تھے جنہیں مدعو کیا گیا تھا۔ یہ کل چالیس افراد تھے
جنہیں باہمی مشاورت سے نئے خان کا انتخاب کرنا تھا۔ وہ
یُرت کے اندر دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے اور ان کی
نشانی کے لیے کرغز روایت کے مطابق بھیڑیں دُعا کی گئی
تھیں۔ خواتین کھانا تیار کر رہی تھیں۔

کرغز باشندوں میں بھیڑ کے گوشت سے تیار کردہ دُش
دعوت کا لازمی جزو ہے۔ یہ نہایت لذیذ ہوتی ہے۔ ان کے
ہاں اسے روایت کا درجہ حاصل ہے۔ بھیڑ کے گوشت کو اسی
کی چربی میں پکا یا جاتا ہے۔ اس کی تیاری میں بہت وقت لگتا
ہے۔ گوشت کو اس وقت بدستور مدھم آگ پر پکا یا جاتا ہے،
جب تک چربی پھل کر زور رنگ کے شود ہے ایسی صورت
اختیار نہ کر لے۔

میں نے یہ دُش کھائی ہے۔ روایتی مصالحوں اور قدیم
طریقوں سے تیار کردہ یہ دُش سادہ مگر نہایت لذیذ تھی۔
اسے کچے کے لیے تقریباً آٹھ گھنٹہ دیکھتے رہتے ہیں۔
وہ کرغزیوں کی روایت کے عین مطابق دعوت تھی۔
کھانے کے بعد تھوہ پیش کیا گیا اور پھر سہ پہر کے قریب
سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کے لیے اٹھ کھڑے
ہوئے۔ جب تک یہ طے ہو چکا تھا کہ مرحوم عہدار شہید کی جگہ
ان کا بڑا بیٹا حاجی روشن خان کرغز خانہ بدوشوں کا نیا خان
ہوگا۔

اگرچہ قہاں کے بزرگوں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا لیکن
ضروری نہیں کہ سب مراد کو سب کی حمایت حاصل ہو۔
حقیقت یہ تھی کہ قبیلے والوں میں ناخود خان کی شہرت ٹھیک
نہیں تھی اور اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں۔ سرخی اور

آزاد ہیت میں کرغز بدنامی کی حد تک مشہور ہیں۔
کلیہاں ماہر بشریات ہیں اور گزشتہ کئی سالوں سے
کرغز خانہ بدوشوں کے درمیان رہ رہے ہیں۔ وہ ان کی
یورپا میں پر تحقیق کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگرچہ
کرغزیوں کے ہاں خان کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی
روایت نہیں لیکن آزادی ان کی خطرہ میں شامل ہے۔ ان
کی زندگی خان کے گرد نہیں گھومتی، وہ اپنی سوچ کے تابع
ہیں۔ انہوں نے کرغزیوں کے بارے میں۔۔۔ ایک حکایت
بھی سنا لی جو لکھنے کی حد تک مشہور ہے "کہتے ہیں کہ کسی ایک
یُرت میں تین کرغزیوں کو بٹھا کر چھوڑا جا، ایک گھٹنے بعد پٹو
کے تو وہاں پانچ خان بن گئے۔

نئے خان پر بعض کو اعتراض تھا کہ ابھی وہ کم عمر ہے۔
کچھ کہتے تھے کہ وہ "سکین" نہیں۔ سکین۔۔۔ کرغزیوں میں
جرات، ہمت اور بہادری کا استعارہ ہے۔ "سکین" معنات کا
حامل چٹن کی طرح مضبوط ہوتا ہے۔ کرغزی، ہمیشہ سے
"سکین" ہونے کی چادر رکھتے ہیں اور وہ اپنے خان میں بھی
ایسی معنات دیکھنا چاہتے ہیں۔ سنگار، بے آب و گیاہ اور
سکین موسموں میں رہنے والے کرغزی خانہ بدوشوں کی یہ
خواہش بھی کچھ کم سکین نہیں۔

مگر خان پر معترض بعض افراد کی یہ بھی رائے تھی کہ
اگر سب متفق نہ ہوئے تو پھر وادی کے دور دراز اور انتہائی
سرے پر رہنے والا ایک سرکش اور مرحوم خان عہدار شہید کا
دشمن، روشن اس کی جگہ نیا خان بن سکتا ہے۔ کچھ اس پر مصر
تھے کہ بس! اب وقت بدل چکا، خان کا عہد ختم، اب انکس
کسی خان کی کوئی ضرورت نہیں۔

ان سب آراء کے باوجود بنیادی حقیقت یہ تھی کہ اگر علی،
نئے ناخود خان کا سب سے بڑا حمایتی تھا۔ اس وقت کچھ
رائے یہ بھی تھی کہ نیا خان سفید موٹھوں والا کوئی بزرگ ہونا
چاہیے۔ ویسے اُس وقت آوازیں اگر علی کی حمایت میں بھی
اٹھ رہی تھیں۔ اس کی موٹھیں داڑھی سفید تھیں۔ اس کے
پاس دو کوہالی اونٹ بھی تھے، اور وہ بھی ایک بڑا دو ٹھیں،
پھرے چم کے چم۔ بھیڑ بکریوں کا ایک بڑا گائے بھی اس کے
پاس تھا۔

ان سب سے متغلب اور منفرد رائے کلیہاں کی تھی۔ اُن کا
کہنا تھا کہ "اگر سفید داڑھی اور موٹھیں سرور کی قابلیت اور
اہلیت کا اظہار ہے تو پھر ہمیں ایک بکرے کو خان منتخب
کر لینا چاہیے۔ پھاڑی بکرے کی داڑھی اور موٹھیں،

دونوں ہی سید ہوتی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "جب ایسا ہی ہے تو مجھ کو بکرا بھی ان سرکشوں کا سردار بن سکتا ہے۔"

خان کی بدنامی کا سب سے بڑا سبب الجھن لینا ہے۔ اگرچہ خان کا دعویٰ ہے کہ وہ الجھن ترک کر چکا مگر یاد دہانی کے لئے کو چار نہیں۔ اہم عمل کی حیثیت میں ملے کر وہ فیصلے کے مطابق اگرچہ اب حالی روشن ملی ہی کر فرزند بدوشوں کا خان ہے لیکن پھر بھی اس کی 'عوامی' مشکلات میں کی نہیں آئی۔ خان بننے کے بعد بھی اس کے خلاف آوازیں اٹھتی رہی ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے لوگوں کو یہ یاد کرانے میں مصروف رہتا ہے کہ حسب کے لیے اس سے بھڑک کر کوئی اور کر فرزند ہو ہی نہیں سکتا۔

دنیا کے نہایت کھن قدرتی ماحول میں زندگی بسر کرنے والے کر فرزندوں کو جن مسائل کا سامنا ہے ان کے حل کی خاطر خان کی کوششیں بھرپور ہیں۔ یہ خود کو سب سے بہتر ثابت کرنے کے لیے ہے۔ اسی کی خاطر وہ افغان صدر اور وزیر سے ملتا تھا لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود اسپتال، اسکول اور ہاں سڑک بھی۔۔۔ کسی کے کچھ چار نہیں۔

☆☆☆

نقل مکانی کے روز تیاری کی گرائی خان کی زندگی دہری ہوتی ہے۔ یہ اس کا ذمہ ہے کہ قبیلے کے تمام مال بردار چمڑ، گدھے، گھوڑے، بادلر پاک اس کے موسم گرما کے کپ کے سامنے مقررہ وقت تک پہنچ چکے ہوں، تاکہ ایک ساتھ مال بردار جانوروں کا قافلہ روانہ کیا جاسکے۔

اگرچہ وہ جون کا مہینہ تھا لیکن آسمان جب بھی ابر آلود تھا۔ کبھی کبھار اچانک بلی برف بھی پڑنے لگتی لیکن خان کو اس کی نقل کوئی پروا نہیں تھی۔ اسے سرمائی ٹھکانے پر، طویل سردیاں گزارنے کے لیے اپنے موشیوں کے واسطے، ہر حال میں چارے کا خاطر خواہ ڈھیر لگانا تھا۔

خان اور اس کا خاندان، یوں تو سال کا بیشتر حصہ ریت میں ہی بسر کرتے ہیں، البتہ سرمائی ٹھکانے پر، سردیوں کے دوران میں وہ گارے سے بنی موٹی دیواروں والے کچے گھر میں رہتے ہیں۔ صرف خان ہی نہیں، تمام کر فرزند بدوشوں کی نقل مکانی اور خود کو گرم رکھنے کے واسطے، سرمائی ٹھکانوں میں دہائش کا بھی اندازہ ہے۔

سردیوں میں وہ وادی کے جنوبی حصے کی طرف ہجرت کرتے ہیں اور پھر موسم گرما شروع ہوتے ہی سبزے کی

مٹاؤں میں چند میل کی دوری سے پڑا ڈالنے ہوئے ٹال کی چاب، آہستہ آہستہ برف کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ اس بار سرمائی پڑاؤ کی طرف نقل مکانی کے سفر میں، عین بھی شریک تھا۔ مجھے سادری کے لیے خان کے رہوڑ کا ایک پاک مل گیا تھا۔

نقل مکانی کے اس راستے میں ہی نہیں، پوری وادی بلی میں جدھر نظر ڈالو، پھاڑوں کی برف پوش بکھڑ و پالا چوٹیاں اور ان کے نو پر تیرتے بادل ہی نظر آتے ہیں۔ یہ آسمان تک پہنچنے والی نظر کی راہ روکدہ ہے۔ لگتا ہے کہ انسانوں کو اتنا قریب دیکھ کر آسمان بھی پردہ کرنے پر اتر آتا ہو۔

یہاں، دنیا کی اس چھت پر، دنیا کے کئی بڑے پھاڑی سلیطے باہم گلے ملتے ہیں، جن میں ہندو کش، قراقرم اور پامیر شامل ہیں۔ وادی خان کی یہ پٹی اور اس پر ایستادہ برف پوش پھاڑی سلیطے، مشرق و مغرب کی سمت پہنچنے والے کئی بڑے دریاؤں کی جنم بھومی بھی ہیں۔ انجی میں سے ایک دریا ہے آمو، بلالور دریا بھی ہے۔ دریا ہے آمو، وسط ایشیا کا ایک اہم آبی وسیلہ ہے۔

چلتے چلتے ہمارا کارواں دریا کے ٹکسوں کے کنارے پہنچا۔ سال کے ان ایام میں برف اور گلیشیروں کے پگھلنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے، جس سے دریاؤں میں پانی کی مقدار بہت زیادہ اور بہاؤ خاصا تیز ہو جاتا ہے۔ اس وقت دریا کے ٹکسوں میں بھی غلیانی جیسا ماحول تھا۔ شفاف اور ہلکا سبز نکل پانی شور مچاتا تھا گھانٹوں سے گزر رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر خان نے کچھ دیر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ ہماری بوجھ سے بوجھل پاک تھک چکے ہیں، انہیں بھی کچھ آرام اور پانی کی ضرورت ہے۔ پاک بھی ہانپ رہے تھے، ان کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں، پٹی پٹی لگ رہی تھیں۔ پیاس کی شدت اور ہانپنے کے باعث ان کے نچھنے ہار ہار تیزی سے گل بند ہو رہے تھے۔

تمام بار بردار جانور کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ تھوڑا سا آرام بھی ہو چکا تھا۔ اب ہماری دریا پار کرنے کی جی تھوڑی بھی خان کی تھی۔ میرے لیے تو خیر یہ تجربہ نیا تھا لیکن ان کے لیے نہیں۔ خان کے بردار بستی کی ذمہ داری گھوڑوں اور دیگر مال بردار جانوروں کو دریا پار پہنچانے کی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں گھوڑے کی ناک میں اور دوسرے سے پاک کی ٹکلی تھامی اور غصے سے پانی میں کود گیا۔ جانور اور وہ تیرتے

ہوئے دوسرے کنا۔۔۔ تک پہنچے۔ جانور دریا پار کر گئے تو اب باری تھی بچوں کو۔۔۔ دریا پار کرانے کی۔

خان کی سوانہ نے واسطے ایک گھوڑا تھا۔ اس نے اپنی پانچ سالہ بیٹی راہجہ، مانتے بٹھایا۔ ایک ہاتھ اس کی کمر کے گرد حائل کر کے مضبوطی سے اسے تھاما۔ اس کے پیچھے بیوی اور دو سالہ بیٹی عارضہ تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے لگام تھام کر گھوڑے کو دریا میں اتار لیا۔ بھگنے سے نہ بچنے کے لیے اس نے پاؤں لو پر اٹھا لیے تھے۔ اس کا چھ سالہ بیٹا کش علی اور تین سالہ جوتکا اپنے ایک اور ماسواں کے ساتھ گھوڑے پر سوار دریا پار کر رہے تھے۔

ہم دوسرے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ تاجہ نظر سرسبز چراگاہ دریا کا شگاف پانی اور دریا۔۔۔ ایسے میں خانہ بدوش کے قدم خود بخود ختم جاتے ہیں۔ سرمائی لٹکانے تک پہنچنے سے پہلی ہی خان کی سرداری میں کرغز خانہ بدوشوں کا عارضہ پڑا تھا۔ جب تک موسم سازگار اور چراگاہ پوری بھری تھی، جب تک یہی ان کا مسکن تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پالو مویشیوں کے رہیڑ بھی دریا میں تیرتے ہوئے پار اترنے لگے۔

خان اور اس کا بھادر بھتیجی بل بھادر پاک، فچروں اور گھوڑوں پر لدا سامان اتار کر نہر ت لگانے کی تیار ہواں کر رہے تھے۔ گھرواری خاتون کی ذمہ داری، لہذا خان کی بیوی کی پوری توجہ نہر ت لگانے پر تھی۔ اگرچہ ٹھیک طور پر یہ موسم گرما تھا اور خان کے مطابق خوشگوار بھی لیکن سچ پوچھو تو سرد گات واد ہوا جسم کو سن کیے جارہی تھی۔

"یادو خان ہے، اس کے حرے لو۔" خان نے مجھے ہاتھوں کی پتیلیوں کو ہا بھر گڑتے دیکھا تو اس کی مشورہ دیا۔ "وہی کر رہا ہوں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ سرد موسم میں رہنے کے سبب میرے ہاتھوں کی کھال بھی کافی سخت ہو چکی تھی۔

خان کی بیوی بندھا سامان کھول رہی تھی، بچے ادھر ادھر بھر رہے تھے جبکہ مرد موہاگل فون ٹی میڈیا پر بچتے کسی کرغز لگانے کی دھن میں لگے، نہر ت لگانے میں بچتے تھے۔ موسیقی کسی زبان کی پابند نہیں، مجھے بھی دھن اچھی لگ رہی تھی۔ وہ تین تاروں پر مشتمل ستار یا گٹار جیسے کسی ساز سے نکل مسور لگن دھن تھی۔ یہ کرغز باشندوں کا روایتی ساز کچھ افغانستان اور پاکستان میں بختونلوں کے روایتی ساز زرباب سے مشابہ ہے۔ کرغزیوں کا روایتی ساز شاید اس سے ذرا سا

تلف ہوگا۔ اس ساز کو کرغز زبان میں قور کہتے ہیں۔ نہر ت لگانا بھی ایک فن ہے۔ یہ کلڑوں میں بیٹی کی تصویر

کو درست طور پر جوڑ کر کھیل تصویر بنانے جیسا ہی ہے۔ اس کام میں کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ نہر ت کھڑا کر لینے کے بعد، یہ راہر سے بالکل غیر متاثر لگن اور کسی لہو ترے آلو کی مانند بے کشش نظر آتا ہے۔ خود نہر ت کی طرح کرغز خانہ بدوش بھی بڑی حد تک غیر متاثر لگن اور سماجی میل ملاپ سے دور درگزر دہی بسر کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ ذرا دہشتے بھی نہیں، مسکرانے میں بھی بہت کچھ ہیں۔ ان کی کوئی کتاب نہیں، جس پر دعویٰ کر سکیں کہ ہم یہ میراث رکھتے ہیں۔ نہ وہ تاش کھیلے ہیں نہ ہی بورڈ پر کھیلے جانے والا کوئی دوسرا روایتی کھیل البتہ خوشی کے موقع پر دائرے میں جمع ہو کر مرد ایک روایتی رقص ضرور کرتے ہیں۔ ہر رقص کرنے والے مرد کے ہاتھوں میں دو مال ہوتا ہے جو اس کے گھر کے قدم کے ساتھ ساتھ ہوا میں لہرا رہا ہے۔ یہ پاکستان اور افغانستان میں آباد بختونلوں کے تنگ داس سے مماثلت رکھتا ہے۔

کرغز خانہ بدوشوں کے ایک لوجوان کے سوا، جسے مسلسل سے پور رٹ بنانے کا شوق تھا، اور اس کے پاس ایک ڈرائنگ بک بھی تھی، جس میں اس کے بنائے نہایت عمدہ پور رٹ تھے، مجھے ایسا کوئی کرغزی نہ ملا۔ جسے فائن آرٹس میں دلچسپی ہوتی۔ میں نے کرغزیوں کے باں شادی کی ایک تقریب میں بھی شرکت کی تھی مگر وہ بھی مکمل طور پر بے طلب رہی۔

عام طور پر کرغز خانہ بدوشوں کو کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں البتہ بونگس ان کا روایتی کھیل ہے اور وہ لائق و شوق سے اسے کھیلے ہیں۔ یہ وسط ایشیائی ممالک اور خود افغانستان میں بھی کھیلا جانے والا صدیوں پرانا روایتی کھیل ہے، جس میں حصہ لینے والی ٹیموں کو میدان کے بچوں کا لڑائی کچے بے سر کے مینڈھے کو گھوڑا دوڑاتے ہوئے اٹھانا اور سچ کے لیے متحین منزل تک پہنچنا ہوتا ہے۔ ترکی اور افغانستان سمیت وسط ایشیا کی متعدد ریاستوں میں آج بھی یہ کھیل کھیلا جاتا ہے اور ریاستی سطح پر اس کے ٹورنامنٹ بھی منعقد ہوتے ہیں۔ اس روز شادی کی تقریب تھی اور مردوں کی تفریح و طبع کے لیے بونگس کا مقابلہ جاری تھا۔

عمومی طور پر کرغزیوں کو بااخلاق کہا جاسکتا ہے۔ اگر راہ چلتے، ہاتھیں کرتے کرتے کوئی کرغز بے تلفی سے آپ کی بیب میں ہاتھ ڈال کر اندر سے کوئی شے باہر نکال لے تو

دوبلے گھاس کی لکڑی سے بنی ڈاٹجسٹ



جاسوسی ڈاٹجسٹ سسٹمز ڈاٹجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈاٹجسٹ سسٹمز ڈاٹجسٹ

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(شامل رجسٹرڈ ایک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیمہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے قلم
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ قلم اسی حساب سے
لومال کریں۔ ہم فوراً آپ کے قلمے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ایک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے پہلے ایک سال کے لیے بہترین قیمت پر ہو سکتا ہے

پوران ملک سے قارئین صرف ایسٹرن ٹائمز یا مینی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شمارہ س (فون نمبر 0301-2454188)

جاسوسی ڈاٹجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 111، بینکیشن، ٹیکس، ڈسٹریکٹ، احمدی میں کوہنگی روڈ، کراچی
فون 35802551، فکس 35805313

اسے غیر معمولی خیال مت کرنا۔ خیال کرتے ہو تو یہ آپ کا
نئی خیال ہوگا۔ ان کے لیے یہ معمولی بات ہے۔ خود میرے
ساتھ ایک سے زائد مرتبہ ایسا ہوا کہ ہاتھ کرتے کرتے کسی
کرغز نے میرے کوٹ کی جیب میں یہ دیکھنے کے لیے ہاتھ
ڈال دیا کہ اندر کیا رکھا ہے۔ ایسا بھی نگلی ہار ہوا کہ جیب
نے ہاتھ کرتے کرتے دیکھا اجازت میری ناک پر ٹکا دھوپ
کا چشما چک کر یہ دیکھنے کے لیے اپنی آنکھوں پر چڑھا لیا
کہ اس سے دھوپ کیسی ٹھہراتی ہے۔

کرغز گوشت خور ہیں اور بہت زیادہ گوشت کھاتے
ہیں۔ وہ گوشت کو پتے پتے پارچوں کی شکل میں کاٹ کر
بھوتے ہیں۔ ایک کرغز سے یہ بعید نہیں کہ وہ گوشت کا ایک
پارچہ لے کر کھارہا ہو اور جب اس سے کھایا نہ جائے تو وہ
جیب میں رکھ لے گا نگلی ہار بھوک گھنے کی صورت میں فوری
کھانے کے واسطے۔

کرغزی، موہائل فون پر مہبتی سننے کے بہت شوقین
ہیں لیکن روایتی طور پر ان خانہ بدوشوں کو گیت گنگانے سے
کچھ خاص رغبت نہیں۔ اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ بھول
خان" یہ وہ سرزمین ہے، جہاں کوئی بچہ پیدا ہو کر مرنے سے
بچا جائے تو بہت تیزی سے بوڑھا ہونے لگتا ہے۔"

واخان کی بٹی کے سخت ترین موسمی جہر نے، کرغز خانہ
بدوشوں کو زندگی کی بھا کے سوا کچھ اور سوچنے کے قابل ہی
نہیں چھوڑا۔ سال کا زیادہ تر حصہ، یہاں درجہ حرارت نقطہ
الجماد سے نیچے نہیں بلکہ بہت نیچے رہتا ہے۔ ٹھنڈ اور برف
باری کے سبب ہر وقت لہو رگوں میں جمنا شروع ہوتا ہے۔
موسمیوں کے گلے ان کا معاش ہی نہیں، خوراک بھی ہے۔
ان کی کھالیں سرد ترین موسموں سے بچاؤ کے لیے نہ ت
ہٹانے سمیت کئی کاموں میں استعمال ہوتی ہیں۔ رگوں میں
لہو جماتی، تقریباً سال بھر کی ٹھنڈ میں اگر انہیں کہیں سازگار
ماحول میسر آتا ہے تو وہ نہرت ہے۔ ہائے حیات، ان کا
اول و آخر مقصد حیات ہے۔ یہاں زندگی مشکل نہیں، مشکل
ترین ہے۔ ایسے میں کسی واخان کی کرغز خانہ بدوش کی
جما لیتی جس کیسے پروان چڑھ سکتی ہے، البتہ جہاں تک ان
کے نہرت کا معاملہ ہے تو وہ نہایت خوبصورت اور لہو
گرما دینے والے رگوں سے سہا اور ان کے ایسے جمالیاتی
جذبے کا مظہر ہے جو صرف نہرت کے اندر بیدار ہوتا ہے۔
باہر سے بے کشش نظر آنے والے نہرت کے داخلی
دروازے پر چڑھنے نہایت موزوں اور بھاری پردے کو اٹھا کر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

والے حصے پر کئی ناخن کڑھنے دیکھے تو بہت حیرت ہوئی۔ معلوم کیا تو پتا چلا کہ ظہر بد اور پورائی طاقتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے کالا گیا تھا۔ یہ سب دیکھنے کے بعد بھی اگر میں کرفز خواتین کے بحالہائی لائق اور آرائشی اختراع کی داد دیتا تو بڑی زیادتی ہوئی۔

کرفز خواتین کا ایک اور پہلو آرائش کیسو ہے۔ بے ہالوں کی ایک نہیں کئی کئی چھٹیاں گوندھی جاتی ہیں، جن پر چاندی کے آرائشی زیورات اٹکائے جاتے ہیں۔ انہیں سنگھار کے ساتھ ساتھ ہار کا بھی بہت شوق ہے۔ میں نے کوئی خاتون ایسی نہ دیکھی جس کی گردن خالی ہو۔ سب کے گلے میں ہار تھے اور ایک سے زیادہ۔ انہیں سنورنے کے ساتھ ساتھ بچنے کے لیے زیورات پہننے کا جو شوق ہے اس کی عمدہ مثال انگولیاں ہیں۔ درمیانی انگلی کو چھوڑ کر، کرفز خواتین کے ہاتھ کی ہر انگلی حتیٰ کہ انگوٹھے تک میں بھی رنگ بے رنگ پتھروں کی جڑاؤ انگولیاں نظر آتی ہیں۔ ہات میں تک محدود نہیں، لیکن بھی عام استعمال میں ہے۔ نئے سے لازم ہیں لیکن بڑے سائز کے ہوں، ہندوستان کے جھسکوں جیسے اور گھڑی تو ایک کافی نہیں، وہ نہیں ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ایک خاتون کی دونوں کلائیوں پر گھڑیاں بندھی تھیں۔ کتنا تو وہ عجیب۔ شاید اسے یہ تعداد مناسب لگی ہو پھر بھی بہتری کی گنجائش ضرور موجود تھی۔

ان کی روزمرہ زندگی سخت مشق سے عبارت ہے۔ کرفز خواتین کے روزمرہ معمولات میں سلاخی، کڑھائی، بنائی، کھانا پکانے، صفائی ستھرائی، بچے پیدا کر لے اور انہیں پالنے کے علاوہ، دن میں دو بار پاک کا دودھ دوتے، ان سے دھو اور بغیر ہاتھ بھی شامل ہے۔ ہاتھ والوں کے اصل کی صفائی ستھرائی میں بھی بے حساسیت ہیں اور فصل مکانی کی تیاری ان کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہ بہت شرمیلی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی مرد ان کے قریب موجود ہو تو نکلی بات نہیں کرتیں۔ مجھے ایک کرفز خاتون سے صرف یہ باتیں میں ایک گھنٹہ کا کہ آخر میں نے ہاتھ کی ایک کلائی میں تین گھڑیاں کیوں باندھ رکھی ہیں۔ کافی رات قدرے کے بعد شرماتے ہوئے اس نے مختصر سا جواب دیا تھا۔ ”یہ مجھے اچھی لگتی ہیں۔“

ان کے شرماتے کا عالم یہ ہے کہ میں خان کے کیمپ میں اس کے ساتھ کئی دفعے رہا لیکن کمال ہے کہ اس کی بیوی

نے بھی مجھ سے ایک لفظ بھی کہا ہو۔ میں نے اتنی زیادہ شرمیلی خواتین پہلے نہیں اور نہیں دیکھی تھیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ان کی زندگی بہت محدود ہے۔ اگر ایک اوسط عمر کی کرفز خاتون کی زندگی کا احاطہ کریں تو وہ جہاں پیدا ہوئی ہیں، وہاں سے صرف چند میل کی دوری تک ہی، اس کا سفر حیات محدود رہتا ہے۔ ان کی زندگی کا سب سے طویل سفر ماں باپ کے گھر سے بیاہ کر شوہر کے زیر تک پہنچنے کا ہے۔ یہ بھی چند میل سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ان کی زندگی کا دائرہ اور بھی سست جاتا ہے۔ بقول خان ”ہم ان احمق لوگوں میں سے نہیں ہیں جو ہر جگہ بیوی کو دم چھلا بنائے پھرتے رہتے ہیں۔“

کرفز باشندوں میں کم عمر کی شادیوں کا رواج ہے۔ لڑکیوں کا دس سے چودہ برس کی عمر تک شادیاں کر دی جاتی ہیں۔ جب خان کی شادی ہوئی تو وہ پھر وہ جب کہ اس کی بیوی تیرہ برس کی تھی۔ عموماً ان شادیوں میں ’لوہریج‘ کا قصورہ درودور تک نہیں۔ شادیاں گھر کے بڑے بڑے کرتے ہیں، جن میں بچوں کی مرضی کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

جن پندہ کرفز خواتین نے مجھ سے کھل کر بات کی، ان میں ایک بزرگ خاتون پازلی بی بی بھی تھیں۔ وہ بیوہ تھیں اور ان کا اندازہ تھا کہ عمر ستر برس تو ہوگی۔ ان کی پانچ بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ وہ سب کے سب اس جہان سے گزر چکے تھے۔ پازلی بی بی کا کہنا تھا کہ ”مرد پاک کا دودھ نہیں دوتے، وہ گھر کی صفائی ستھرائی اور کھانا نہیں بنا سکتے، بچوں کی دیکھ بھال تو درکنار وہ تو خود اپنی دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ اگر عورت نہ ہو مرد تو ایک دن بھی دنیا میں نہیں جی سکتا۔“

کرفز باشندوں کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ اپنی پوری تاریخ میں وہ بھی کسی حکومت یا کسی ایک بادشاہ کے تابع نہیں رہے۔ بیشہ ان کی زندگی آزادی سے عبارت رہی ہے۔ ایک کرفز باشندے نے چارے فخر سے بڑی اہم بات مجھ سے کہی تھی۔ ”ہم وہ آزاد جنگی گھوڑے ہیں جس پر آج تک کوئی شکاری اپنی کند ڈالنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔“ کرفزیوں کی اصل حقیقت کیا ہے، یہ بات اب تک تاریخ کے تاریک پردوں میں لپیٹی ہے۔

کرفزیوں کا سب سے اولین تذکرہ دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی جتنی دستاویزات میں ملتا ہے۔ جس میں ان کا تعلق اسی سلسلہ کوہ سے قایم کیا ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ آج روسی ساہیرو اور منگولیا میں واقع ہے۔

پاکستان میں شامل ہندو کش سلسلہ کوہ کی جانب ہجرت کر گئے۔

ہجرت کے پہلے ہی سال کرغز مہاجرین وہاں کا کھار ہوئے اور چار یوں نے ایک سو سے زائد چھوٹوں اور بڑوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اگرچہ اس صورت حال نے انہیں واپسی پر مجبور کیا لیکن ان کے خان رحمان گل نے زور دیا کہ وہ پاکستان میں ہی رہیں۔ اس نے خبردار کیا کہ سوویت فوج صرف ان کی آڑ لوی ہی سلب نہیں کرے گی بلکہ ان کے ایمان پر بھی حملے کرنے کی۔ ایسے میں بہت سارے کرغزیوں کو قیادت کی فوج پر شک ہو رہا تھا۔

وہ دنیا کی چھت پر زندگی بسر کرنے والے لوگ تھے۔ ہجرت کے اس مرحلے میں انہیں اپنی دادی کی یاد دہی طرح سہلی رہی تھی۔ بس! یہیں سے پاکستان ہجرت کرنے والے کرغزیوں میں تقسیم شروع ہوئی۔ وہ دھڑے بن گئے ایک، مختلف منتخب رحمان گل کی حمایت کر رہا تھا، دوسرے کی سربراہی سوچو وہ خان کے والد عبدالرشید کر رہے تھے۔ بات بڑھ گئی۔ عبدالرشید نے تین سو کرغزیوں کے ساتھ افغانستان لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے ساتھ واخان لوٹنے والوں میں اہل علی بھی شامل تھے۔ یہ وہ موقع تھا کہ جب لوٹنے والوں نے رحمان گل کو مسترد کر کے عبدالرشید کو اپنا نیا خان منتخب کیا۔

کابل پر سوویت تسلط منسبوط ہو چکا تھا۔ ان کے واپس لوٹنے پر سوویت فوج کمال مہربانی سے پیش آئی۔ پاکستان ہجرت کرنے والے تین سو کرغزی اپنی سرزمین پر لوٹ آئے تھے لیکن ان کی تعداد بہت کم ہو چکی تھی۔ اگرچہ کرغزیوں میں، شیر خوار اور کسن بچوں میں شرح اموات خطرناک حد تک زیادہ ہے لیکن بھر بھی، گزشتہ تین دہائیوں کے درمیان ان کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا۔ آج ان کی تعداد ایک ہزار نفوس سے تجاوز کر چکی ہے۔

عبدالرشید کے برعکس، جنہوں نے رحمان گل کی سربراہی میں پاکستان کے اندر ہی ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا، وہ بھی نہر کے۔ انہوں نے بھی نقل مکانی کی۔ اس وقت وہ مشرقی ترکی کے ایک گاؤں میں آباد ہو چکے ہیں، جس کا نام "کوکی کز" ہے۔ اس گاؤں میں بچے مکانات ہیں۔ جہاں ان باشندوں کو بیکل، کیبل ٹی وی سیٹ، ورک، پختہ سڑکوں اور کار جیسی تمام سہولیات حاصل ہیں۔ ان کرغز خانہ بدوشوں کی زندگی اب نئے رخ پر ہے۔ وہ اپنے نام کے آخر میں

بہر بشریات نازف شاہرانی لفظ "کرغز" کی وجہ تسمیہ یوں بیان کرتے ہیں۔ "یہ ایک سے زائد الفاظ کا مجموعہ بھی ہو سکتا ہے جیسے "کیرک جس" کا مطلب ہے "چالیس" اور "کیز" جس کا مطلب لڑکی ہے۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ چالیس ماؤں کی اولاد ہوں جو اتنی چلی پھولی کہ اسی مناسبت سے "کرغز" کہلانے لگی ہوں۔"

وجہ تسمیہ دلچسپ اور لوک کہانیوں جیسی ہے لیکن اس پر استغنا کر لینا کچھ بہتر نہیں۔ تاریخ کو کھنگالنے اور تحقیق کرنے کی یہاں بہت گنجائش موجود ہے۔

تعداد کے لحاظ سے افغان کرغز خانہ بدوش قبیلہ بہت بڑا نہیں۔ یہ صدیوں سے وسط ایشیائی چراگاہوں میں پھرتے رہے ہیں۔ تاریخ میں یہ لوگ وسط ایشیائے گزرنے والے "سلک روٹ" یا شاہراہ ریشم کے تہذیبی تعلقوں کو لوٹنے کی بھی شہرت رکھتے ہیں۔

سن سترہ سو کے دوران میں انہوں نے افغانستان کی اس دادی میں اپنے قدم بچانے کا آغاز کیا جو آج موسم گرما کے لیے ان کے مویشیوں کی چراگاہ ہے۔ سخت سردیوں سے بچاؤ کے لیے وہ یہاں سے دادی کی ترائی میں اتر جاتے ہیں لیکن جونہی طویل اور سخت موسم سرما ختم ہونے لگتا ہے، وہ ایک بار پھر بلندی پر واقع گرمائی چراگاہوں کے لیے نقل مکانی کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں، جہاں وہ اگلے موسم سرما کے شروع ہونے تک ڈیرا ڈالے رکھتے ہیں۔

آزاد کش کرغز قبائل کو بیرونی تسلط سے آزاد رہنے پر فخر ہے جو کچھ غلط بھی کہیں لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں دنیا کے اندر جاری نوآبادیاتی لہر اور کمیونزم کے گراؤ سے برطانیہ اور روس کا جو گریٹ گیم شروع ہوا تھا، کرغز خانہ بدوش اور ان کا یہ خطہ بھی اس سے متاثر ہونے کا اندیشہ بنا۔

1950ء میں ان پر تمام سرحدیں بند کر دی گئیں اور نیند کیلین نے کہا کہ "گنگنل طور پر کرغز افغان باشندے بن چکے ہیں۔" اس کے بعد وہ کئی سالوں تک واخان کی اپنی تک

قی محدود رہے۔ 1978ء میں، کابل میں بغاوت ہوئی اور اس کے نتیجے میں سابق سوویت یونین نے فوجی مداخلت کی۔ کرغز خانہ بدوشوں کو غول لاق ہو گیا کہ اس کے نتیجے میں افغانستان بھی کیونسٹ ملک بن جائے گا۔ اس وقت تقریباً تمام کرغز باشندوں، جن کی کل تعداد تیرہ سو کے لگ بھگ تھی، نے مختلف طور پر رحمان گل کو اپنا پہلا خان منتخب کیا اور

رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

تھیرپیسٹ

لیڈی کی فیسرٹیس گوئیوں کی صورت میں نکھائی جاتی ہے اور غریب کھال کر کے ہنس کے ہنسنے سے رنگ نکھرتی ہے۔ اس کے ہاتھ اور استعمال سے رنگت نکھلتے ہوئے گودے پر نہ ہونے دیا جاتا ہے اور ساتھ ہی چہرے کے داغ اور آکھوں سے گودے پر سے ہر گودے کی ہر ہر جگہ پر جاتی ہیں۔ تو ان کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے بھی یہاں مہیا ہے۔ مردوں کے لئے بہت مشکل ہے کہ وہ اپنی لاد کر بیکس ملنے پھر رہی ہیں فیسرٹیس کدبانوں نے لئے بہت کوشاں ہے۔



www.facebook.com/top.treatments

اپنی جھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

گروٹال

انسانی قد وصال آپ کو میٹجک اور بے ہودہ اثرات سے بچاتا ہے۔ یہاں تک کہ انسانی جسم میں ہونے والی تبدیلیاں کا بارشوں کی بجائے انسانی جسم میں سے ہونے والی تبدیلیاں ملتی ہے۔ ہمارے ہاں کے بڑے کی۔ اور پھر ہوجاتا ہے۔ 20 سال سے 30 سال کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قد میں نمک اضافی کرنا۔

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!



ہیلپ لائن ملک بھر کے ہر ایجنٹ میڈیکل سٹور، ہومیو پیتھک سٹور اور دواخانہ پر دستیاب

042-35789145 6.0334-4266255

Email: top.treatments@gmail.com Website: www.top.treatments.net



ہر آنے کوئی رشتے اور نسلی تعلق بھی۔ فی الحال تو اس کے آثار
نہیں لیکن یہ آئین ہے جسے وہ بھی بھی استعمال کر سکتے ہیں۔
آخر میں تو آزاد غفلت خانہ بدوش!

افغان کرغزوں کے نوجوان خان کو بھی ضروریات
کے حل اور سہولتوں کی تلاش میں ہجرت کے اس خیال سے
مغربوں۔ خود اس نے بھی یہ حقیقت تسلیم کی۔ "میں بھی اکثر
سوچتا ہوں کہ واخان چھوڑ کر افغان سرزمین کے کسی چھوٹے
شہر میں جا کر بس جاؤں۔ میرے خاندان کے مسائل تو
حل ہوں گے۔ ہمیں وہ سہولتیں تو ملیں گی جنہیں ہمارے
جیسے دوسرے انسان استعمال کر کے اپنی زندگی آسان
نہ کر سکتے ہیں۔"

جب خان نے یہ اعتراض کیا، اس وقت ہم موسم گرما
کی چراگاہ میں بیٹھے تھے۔ سامنے بھیلروں کا گلہ سرسبز
میدان میں گھس چکا تھا۔ خوش گوشت موسم میں گئی نہ تھی
ہمارے سامنے تھے لیکن اس کی بات سننے کے بعد میرا ذہن
کھینک اور بھٹک رہا تھا۔

سہولتوں کی تلاش میں جب کرغز اپنی صدیوں قدیم
سرزمین چھوڑنے پر خود کو آمادہ کر بیٹھے ہوں تو پھر یہ کھانا
مشکل نہیں کہ شاید آنے والی کسی دہائی میں، واخان کی اس
پٹی میں شاید ہی کوئی کرغز خانہ بدوش اپنے ریوڑ سمیت
جہاز کا رخ کرنا نظر آئے۔ کسی بلند پہاڑ پر چڑھ کر
بچھڑاؤ ہر میدان میں گئے یہ نریت کہ زبان کے ماتھے پر
تھکے ہوئے سر کی مانند نظر آتے ہیں۔ اگر کرغز قس مکاری کر گئے تو
تو واخان کی اس پٹی کے ماتھے کا گم نہ مہینا جائے گا۔ کچھ
نہیں کہہ سکتے!

ایک ہزار سے کچھ زیادہ کرغز خانہ بدوش صدیوں سے
اس سرزمین پر آباد ہیں۔ انہی کے دم قدم سے دنیا کے اس
انتہائی بلند مقام پر زندگی کی رمتی نظر آتی ہے۔ شاید واخان
کی پٹی ان کے بعد بھوتوں کی ہستی بن کر رہ جائے گی۔ "ایسا
نہ ہو۔" میرے منہ سے نکلا۔ پلٹ کر دیکھا تو میری خود کلامی
پر خان حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے مسائل کا
حل چاہتا ہے۔ تعلیم، علاج کی فہمادی سہولتیں، یہی سڑک
اور ہاں۔۔۔ ایک کار بھی۔

"کہا ہوا۔" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس اگر وہ دھپالی میں منہ سے کچھ
نکل گیا۔" میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے بات چلی۔
تا دینا تو وہ نہ مان جاتا۔ میری دعا شاید اسے بددعا لگتی۔

سڑک شایستگی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے بچے اس زندگی
کے مادی ہو چکے۔ وہ گھر سواہی اور بڑائی کے بجائے ڈیو
گیم سے لطف اندوز ہونا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کے
خوش خانوں میں لڑائی و لڑائی آپ کا ہر یہ نظام ہے اور
وہ ٹوائٹ کے لیے لٹس سسٹم کی سہولت سے استفادہ کرتے
ہیں۔

کابل کے تازہ ترین دورے کے دوران میں ایک ایک
ایک دن خان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ وہ اسپتال گیا۔
ڈاکٹروں نے ایپنڈکس کی سوزش تشخیص کی۔ آپریشن جو ج
ہوا اور کامیاب بھی رہا۔ اگرچہ یہ نہایت معمولی نوعیت کا
آپریشن ہے لیکن اس کے لیے ہرگز معمولی نہیں۔ وہ اسے
اپنی زندگی کے لیے بہت اہم تصور کرتا ہے۔ "اگر یہ مسئلہ
میری وادی میں پیش آتا تو پھر پچھا حال تھا۔ میں نے اپنے
کئی ساتھیوں کو اس تکلیف کے باعث مرتے دیکھا ہے۔"

آخر اوقات، بالخصوص رات کو نریت کے خوش گوشت
خاندان میں آگ کے گرد بیٹھ کر، قبوے کی چٹکیاں بھرنے
والے کرغزوں کی گفتگو کا پسندیدہ موضوع ہے کہ آیا رہنے
کے لیے اس سے بہتر کوئی اور بھی جگہ ہو سکتی ہے؟ اکثر وہ اس
معاظت پر بات کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہجرت کے لیے
تیار ہیں لیکن اس وقت آزادی کو خطرہ لاحق ہے نہ ایمان نہ
نہیں کہہ سکتے۔۔۔ یہ ہمارا معاملہ ہے ساتھیوں تک رسائی

میں نے یہ سنا۔۔۔ راحت کے بعد سے آج تک
افغان کرغزوں کی زندگی۔۔۔ نہیں بن سکا۔ ملک کے مختلف
حصوں میں نہ جنگی جہازیں ہیں لیکن کرغزوں کے واخان
میں ایسا چھوٹا۔ یہاں امن و امان مستحکم ہے لیکن واخان
کے یہ کرغزی اب واخانی پٹی تک محدود زندگی کے دائرے
سے باہر قدم نکال کر دیکھ چکے۔ شاید وہ صدیوں تک
چراگا ہوں کی تلاش میں چل چل کر تھک چکے اور اب مٹی پر
پاؤں جمانا چاہتے ہیں۔ ہجرت کا تجربہ ان کے پاس ہے اور
نقل مکانی خون میں رہی ہے۔ یہ لوگ لب واخان کی
بجائے کہیں اور جا کر بسنا چاہتے ہیں۔ گو کہ معاملہ اب تک
صرح گفتگو کی حد تک ہے مگر گفتگو جاری ہے اور یہ تحریک بھی
بند نہیں ہوتی۔

واخان کے بہت سارے کرغزی اب سابق سوویت
یونین کی آزاد ریاست کرغزستان کی ہجرت پر سوچ رہے
ہیں۔ وہ صاف ظاہر ہے۔ زبان ایک ہے اور صدیوں

اسے دونوں سے اس کا تنک کھار ہا ہوں، تنک حرامی کا ہوں
بردا احترا۔ اچھا نہیں لگتا!

خان کی گرہائی چراگاہ میں یہ دوسرا تیسرا دن تھا کہ
جب ایک اہم خبر پہنچی۔ کامل سے دوسرا کاروبار اچھتر
سروے کے لیے آئے تھے۔ وہ موجودہ سڑک کو اس کے
اختتام سے لے کر کرغز پہاڑوں تک توسیع دینے کی
خاطر ایک سروے کرنا چاہتے تھے۔ یہ خبر خان کے لیے
بہت خوش کن تھی۔

"سڑک تعمیر ہوگی تو پھر گھوڑوں کے بارے میں قین دن کا
سفر چند گھنٹے کا رہ جائے گا اور میں کاروبار بھی خرید لوں گا۔" یہ خبر
سن کر اس کا چہرہ ختم ہوا تھا۔ خان کو ایک بار پھر اپنا خواب
تعبیر سے قریب تر دکھائی دے رہا تھا۔ اسے اچھتروں سے
ملاقات کے لیے جانا تھا۔ یہ ملاقات خان کی حیثیت سے
ہونی تھی۔

ہم نیت میں بیٹھے تھے۔ دوسرے دن خان کو
اچھتروں سے ملاقات کے لیے بچے جانا تھا۔ اس کی
یہ کیا لو ہے کے صندوق سے خان کا بہترین لباس نکال
دی تھی۔ اسے خان کے سفر کی تیاری کرنا تھی۔ وہ خود بھی
اس کے ساتھ جانے والی تھی۔ اس نے اون سے بنا سرخ
رنگ کا بہترین لباس نکالا۔ واقعی اس پر بہت خوبصورت
اور دلکش پہول نے کھینچ دیے تھے۔ ساتھ ہی
چڑے کے لیے سفری جوتے، پر طوم کی ایک جھولی سی
بوتل اور سیاہ سفید رنگوں سے بنا دو پٹا۔ وہ سوار کی ڈلی
رکنا نہیں بھولی تھی۔ دوسری کرغز خواہش کی طرح وہ بھی
نوسرا استعمال کرتی تھی۔ سڑک بننے کی خوشخبری، شوہر کے
ساتھ بے لطف سفر یا نئی زندگی سے تھوڑا سا فرار۔۔۔۔۔
وہ بہت خوش تھی مگر میں اس کے خوش ہونے کی حقیقی وجہ
سمجھنے سے قاصر تھا۔

"سڑک بننے کی خبر سے سب ہی بہت خوش ہیں۔"
خان نے تھوڑے کی ہانسی بھرتے ہوئے کہا۔ میں نے گردن
گھما کر دیکھا۔ صندوق پر سر جھکا کر کھڑی اس کی بھئی بھی
سر ہلا کر شوہر کی تائید کر رہی تھی۔

دوسرے دن وہ سویرے سویرے سفر کے لیے تیار
ہو گئے۔ روانگی کے لیے گھوڑے پر سوار تھے۔ میں خدا حافظ
کہنے کے لیے کھڑا تھا۔ "اس بار سڑک بننے کے امکانات سو
فیصد ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ "دعا کرنا۔۔۔۔۔ اللہ
حافظ۔" اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

ملہنا مسرگشت

اس کا یہ سڑک ویش آٹھ دن روز کا تھا۔ اس دوران
میں مجھے تنہا ہی اس علاقے میں گھومنا پھرنا تھا۔ میں نے
اسے جانا دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ دعا کر رہا تھا کہ سڑک میں
جائے ورنہ کرغز جا بھی سکتے ہیں۔ میں نے وادی پر نظر
ڈالی۔ "اتنی اونچائی، سخت سردی اور مشکل ترین قدرتی
ماحول میں کرغز خانہ بدوش ہی رہ سکتے ہیں۔ یہ بھی چلے
گئے تو اب کوئی اور یہاں آ کر آباد نہیں ہونے والا۔"
"اے اللہ۔۔۔۔۔ اس بار تو سڑک بنا دے ورنہ۔۔۔۔۔" مجھے
یقین تھا کہ آگے کی بات اور والا کچھ چکا ہوگا۔ اتنی ہلندی
پر دیے ہی اللہ اور فطرت سے انسان کا تعلق زیادہ گہرا،
قریبی اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

میں ایک پہاڑی کے اوپر پہنچا۔ وہاں سے میں خان
کو بچے اترتا دیکھ سکتا تھا۔ وہ بہت احماد سے آڑے
ترجمے پہاڑی راستوں پر گھوڑا آگے بڑھا رہا تھا۔ اس کی
رکاوٹ دیکھ کر لگا کہ منزل پر پہنچنے کی ہلندی تھی۔ نھر آ رہا تھا
کہ وہ بس سڑک کے پتے دیکھتا تھا، اس بار حقیقت میں
بدلتے جا رہا ہے لیکن ایک ایسا ملک جہاں نیت فریت اور
پسماندگی ہو، جہاں امن کی حالت سبکی اور خانہ بدوش کی
جڑیں مضبوط ہو چکی ہوں، تمہاری سرگرمیاں کم اور مصیقت
پیداوار نہ ہونے کے برابر ہو، جہاں درآبادات تو بہت مگر
برآبادات کچھ خاص نہ ہوں وہیں ایک سڑک کی ترقی
تعمیر اور دھنکی خان کی سوچ کے عین مطابق ہے۔
ملک کی ضروریات اور ترجیحات کا کچھ شمار نہیں۔ خان نے
سڑک کی حیثیت کی مولیٰ تھی۔

وہ بے بھی افغانستان جیسے ملک میں ایک سڑک کی
تعمیر ہل کام نہیں، وہ بھی ایسی سڑک جسے دشوار گزار
پہاڑی علاقے میں چٹانوں کو تراش کر بنانا ہو۔ اس
برائیکوں شاید کروڑوں ڈالر کا خرچ ہوگا۔ خرچ کم نہیں
لیکن اس سے جو سہولتیں ملیں گی، ان کی قیمت بھی کم نہیں،
خاص طور پر ان کرغزیوں کے لیے جو ایک سڑک نہ ہونے
کے باعث تعلیم سے دور اور علاج کی سہولتوں سے محروم
ہیں، جس کے باعث وہاں شرح اموات خطرناک حد
تک زیادہ ہے۔ شاید ایک سڑک ان کی زندگی اور واخان
کی بٹی کے اس حصے میں موجود کرغز خانہ بدوش ثقافت کو
بچائے۔ شاید۔۔۔۔۔ یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ ہنوز
سڑک دور است!

اس روز خان کی غیر موجودگی میں سڑک کی بات

اکتوبر 2014ء

سامنے تھی۔ "یہ عمل نے ایک گھونٹ بھرا اور میری طرف دیکھا۔" یہاں کے لوگ سڑک چاہتے ہیں تاکہ گھولے کی پیٹھ کی بجائے کار کی نرم نرم گدیوں پر بیٹھ کر سفر کریں۔"

کھتے ہیں کہ اس سے انہیں خوشی ملے گی مگر....."

انہوں نے ہاتھ اٹھادی چھوڑی تو میں نے ساری نظروں سے دیکھا۔ وہ سمجھ گئے تھے، وہ بارہا بات شروع کرتے تھے۔ یہ جگہ بہت خوبصورت ہے۔ ہم ایک بڑے خانہ آواز کی بصورت، یہاں امن اور پیار سے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے امن مقام ہے۔"

پہلے کے بعد میرے ہاتھم تصور میں خان ابھر آیا۔ سرخ گھولے کو اچ لگا کر تیزی سے دوڑاتے ہوئے وہ سڑک کا سروے کرنے والے انجینئروں سے ملنے چلا ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اُن آواز سے نرمی پھاڑی راستوں پر ملے۔ حافی، ہموار اور خوبصورت سڑک، دھبے، جس پر خان اپنا کار دوڑا رہا تھا۔ حافی نے شے لپٹے تھے۔ تیز ہوا سے اس نے لمبے پال لہرا رہے تھے۔ اندر سے سڑک بچ رہا تھا۔

میر علی کی باتیں سننے کے بعد میں بھی اب اس کی اور انداز سے سوچ رہا تھا۔ چلو! خان کا خواب پورا ہو جائے۔ سڑک بن جائے، وہ اس پر اپنی کار بھی دوڑائے لیکن..... ان کرغز خانہ بدوشوں کا کیا ہوگا..... بھڑوں، پاک، رنگ، رنگ، قلعین اور نرے والے آزاد منشی کرغز جنہیں اپنی ثقافت پر ناز ہے۔ وہ جو پچھلے دو ہزار برس سے دنیا کے سخت ترین سرد موسم والے علاقے میں خانہ بدوش زندگی بسر کرنے کے باوجود اب تک خود کو معدوی سے محفوظ رکھے بیٹھے ہیں۔ کیا ایک سڑک بننے کے بعد، ہزار ہا سال سے محفوظ یہ خانہ بدوش قبیلہ تہذیبوں کی زد سے خود کو محفوظ رکھ پائے گا۔

"یہ ر..... میں میر علی کی آواز سن کر چونکا۔ میری طرف قبوہ کی بیانی بڑھائی۔ "ہم اب تک محفوظ ہیں اور اس کی وجہ ہر وہی دنیا میں خود کو گم نہ کرنا ہے مگر ایک سڑک..... ہمیں افغانستان پر وہی تسلط نے ختم نہیں کیا مگر کابل کے حکمرانوں کے یہ وہ انجینئر شاہیہ ہمارے خاتمے کا آغاز کر دیں گے۔"

سامنے بیٹھے بزرگ میر علی کا چہرہ گرم گرم قبوہ سے اٹھنے والی بھاپ میں اٹھلا رہا تھا۔

میر علی تھی اور میر علی بھی ساتھ تھے۔ "سڑک کی تعمیر کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔" میں نے اُن سے اتفاق کیا۔

"میر علی تھے کہ جب موجودہ خان کے والد زندہ تھے جب بھی ان کی کوششوں سے ایک بار کابل کے سرکاری انجینئر سڑک بنانے کے لیے سروے کرنے پہنچے تھے مگر....."

انہوں نے سامنے پہاڑ کی طرف خود سے دیکھا اور پھر چہرہ میری طرف کیا۔ "اُس وقت بھی سروے ہوا تھا وہ خان بھی بہت خوش تھیں۔" اس نے کھائی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم اب بھی گھولے، قر..... نے ہیں۔ اس بار بھی سروے ضرور ہوگا۔" باب کا بیٹا آسان نہیں۔ "وہ نئے خان کا جوش جانتے تھے۔ ان کی دعائیں اُسی کے ساتھ تھیں مگر پرانے خان کا تجربہ یادداشت سے محو نہیں ہوا تھا۔ "سڑک کا بیٹا آسان نہیں۔" یہ سن کر میں نے بھی سر ہلا دیا تھا۔ اب یہ علم نہیں کہ تائید میں ہلا تھا یا تردید میں۔

ویسے میر علی اور خان کی سوچ میں کافی فرق تھا۔ خان کے لیے سڑک اور کار اہم تھی لیکن یہ کچھ اور بھی سوچتے تھے۔ "سڑک آسانوں کے ساتھ اپنے مسائل بھی لے کر آتی ہے۔" انہوں نے قبوے کی پانی میری طرف بڑھائی۔ "بھئی، سڑک بننے کی تو سب کچھ نہیں کی مگر اس کے ساتھ ہی یہاں فوج اور انتہائی سیاح بھی پہنچیں گے۔ زندگی تو سب کچھ نہیں آتا تو تھارے نو جوان اور آنے والی نسلیں بھی شہریوں کی طرح تن آمان اور ست ہو جائیں گے۔ ہمارے کھانے پینے، رہنے، رہنے، رشتے، تعلیم..... سب کچھ بدل سکتا ہے۔" سڑک انسان کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہے۔ اتنا گہرا کہ وہ صدیوں پرانی ایجاد کی روایت اور اپنی ہزار ہا برس قدیم ثقافت..... آہستہ آہستہ سب سے لاپتہ ہوتا چلا جاتا ہے۔"

میں سمجھ چکا تھا۔ اسے عام طور پر جرنیشن کیپ (نسلیں) کہا جاتا ہے (فرق) کہتے ہیں۔ خان کے لیے کار اہم نہیں ہے۔ سڑک لیکن لگ بھگ پوری زندگی کے لیے ہے۔ اُن کے جہاں وہ میر علی کے واسطے اب سب کچھ نہیں ہے۔ ثقافت اور اجداد کے ریت و لاج زیادہ عزیز ہے۔ میری اور خان ساتھ ساتھ تھے مگر دونوں کی سوچیں اپنے اپنے دائرے میں تھیں۔

اس کے بعد کافی دیر تک ریت میں خاموشی طاری رہی۔ آخر قبوے کی جھک میں حقیقت کی دنیا میں واپس لائی۔ بھاپ اڑاتے خوشبو گرم گرم قبوے کی بیانی

ماہنامہ سرگزشت

اگست 2014

64

ابن سیر کے لیے ایک اہمیت کی حامل تحریر

یوم آزادی

14 یا 15 اگست

عقیل عباس جعفری

ہم عرصہ سے ایسی الجھن میں گرفتار ہیں کہ پاکستان کی تاریخ آزادی کون سی ہے۔ 14 اگست 1947ء بروز جمعرات بمطابق 28 رمضان یا 27 رمضان یعنی 15 اگست؟ اس معما کو حل کرنے کے لیے تحقیق کا باب کھولا گیا۔ اب آپ خود ملاحظہ کریں کہ اصل تاریخ کیا ہے۔ تمام ثبوت و شواہد سامنے رکھ دیے ہیں۔

پاکستان کو آزاد ہونے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس طویل عرصے میں ہم اپنی تاریخ کے کتنے ہی گوشوں سے ناواقف رہے۔ ہم اپنی یوم آزادی کی تقریبات ہر سال 14 اگست کو اور ہمارے ساتھ آزاد ہونے والا ہمسایہ ملک بھارت اپنی یوم آزادی 15 اگست کو مناتا ہے۔ ہر سال یہ سوال اٹھتا ہے کہ دو ملک جو ایک ساتھ آزاد ہوئے ہوں ان کے یوم آزادی میں ایک دن کا فرق کیسے آگیا؟ اپنی اس تحریر میں ہم نے اسی معما کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔



اگست 2014ء

65

ماہنامہ سرگشت



قائد اعظم محمد علی جناح دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے

کی تاریخ 15 اگست 1947ء کیوں طبع ہوئی اور اگر پاکستان 15 اگست 1947ء کو آزاد ہوا تو ہم نے آزادی کی پہلی سالگرہ 15 اگست کی بجائے 14 اگست 1948ء کو کیوں منائی؟ اور آج تک یہ سالگرہ 15 کی بجائے 14 اگست کو کیوں مناتے چلے آ رہے ہیں؟

آج ہم اپنی اس تحریر میں اسی ”سبب“ کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ پاکستان اصلاً آزاد کب ہوا۔

اس سلسلے میں سب سے اہم دستاویز Indian Independence Act 1947ء ہے جسے برطانوی پارلیمان نے منظور کیا اور جس کی توثیق شہنشاہ برطانیہ جارج ششم نے 18 جولائی 1947ء کو کی۔ اس قانون کی ایک نقل پاکستان کے سیکریٹری جنرل چودھری محمد علی نے (جو بعد ازاں پاکستان کے وزیر اعظم بھی بنے) 24 جولائی 1947ء کو قائد اعظم کو ارسال کی۔

یہ قانون 1983ء میں حکومت برطانیہ کی شائع کردہ دستاویز The Transfer of Power کی جلد 12

نمبر سے بزرگ نہیں بتاتے ہیں کہ پاکستان برصغیر کی 27 ویں شپ کو آزاد ہوا اور یہ کہ جس دن پاکستان آزاد ہوا اس دن جمعہ الوداع کا مبارک دن تھا پھر ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اس دن 14 اگست 1947ء کی تاریخ تھی اور ہم اپنے ساتھ آزاد ہونے والے ملک سے ایک ”دن بڑے“ ہیں۔ جب ہم 14 اگست 1947ء کی تقویم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دن تو جمعرات تھی اور ہجری تاریخ بھی 27 ذی قعدہ 1366ھ تھا۔ پھر ہم پاکستان کے پہلے ڈاک ٹکٹ دیکھتے ہیں جو پاکستان کی آزادی کے 11 ماہ بعد 9 جولائی 1948ء کو جاری ہوئے تھے۔ ان ڈاک ٹکٹوں پر واضح طور پر پاکستان کا پرچم آزادی 15 اگست 1947ء طبع ہوا ہے۔ ہم پھر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پاکستان کا پرچم آزادی بھی 14 ذی قعدہ 1366ھ 15 اگست 1947ء ہے مگر پھر پرچم آزادی کی پہلی سالگرہ 14 اگست 1948ء کو کیوں منائی گئی؟ ہمیں ذہن ایک مروجہ پھر الجھ جاتا ہے کہ پاکستان آزاد کب ہوا تھا۔ 14 اگست 1947ء کو یا 15 اگست 1947ء کو.....

اگر ہم 14 اگست 1947ء کو آزاد ہوئے تو آزادی کے گیارہ ماہ بعد شائع ہونے والے ڈاک ٹکٹوں پر پرچم آزادی

hereafter in the Act referred to as "the new Dominions", and the said fifteenth day of August is hereafter in this Act referred to as "the appointed day"

اس قانون کے سلسل میں چل رہی ہونے والے چند اور احکامات ملاحظہ ہوں جن کے اقتباسات اور ترجمہ ضیاء المذہب لاہوری نے اپنے مضمون "مہم آزادی: جمعۃ المبارک 27 رمضان 15 اگست" مشمولہ جریہ 36 - شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی میں شامل کیا ہے

☆ 7 اگست 1947ء: اقوام متحدہ میں برطانیہ کے مستقل نمائندے کے نام دفتر خارجہ کا تار:



15 اگست 1947ء کو لاہور میں پاکستان کے پہلے وزیر جنرل کے عہدہ سنبھالتے ہوئے



روزنامہ ڈان، کراچی کا 15 اگست 1947ء کا شمارہ

کے صفحہ 234 پر اور اس کا ترجمہ قاضی عظیم بھیر پرچک کیبٹ ڈویژن حکومت پاکستان اسلام آباد کے شائع کردہ جناح بھیر (کے اردو ترجمے) کی جلد سوم کے صفحہ 45 سے صفحہ 72 تک ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس قانون میں واضح طور پر درج ہے۔

1- (1) 15 اگست 1947ء سے برطانوی ہندوستان میں دو آزاد فرماں بردار مملکتیں قائم کی جائیں گی جو بالترتیب اظہار اور پاکستان کے نام سے موسوم ہوں گی۔

(2) بعد ازاں اس قانون میں "ان مملکتوں" سے مطلب نئی مملکتیں اور "مقررہ دن" سے مراد 15 اگست کی تاریخ ہوگی۔

لر انسرف آف پاؤر جلد 12 کے صفحہ نمبر 234 پر اصل تحریر لکھی ہوئی ہے:

Indian Independence Act, 1947

1-(1) As from the fifteenth day of August, nineteen hundred and forty seven, two Independent Dominions shall be set up in India, to be known respectively as India and Pakistan.

(2) The said Dominions are

"اب دوسرا نے نے تار بھیجا ہے کہ سلطان قائدین اقوام متحدہ کی رکنیت کے لیے درخواست دینے کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ برطانیہ فوری طور پر پاکستان کی طرف سے درخواست دائر کرے اور جب پاکستان 15 اگست کو ایک آزاد مملکت بن جائے گا تو وہ اس کی توثیق برادر است خود کرے گا"۔ (صفحہ: 570)

☆ 12 اگست 1947ء (ہندوستان اور پاکستان کی رکنیت کے استحقاق پر یکہ طریت اقوام متحدہ کے میمورنڈم کی پریس ریلیز سے ایک اقتباس)

پاکستان کی آزادی کا اعلان

پاکستان کی آزادی کا اعلان 15 اگست 1947ء کو کیا گیا۔ اس وقت پاکستان کی سرحدیں اور دارالحکومت کا نام بھی طے نہیں کیا تھا۔

پاکستان کی آزادی کا اعلان 15 اگست 1947ء کو کیا گیا۔ اس وقت پاکستان کی سرحدیں اور دارالحکومت کا نام بھی طے نہیں کیا تھا۔

پاکستان کی آزادی کا اعلان 15 اگست 1947ء کو کیا گیا۔ اس وقت پاکستان کی سرحدیں اور دارالحکومت کا نام بھی طے نہیں کیا تھا۔

”قانون آزادی ہند قرار دیتا ہے کہ اگست 1947ء کی 15 تاریخ کو ہندوستان میں دو آزاد ملک تیار ہوں گے۔ ایک پاکستان اور ایک ہندوستان۔ نام سے قائم ہوں گے۔“

حکومت برطانیہ نے یہ اعلان تو کر دیا کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ایک ہی وقت یعنی 15 اگست 1947ء کو طر سامت پر آزاد ہوں گے مگر مسئلہ یہ ہوا کہ لارڈ مائونٹ بیٹن کو 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب نئی دہلی میں ہندوستان کی آزادی کا اعلان کرنا تھا۔ منتخب حکومت کو اقتدار منتقل کرنا تھا اور خود آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنا تھا۔

مسکے کامل یہ نکالا گیا کہ لارڈ مائونٹ بیٹن 13 اگست 1947ء کو کراچی تشریف لائیں اور 14 اگست 1947ء کی صبح پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے

پاکستان کی آزادی کا اعلان

15 اگست 1947ء کو لارڈ مائونٹ بیٹن نے پاکستان کی آزادی کا اعلان کیا۔ اس وقت پاکستان کی سرحدیں اور دارالحکومت کا نام بھی طے نہیں کیا تھا۔

پاکستان کی آزادی کا اعلان 15 اگست 1947ء کو کیا گیا۔ اس وقت پاکستان کی سرحدیں اور دارالحکومت کا نام بھی طے نہیں کیا تھا۔

پاکستان کی آزادی کا اعلان 15 اگست 1947ء کو کیا گیا۔ اس وقت پاکستان کی سرحدیں اور دارالحکومت کا نام بھی طے نہیں کیا تھا۔

انتظار انتظار کی کارروائی مکمل کریں اور یہ اعلان کریں کہ اس رات یعنی 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب پاکستان ایک آزاد ملک بن جائے گا۔

چنانچہ یہی اسی ہوا 13 اگست 1947ء کو لارڈ مائونٹ بیٹن کراچی تشریف لے آئے اور اسی رات کراچی کے گورنر جنرل ہاؤس میں ان کے اعزاز میں ایک عشاءِ دوپہا گیا جس سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم محمد علی جناح نے فرمایا:

”میں ملکِ عظیم کی صحت کا جامِ نجویز کرتے ہوئے بے حد مسرت محسوس کرتا ہوں۔ یہ ایک نہایت اہم اور منفرد موقع ہے۔ آج ہندوستان کے لوگوں کو مکمل اقتدار منتقل ہونے والا ہے اور 15 اگست 1947ء کے مقررہ دن دو آزاد اور خود مختار ملک تیار ہوں گے اور ہندوستان معرضِ وجود میں آجائے گی۔ ملکِ عظیم کی حکومت کے اس فیصلے سے وہ اپنی دلچسپی و توجہ کو پاکستان کی طرف متوجہ کرے گا جو دولتِ مشترکہ کے قیام کا واحد متحد قرار دیا گیا تھا۔“

اگلے روز جمعرات 14 اگست 1947ء مطابق 26 رمضان المبارک 1366ھ کی صبح 9 بجے موجودہ دستور ساز اسمبلی بلاڈنگ میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا خصوصی اجلاس شروع ہوا۔

صبح سے ہی ملک کے سارے پڑ چوڑ عوام جمع تھے۔ جب پاکستان کے موجود گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی

اگست 2014ء



پاکستان - پندرہ سال تک سرگرمی میں رہا ہے۔ 15 سال پہلے 1947ء میں قائم ہوا۔

مثال ہے۔ میں تو قیام رکھتا ہوں کہ برطانوی دولت مشترکہ کے تمام ارکان، جمہوری اصولوں کو سر بلند رکھنے میں آپ کا ساتھ دیتے ہیں۔

اسی پیغام کے بعد لاہور میں پندرہ سال پہلے کے الوداعی تقریر کی اور پاکستان اور پاکستانی عوام کی سلامتی کے لیے دعا کی۔ اپنی اس تقریر میں لاہور میں پندرہ سال پہلے کے واضح الفاظ

تھا تھا، آج میں آپ سے آپ کے واسطے کی حیثیت سے خطاب کر رہا ہوں، کل نئی اور نئی پاکستان کی حکومت کی باگ و بار آپ کے ہاتھ میں ہوگی اور میں آپ کی ہمسایہ ڈومین آف انڈیا کا آئینی سربراہ ہوں گا۔ دونوں حکومتوں کے قائدین نے مجھے جوائنٹ وینس کونسل کا غیر جانبدار چیئرمین بننے کی دعوت دی ہے یہ میرے لیے ایک اعزاز ہے جس پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔

کل روٹی خود مختار ریاستیں دولت مشترکہ میں شامل ہوں گی، یہ نئی اقوام ہوں گی بلکہ یہ قدیم قومن خیرتوں کی

جناح لاہور میں پندرہ سال پہلے میں ایک خصوصی جلسے میں سوار اسٹیبل ہال پہنچے تو عوام نے بے جوش نعروں اور تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ اسٹیبل کی تمام نشستیں بے گھری میں ممتاز شہریوں، سیاست دانوں، عدلی اور غیر ملکی اخباری نمائندوں کی بھاری تعداد موجود تھی۔ کرنی صدارت پر دستور ساز اسٹیبل کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح تشریف فرما تھے اور ان کے برابر میں لاہور میں پندرہ سال پہلے کی نشست تھی۔ وہاں ان کے باب اپنی اپنی نشستیں سنبھالیں تو کارروائی کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔

سب سے پہلے لاہور میں پندرہ سال پہلے کے شاہ انگلستان کا پیغام پڑھا کر سنایا جس میں قائد اعظم کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا تھا

”برطانوی دولت مشترکہ کی قوم کی صف میں شامل ہونے والی نئی ریاست کے قیام کے عظیم موقع پر میں آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ نے جس طرح آزادی حاصل کی ہے وہ ساری دنیا کے حریت پسند عوام کے لیے ایک

My dear Shauk Ali,

You asked me some days back whether the United Nations should be asked to decide whether the 14th August should be celebrated on the 14th August or on the 15th August. I write to confirm that the intention is that our Independence Day should be celebrated on the 14th and succeeding years on the 14th August. I trust you will take steps to inform everybody concerned.

Yours sincerely,

(S. S. Ali)

S. S. Ali, Secretary,
Ministry of Education.

وہی نگر ہادی سید احمدی کے نام سید خان علی کا مراسلہ جس میں مندرجہ بالا ہے کہ
15 اگست کی بجائے 14 اگست کو ہمارا آزادی کا دن منایا جائے گا اور اس پر عمل کیا جائے گا۔

اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب رات 12 بجے دنیا کے نقشے پر ایک آزاد اور خود مختار اور دنیا کے اسلام کی سب سے بڑی مملکت کا اضافہ ہوا۔ جس کا نام پاکستان تھا۔

یعنی اسی وقت لاہور، پشاور اور ڈھاکہ سے پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس سے پاکستان کی آزادی کا اعلان ہوا۔ اس سے قبل 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی رات لاہور، پشاور اور ڈھاکہ اسٹیشنوں سے رات 11 بجے آل انڈیا ریڈیو سروس نے اپنا آخری اعلان نشر کیا۔ 12 بجے سے پہلے سے پیپرز ریڈیو پاکستان کی شناختی دھن بجانی لگی اور تقسیم ہند کی آواز میں انگریزی زبان میں فضا میں ایک اعلان گونج آیا۔ رات کے وقت پاکستان کی آزاد اور خود مختار مملکت معرض وجود میں آجاتی گی۔ رات کے ٹھیک 12 بجے ہزاروں مساجد میں گانوں میں پہلے انگریزی اور پھر اردو میں یہ الفاظ گونجنے لگے۔ "یہ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس ہے۔"

انگریزی میں یہ اعلان گھبراہٹ اور ہراسہ میں مصطفیٰ علی بدلتی نے کیا۔ اس اعلان کے فوراً بعد مولانا ابوالفتح کی نے قرآن مجید کی سورہ فتح کی آیات تلاوت فرمائیں۔ جس کے بعد ان کا ترجمہ نشر کیا گیا بعد ازاں خواجہ خورشید انور کا مرتب کیا ہوا ایک خصوصی سازیدہ بھلا گیا پھر سنتو خاں امدان کے ہم نوائے توالی میں علامہ اقبال کی نظم ساقی نامہ کے چند بند پیش کئے۔ ان نشریات کا اختتام حفیظ ہوشیار پوری کی ایک تقریر پر ہوا۔ آدھی رات کے وقت علی ریڈیو پاکستان پشاور سے کتاب احمد نیکل نے امداد میں نور محمد اللہ جان مقوم نے پشتو میں پاکستان کے قیام کا اعلان کیا جبکہ قرآن پاک کی تلاوت کا شرب محمدی

اگست 2014ء

دارت اقوام ہیں۔ ان کھل طور پر آزاد ریاستوں کے لیڈر بڑے دھڑے ہیں۔ دنیا بھر کی نگاہوں میں احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کے شاعروں، مکتف دانوں، سیاست دانوں اور انوار نے انسانیت کی خدمت کے لیے ناقابل فراموش خدمات سر انجام دی ہیں۔ ان ریاستوں کی حکومتیں نا تجربہ کار اور کمزور نہیں ہیں بلکہ دنیا بھر میں قیام امن اور ترقی کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیتیں رکھتی ہیں۔"



لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنی تقریر کا آغاز کیا انہوں نے سب سے پہلے شاہ انگلستان اور دیگر سربراہان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں یقین دلایا کہ:

"ہمارا ہمسایوں سے بہتر اور دوستانہ تعلقات کا جذبہ کبھی کم نہ ہوگا اور ہم ساری دنیا کے دوست رہیں گے۔"

اسٹیج کی کارروائی اور اعلان آزادی کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سربراہان کی مجلس میں گورنر جنرل ہاؤس واپس ہوئے۔ دیکھو وہ بجے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نئی دہلی روانہ ہو گئے جہاں ہی رات 12 بجے بھارت کی آزادی کے اعلان کے ساتھ انہیں بھارت کے گورنر جنرل کا منصب سنبھالنا تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اعلان آزادی کے مطابق 14

میلینا مصر گزشت

GOVERNMENT OF PAKISTAN,
Ministry of Interior,
Karachi.

Karachi, the 14th July, 1947.

NOTIFICATION

In exercise of the powers conferred by section 25 of the Negotiable Instruments Act (Act XXVI of 1911), the Government of Pakistan is pleased to declare the 14th August 1947, the day on which the anniversary of the birth of Pakistan will be celebrated, as a public holiday throughout the Dominion of Pakistan for the purposes of the said Section of the said Act.

امید علی، ایڈیٹر، حکومت پاکستان کا جاری کردہ حکم نامہ
Deputy Secretary to the Govt. of Pakistan.

کے ساتھ میں آپ کو تہنیت کا پیغام دیتا ہوں۔ 15 اگست آزادی اور خود مختار پاکستان کی پیدائش کا دن ہے۔ یہ مسلم قوم کی منزل مقصود کی علامت ہے جس نے بچپنے چند برسوں میں اپنے وطن کے حصول کے لیے عظیم قربانیاں پیش کیں۔ اپنے اس خطاب میں قائد اعظم نے پاکستان کے قیام شہریوں کو پاکستان کی خود مختار حکومت کے قیام کی مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اس نئی حکومت کے وجود میں آنے سے پاکستان کے باشندوں پر بہت بڑا فائدہ ہوگا اور یہاں قائم ہونے والے ایک نیا اور بے پارت کردار پائے گئے کہ کس طرح ایک قوم، جس میں مختلف مذاہب شامل ہیں، آپس میں مل جل کر متحد و متفق رہے۔

اسی دن یعنی 15 اگست 1947ء کی صبح اخبارات پاکستان کے عام آزادی کے حوالے سے خصوصی شمارے شائع

نہا محمد نے حاصل کیا۔ ان شریات کا اختتام جناب احمد نعیم قاسمی کے لکھے ہوئے ایک نئے پر ہوا جس کے بول تھے "پاکستان بنانے والے پاکستان سہاگ ہو۔"

اسی وقت اسی قومیت کا اعلان ریڈیو پاکستان (حاکم) سے انگریزی میں کلیم اللہ نے کیا جس کا ترجمہ بھگوان میں نشر کیا گیا۔

15 اگست 1947ء کی صبح ریڈیو پاکستان لاہور کی ٹرانسمیشن کا آغاز آٹھ بجے ہوا۔۔۔۔۔ آل عمران کی آیت آیت سے ہوا۔۔۔۔۔ آیت تراتی کی تلاوت کے بعد انگریزی خبروں کا آغاز ہوا اور یہ آیت تلاوت کرنے پر ہر شخص نے ہر صبح۔ خبروں کے بعد ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے قائد اعظم کی آواز میں ایک پیغام سنوایا گیا۔ جو پہلے سے ریکارڈ شدہ تھا۔ (قائد اعظم کے اس خطاب کی آڈیو کاپ یہ ٹیپ پر موجود ہے۔) قائد اعظم کی تقریر کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا:

"It is with feelings of greatest happiness and emotion that I send you my greetings. August 15 is the birthday of the independent and sovereign State of Pakistan. It marks the fulfilment of the destiny of the Muslim nation which made great sacrifices in the past few years to have its homeland."

(ترجمہ: سبھی پاؤں صرست اور احساس کے جذبات)
ماہنامہ سرگزشت

GOVERNMENT OF PAKISTAN
MINISTRY OF INTERIOR
Karachi, the 14th July, 1947.

NOTIFICATION

In exercise of the powers conferred by section 25 of the Negotiable Instruments Act (Act XXVI of 1911), the Government of Pakistan is pleased to declare the 14th August 1947, the day on which the anniversary of the birth of Pakistan will be celebrated, as a public holiday throughout the Dominion of Pakistan for the purposes of the said Section of the said Act.

Deputy Secretary to the Govt. of Pakistan.

کی جن سالانہ تعطیلات کا اعلان کیا ان میں 1948ء کے لیے یوم پاکستان کی تعطیل کے آٹے 15 اگست 1948ء کی تاریخ درج تھی (یہ مراسلہ پیش وزیر پینشن سیکرٹری اسلام آباد میں محفوظ ہے۔)

1948ء کی پہلی سہ ماہی میں پاکستان کے ٹکڑاؤں نے پاکستان کے ابتدائی ڈاک ٹکٹوں کی ڈیزائننگ اور طبعیت کے کام کا آغاز کیا۔ یہ چار ڈاک ٹکٹوں کا سیٹ تھا جن کے ابتدائی ٹین ڈاک ٹکٹ ایکسٹرنل پبلیشنگ ڈپارٹمنٹ کے مصوروں رشید الدین اور محمد لطیف نے مشترکہ طور پر ڈیزائن کیے تھے

PAKISTAN TIMES

Founded by Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah

Pakistan Broadcasting Service to take over 3 stations

The three radio stations in Pakistan - Lahore, Peshawar and Ferozepur - will be taken over by the Pakistan Broadcasting Service as indicated tonight.

The Lahore station has arranged to broadcast all sports programmes on the radio in Urdu. The birth of Pakistan the 15th August will be on the air from midnight to 1 a.m.

At 11 in the same morning Peshawar is recorded with a programme from Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah to the people of Pakistan will be broadcast. Dawn and Peshawar will also broadcast this message - APF

جبکہ چوتھا ڈاک ٹکٹ اور اس کے ساتھ شائع ہونے والا نوٹدر ملک کے عظیم مصور عبدالرحمن چغتائی کی تخلیق تھا۔ یہ ڈاک ٹکٹ برطانیہ کے طبعاتی ادارے سے مسرز ڈاکس ڈی لارڈ میں طبع ہوئے تھے۔ یہ ڈاک ٹکٹ 9 جولائی 1948ء کو فروخت کے لیے پیش کیے گئے اور ان پر بھی پاکستان کے یوم آزادی کی چوری 15 اگست 1947ء شائع کی گئی تھی۔

گویا 9 جولائی 1948ء تک یہ بات طے تھی کہ پاکستان 15 اگست 1947ء کو آزاد ہوا تھا۔ پاکستان کا یوم

کیے اور انگریزی کے مشہور اخبار "ڈان" نے کراچی سے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ اس خصوصی اشاعت کی سرٹی Max Pakistan Prosper Always" Lord Mount Batten اس سرٹی کے نیچے جو خیر شائع ہوئی تھی اس میں لاہور ڈاک ٹکٹ کی اس تقریر کا مکمل متن درج کیا گیا تھا جس کا اقتباس لوہر تحریر کیا جا چکا ہے۔ روزنامہ ڈان نے اس موقع پر 32 صفحات پر مسلسل ایک خصوصی ضمیر بھی شائع کیا تھا جو ہمارے ذاتی کتب خانے میں بھی محفوظ ہے اور یہ خوب یہ بھی 15/8/1947ء کو کرناٹک کرناٹک کیا جاسکتا ہے۔

ڈان کے اس ضمیمے میں قائد اعظم محمد علی جناح کا ایک پیغام بھی شامل تھا جو 10 نورنگ زیب روڈ، نئی دہلی سے جاری کیا گیا تھا۔ اس پیغام پر اس کے اجرا کی تاریخ درج نہیں ہے مگر یہ بات یقینی ہے کہ یہ پیغام 7 اگست 1947ء سے پہلے جاری ہوا تھا۔ اس پیغام میں قائد اعظم محمد علی جناح نے کہا:

"The first issue, I am informed will appear from Karachi, the capital of Pakistan on the 15th of August, the appointed day."

(ترجمہ: مجھے بتایا گیا ہے کہ (روزنامہ ڈان کا) پہلا شمارہ پاکستان کے دارالحکومت کراچی سے 15 اگست کو، جو مقررہ دن ہے، شائع کیا جائے گا)

اسی دن "ڈان" 15 اگست 1947ء کو پاکستان کا پہلا نمبر بھی جاری ہوا جس میں قائد اعظم محمد علی جناح کی بطور گورنر جنرل پاکستان مقرر کیے جانے اور اسی دن سے ان کا یہ عہدہ سنبھالنے کی اطلاع درج تھی۔ اسی روز لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جسٹس عبدالرشید نے قائد اعظم محمد علی جناح سے پاکستان آنے سے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف لیا اور اسی روز لاہور دارالحکومت علی خان کی قیادت میں پاکستان کی پہلی کابینہ کے ارکان نے بھی اپنے عہدوں کے حلف اٹھائے۔

ان تمام معروضات اور دستاویزی شہادتوں سے یہ بات پابین ثبوت کو پہنچتی ہے کہ پاکستان 14 اگست 1947ء کو نہیں بلکہ 15 اگست 1947ء کو معرض وجود میں آیا تھا۔

پاکستان کے قیام کے پہلے برس کسی کو اس معاملے میں اہم نہیں تھا کہ پاکستان سب آزاد ہوا؟ اس بات کو تسلیم یہ اس چیز سے بھی ملتی ہے کہ 19 دسمبر 1947ء کو پاکستان کے اندر داخلہ نے اپنے مراسلے 47/17 کے ذریعہ 1948ء



ایشاق خان



مصطفیٰ علی جعفری



ظہور آذر



قائدِ ذہن: قاضی

میں۔ جس میں وزیر خارجہ، وزیر مواصلات، قانون و صحت، وزیر مہاجرین و آباد کاری، وزیر خوراک، زراعت و صنعت اور وزیر داخلہ، اطلاعات و نشریات موجود تھے، فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان کے پہلے ایم آزادی کی تقریبات 15 اگست 1948ء کی بجائے 14 اگست 1948ء کو منائی جائیں۔ وزیراعظم لیاقت علی نے کابینہ کو بتایا کہ یہ فیصلہ حتیٰ نہیں ہے یہ معاملہ قائداعظم محمد علی جناح کے حکم میں نہیں ہے اور جو بھی فیصلہ ہوگا قائداعظم کی منظوری کے بعد ہوگا۔

وہ قائل جس میں یہ تفصیل درج ہے اس کا نمبر ہے 196/CF/48 اور کیس کا نمبر ہے 393/54/48۔ اس قائل میں انگریزی میں درج کارروائی میں تحریر ہے:

The Hon'ble the Prime Minister undertook to convey to the Quaid-i-Azam the suggestion that our Independence Day celebrations should be held on the 14th rather than the 15th August.

(ترجمہ: معزز وزیراعظم نے یہ اہم کاری سنجالی ہے کہ وہ قائداعظم تک یہ تجویز پہنچائیں کہ ہماری ایم آزادی کی تقریبات 15 اگست کی بجائے 14 اگست کو منائی جائیں) اس قائل میں یہ تحریر نہیں کہ اس تجویز کا محرک کون تھا اور ایم آزادی کی تقریبات 15 کی بجائے 14 اگست کو منائے جانے کے حق میں کیا دلائل پیش کیے گئے تھے۔ کارروائی کے آخر میں بریکٹ میں تحریر ہے:

Quaid-i-Azam has approved the suggestion.

(قائداعظم نے تجویز کو منظور کر لیا)

آزادی 15 اگست سے 14 اگست کو ہو، یہ معاملہ کرنے کے لیے ہم نے نیشنل ڈاکیومنٹیشن سینٹر، کیننٹ ڈیوڈن، اسلام آباد کے دروازے پر دستک دی۔ وہاں ہماری ملاقات اس سینٹر کے لائبریکٹر جناب قمرالزمان سے ہوئی۔ جن کی مدد سے ہماری دہائی اس سینٹر میں محفوظ ان فائلوں تک ہوئی جو ایک طریقہ کار سے تک خفیہ رہنے کے بعد اب عوام کے لیے کھول دی گئی ہیں۔

ان فائلوں کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوا کہ منگل 29 جون 1948ء کو کراچی میں وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کی زیر صدارت منعقد ہونے والے کابینہ کے ایک اجلاس



قائداعظم، نوابزادہ لیاقت علی خان اور دیگر وزرا آزادی کے بعد ملائی لیتے ہوئے

پاکستان کی تمام وزارتوں، تمام ڈیویژنوں، کیبنٹ سیکریٹری، دستور ساز اسمبلی، قائد اعظم کے پرائیویٹ اور پبلیک سیکریٹری، اکاؤنٹس جنرل پاکستان ریونیو، آڈیٹر جنرل آف پاکستان اور بھارت میں پاکستان کے ہائی کمشنر کو مطلع کر دیا جائے۔

فائل میں محفوظ اگلے حکم نمبر 14 جولائی 1948ء کو جاری ہوا اور اس کا ڈی او نمبر ہے 390/CB/48۔ اس میں ایس (شہادت) مٹن علی نے (اپنی سیکریٹری نو دی کیبنٹ) نے وزارت داخلہ کے ڈپٹی سیکریٹری خان بہادر سید احمد علی کو مخاطب کیا ہے اور انہیں مطلع کیا ہے۔

(ترجمہ): "آپ نے چند روز قبل کابینہ کے اس فیصلے کے بارے میں کہ پاکستان کی یوم آزادی کی تقریب 14 اگست کو منائی جائے گی، دریافت کیا تھا کہ کیا یہ فیصلہ صرف اس سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے ہے۔ میں آپ کو بالخصوص بتانا اور تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ نہ صرف اس سال بلکہ آئندہ ہمیشہ یہ تقریب 14 اگست کو منائی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہر متعلقہ شخص کو اس فیصلے سے مطلع فرما دیں گے۔"

کابینہ کے اس فیصلے پر عمل درآمد ہوا اور ملک بھر میں پاکستان کے پہلے یوم آزادی کی تقریبات 14 اگست 1948ء کو منائی گئیں۔ تاہم روزنامہ ڈان نے یوم آزادی کے حوالے سے اپنا پہلا سالنامہ جو 100 صفحات کے خصوصی نمبر کی صورت میں شائع کیا گیا تھا 14 کی بجائے 15 اگست 1948ء میں کو شائع کیا۔

(شاید اس کا ایک سبب یہ ہو کہ اس سال 15 اگست کو اتوار کا دن تھا اور یہ دن کسی اخباری نمبر کی اشاعت کے لیے نہایت موزوں تھا)

پیشگی ڈاکیومنٹیشن سینٹر میں ایک فائل 360/CF/48 بھی محفوظ ہے جس میں 1948ء میں منائی جانے والی سالانہ تعطیلات کی تفصیل درج ہے۔ اس فائل کے مطابق 1948ء میں یوم پاکستان کی چھٹی 14 اگست 1948ء کو دیے جانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس برس روزنامہ ڈان نے بھی 92 صفحات پر مشتمل اپنا خصوصی نمبر 15 کی بجائے 14 اگست 1948ء کو شائع کیا تھا۔

پاکستان کے یوم آزادی کی تقریبات 15 اگست کی بجائے 14 اگست کو منانے کا یہ دستور آج تک جاری ہے، اور یوں آہستہ آہستہ بات واضح ہو گئی کہ پاکستان 15 اگست 1947ء کو نہیں بلکہ 14 اگست 1947ء کو آزاد ہوا تھا۔

اگست 2014ء



فائل آگے چلتی ہے اور اگلے صفحات میں کیس نمبر 54/CM/48 مورخہ 12 جولائی 1948ء کے تحت کابینہ کے ڈپٹی سیکریٹری ایس مٹن علی کے دستخطوں کے ساتھ تحریر ہے کہ انہیں ہدایت کی گئی ہے کہ وہ وزیر اعظم کی زیر صدارت 29 جون 1948ء کو منعقد ہونے والی کابینہ میٹنگ کے فیصلے سے تمام وزراء اور ان کی وزارت کے متعلقہ سیکریٹریوں کو آگاہ کر دیں تاکہ اس فیصلے پر عملدرآمد ممکن بنایا جاسکے۔

فائل میں اگلے حکم نمبر 15/2/48 ہے جو 13 جولائی 1948ء کو جاری ہوا۔ اس حکم نامہ پر حکومت پاکستان کے ڈپٹی سیکریٹری احمد علی کے دستخط ہیں۔ حکم نامہ میں کہا گیا تھا کہ ملک کے پہلے یوم آزادی کی تقریبات 14 اگست 1948ء کو منائی جائیں گی۔ اس دن ملک بھر میں عام تعطیل ہوگی اور تمام سرکاری اور عوامی عمارتوں پر قومی پرچم لہرائے جائیں گے۔ اس سلسلے میں ایک حکم نامہ اور بھی ہے جس پر حکومت پاکستان کے اسسٹنٹ سیکریٹری محمد عطاء کے دستخط ہیں۔ اس حکم نامہ کا نمبر بھی 15/2/48 ہے اور اس میں بھی وہی حکم دہرایا گیا ہے جو اسٹیٹ حکم نامے میں درج تھا۔ اس حکم نامے میں جو بات اضافی تھی وہ یہ تھی کہ اس فیصلے سے حکومت

ملہنامہ سرگزشت



انجمن اقدار کی تقریب کے بعد کھینچی گئی ایک نادر تصویر

کیمرہ میں نے تصویر کھینچنے کے لیے لائن عبور کی تو ایک افسر اسے واپس کھینچ رہا ہے، فائنٹ ٹینک اپنی اہلیہ سے محو گفتگو ہیں، مختصر مفاطرہ بنانا اپنا پتہ لکھ کر رہی ہیں صرف قائد اعظم کیمرہ میں کی طرف متوجہ ہیں۔

تفصیلات و ترجمہ سید نصرت اللہ شاہ، قائد اعظم پیپر رپروڈیکٹ، کیپٹن ڈیڑھ ڈیڑھ حکومت پاکستان، اسلام آباد، جلد سوم۔

(3) قائد اعظم محمد علی جناح، روز و شب کا تاریخ وار اشارہ، تدوین ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ترجمہ خواجہ رضی حیدر، قائد اعظم اکیڈمی، کراچی۔

(4) پاکستان کا تاریخی انسائیکلو پیڈیا، زاہد حسین انجم، شیخ نظام علی اینڈ سنز، لاہور۔

(5) پاکستان کروئیکل، مختل مہاس جعفری، ورثہ جلی کیسنز، کراچی۔

(6) کمونڈ نامہ پاکستان، ناصر، لاہور، 15 جولائی 1947ء تا 15 اگست 1947ء کے شمارے۔

(7) کمونڈ نامہ سالانہ، کراچی، 15 اگست 1947ء۔

(8) کمونڈ نامہ سالانہ، کراچی، 15 اگست 1948ء۔

(9) کمونڈ نامہ سالانہ، کراچی، 14 اگست 1949ء۔

(10) مضمون، یوم آزادی: جنت المبارک 27 رمضان یا 15 اگست، ضیاء الدین لاہوری، مشمولہ جریڈہ 36، (غیر مطبوعہ کتابیں نمبر) شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی۔

(11) خفیہ فائل نمبر 48/CF/360، پیش لاء کیہ میٹینس سنٹر، کابینہ ڈیڑھ، حکومت پاکستان، اسلام آباد۔

(12) خفیہ فائل نمبر 48/CF/196، پیش لاء کیہ میٹینس سنٹر، کابینہ ڈیڑھ، حکومت پاکستان، اسلام آباد۔

حالانکہ محولہ بالا دستاویزات کے مطالعے سے یہ بات بڑی حد تک طے ہو جاتی ہے کہ پاکستان کی پہلی کابینہ نے پاکستان کی تاریخ آزادی تہذیبی شخص کی تھی بلکہ صرف یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہر سال پاکستان کے یوم آزادی کی تقریبات 15 بجائے 14 اگست کو منایا جائے گی اور قائد اعظم نے بھی اسی فیصلے کی توثیق کی تھی۔

ہمیں یقین ہے کہ ہماری اس تحقیق اور اس تحریر کی اشاعت کے باوجود پاکستان کے یوم آزادی کی تاریخ میں سرکاری طور پر کوئی فرق نہیں آئے گا مگر یہ حقیقت نہ جھٹلائی جاسکتی ہے اور نہ اسے تہذیبی کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا یوم آزادی 15 اگست 1947ء ہے۔ اس دن جمعہ الوداع تھا اور اسلامی تاریخ 27 رمضان المبارک 1366ھ تھی۔ اپنا یوم آزادی 15 اگست 1947ء کی بجائے 14 اگست 1947ء قرار دینے سے نہ صرف ہم اپنے یوم آزادی کی تاریخ بدلنے کے مرکب ہوتے ہیں بلکہ جمعہ الوداع اور 27 رمضان المبارک کے اعزاز سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

اس مضمون کے تیار کرنے میں حسب ذیل مضمون

کتب اور دستاویزات سے مدد لی گئی ہے

(1) ڈیڑھ اسفر آف پاور، جلد 12، ہر میٹینس، میٹینس آفس لندن۔

(2) جناح پیپر، تدوین ڈاکٹر زاہد حسین زیدی،

خولی شیریاں

انجم فاروق ساحلی



عام طور پر شیر آدم خور نہیں ہوتے مگر جب کسی شیر کے منہ کو انسانی گوشت کا ذائقہ لگ جائے تو پھر وہ حد سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے مگر وہاں تو بیک وقت دو شیریاں تھیں۔ دونوں مل کر شکار پر نکلتی تھیں۔ انہیں آدم خور ان کی ماں نے بتایا تھا۔ اہسی شیرنیوں کا شکار آسان نہیں۔



شکاریات پر حے والوں کے لیے ایک تحفہ

حافظ اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، تاہم ان میں توہم پرستی، زوروں پرستی اور خصوصاً بڑے جنگلوں میں کام کرنے والے مزدوروں میں توہمات کا مرض اس قدر شدید تھا کہ خدا کی پناہ۔ ہر شخص نیک و بد شکلوں پر یقین رکھتا۔ بدروحوں اور بھوتوں کے

میر ذکر ہے ملایا کے شمال مشرقی جنگلوں کا۔ اس زمانے میں مسلسل ملازمت میں دیاست ترکانو میں اقیقات تھا۔ جدید ترین آسائشوں سے نا آشنا اس دیاست میں زمانہ قدیم کی رسمیں رائج تھیں۔ ہاشمے اگرچہ مسلمان تھے۔ اکثر قرآن کے

قصے بھی کی زبان پر نہ ہے۔ درندوں کی یہاں کثرت تھی۔ جن میں شیر اور چیتے قاتل ذکر ہیں۔ طایا کے جنگلوں میں چلنے والے شیروں کے بارے میں میں نے سن رکھا تھا کہ پیدا کئی آدم خود ہوتے ہیں۔ مجھے اس سے خوشتر ریاست جہور میں ایک آدم خود کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جسے میں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

آدم خوروں کی نفسیات اور عادات میں جانتے کے لیے ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ میری مصروفیات کچھ اس نوعیت کی تھیں کہ دن رات کا بیشتر حصہ جنگل میں گزرتا تھا، اس لیے بہت جلد جنگل کی زندگی اور یہاں کے قانون سے واقف ہو گیا۔ تاہم اکیلے کسی خطرناک مقام پر جاتے ہوئے اب بھی ڈر لگتا تھا۔ میں نے اپنے تین سالہ قیام کے دوران میں مقامی باشندوں سے خاصا ربط و ربط بڑھالیا تھا اور ان کی زبان بھی نہ صرف بخوبی سمجھنے لگا تھا بلکہ نولے پھولے الفاظ میں اپنا ماضی الخیر بھی بیان کرنے پر قادر ہو گیا تھا۔ طایا کے شہروں میں رہنے والے لوگوں کے برعکس جو جدید تہذیب و تمدن سے آہستہ آہستہ آشنا ہوتے جا رہے تھے۔

لوہات سے قطع نظر ان لوگوں میں سچائی، بہادری، محنت اور جفاکشی، مہمان نوازی کی روایتیں اپنی اصلی شکل میں ملتی ہیں۔ ہر شخص اپنے تہذیب کے احکامات پر چلتے رہتا تو لیکن فرض سمجھتا ہے۔ خدا اور رسول سے محبت ان کا جردایمان ہے۔ دھوکا، فریب، عیاری اور دھوکے دہاندی سے قطعاً نا آشنا ہیں۔ یہ لوگ ایسی دنیا میں رہتے ہیں جس میں صدیوں سے کوئی تغیر دھندل نہیں ہوا۔ جو کام باپ دادا کے زمانے سے ہوتا چلا آ رہا ہے اس میں کسی کو ترمیم و ترمیم کا حق حاصل نہیں۔

ریاست جہور میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد اچانک مجھے یہاں کے علاقے میں رہنے کے جنگلوں کی گہرائی اور حوروں سے کام لینے کے عہدے پر ایک برطانوی شہید کی لاش کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا۔ یہاں میں رہنے کے انتہائی وسیع و عریض گھنے جنگل، دلہلی زمین اور نہایت خطرناک گھانٹیاں تھیں۔ کہیں کہیں ان جنگلوں میں سودو سو افراد پر مشتمل آبادی کے آثار نظر آ جاتے ورنہ ہر جگہ درندوں کی حکومت تھی۔ ندی نالے کثرت تھے جو برسات کے موسم میں خوب بڑھ جاتے۔ ان کا پانی نہ صرف لہو گرد کی بستیوں میں جاتی ہوا دیتا بلکہ درندوں کو بھی ان کی کہیں گاہوں سے

کھال کر بستیوں کی طرف دھکیل دیتا۔ درندوں کے علاوہ دوسری بڑی مصیبت سانپ، بچھو، کن کجورے اور اس طرح کے دوسرے حشرات الارض تھے جو بستیوں کی طرح راستوں چمڑیوں اور پلوں پر رہتے نظر آتے تھے۔ لوگ مویشیوں کو پالنے کے بڑے شوقین تھے کیونکہ انہی کے گوشت اور دودھ پر ان کا گزارہ تھا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ تھی کہ درندے دن در ہاڑے بستیوں میں گھس آتے اور مویشیوں کو پکڑ کر لے جاتے۔ یہاں بددوق کی کسی کے پاس تھی وہ بھی پرانی جسے لڑل لڑا تک کہتے ہیں اور جس میں نال کی طرف سے بارود بھر کر فائر کیا جاتا ہے۔ یہ بددوق نہایت خطرناک ہوتی ہے اور اگر چلانے والا احتیاط سے کام نہ لے تو اس کو زخمی یا ہلاک کر دیتی ہے۔

اس تہذیب کے بعد میں اپنے قصے کی طرف آتا ہوں۔ جڑواں آدم خود ابتدا میں مویشی اٹھالے جاتے تھے ان کا باپ کچال کے جنگلوں میں رہنے والا انتہائی خوشنور شیر تھا۔ اس کی قوت کا یہ عالم تھا کہ کئی سن ورنی بھینس کو پٹے کی ایک ہی ضرب سے ہلاک کر ڈالتا اور اسے دانتوں کی مدد سے گھسیٹ کر کٹی میل دور لے جاتا۔ یہ شیر بھینسوں کا خصوصاً دشمن تھا۔ بعض اوقات وہ درو بھینسوں کو پکڑ کر گھسیٹ لے جاتا۔ لوگ اس کی حرکتوں پر پریشان اور جھنجھلائے ہوئے تھے۔ لیکن کچھ بس نہ چلتا تھا۔ خیر تھی کہ ابھی اس نے کسی آدمی کے گوشت اور خون کا ذائقہ نہیں چکھا تھا ورنہ قیامت علی برپا ہو جاتی۔ اس شیر کو میں نے کس طرح ہلاک کیا یہ داستان الگ ہے۔ اس وقت تو میں جڑواں آدم خوروں کی کہانی بیان کروں گا۔ وہ شیر جب مارا گیا تو لوگوں نے سکھ کا ساکس لیا۔ ان کے مویشی اب محفوظ ہو گئے۔ اور لوگ بھی آزادی سے ایک دوسرے کے کام کرنے لگے تھے مگر ایک بلابعد مجھے بتا چلا کہ شیرنی میدان میں آگئی ہے۔ یہ بات حیرت انگیز تھی کیونکہ طایا کی شیرنیاں عام طور پر خوشنور اور مردم آزار نہیں ہوا کرتیں۔ دراصل قصہ یہ تھا کہ اس شیرنی کو اپنے دو جڑواں بچوں کی پرورش کے لیے بہر حال گوشت کی ضرورت تھی اور چونکہ وہ جنگلی جانوروں کا شکار کرنے کے قابل نہ تھی اس لیے مویشیوں پر ہاتھ صاف کرنا اسے آسان نظر آیا۔

میں ایک دن اس شیرنی کی تلاش میں گھوم رہا تھا کہ ایک جھاری کے اندر سے کچھ کڑی کی آواز آئی۔ میں رک گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ شیرنی تو نظر نہ آئی البتہ بھورے

پر چڑھ گئے۔ شیرنی دیر تک مضطرب اور اُدھر بھرتی رہی۔ لیکن اسے لاش کے قریب جانے کی جرأت نہیں ہوئی پھر وہ ایک طرف کو ہٹ گئی۔

اگلے روز یہ قصہ میرے کانوں میں پہنچا۔ میں نے فوراً چند آدمیوں کو ساتھ لیا اور وہاں پہنچ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لاش ابھی تک اسی حالت میں پڑی تھی اور کسی جانور نے اسے چھیڑنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ وہ ایک بوڑھا اور عبادت گزار شخص تھا جس کے بارے میں مقامی لوگ کہتے تھے کہ وہ خدا رسیدہ اور ولی آدمی ہے۔ اس کی کئی کراٹھیں مشہور تھیں مگر شیرنی کے سامنے اس کی کوئی کراٹھ کام نہ آئی۔ دراصل اس کی موت اس بہانے لکھی گئی۔ میں بھی اسے جانتا تھا لیکن وہ خدا رسیدہ تھا یا نہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ ایک پرہیزگار اور متقی شخص ضرور تھا۔ مجھے اس کی اندوہناک موت کا صدمہ ہوا۔ بستی والے بھی اس کا ماتم کر رہے تھے مگر جنگل جا کر اس کی لاش اٹھانے کی جرأت کسی میں نہ تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ شیرنی نے اسے بڑپ نہیں کیا تو گتیا بات یہ ہے کہ مجھے اس شخص کے ولی ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا۔ یہ کتنی عجیب بات تھی کہ اس ساری رات جنگل میں پڑی رہی اور بھوک سے بے تاب شیرنی اور اس کے بچے قریب بھی نہ پہنچ سکے۔ میں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ لاش کو وہیں پڑا رہنے دیں۔ میں ایک رات اس کے قریب ہی کسی درخت پر چھان باندھ کر شیرنی کا انتظار کرنا چاہتا ہوں۔ سورج غروب ہونے سے آدھا گھنٹہ دھڑکتے ہوئے کھڑے ہو کر چھان پر پہنچ گیا۔ شمال کی جانب سے آہستہ آہستہ کالی گھٹائیں نظر رہی تھیں اور ہوا کی تیزی اور تندی میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ خدشہ یہ ہوا کہ اگر ہوا اس طرح چلتی رہی تو چھان کا خدائی حافظہ ہے۔ میرے ساتھ آنے والے سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس جا چکے تھے۔ اب میں تھا اور جنگل کی قیامت ناک فضا جس میں یکن آدم خور گھٹائیں لگائے بیٹھے تھے۔ یک لخت گھٹائیں اٹھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر ایک ہو گیا۔ پھر بجلی کی کڑک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اب مجھے احساس ہو گیا کہ یہ مصیبت میں پہنچ گیا ہوں۔ چھان سے اتنا محال تھا۔ بارش کا پانی ننھے ننھے نظروں کی مانند میرے چہرے پر آ کر لگ رہے تھے اور سردی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ میرے سامنے کچھ فاصلے پر بوڑھے کی لاش پڑی پانی میں بھیگ رہی تھی اور میں اپنی

بھروسے رنگ کے دو ننھے ننھے بچے ضرور دکھائی دیے۔ یہی چڑواں بچے تھے۔ میری آہٹ پا کر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ اس کے بعد کئی ماہ تک میں انہیں نہ دیکھ سکا۔ اس دور لان میں شی نی نے چار پانچ بھینسیں اور کچھ بکریاں مار ڈالی تھیں۔ ایک دن شیرنی ایک مقامی باشندے کی محل لڑائی کے بعد قتل کا نشانہ بن کے ڈھکی ہو گئی۔ ڈھکی ہونے کے بعد اس کے لیے مویشیوں کو ہلاک کرنا بھی ممکن نہ رہا اور پھر اچانک ایک روز وہ جنگل میں اس جگہ نمودار ہوئی جہاں مزدور بڑے کے درختوں پر کام کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ دونوں بچے بھی تھے۔ جو جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھنے لگی والے تھے۔

شیرنی نے ایک مزدور کو پکڑ لیا اور گھسیٹ کر جھاڑیوں میں لے گئی پھر اس نے دور کھڑے درخت زدہ مزدوروں کے سامنے لاش کو جھرا دیا اور بڑپ کرنا شروع کر دیا۔ شیرنی کا آدم خور بن جانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ مزدوروں نے نہ صرف کام پر جانا چھوڑ دیا بلکہ خوف و دہشت کی لہر نے سراپنگی پیدا کر دی۔ ایک ہفتے بعد شیرنی نے دوسرا انسان قتل کر دیا۔ اس مرتبہ ایک بد نصیب عورت اس کے ہتھے چڑھی۔ وہ تندی سے پانی کا گڑا بھر رہی تھی کہ گھاس میں چھپی ہوئی شیرنی نے عورت پر حملہ کر دیا۔ عورت کی چھلیں سن کر کچھ لوگ نیزے اور گولہ باریں لے کر دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ شیرنی نے عورت کو چوسنے کی مانند منہ میں دھاڑ رکھا ہے اور اس کے ساتھ دو چھوٹے شیر بھی اچھلتے کودتے جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شیرنی آدم خور بن چکی ہے بلکہ اس نے اپنے بچوں کو بھی انسانی گوشت اور خون کی چاٹ لگا دی ہے اور اگر ان کا مقابلہ نہ کیا گیا تو یہ تمام بستیوں کا مٹا دیا کریں گے۔

تیسرے ہفتے شیرنی نے ایک اور شخص کو ہلاک کیا مگر لاش کو لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت بستی کے سوا بڑا سوا آدمی جنازہ اٹھائے قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے خون میں لت پت شخص کو دیکھا تو رک گئے۔ وہ مر چکا تھا۔ چنانچہ اسے بھی چند لوگوں نے چادر میں لپیٹا اور ساتھ لے چلے۔ شیرنی اور اس کے بچے قریبی جھاڑیوں میں چھپے یہ تناؤ دیکھ رہے تھے۔ شیرنی نے جب لاش کو ہاتھ سے جاتے دیکھا تو تپ اٹھی اور گرج کر جھاڑیوں سے باہر نکل آئی۔ لوگ اندھا دھند بھاگ اٹھے اور انہوں نے جنازہ بھی ایک طرف دھک دیا اور درختوں

اس حماقت پر عداوت محسوس کر رہا تھا کہ محض اپنے شوقِ مہم جوئی کی خاطر ایک مسلمان بزرگ کی میت کی بے حرمتی کر رہا ہوں، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی پاداش میں خدا مجھے اس شیرینی کا نوالہ نہ دے۔ یہ خیال آتے ہی میرے جسم کا رواں رواں فرطِ خوف سے کانپ گیا۔ جسم تو پہلے ہی لرز رہا تھا۔ اس بھیانک تصور نے میرا دل دوداغِ شلوغ کر دیا۔ اب میں خدا سے اپنے اس تصور کی دل ہی دل میں معافی مانگ رہا تھا۔

ہارش فور ہوا کا شور، الامان والحفظ، ہر طرف گھبراہٹ مچا جسے کبھی بھی بجلی کی چمک دور کرتی تھی۔ میں جس درخت پر چھان باندھ کر خرگوش کی مانند دیکھا بیٹھا تھا وہ کچھ زیادہ اونچا نہ تھا۔ کپڑے تر ہو چکے تھے اور کچھ کچھ میں نہ آتا تھا کہ اس حالت میں اگر شیرینی نمودار ہوگی تو میں قارئین کے کروں گا۔ ادھر ہارش کی یہ کیفیت کے گویا نہ رہنے کی قسم کھاتی تھی۔

دیر نہ کھینچے بعد کچھ اُمید بندی کہ یہ قیامت خیز طوفان ہادو ہاراں رک جائے گا۔ موسلا دھار ہارش آہستہ آہستہ پھوار میں بدلتے گئے۔ مطلع صاف ہونے لگا اور آسمان پر آکا دکا تارے نمودار ہونے لگے۔ درختوں سے گرتے ہوئے پانی کی آوازیں اب بھی کانوں میں آرہی تھیں اور میں نے محسوس ہی روشنی میں دیکھا کہ ہارش کا پانی میرے دائیں جانب ایک نشیب میں جمع ہو رہا تھا۔ بیکار ہوں محسوس ہوا جیسے کوئی جانور درخت کے مینے سے نیچے حرکت کر رہا ہے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، مگر کچھ نظر نہ آیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے شیرینی کی گرج سے جنگل کا چہرہ بیدار ہو گیا اور میرا دل یک لخت اچھل کر طلق میں آ گیا۔ میں نے بدحواس ہو کر برقی تاروں میں روشن کر دی۔ کیا دیکھا ہوں کہ ایک قد آور شیرینی کچھ فاصلے پر کھڑی لچائی نظروں سے لاش کی طرف دیکھ رہی ہے۔

تاریخ روشن ہوتے ہی شیرینی نے میری طرف مگھور کر دیکھا اور پھر گرجتی ہوئی اس طرف آئی لیکن وہ نظر اکر چل رہی تھی۔ غالباً اس کا دایاں پیچہ بے کار ہو چکا تھا۔ میں نے تاریخ بجاوادی اور راتھل سے نشانہ لیے بغیر فائر کر دیا۔ شیرینی دھماکتی ہوئی مہاڑیوں میں جا بھسی اور دیر تک ادھر ادھر پھرنے اور فرارنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اس موقع پر میں پڑھنے والے دوستوں کو کچھ کچھ بتا دیتا چاہتا ہوں کہ میں جم کاربٹ، کیمتھ اینڈ سن، جے اے ویٹیا کرل پیئر سن کی

طرح تجربے کار اور ظریف کاری ہرگز نہیں ہوں۔ یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ مجھے راتھل سنبھائی پڑی اور وہ بھی اس لیے کہ جس علاقے میں میرا کام تھا وہاں راتھل کے بغیر گزارہ ہی نہیں تھا۔ ابتدا میں ایک دو شیر مارنے کے بعد مجھے خوش فہمی ہو گئی تھی کہ میں اچھا شکاری بن سکتا ہوں۔ چنانچہ اس زعم میں آدم خوروں سے دو دو ہاتھ کرنے کی جرأت ہوئی۔ لیکن اب پتا چلا کہ یہ کام کتنے جان جھکوں کا ہے اور شکاری کی ذرا سی حماقت اسے کس طرح آدم خود کے پیٹ کا ایندھن بنا سکتی ہے۔

میں جس چھان پر بیٹھا تھا، زمین سے اس کی اونچائی سات آٹھ فٹ سے زیادہ نہ تھی اور اگر شیرینی کی اگلی دائیں ٹانگہ ڈھکی نہ ہوتی تو وہ یقیناً اتنی بلندی تک ہست لگا کر مجھے پکڑ سکتی تھی اور ممکن ہے کہ اگر طوفان ہادو ہاراں نہ نازل ہوتا تو وہ ایسا کر بھی گزرتی تاہم خدا نے ہال ہال بھالیا۔ میں نے شیرینی کو خوف زدہ کرنے کے لیے حریدہ دو فائر کیے اور یہ ترکیب کار گر ثابت ہوئی۔ چند منٹ گرجے اور فرارنے کے بعد وہ دور چلی گئی اور پھر رفتہ رفتہ اس کی آواز معدوم ہو گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں یہیں بیٹھا رہوں، تو صبح سے پہلے کوئی شخص میری خبر لینے نہیں آئے گا اور ابھی صبح ہونے میں کافی وقت تھا۔

شیرینی جا چکی تھی اور خطرہ نکل گیا تھا۔ کیا سیاہ ہادل دو بارہ جمع ہو رہے تھے۔ میں پہلے ہی ہارش میں اس قدر بھیک چکا تھا کہ حریدہ بھینکنے سے تیار پڑنے کا خدشہ تھا۔ جوں توں کر کے چھان سے اتر اور واپس گاؤں کی طرف چلا۔ لوگ ابھی تک جاگ رہے تھے۔ اور انہوں نے قارئین کی آواز میں بھی کئی نہیں لیکن جب پتا چلا کہ شیرینی ابھی مری نہیں تو خیسے اور مایوسی سے ان کے چہرے لگ گئے۔ خیر اس بات پر کہ میری وجہ سے پیچھے ہوئے ایک بزرگ کی لاش بے گورہ لیکن جنگل میں پڑی رہی اور مایوسی ہوں کہ شیرینی پھر بچ کر نکل گئی۔ لوگوں نے اگر چہ مجھ سے کچھ کہا تو نہیں لیکن پھر بھی ان کی ناراضگی کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔

اگلے روز ان بزرگ کو نہایت عزت و احترام سے سپرد خاک کر دیا گیا۔ جنازے میں دور نزدیک کی سبھی بستیوں کے مرد و زن شریک ہوئے۔ میری حالت چہروں کی سی تھی اور بلاشبہ مجھے اپنے کیے پر شرم محسوس ہو رہی تھی مگر میں محضرت کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ پانی میں بیٹھنے اور سردی گھٹنے کے سبب مجھے کئی روز تک ہلکا ہلکا بخار بھی رہا۔

نقصان پہنچائے اسے مار ڈالنے، بھاگنے کی کوشش کرو۔ بس چپ چاپ غم سہجھن کی فطرت بن چکی تھی۔ کچال کی یہ آدم خود شیرنی نہ معلوم کہاں چھپ گئی تھی۔ بہت عرصے تک اس کا کچھ پتا نہ چلا اور اس دور میں کئی نئی دلدل کے بھی تذکرہ سننے میں نہ آیا۔ بہر حال لوگوں نے سکون کا سانس لیا اور اطمینان سے اپنے روزمرہ کے دغدغوں میں مصروف ہو گئے۔ لیکن میرے دل میں پھانس سی اگلی ہوئی تھی۔ میں جانتا چاہتا تھا آخر شیرنی اور اس کے بچوں پر کیا ہوا۔ کچال کے گرد و نواح میں ایک ایک چھپ چھان مارا مگر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ابھی بعض لوگوں نے یہ اقرار کیا کہ انہوں نے رات کے ہولناک سنائے میں پھاڑی کی طرف سے شیروں کے کد ہانڈنے کی آواز میں ضرور سنی ہیں۔

کچال کے چاروں طرف نہایت گھٹا اور تاریک جنگل تھا جسے ایک اور برطانوی کپتی نے خرید لیا تھا اور چند روز کے اندر اس میں کام شروع ہونے لگا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے، میں اپنے دوست سے ملنے پنجور کی طرف گیا۔ جس جگہ میں رہتا تھا وہیں پنجور کا قاصد تقریباً بیس میل تھا اور گھوڑے کے سوا اور کوئی سفر کا چارہ نہ تھا۔ صبح کا وقت تھا اور منہری دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں اپنے گھوڑے پر ٹھوسر تھا۔ راستے میں جا بجا مزدور کام کرتے دکھائی دیے۔ کبھی مجھے جانتے پہچانتے تھے۔ ان سے شیرنی اور اس کے بچوں کے بارے میں پوچھتا آگے بڑھ گیا۔ کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی۔

جب پھاڑی کے دامن میں پہنچا تو دو پہر ہو چکی تھی۔ میں نے گھوڑا ایک نیلے کے پاس روکا اور اسے گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر میں نے اپنا ناشتہ دان نکالا اور ایک طرف بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ تیسرے پہر تک پنجور پہنچ جاؤں گا۔

ابھی بمشکل میں نے چند نوالے ہی کھائے تھے کہ گھوڑا زور سے نہہتا نے لگا پھر دوڑ کر میرے پاس آیا۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا اور گردن ہلا ہلا کر نہہتا جاتا۔ میں سمجھ گیا ضرور کوئی بات ہے فوراً منتقل سنبھالی اور چو کنا ہو کر اپنے ارد گرد دیکھا۔ دائیں ہاتھ پر ایک بلند نیلے کے ساتھ ایک چھوٹی سی کھائی تھی اور اس میں کسی جانور کے آہستہ آہستہ حرکت کرنے کی آواز آرہی تھی۔ میں بھی گھاس میں چھپ گیا۔

گھوڑا ایک بار پھر نہہتا اور یک تخت ایک طرف اندھا دھند بھاگ اٹھا اور ابھی میں اسے حیرت اور خوف کی

لیکن اس دور میں کبھی شیرنی کی کھوج میں برابر لگا رہا۔ آخر معلوم ہوا کہ اسے دو بچوں سمیت اس علاقے کی مشہور کچال پھاڑی کے جنوبی حصے میں گھومتے پھرتے دیکھا گیا ہے۔ کچال پھاڑی کے بارے میں مقامی باشندے طرح طرح کی کہانیاں بیان کرتے تھے۔ ایک روایت یہ تھی کہ اس پھاڑی پر صدیوں پہلے کوئی بزرگ آکر ٹھہرے تھے اور انہوں نے چلا گئی کی تھی۔ چلے کے دوران میں جس کی مدت چالیس روز تھی۔ ان بزرگ نے کچھ کھا یا نہ پیا۔ لیکن انہیں جسمانی کمزوری یا ناقصیت مطلق نہ ہوئی، پھر لوگوں نے دیکھا کہ جنگل کے تمام جانور اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکلے اور پھاڑی کے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں درندے، چرتہ، پرند بھی شامل تھے۔ وہ ان بزرگ کو سلام کرنے آئے تھے لیکن بزرگ نے آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہ دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ کبھی جانور خاموشی سے چلے گئے۔ پھر لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ درندے اس پھاڑی کے گرد ساری ساری رات پیہرہ دیتے۔ بعد میں وہ بزرگ اچانک غائب ہو گئے۔ لیکن ان کی حرکت کا اثر ابھی تک اس پھاڑی پر موجود ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو شخص پھاڑی کی چوٹی پر پناہ لے لے۔ اسے کوئی درندہ یا دوسرا جانور نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

کچال پھاڑی کے گرد و نواح میں تین بستیاں بڑی مشہور اور خوب آباد تھیں۔ ایک کا نام تیلوک پنجور دوسری کا تیلوک کالوگ تیسری کو تیلوک مینکو انگ کہتے ہیں۔ مذکور زبان میں تیلوک کا لفظ بستی یا گاؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ زیادہ تر باشندے درختوں سے رہ بڑھائے، کٹائی کرنے، گھاس جمع کرنے اور اس طرح کے بہت سے کام کیا کرتے تھے۔ نہایت صابرو شا کرتے۔ جوں جاتا اس پر قناعت کرنے والے، غامدہ ہوتا تو خدا کا شکر ادا کرتے اور اگر نقصان ہو جاتا تو خدا کی طرف سے کوئی بہتری سمجھ کر بھول جاتے۔

جنگلی درندے آئے دن ان کے جانور اٹھا کر لے جاتے مگر ان لوگوں کو مطلق پروا نہ تھی۔ میں نے کئی آدمیوں کی ترہائی سنا کہ یہ درندے بھی خدا کی مخلوق ہیں اور انہیں رزق دینا بھی اللہ کا کام ہے۔ لہذا مینے دو مینے میں چند مویشی لہن کی خود رک بن جائیں تو کیا حرج ہے۔ ان لوگوں نے خود بھی جنگلی درندوں سے چھٹکارا پانے کی کبھی کوشش نہیں کی غالباً یہ روایت وہاں تھی ہی نہیں کہ جو نہیں

کہ گھوڑے پر بات مل گئی ورنہ وہ شیریاں آپ کو بھی پکڑ کر لے جاتیں۔"

"تمی ہاں بس مجرہ ہی ہو گیا۔" میں نے کہا۔ مگر یہ کچھ نیچے کہ اب پھر اس علاقے پر کوئی آفت آیا ہی چاہتی ہے۔ آدم خود شیرینی تو مرچکی ہے۔ میں اس کی لاش کھائی پر پڑی ہوئی دیکھ چکا ہوں۔ وہ بلند چٹان سے اتفاقہ طور پر گری اور مر گئی۔ اس کے دو بچے جوان ہو چکے ہیں اور دونوں مادہ ہیں، انکی نے میرے گھوڑے کو پکڑا ہے۔ مجھے معلوم ہے انکی بچپن سے ہی آدمی کے خون اور گوشت کا چمکا پڑا ہوا ہے۔ ابھی تو وہ سویشیوں کے پیچھے ہیں لیکن جلد ہی آدمیوں کی بھی ہاری آئے گی اور علاقہ بھی آپ کا ہے۔"

مسٹرولسن یہ سن کر ہنسنے لگے۔ چند لمبے تک خاموش بیٹھے کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے۔ "واقعی بات تو تشویش کی ہے۔ آج کل کام کا زور ہے۔ اگر ان دلوں کچھ گڑبڑ ہوئی تو خاصا نقصان ہوگا۔ ان درندوں کا ابھی سے انتظام ہونا چاہئے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں۔"

"جناب، میرے علاقے میں اتنی پھیلی ہوئی ہے۔ اب خدا خدا کر کے کچھ سکون ہوا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ سکون عارضی ہے حالات تبدیل ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔ میں تو اس لیے آیا تھا کہ آپ حکومت کی طرف سے مجھے کیا کیا سہولتیں پہنچا سکتے ہیں۔"

"سہولت تو جو آپ نہیں مل سکتی ہے۔" مسٹرولسن نے کہا۔ "لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہاں کے لوگ بڑے عجیب ہیں۔ ان سے آپ کو تعاون بمشکل ملے گا اور لوگوں کی مدد کے بغیر کوئی قدم اٹھانا خطرناک ہوگا۔ بہر حال آپ آج آرام کیجئے۔ صبح میں اپنے چند کامروندوں کو بلاؤں گا۔ ان میں چند لوگ طر راور جنگلوں سے واقف ہیں۔ روپے کا لالچ کام کر جائے گا۔ شاید ان میں سے ایک آدھا آدمی بخود ق چلانا بھی جانتا ہو۔"

اگلے روز علی الصباح میں بیدار ہوا۔ مسٹرولسن کے اردلی سے معلوم ہوا کہ صاحب دورے پر چلے گئے ہیں اور شام تک لوٹیں گے۔ میں نے رائفل کندھے پر لٹکائی اور گاؤں کی سیر کے لیے لکل کھڑا ہوا۔ یہ گاؤں تین طرف سے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ آبادی مشکل سے پانچ سو نفوس پر مشتمل ہوگی۔ مکان سب کے سب لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ مرد کام پر جا چکے تھے۔ بچے گھروں اور گلیوں میں کھیل رہے تھے اور عورتیں آپس میں کپ شپ

ملی جلی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ کھائی میں سے دو غراتی۔ مگر جتنی نہایت خوبصورت شیریاں برآمد ہوئیں اور گھوڑے کے تعاقب میں روانہ ہو گئیں چشم زدن میں انہوں نے گھوڑے کو جالیا اور اس سے خوشتر کہ میں کچھ بچھ سکوں۔ وہ گھوڑے کو گھسیٹ کر جنگل میں غائب ہو گئیں۔

دیر تک پھر کے بے جان بت کی مانند میں بھی گھاس میں بے حس و حرکت پڑا رہا پھر ہمت کر کے اٹھا اور کھائی کی طرف چلا۔ شیرنیوں کے قدموں کے نشانات اور تازہ لید کثرت سے پڑی تھی اور جانوروں کی ہڈیوں کے ابار لگے ہوئے تھے۔ لٹھلی اور سڑاند برداشت سے باہر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا یہ شیریاں ابھی تک مل جل کر رہتی ہیں اور غدار یہاں لاکر ہڑپ کرنے کی عادی ہیں۔ کھائی کے پرلے سرے پر مجھے ایک جانور کی لاش پڑی دکھائی دی اور یہ وہی بوڑھی شیرینی تھی جس کی تلاش میں حیران پریشان پھر رہا تھا۔ اس کی کھوپڑی پھٹی ہوئی تھی۔ نامعلوم کیا حادثہ پیش آیا کہ شیرینی اس بلند نیلے سے نیچے کھائی میں گری۔ ایک بڑے پتھر سے اس کا سر گر آیا اور وہ وہیں مر گئی۔

گھوڑا تو ہاتھ سے جا چکا تھا مگر مجھے ان جوان شیرنیوں کے لٹکانے کا ہتھل گیا تھا۔ اب میرے سامنے دو راستے تھے۔ پہلا تو یہ کہ سیدھا پنچور جاؤں۔ اپنے دوست سے تذکرہ کروں پھر اسے ساتھ لے کر یہاں آؤں اور ان شیرنیوں کو لٹکانے لگا دوں۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ چھپ کر شیرنیوں کا انتظار کروں۔ دیر تک سوچتا رہا۔ یہ طے کر کے کہ ان موڑیوں کا لٹکانا تو معلوم ہو چکا ہے۔ پنچور جانا چاہیے۔

میں حیرتوں سے اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔ کیمپال پہاڑی اپنی پوری عظمت اور شان شوکت کے ساتھ میرے سامنے تھی اور جو فنی میں چڑھائی طے کر کے پرلی ڈھلان پر نکلا پنچور کی خوبصورت بہتی مہری لگا ہوں کے سامنے تھی۔ ان دلوں پنچور میں میرے ایک انگریز دوست جنہیں مسٹرولسن کہہ لیجئے۔ تعینات تھے اور جنگلوں کے ایڈمنسٹریٹر آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ سیدھا ان کے ہنگلے پر پہنچا۔ وہ لکڑی کے برآمدے میں بیٹھے۔ بہر کی چائے پی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت تھاک سے ملے۔ آدم خود شیرینی کی داستانیں ان کے کانوں تک پہنچی تھیں اور اگرچہ انکی بھی غدار سے واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن تھے ہی دار آدمی۔ میرا قصہ سن کر بہت ہنسے اور کہنے لگے۔ "خدا کا شکر ادا کیجئے

سے کہہ دیا تھا کہ وہ اونچی آواز میں ہاتھ کرتے ہو کوئی گیت گاتے ہوئے چلیں تاکہ شیرنی اگر اب بھی ہوئی تو اپنے آرام میں خلل پا کر دوبارہ متوجہ ہوگی۔ تقریباً ڈھائی تین میل چلنے کے بعد اچانک ایک شخص چلایا "دیکھئے جناب، یہ ہے اس کے بچوں کے نشان۔"

میں نے ان نشانات کو غور سے دیکھا اور دیکھتے ہی کچھ گیا کہ یہ شیرنی ہے۔ مجھے ان لوگوں نے بتایا تھا کہ اس کا قد چودہ فٹ لمبا اور پانچ فٹ اونچا ہے۔ لیکن اس کے قد و قامت کا جائزہ کیا وہ یہ تھا کہ قدم سے لے کر ناک تک سات فٹ لمبا اور اونچائی تقریباً ڈھائی فٹ تھی۔ نرم زمین پر اس کے گہرے پنچوں کے نشانات بھی یہ ظاہر کرتے تھے کہ اس کا وزن عام شیرنیوں کی نسبت کچھ زیادہ ہے۔ بہر حال ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ حد نظر تک خادربار جھازیاں بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔ کہیں کہیں جنگلی چوہوں اور بندوں کے غول بھی پھرتے نظر آئے۔ مگر ہمارے قدموں کی آہٹ پا کر چشم زدن میں غائب ہو جاتے۔ شیرنی کے پنچوں کے نشان جھازیوں کے ساتھ سیدھے میں شرق کی طرف چلے گئے تھے۔

اب ہم... یہ اجاڑ اور ویران حصہ عبور کر کے ایک سرسبز و شاداب پہاڑی کے دامن میں داخل ہوئے جس کے اوپر کی جانب ایک گھٹا اور صیت ناک ریز کے درختوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا اور یہ مزدور اس جنگل میں کام کرتے تھے۔ وہاں سے بے شمار لوگوں کے ہاتھیں کرنے اور حقیمے لگانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچھ لوگ ایک جانب لکڑی کا چھوٹا سا مکان بنا رہے تھے۔ شیرنی اس جنگل میں کسی جگہ چھپی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہاں کام کرنے والے ایک آدمی نے اسے اس طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس شیرنی کو بچپن سے انسانی خون کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔ بہر حال میں نے اس موقع پر یہ خبر سنا کر غراغری پھیلائے کو مناسب نہ سمجھا۔ البتہ گھران کو بتا دیا کہ شیرنی کا خاص خیال رکھے کہ وہ آدم غور ہے اور کسی وقت بھی حردوروں پر حملہ کر سکتی ہے۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر دہشت کے آثار نمودار ہوئے اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ چند منٹ کے بعد امداد یہ خوفناک خبر سارے جنگل میں پھیل چکی تھی اور مزدور کام بند کر کے ایک جگہ جمع ہو رہے تھے۔ غضب یہ ہوا کہ اس خبر کی تصدیق میرے ساتھ آنے والے مزدوروں نے بھی کر دی۔ حالانکہ ان میں سے کسی کو

میں گن گھس۔ میری طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ کچھ بوڑھے لوگوں سے سلام دعا ضرور ہوئی۔ ایک لڑکھٹا گھوم پھر کر بچکے کی طرف لوٹا۔ پکا ایک چودہ فٹ آدمیوں کا ایک گروہ شمال سے گاؤں کی طرف آنا دکھائی دیا۔ یہ لوگ بے وقت واپس آ رہے تھے۔ اس لیے میں رک کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ یقیناً کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔ جب یہ گروہ قریب پہنچا تو میں نے دیکھا ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ چیخ کر اپنی زبان میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ان میں چند آدمی ایسے بھی تھے جنہیں میں پہچانتا تھا اور وہ میری قفل سے آشنا تھے۔ چنانچہ ہستی کی طرف جانے کی بجائے سیدھے میری طرف آئے اور آتے ہی کہنے لگے۔ "جناب، جلدی جائیے، کالونگ والی سڑک پر چودہ فٹ لمبا اور پانچ فٹ اونچا شیر گھوم رہا ہے، اس نے ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر خدا نے پہلایا ہم کام پر جا رہے تھے اور وہ ہمارے انتظار میں وہاں چھپا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا اور دانت نکال کر فرمایا۔"

"شیر نہیں شیرنی تھی۔" دوسرے نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے غور سے اسے دیکھا تھا وہ شیرنی تھی۔" میں کچھ گیا کہ انہوں نے جڑواں شیرنیوں میں سے کسی ایک کو کچل لیا ہے۔ لیکن حیرت یہ تھی کہ دن نکلنے کے بعد بھی اس نے انہیں دوسرے گزرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

"آؤ تم لوگ میرے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔ "ارومت میرے پاس بندو ق ہے۔ میں اس شیرنی کی تلاش میں ادھر آیا ہوں۔" بڑی مشکل سے میں نے انہیں ساتھ لیا۔ ان سب کے پاس کھانیاں تھیں اور جسانی طور پر بھی سب بٹے کئے تھے۔ اگر چاہے تو شیرنی کو گھیر کر چند لمحوں میں ننگہ ہوئی کر ڈالتے۔ اس معاملے میں یوگنڈا، کینیا اور نیروبی کے جنگلی خاتمے تیز ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نیزوں، بڑھوں، تیرکالوں سے ہی شیروں، چیتوں، گینگڈوں اور ہاتھیوں کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ اگرچہ ایسی مہموں میں کئی لوگ مارے بھی جاتے ہیں۔ بہر حال میں ان سب افراد کو نصیحت کرتا اور یہاں لوگوں کے قہے سناتا ہوا اس پگڈنڈی کی طرف چلا دوسرے وہ لوگ آ رہے تھے۔

یہاں جنگل زیادہ گھٹا نہ تھا۔ زمین نرم اور ولدی تھی اور جھاز جھناڑ کھڑت سے اگا ہوا تھا۔ ان جھازوں کو عبور کرنا انسان کے بس میں نہ تھا۔ کیونکہ تین تین انچ لمبے اور سوئیوں کی مانند نوکیلے کانٹے تھے۔ میں نے ان آدمیوں

بھی یہ معلوم نہ تھا کہ جڑواں شیرنیاں آدم خور ہیں۔ اس جنگل سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر بھی مردوروں کے اچانک کام چھوڑنے سے مجھے تشویش ہوئی کہ جب لسنے دار لوگوں کو بتا دے گا تو وہ مجھے قصور وار ٹھہرائیں گے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ مردوروں کو بارہ کام شروع کر دیں مگر کوئی شخص لسن سے سنا نہ ہوا۔ بلکہ سب اپنے اپنے گھروں کو جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ میں نے سوچا ممکن ہے مسٹر لسن آگئے ہوں وہی اس معاملے میں کوئی قدم اٹھا سکیں گے۔ لہذا پتھر واپس چننا چاہئے۔ چنانچہ پتھر میں رہنے والے مردوروں کی ایک جماعت کے ساتھ واپس ہوا اور سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر قبل ہستی میں پہنچ گیا۔

مسٹر لسن کے بنگلے کے سامنے مردوروں، عورتوں اور بچوں کا ہجوم تھا اور ان میں سے بعض کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ کہیں مسٹر لسن کو کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔ مجمع مجھے دیکھ کر کاکلی کی طرح چبھ گیا۔ مسٹر لسن کا اردلی دونوں ہاتھوں سے چہرہ اٹھائے بچوں کی طرح چٹا چٹا کر رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے اسے پوچھ کر کہا۔ "مسٹر لسن کہاں ہیں؟"

"انہیں شیر پکڑ کر لے گیا ہے۔" اردلی نے جواب دیا اور میرا دل جیسے نیچے بیٹھنے لگا۔ "شیر پکڑ کر لے گیا ہے؟" کہاں؟ کس جگہ؟" اردلی نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان جو کہانی سنائی اس کا خلاصہ یہ ہے۔ مسٹر لسن اپنی پرانی جیب گاڑی میں گئے تھے۔ ان کے پاس کوئی بندوق یا ہتھیار نہیں تھا۔ شام سے پہلے پتھر کی طرف واپس آ رہے تھے کہ ایک جگہ جیب خراب ہو گئی۔ انہوں نے اسے لٹیک کرنے کی بڑی کوشش کی مگر بے سود چنانچہ جیب وہیں چھوڑ کر بیدل چلے۔ اندھیرا لہو بہ لہو بڑھتا جا رہا تھا۔ پتھر ابھی پانچ میل دور تھا۔ پانچ ایک انہوں نے دیکھا ایک شیرنی پور شیر تعاقب میں چلا آتا ہے اور اس سے خوشتر کہ وہ چھاؤں کے لیے کسی درخت پر چڑھتے شیر نے جست مار کر انہیں دیوبج لیا اور منہ میں دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ حضور میں نے یہ منظر ایک درخت کی اوٹ سے دیکھا اور خوف سے زمین پر گر پڑا میرے سچے سے آواز تک نہ نکل سکی۔ میں اس طرف پیٹاب کرنے گیا تھا ورنہ کم بخت دوسرا شیر مجھے بھی پکڑ کر لے جاتا۔"

میری گرفت رانگل پر سخت ہو گئی وہ رات انتہائی

ڈراؤنی اور بھیاں تک تھی۔ بار بار مسٹر لسن کا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھومنے لگتا۔ گاؤں کے لوگ بھی ان کی موت پر افسردہ اور خاموش خاموش تھے۔ بچے سہے ہوئے، عورتیں لرز رہیں و ترساں اور مرد حیران پریشان تھے۔

میں نے اپنا سامان تیار کیا۔ گاؤں سے چند ہٹے گئے اور جی دار قسم کے لوگ جمع کیے اور مسٹر لسن کی لاش کے بچے کے اجزا کی تلاش میں روانہ ہوا۔ راہ نمائی کے لیے اردلی کو ساتھ لے لیا۔ پتھر سے پانچ میل شمال کی جانب ایک جگہ جنگل کے سین وسط میں مسٹر لسن کی جیب کھڑی دکھائی دی۔ کچھ فاصلے پر شیرنی کے پنجوں کے نشانات بھی واضح تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ کافی دور سے جیب کے تعاقب میں بھاگتی آئی تھی اور یہ حرکت شیرنی کی فطرت سے بعید ہے۔ ممکن ہے جیب خراب نہ ہوئی تو مسٹر لسن پر اسے حملہ کرنے کا موقع نہ ملتا۔ جب میں نے جیب کو سمجھا کہ کیا تو وہ فوراً اسٹاپ ہو گئی۔ میری حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ شیرنی نے جس جگہ مسٹر لسن کو گرایا تھا وہاں جما ہوا خون بڑی مقدار میں پھرا ہوا تھا اور ان کے کپڑوں کی دھبیاں بھی جا بجا پھری نظر آئیں۔ یہ منظر اتنا دل دوز تھا کہ میں اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ اور اردلی کی تو روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ مسٹر لسن کی لاش اٹھانے میں کچھ زیادہ وقت نہ ہوئی۔ ایک گھنٹی بھاڑی سے ان کی کھوپڑی ہاتھوں میں کی اٹھایا، چند پسلیاں، ایک ٹانگ اور آنتیں وغیرہ پڑی نظر آئیں۔ شیرنی کاٹا کٹی دن کی بھوک تھی، اس نے جی بھر کر پیٹ بھرا تھا۔ میں نے ان اعضا کو وہیں رہنے دیا اور ادھر ادھر جانے لے کر اندازہ کیا کہ کون سی جگہ مناسب ہے جہاں چھپ کر میں شیرنی کا انتظار کروں۔ یہ تو طے تھا کہ وہ دوبارہ ادھر ضرور آئے گی۔

تقریباً پچیس فٹ کے فاصلے پر ایک ٹیلا نظر آیا جس کے ارد گرد جھاڑ جھنکار کھڑت سے اگا ہوا تھا۔ یہ ٹیلا بہترین کمین گاہ بن سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے بعد رات اس ٹیلے پر گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ممکن ہے میں ایسی حماقت آمیز جرأت نہ کرتا لیکن مسٹر لسن کی دردناک موت سے میرے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور میں ہر قیمت پر اس شیرنی کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا تھا۔ میں نے گاؤں والوں کو واپس بھیج دیا اور خود اردلی کے ساتھ ٹیلے کے گرد حفاظتی اقدامات کرنے لگا۔ ارد گرد سے مزید حامدار جھاڑیاں کاٹ کاٹ کر

لیٹے کے چاروں طرف پھیلا لیں تاکہ شیرنی اگر اس پر چڑھنے کی کوشش کرے بھی تو ناکام رہے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے شیرنی کے بچوں کے نشانات تلاش کیے۔ معلوم ہوا کہ اپنا پیٹ بھرنے کے بعد وہ جنگل کے اندر دینی حصے میں چل گئی ہے۔ بچوں کے نشان سیدھ میں چلے گئے تھے۔ اردلی نے بتایا دو تین میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی چشمہ ہے اور شیرنی اپنی پیاس بجھانے وہیں چلی ہوگی۔ میں نے چشمہ دیکھنے کا ارادہ کیا تو وہ کچھ ہی دیر میں وہیں پہنچ گیا۔ قاتل اور رہا تھا لیکن بہت بندھانے پر اور مسٹرولسن کی مہربانیوں کا خیال کر کے آخر چل ہی پڑا۔ تاہم خوفزدہ غھروں سے بھر آہر دیکھا جاتا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے راتقل سنبھالے جا رہا تھا۔ شیرنی نے چشمے تک پہنچنے کے لیے نہایت چالاکی سے کام لیا تھا وہ سیدھا راستہ اختیار کرنے کی بجائے پھر کاٹ کر وہاں تک پہنچی تھی۔ بہر حال ہم نے بہت جلد وہ چشمہ تلاش کر لیا۔ چشمہ کیا تھا۔ ایک بلند اور سرسبز پہاڑی ٹیلے کے چند ننھے سوراخوں سے پانی دس دس کر ایک شیشی گڑھے میں جمع ہوتا جاتا تھا۔ اس گڑھے کے گرد شیرنی کے علاوہ لود جانوروں کے بیڑوں کے نشانات بھی دکھائی دیے۔ پانی پینے کے بعد شیرنی نے اپنا رخ یکا یک مشرق کی طرف کر لیا تھا۔ اب میں نے وہاں ہی کا ارادہ کیا اور مجھے پورا یقین تھا کہ شیرنی اس جنگل میں کسی جگہ موجود ہے اور رات کو لاش پر ضرور آئے گی۔ وہاں ہی پر ہم ایک اور راستے سے گزرے۔ یہاں بھی ہم نے شیرنی کے بچوں کے نشانات دیکھے۔ کچھ کچھ میں نہ آیا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ شیرنی کو بیک وقت دو مختلف راستوں پر آنے جانے کی کیا ضرورت پیش آئی، لیکن جب غور سے ان نشانوں کو دیکھا تو حیرت کا ایک نیا باب کھل گیا۔ یہ نشان ان نشانوں سے مختلف تھے جو میں نے مسٹرولسن کی لاش اور چشمے کے ارد گرد دیکھے تھے۔ یکا یک خیال آیا کہ یہ اس کی جڑواں بہن ہوگی۔ گویا وہ دونوں شیرنیاں یہاں جمع ہو گئی ہیں۔

میں ایک بار پھر مسٹرولسن کے پنجے لکھے اعضا کو دیکھنے پہنچا اب وہاں بھی یہ انکشاف ہوا کہ لاش کو دونوں شیرنیوں نے مل کر کھا لیا ہے۔ ورنہ ایک شیرنی خود کتنی بھوکے کیوں نہ ہو لاش کا بیشتر حصہ ہڑپ نہیں کر سکتی۔

☆☆☆

وہ رات ساری عمر نہ بھول سکوں گا۔ تاریک جنگل میں ایک ٹیلے پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اگر ان آدم خود شیرنیوں کو

کر لٹھے کا موقع مل گیا تو اس کے کتنے بھیاک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس وقت ہر طرف ہولناک سناٹا طاری تھا اور کبھی کبھی مغرب کی جانب سے چند کون کے لڑانے کی مدھم آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ ہوا بند تھی۔ درختوں کے پتے ساکن اور شاخیں بے حس و حرکت تھیں۔ میرے پاس رات کاٹنے کا پورا سامان تھا۔ تھپاکو کی چٹیل، پائپ، تھوڑے سے بھرا ہوا تھرماس، فلاکی چاقو، نارنج اور طاقتور راتقل۔ وقت کاٹنے کے لیے میں نے پائپ بھرا لیکن ماچس کی تلی جلاتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ اس کا شعلہ روشن ہوتے ہی شیرنیاں قریب ہوئیں تو چمک کر فرار راہ اختیار کریں گی۔ چنانچہ دم سادھے بیٹھا رہا۔ آسمان پر مطلع صاف تھا اور تارے جھلجھلک کر رہے تھے۔ میں نے کلائی موڈ کر گھڑی پر نظر ڈالی، چمکتی ہوئی سوئیں نے بتایا کہ بارہ بج کر چند منٹ ہوئے ہیں۔ ایک ٹھنڈی ہوا کا ایک بھولا سرسراہٹا ہوا میرے پاس سے گزر گیا اور پھر ایسی آہٹ ہوئی جیسے کوئی جانور۔ بے پاؤں قریبی جھاڑیوں میں حرکت کر رہا ہے۔

ابتدا میں ایسا محسوس ہوا جیسے آوازیں ہا میں جانب سے آئی ہیں پھر دائیں جانب سے۔ میرے حواس پوری طرح بیدار تھے اور اعصاب چاق و چوبند، راتقل سختی سے تھام کر میں نے ذرا سا سر اوپر اٹھایا اور گرد دیکھا۔ آواز چند لمبے تک رکی رہی اور پھر وہی کھڑبڑ۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ یک لخت میں نے چاروں کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ دونوں شیرنیاں دائیں بائیں سے نکلیں اور مسٹرولسن کے اعضا کی طرف بڑھیں۔ ان کا قد قامت ایک جیسا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمبے ہڈیاں چٹختے اور گوشت چبانے کی آوازیں سنائی دیں۔ اب میں نے نارنج کا ٹخنہ دبا یا اور اس کے ساتھ ہی میری راتقل سے یکے کے بعد دیکھے دو گولیاں نکلیں۔ خدا کی پناہ قاتل کے دھماکے، شیرنیوں کی گرج، جنگلی پرندوں اور جانوروں کی آوازوں سے گویا حشر مچا ہو گیا۔ چند لمبے ان بھیاک آوازوں سے جنگل کی لٹا لڑتی رہی پھر حسب معمول خاموشی چھا گئی۔

میں نے نارنج کی روشنی جھاڑیوں پر ڈالی اور یہ دیکھ کر میری سرسٹ کی انتہا نہ رہی کہ دونوں گولیاں نشانے پر بیٹھی تھیں اور دونوں شیرنیوں کے پیچھے اڑ گئے تھے اور اس طرح کچال کی آدم خود شیرنیوں کا قصہ پاک ہوا جو اگر زندہ رہتی تو جانے کتنے انسانوں کا لہو پی جاتی۔



یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

تذکرہ: 230

ایسے نادر و روزگار حال حال ہی نظر آتے ہیں جو نصف
صدی سے علم و ادب "صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل
ہوں اور اپنے روزاویل کی طرح شام دم بھی ان کے لہجہ و لہجہ کی
پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر
آئے۔ آفاقی صاحبِ پکار ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ
ہیں وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے اپنی نمایاں قابلیت کی
دشمن اس کی پیمائش پر تیار نہیں رہے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے
وابستگی کے دوران میں انہیں اپنی عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت
سے ملائے اور اس کے بارے میں انکساری کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید
اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل
رفتہ ہے آئیے ہم بھی ان کے وہ پہلے سے اپنے زمانہ کی نامور
شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج
خواب معلوم ہوتا ہے

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک وراثہ ایک داستان در داستان سرگزشت

بے حد پسند کی گئیں۔ پنجابی روایتی داستان "ہیر رانجھا"
سب سے پہلے 1928ء میں لاہور میں بنائی گئی تھی۔ یہ
ایک خاموش فلم تھی کیونکہ ابھی بولتی فلموں کا دور شروع نہیں
ہوا تھا۔ ہیر رانجھا کلکتہ میں فلمائی گئی تھی اور اس کو بنانے

آئے آج آپ کو پنجاب کی پرانی داستانیں
سنائیں۔ کہے کہ تو یہ پنجاب کی لوک کہانیاں ہیں لیکن سارے
برصغیر میں مشہور ہیں۔ لیکن وجہ ہے کہ ہیر رانجھا، مرزا
صاحبان کی داستانیں سارے ہندوستان میں فلمائی گئیں اور

عابدی سرگزشت

ریکارڈ توڑ دیتے تھے۔ ان کا تعلق رابندر ناتھ ٹیگور کے خاندان سے تھا۔ اس ادارے نے اچھوتے اور ایسے موضوعات پر فلمیں بنائی تھیں جنہیں کوئی فلمساز کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

42 سال کی عمر میں ہی انسورائے ہارٹ فلم کے باعث انتقال کر گئے۔ بیٹی تانیزہ جیسے مثالی ادارے کو دیو پیکا رانی نے چلایا۔ اس ادارے میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کی فلمیں اور نقوشوں میں عدالت بھی جو کسی اور فلم ساز کو حاصل نہ تھی ماسوائے نیو ٹھیٹر کے جو کثرت میں فلم سازی کی نئی روایات قائم کر رہا تھا۔ معروف گلوکار کے ایل سہگل تھے تو چاندھر کے مگر ان کی زیادہ تر مشہور اور کامیاب فلمیں نیو ٹھیٹر ہی نے بنائی تھیں۔

دیکھتے تھے کہ آغا ز کہاں سے ہوا تھا اور بات کہاں پہنچ گئی۔ "بیر رانھا" مرزا صاحب، سوئی سٹوڈیو وغیرہ اسکا داستان ہیں جو ٹھیٹر کے زمانے سے پہلے بھی محفلوں میں زبان بولی جاتی تھیں۔ چوپالوں اور محفلوں میں رات گئے لوگ اکٹھے ہو کر داستان کو حضرات سے ساری ساری رات یہ داستان سننا کرتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ بیر رانھا کی موت اور ان کی قبروں کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ضلع جھنگ کے قریب ایک گاؤں کھوہ میں ان دونوں کی قبریں موجود ہیں۔ دونوں ایک ہی قبر میں دفن کیے گئے تھے۔ کم از کم کہا جاتا ہے۔ قبریں گاؤں کے پرانے قبرستان میں ہیں لیکن ان کے حراس کی عمارت طبعاً نظر آتی ہے اور استدلالاً مانہ نے اس پر نقوش تو ضرور چھوڑے ہیں مگر مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے بعد مقبرے کی عمارت کا ایک حصہ اور عمارتیں تو آج بھی پرانی طرز تعمیر کی یادیں چہرہ کرتی ہیں مگر عمارت کی ٹوٹ پھوٹ اور عمارت کی اشیائیں بکھری نظر آتی ہیں۔ عمارت موسم اور طویل عرصے تک دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اپنا پرانا رنگ کھو چکی ہے۔ یہ حراس کے درمیان میں ایک چھوٹے سے کٹے میدان میں ہے جس میں جا بجا پرانے درخت موجود ہیں۔

کھوہ گاؤں شکت حالت میں ہے اور موسموں، ہارٹوں کے باعث اب یہ ایک کھنڈ بن چکا ہے۔ گاؤں میں واحد صحیح سلامت عمارت ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اسی گاؤں میں ایک صدیوں پرانا درخت بھی ہے جو ایک طرف کو جھک گیا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی درخت کے نیچے مرزا اور صاحبان کو قتل کیا گیا تھا جس کے غم میں یہ درخت

والے بھی ایک ہفتاب کے ہدایت کار اے آر کاردار تھے۔ کاردار صاحب کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ دراصل نو جوانی ہی سے ان کی پہلی اور آخری محبت فلم سازی اور ہدایت کاری ہی رہی۔ ان کی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن بد قسمتی سے برصغیر کی فلمی صنعت میں انہیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ اسے آپ ہندو اکثریت کا تعصب سمجھ لیجئے یا مسلمانوں کی بے بسی اور لاعلمی، لاہور میں برصغیر کا پہلا فلم اسٹوڈیو بھی انہوں نے ہی راوی کنارے بنایا تھا۔ اسٹوڈیو کیا تھا بس ایک چار دیواری تھی۔ ساؤنڈ سسٹم اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا۔ اس اسٹوڈیو کی محبت نہیں تھی کیونکہ دن میں سورج کی روشنی میں یہاں فلمیں بنائی جاتی تھیں۔

ایک اور فلموں کے دیوانے ہی انسورائے بھی تھے جنہوں نے لاہور میں ایک اسٹوڈیو بنایا تھا مگر پھر حالات کے تقاضے کی وجہ سے بیٹی چلے گئے تھے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ ذہین اور خوش شکل انسان تھے۔ انہوں نے فلموں میں اداکاری بھی کی تھی۔ اپنے زمانے کی حسین ترین اور ذہین اداکارہ دیو پیکارانی سے شادی کر لی تھی اور ممبئی ٹرانسفر کر کے ایک یادگار فلم ساز اور اداکار بن گیا تھا۔ اشوک کمار، دیپ کمار جیسے فنکاروں کی تلاش کا سہرا بھی دیو پیکارانی کے سر ہے۔

وہ حسن پرست تھیں۔ جب ہفتاب سے نجم الحسن اداکار اور ہیر دین کر بھی گئے تو دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد باہمی دوستوں نے ہی انسورائے اور دیو پیکارانی کی صلح کرادی۔ نجم الحسن پھر سے قانع ہو گئے، بعد میں وہ لونا کادی تو کرتے رہے مگر عروج حاصل نہ کر سکے۔ لاہور میں ہم نے انہیں فلم کے ایک سیٹ پر دیکھا تھا۔ قدرے سولے ہو گئے تھے مگر بہت خواہ صورت اور شاندار انسان تھے اور وضعداری کی مثال تھے۔ لاہور میں انہوں نے چند فلموں میں معاون کردار کیے لیکن پھر فلمی صنعت سے کنارہ کش ہو گئے۔ کھاتے پیچے خوشحال گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ پرانی وضع داری، اصولوں اور اخلاق کا نمونہ تھا۔

دیو پیکارانی قیام پاکستان سے قبل لندن میں فلم اور اداکاری کی تعلیم حاصل کر کے آئی تھیں جس سے ان کی روشن خیالی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اشوک کمار کے ساتھ ہیر دین کی حیثیت سے فلم "اچھوت کنیا" میں کام کیا تھا جس نے سارے ہندوستان میں کامیابی کے تمام

ماہنامہ سرگزشت



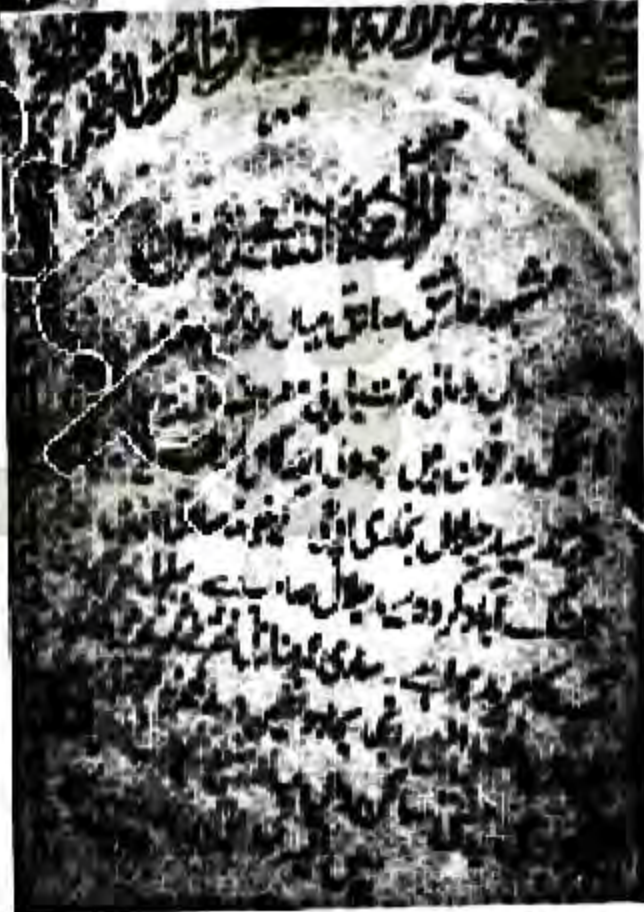
ہیرا دا نگھا کا حرار

تھی اس کی لاش کو موجودہ مقبرے تک کسی پہنچا یا گیا یہ بھی ایک معما ہے کیونکہ وہ جس جگہ ہلاک ہوئی تھی اس کا مقبرہ اس جگہ سے کافی قاصلے پر ہے۔ اس بارے میں حقائق اب تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ بعض لوگوں کو اس بات پر بھی یقین نہیں ہے کہ مرزا اور صاحبان ایک ہی قبر میں دفن ہیں۔ ان دونوں کے پرستاروں کی تعداد کم نہیں ہے۔ ایک تحقیق نے یہ بھی کہا ہے کہ مرزا صاحبان کی داستان ایک فرسی کہانی ہے حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ گاؤں کچھوہ کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے صاحبان کے بھائیوں نے غصے میں گاؤں کو آگ لگا دی۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں سیال نے (جس قبیلے سے صاحبان کا تعلق تھا) بیٹیاں پیدا کرنا بند کر دی تھیں تاکہ کوئی اور ان کی صاحبان کی طرح قبیضے کی بدنامی اور رسوائی کا سبب نہ بن جائے۔ صاحبان کی کہانی پنجاب کی روایتی لوک کہانیوں میں آخری کہانی ہے۔ اس کے بعد ایکن کوئی اور روایتی داستان سامنے نہیں آتی۔

ہیرا دا نگھا کا حرار

سوان کے نگھا سے جیسا آملی
شہر کی لونڈیا تینوں کے تیر چلا گئی

اگست 2014ء



ایک طرف کو جھک گیا ہے۔

مرزا صاحبان کی محبت کے بارے میں ایک تاریخ یہ بھی ہے کہ ان کا عشق بلی بھٹوں اور سکی بٹوں کی طرح پاکیزہ نہیں تھا۔ سبب وہ ہے کہ جب انہوں نے ایک گاؤں میں پڑاؤ کیا تو صاحبان کے بھائیوں کو علم ہو گیا اور انہوں نے مرزا کو ہلاک کر دیا۔ صاحبان بھی شدید زخمی حالت میں

ماہنامہ سرگشت

کہارن" کا آغاز ہوا تو موسیقار کے طور پر چشتی صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ادھر کلکتہ میں "سوانی میٹروپولیٹن" کے نام سے ایک فلم کا آغاز ہوا اور دونوں فلمیں ایک ساتھ ہی ریلیز ہوئیں۔ "سوانی میٹروپولیٹن" کے موسیقار مشہور موسیقار شیاام سندھ تھے۔ اتفاقاً دیکھیے کہ چشتی صاحب کی فلم کے لئے اس فلم کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوئے۔ ان کی شہرت کلکتہ تک پہنچ گئی تو وہیں سے ایک فلم ساز ان کو تلاش کرتے ہوئے لاہور پہنچے اور ہمراہ لے گئے۔ کلکتہ میں انہوں نے دو پنجابی فلموں کی موسیقی مرتب کی۔ چشتی صاحب کی پہلی اردو فلم "خاموشی" تھی جو 1942ء میں ریلیز ہوئی اور اس کے چار پانچ نئے بے حد مقبول ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے چھ اور اردو فلموں کی موسیقی مرتب کی۔ "شکرپہ" کے گیتوں کا تذکرہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ اس کا سیلابی کے بعد چشتی صاحب کو ہدایت کار کیدار شرما کلکتہ سے بنگالی لے گئے۔ یہ فلم "نکلیاں" تھی مگر نمائش کے لیے پیش ہوئی تو فلاپ ہوئی۔ ان کی اگلی فلم "اکیل" کی موسیقی بے حد مقبول ہوئی۔ ممبئی میں چند فلموں کی موسیقی بنانے کے بعد قیام پاکستان کے بعد وہ لاہور آ گئے اور پھر ممبئی کے ہو کر رہ گئے۔ پاکستان میں لن کی جیٹی فلم ہدایت کار لقمان کی "شاہدہ" تھی۔ یہ فلم 1949ء میں ریلیز ہوئی اور اس کے تین چار گانے بے حد مقبول ہوئے۔

پاکستان میں آنے کے بعد بابا چشتی کی موسیقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ وہ پاکستان کی صنعت فلم سازی کا ابتدائی دور تھا۔ بہت کم تعداد میں فلمیں بنائی جاتی تھیں اور فلموں کا معیار بھی زیادہ بلند نہیں تھا۔ مگر فلم ساز ہدایت کار نذیر نے "پھیرے" اور "لارے" بنا کر ایک نئے دور کا ڈول ڈالا۔ بابا چشتی نے ان فلموں میں ایسی موسیقی مرتب کی جو آج بھی روزِ اول کی طرح تروتازہ ہے۔ بابا چشتی نے "پھیرے" میں ایک اور نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ انہوں نے ایک ہی دن میں چھ فلمی فلموں کی طرف سے مرتب کیں اور ریکارڈ کر لیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ گانے اپنی فکس اور خوبصورتی کے باعث آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں۔ پھر تو فلموں کا تانا باندا بندہ گیا اور انہوں نے ایک کے بعد ایک بے شمار فلموں کی موسیقی بنائی اور ان میں سے بیشتر فلموں کی موسیقی نے ملک بھر میں دھوم مچا دی۔ ان میں سے چند فلموں کے نام یہ ہیں: جنم، انوکھی داستان، پھیرے، لارے، کیے دہلی، مایہ منڈا، گھبرو، سنی ما ائی، لخت جگر، مرد اور دلا، بھٹی، زلفاں،

اگست 2014ء

بھری گل آنا۔ اچھا جی
ایک زمانے میں یہ فلمی گانے کشمیر سے اس کداری تک ہندوستان کے طول و عرض میں بچے بچے کی زبان پر تھے۔ گل کوچوں میں جسے دیکھیے یہی گیت گانا پھرنا تھا۔ شہر کی لوٹ پلوٹ اس قدر مشہور اور مقبول ہوا کہ انگریزی حکومت کو نقص امن کا خطرہ دیکھ کر انگریزوں کو اس پر پابندی لگانی پڑی۔ یہ گیت جس شخص نے ترتیب دیے تھے اس کا نام موسیقار جی اے چشتی تھا۔ آخر الذکر دونوں گانے فلم "شکرپہ" کے تھے۔ یہ فلم 1944ء میں بنی تھی۔ اس قدر مقبولیت بابا چشتی کی موسیقی کو پہلی بار حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے بھی ان کے لئے مقبول عام کی سند حاصل کر چکے تھے۔ گانے تو ہر ایک کے لب پر تھے مگر موسیقار کا نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فلموں میں موسیقار کے نام کو زیادہ نمایاں نہیں کیا جاتا تھا۔ بابا چشتی کے مقبول فلموں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان میں سے کئی گیت خود ان ہی کے تحریر کئے ہوئے تھے۔

بابا چشتی نے اپنے کیریئر کا آغاز لاہور سے کیا تھا۔ تلاش معاش کے سلسلے میں کلکتہ چلے گئے اور کئی فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ اس سے پہلے لاہور میں انہوں نے کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی میں بھی کچھ روز کے طور پر ملازمت کی۔ ان سے پہلے یہ فرائض عظیم موسیقار استاد جھنڈے خان کے سپرد تھے۔ جب انہوں نے ضعیف العزری کے باعث کمپنی سے استعفیٰ دیا تو ان کی سفارش پر جے اے چشتی کو کچھ روز کے طور پر ملازم رکھ لیا گیا۔ بابا چشتی نے استاد جھنڈے خان کے ساتھ محدودے چند روز ہی کام کیا مگر ان سے بہت کچھ سیکھا۔ جھنڈے خان جتنے بڑے موسیقار تھے اتنے ہی مذہبی اور خدا ترس انسان بھی تھے۔ پانچوں وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتے تھے۔ چشتی صاحب نے کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی میں کام شروع کیا تو ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیے کہ لوگ حیران رہ گئے۔ انہوں نے ایک روز میں چھ سات گانے ریکارڈ کرائے کی جو مثال قائم کی بعد میں بھی وہ ریکارڈنگ کمپنی کو ڈسکا اور یہ بلاشبہ ایک عالمی ریکارڈ ہے۔ اس دور میں بابا چشتی نے بے شمار مقبول گیت ریکارڈ کرائے اور اس زمانے کے قریب قریب تمام بڑے گانے والوں اور گانے والیوں کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ فلمی دنیا سے چشتی صاحب کا رابطہ 1937ء میں قائم ہوا اور پچاس سال تک قائم رہا۔ لاہور میں پنجابی فلم "سوانی

ماہنامہ سرگزشت

برصغیر پاک و ہند کے مایہ ناز موسیقار بابا جی اے چشتی بھی ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں سلاز موسیقی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان کے والد ایک درویش صفت انسان تھے اور اپنے لیے گونا گوں کی بڑی مسجد کے امام تھے۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول میں دماغ راگنیوں اور ساز و آواز سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بابا چشتی جو موسیقی اور علم کی دنیا میں بچے چشتی کے نام سے مشہور ہیں ان کا پورا نام غلام احمد چشتی ہے۔ مگر انہیں پورے نام سے کوئی نہیں جانتا۔ وہ بابا جی اے چشتی کے نام سے مشہور ہیں اور بھی نام ان کی شناخت میں چکا ہے۔ کون جانتا تھا کہ ایک قدامت پرست،

نڈھکی گھرانے میں پیدا ہونے والا یہ بچہ ایک دن برصغیر کی دنیا سے موسیقی میں کچھ پیارے گا اور اس کا نام بطور موسیقار ان منٹ ہو جائے گا۔ غلام احمد نے اسکول میں داخلہ لیا تو مطالعہ اور شعر و ادب سے بہت زیادہ وابستگی رہی۔ والد صاحب کے ایما پر انہوں نے نڈھکی تعلیم بھی حاصل کی۔ خوش الحان تھے اس لیے نعت گوئی کے میدان میں قدم رکھا۔



بابا جی اے چشتی

دراصل یہ ان کے شوق موسیقی کا آغاز اور ابتدائی ذریعہ اظہار تھا۔ انہیں ذاتی طور پر بھی نعت گوئی سے دلچسپی تھی اور انہوں نے عنوان شباب میں اپنی شاعری کا آغاز نعت نویسی سے کیا تھا۔ والد کی خواہش تھی کہ انہیں اعلیٰ تعلیم دلائیں مگر قصا نے مہلت نہ دی۔ ابھی غلام احمد دسویں جماعت میں تھے کہ درویش صفت والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چند ماہ بعد ان کی والدہ اور چھوٹی بہن بھی انتقال کر گئیں اور وہ دنیا میں تنہا رہ گئے۔ ان حالات میں تعلیم جاری رکھنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ان پے درپے مصدموں نے انہیں اس قدر مایوس اور افسردہ کیا کہ دنیا سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا۔ مگر پھر دوستوں کی محبت اور ہمدردی کی بدولت انہوں نے جینے کی طرف توجہ دی۔ تعلیم تو کھل نہیں ہوئی تھی اس لیے انہوں نے نعت گوئی کی باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لیے میاں احمد بخش کی شاگردی اختیار کی۔ میاں صاحب بہت اچھے نعت گو تھے اور موسیقی کے بھی استاد مانے جاتے تھے۔ اس طرح بابا جی اے چشتی نے اپنی موسیقی کی تربیت کا آغاز کیا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مصدموں اور تنہائی کے باعث وہ

چنگاں، گڈی گڈا، پٹکاں، دلیر، بلو، محفل، فوکر، چکا، سورنی، سوئی ماں، جٹی، مس 56، ماما جی، تیرا انداز، ان پڑھ، جھ جھڑی، سستی، رانی خاں، ذیلدار، کھنڈا جن ورگا، رانی خاں وغیرہ۔ بابا چشتی نے جن فلموں کی موسیقی ترتیب دی ان کی تعداد اڑھائی سو کے لگ بھگ ہے۔ ہمارے ملک میں اعداد و شمار اکٹھے کرنے کا کوئی بندوبست نہیں ہے مگر ایک اندازے کے مطابق بابا چشتی نے تیس ہزار کے قریب ہر دور اور پنجابی گانوں کی دھنیں بنائی ہیں جن میں سے مقبول ہونے والے انشور کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے۔ یہ ایک ایسی کارکردگی ہے جو کسی بھی اعتبار سے قابل تحسین و افتخار ہے۔ بابا چشتی

کے ذہن ہر سا کی تپانی میں عمر گزرنے کے ساتھ کوئی فرق نہیں آیا تھا مگر ہماری فلمی صنعت نے کئی سال پہلے ہی انہیں عملی طور پر پریشان کر دیا۔ تمام عمر ملی یہ ہے کہ ان کی جگہ جن نئے موسیقاروں نے لی انہوں نے بابا چشتی کی دھنیں انتہائی فراخ دلی سے استعمال کیں اور بعض طرز میں تو ہو بہو اپنائیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی مقبول دھنوں میں زیادہ تعداد بابا چشتی

سے مستعار لی ہوئی دھنوں کی ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کی بزرگی، تجربے اور خدمات کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ ان کے سامنے میں نے بڑے بڑوں کو مودب دیکھا ہے مگر جب بابا چشتی نے فلمی موسیقی سے ”بے غل“ کرنے پر احتجاج کیا اور فلم سازوں سے شکوہ کیا کہ وہ انہیں موسیقی بنانے کا موقع کیوں نہیں دیتے تو کسی نے ان کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ لوگوں کے پاس یہ بہانہ تھا کہ بابا چشتی بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بابا چشتی کی عمر 90 سال ہے مگر ان کی ذہنی استعداد اور قوت تخلیق میں انحطاط نظر نہیں آتا۔ اگرچہ جسمانی طور پر وہ عمر کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں لیکن دس بارہ سال قبل تو وہ بالکل تازہ دم تھے۔

پاکستان میں عموماً موسیقاروں کا تعلق ایسے گھرانوں سے رہا ہے جو پشت پشت سے اسی فن سے وابستہ رہے ہیں لیکن ایسی مثالیں بھی ہیں جب عام گھرانوں کے لوگوں نے موسیقی کے میدان میں قدم رکھا اور اپنی لہانت، صلاحیت اور کارکردگی کے حوالے سے انتہائی بلند مقام حاصل کیا۔ خواجہ خورشید انور، ظیل احمد، مدین کھوش، سکیل رانا، فاکر بڑی وغیرہ اس ضمن میں چند نام ہیں۔ مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ

ملینا امیر گزشت

ایک ماہر، دل گرفتہ اور فزودہ انسان بن جاتے مگر جی۔ اسے چشتی کی فطری خوش مزاجی اور عرافت طبع نے ان کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ ایک فنس کہ بلکہ ایک حد تک مزاحیہ آدمی تھے۔ اس کا اظہار ان کی روزمرہ گفتگو میں بھی ہوتا رہتا تھا۔ فقرہ چست کرنے میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ ذہانت اور قدرتی صلاحیتوں نے انہیں نہ صرف موسیقی کے میدان میں سر بلند کیا بلکہ شاعری میں بھی انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے بے شمار گیت لکھے جن میں سے کچھ ان کے نام سے مگر بیشتر دوسروں کے ناموں سے منسوب ہیں۔ اس بارے میں وہ اتنے فراخ دل اور فیاض تھے کہ اچھے سے اچھے کھڑے غلیظ کرنے کے بعد دوسروں کے حوالے کر دیتے اور پیشانی پر ہل تک نہ آتا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں ایک موسیقار ہوں۔ شاعری میرا شعبہ اور پیشہ نہیں ہے۔ اگر توجہ دیتا تو ہو سکتا ہے ہاتھ کاٹھ شاعر بھی بن جاتا۔ گاہے گاہے اشعار کہہ لینے اور کچھ اچھے کھڑے تصنیف کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں شاعری کے میدان میں بھی قدم رکھ دوں۔ انہوں نے جن لغات کی دھنیں مرتب کی ہیں ان میں ایسے گیتوں کی خاصی تعداد ہے جو ان کی تخلیق کردہ ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا تھا کہ اگر شاعر کے خیالات کی رو میں عقل پیدا ہو گیا تو بابا چشتی نے اترو لکھ کر حوالے کیا اور غصے کو کھل کر دیا۔ ان کی تخلیقی قوت بے مثال تھی۔ کام کی کثرت، وسائل کی کمی، وقت کی نایابی ان کی قوت کا بے مطلق اثر انداز نہیں ہوتی تھیں۔

بابا چشتی نے یوں تو اردو پنجابی دونوں زبانوں کی موسیقی ترتیب دی ہے۔ مگر زیادہ تعداد پنجابی دھنوں کی ہے۔ پنجابی فلموں میں ان کی موسیقی معیار اور مقدر دونوں اظہار سے ممتاز اور قابلِ تحریف ہے۔ ان کے ہارے میں ایک زمانے میں یہ کہا جانے لگا تھا کہ وہ پنجابی فلموں کی موسیقی بنانے میں بیٹا ہیں، اردو فلموں میں وہ انہی کا کردار کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔ بابا چشتی نے "لفت جگر" کی موسیقی بنا کر تنقید کرنے والوں کے منہ بند کر دیے۔ اس سے پہلے فلم "لوکر" میں ان کی موسیقی نے اپنا لوہا منوالیا تھا۔ انہوں نے بابا چشتی کے ساتھ نہ زمانے نے انصاف کیا نہ فلمی صنعت نے۔ مگر اس کے باوجود ان کی خدمات کو یکسر نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ انہیں ٹھہر فلم ایچ ٹیو اور ایگنا ایوارڈ کے علاوہ میشل فلم ایوارڈ بھی دیا جا چکا ہے اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ بابا چشتی کی قرار و اقل قدر نہیں کی گئی۔

بابا چشتی 1901ء میں ضلع جالندھر کے ایک قصبہ گوناچر میں پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ تاہا جاچکا ہے موسیقی سے لگاؤ کی بنا پر وہ راگ اور سُر کی دنیا میں چلے آئے۔ موسیقی سے ان کی رغبت اور لگن کی بدولت راستے خود بخود ہموار ہوتے گئے۔ بابا چشتی نے ابتداء زمانے میں محکمہ آبپاشی میں بھی ملازمت کی ہے۔ یہاں رہا ہے کہ موسیقی کی بنا پر یہاں بھی وہ نہروں اور راجا ہوں کی بجائے موسیقی سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ اس طرح بابا چشتی نے اپنی موسیقی کے بل پر ملازمت حاصل کی اور محکمے میں بھی موسیقی کی محفلیں سجاتے رہے۔ محاش کی طرف سے بے غم رہی ہوئی تو انہوں نے ہاتھ کاٹھ موسیقی سیکھنے پر توجہ دی اور کلاسکی موسیقی کے بڑے بڑے اساتذہ کے پاس جا کر تعلیم حاصل کی۔ پنجاب کے لوگ گیتوں پر انہیں جو عبور حاصل تھا وہ پاکستان کے کسی اور موسیقار کے حصے میں نہیں آیا۔ یہاں وہ ہے کہ ان کے نفوس اور طرزوں کی بنیاد جو لوگ دھنوں پر استوار ہوتی ہے اور یہ موسیقی لازماً اہل حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔ بابا چشتی کو موسیقی کے ساتھ ساتھ گانے کا بھی شوق رہا ہے اور یہی شوق انہیں آغا حشر کاشمیری مرحوم تک لے گیا تھا۔ آغا حشر جن لوگوں کو "پریم پرکاش" کہتے تھے اسی زمانے میں چشتی صاحب کی ان تک رسائی ہوئی اور آغا صاحب نے ان کی ذہانت اور صلاحیت سے متاثر ہو کر انہیں اپنے ادارے میں ملازم رکھ لیا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آغا حشر نہ صرف بہت اچھے شاعر تھے بلکہ کپور تھر بھی تھے۔ اپنے دارا میں کی موسیقی وہ غنا رنگم کے تعاون سے ترتیب دیا کرتے تھے۔ موسیقی کی دھنیں بنانے اور انہیں موزوں سازوں سے سنانے کا لہن بابا چشتی نے آغا حشر ہی سے سیکھا تھا۔ آغا حشر نے اپنے اس دارا کو فلم کے روپ میں ڈھالا تو وہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔ آغا حشر کی وفات کے بعد ہی بابا چشتی نے کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی میں میوزک کپچر کے طور پر کام شروع کیا تھا۔

اپنی طویل فلمی زندگی میں بابا چشتی نے طرزوں، یوں اور سازینوں میں نئے نئے تجربے کیے اور نئی راہیں تراشیں، راگ راگنیوں اور لوک دھنوں کے علاوہ انہوں نے پنجاب کے روایتی اور مقبول سازوں کو بھی فلمی آد کسٹرا سے روشناس کرایا۔ ان کی موسیقی کا ایک حسین اور دلکش پہلو مردم بھی ہے۔ انہوں نے ڈھولک اور گھڑے کو انتہائی خوبصورتی سے استعمال کیا۔ آج بھی یہی مردم پنجابی دھنوں

کی جان تصور کیا جاتا ہے۔ ان کی موسیقی انتہائی سادہ اور پُر اثر ہوتی تھی۔ روزمرہ کے الفاظ اور معمولی سادوں کے خوبصورت استعمال سے وہ طرزوں کو عام فہم اور دلنشین بنا دیتے تھے۔ شاعرانہ ذوق کی بدولت نغموں کا انتخاب بھی انہوں نے بہت اچھے انداز میں کیا۔ ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے نئے نئے بھی خود ہی لکھ دیئے۔ بطور نمونہ ذکر متعارف ہونے کا انہیں کوئی شوق نہیں تھا اور وہ بڑی فیاضی سے اپنے لکھے ہوئے گیت دوسروں کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔

بابا چشتی کو میں نے جب بھی دیکھا ہمیشہ تازہ دم اور زندہ دل ہی پایا۔ عموماً سفید لباس ان کا مرغوب پہناوارہ جلیں بار میں لے آئیں ہدایت کار قہمان کی پنجابی فلم ”تین“ کی موسیقی ترتیب دیتے ہوئے دیکھا۔ یہ 55-56ء کی بات ہے۔ وہ ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے اور دھنوں کا ڈھیر لگا دیا کرتے تھے۔ کئی کھڑے بھی خود ہی بنادیتے۔ فلم ”تین“ میں انہوں نے ایک ہی دن میں تین گانوں کی طرزیں بنا کر صدائیں بھی کرادیا۔ میں ان کا یہ کارنامہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا مگر مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ اس سے پہلے ایک ایک دن میں چھ سات گانے تحریر کر کے گور ان کی دھنیں بنا کر ریکارڈ کرنے کا ریکارڈ بھی قائم کر چکے ہیں۔ انہیں دھن بنانے میں کسی مشکل پیش نہیں آتی بلکہ ان کی دھنوں کے مقابلے میں گانے کم پڑ جاتا کرتے تھے۔ وہ حیران کن حد تک تیزی سے کام کرنے کے عادی تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ ہدایت کار نے فلم کی جو لیٹن بیان کی، ابھی شاعر نے پورا نغمہ بھی قلم بند نہیں کیا کہ بابا چشتی نے طرز بنا کر تیار کر دی۔ اس ضمن میں کچھ لطیفے بھی مشہور ہیں۔ ایک بار فلم ساز آغا علی، اسے گل کی چند قلموں کے لیے بابا چشتی اور ماسٹر حمایت دونوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ بابا چشتی نے ایک ہفتے کے اندر فلم کے تمام گانے ریکارڈ کرادیئے۔ ماسٹر حمایت اپنے انداز میں آہستہ دوی سے کام کرنے کے عادی ہیں۔ وہ مہینے گزر گئے اور ماسٹر حمایت ایک گانا بھی ریکارڈ نہ کرا سکے تو ایک دن بابا چشتی سے کہنے لگے۔ ”بابا جی۔ دو تین دھنیں تو ادھار دے دیں تاکہ میں بھی فلم ساز کے سامنے سرخرو ہو جاؤں۔ بن جائیں گی تو آپ کو بے دہوں گا۔“

ایک زمانے میں فلمی حلقوں میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ بابا چشتی صرف پنجابی فلموں کے موسیقار ہیں۔ بابا چشتی نے سنا تو بہت چرامش ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ موسیقی زبان کی پابند نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص ذاتی میوزک کچل رہے تو

وہ اظہار کی خبروں کی بھی دھن بنا سکتا ہے۔ ثبوت کے طور پر انہوں نے سامنے پڑے ہوئے اخبار میں شائع ہونے والی ایک خبر کی دھن بنا کر دے دی۔ یہ واقعہ ان کی خبر مندی اور دسترس کا منہ بولا ثبوت ہے۔ پنجابی فلم ”دلا بھلی“ ریلیز ہوئی اور بے حد کامیاب ہوئی۔ بابا چشتی پہلے ہی دن شام کے شو پر اپنے بہت سے بچوں کو لے کر پہنچ گئے۔ ہاؤس فیل ہو چکا تھا۔ باہر سیکڑوں خبریوں کا مجمع تھا جو گھٹ حاصل کرنے سے محروم رہا تھا۔ مگر بابا جی کا اصرار تھا کہ ان کے سارے خاندان کو فلم دکھانے کا بندوبست کیا جائے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ بالکل ناممکن ہے اس وقت آپ جاتیے۔ آپ کے لیے اگلے شو میں بندوبست کر دیا جائے گا۔ اس پر وہ برہم ہو کر بولے ”اچھا تو پھر فلم میں سے میری میوزک نکال دو تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ ورنہ نہیں“ اس ہنگامے کی خبر آغا علی اسے گل کو بھی پہنچ گئی اور ان کی ہدایت پر سینما والوں نے کسی نہ کسی طوع بابا چشتی کی ضد پوری کر دی۔

ای۔ ایم۔ آئی ریکارڈنگ کمپنی کی جانب سے مقبول موسیقاروں اور گلوکاروں کو ”گولڈن ڈسک“ پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو بابا چشتی اس سے محروم رہے۔ بابا کو بہت غصہ آیا۔ کمپنی کے چیفنگ ڈائریکٹر کے پاس گئے اور بولے ”میں نے ایک ہی کبوتر چھوڑا تھا جو آج تک لوٹ کر نہیں آیا ہے۔ پھر بھی آپ لوگوں کو میری قدر نہیں ہے۔“ ان کا اشارہ اس مقبول نغمے کی جانب تھا جس کے بول یہ تھے۔

داستانی رب داتا جویں دے کبوتر

اس نغمے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہر طرف گونج رہا تھا اور اس کے ریکارڈوں کی فروخت نے ایک نیا پکارا قائم کر دیا تھا۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں رائٹس اور کاپی رائٹ کا بھی نظام مروج نہ ہونے کی بنا پر بابا جی کے حصے میں کچھ نہ آیا۔ بابا جی ایک سادہ حراج، سادہ لوح انسان ہیں مگر انہیں یہ احساس ہمیشہ رہا ہے کہ ان کے قد و قامت کے مطابق ان کی قدر نہیں کی گئی۔ انہیں فلمی دنیا اور زمانے سے بھی شکوہ رہا جس میں وہ حق بجانب بھی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے کارناموں کے مقابلے میں ان کی شہرت، عزت اور پذیرائی بہت کم رہی ہے۔ غالباً اس میں ان کی سادگی، درویش خلقی اور کم آمیزی کا بھی دخل رہا ہے۔ ایک بار انہوں نے یہ لطیفہ خود سنایا تھا کہ ان کے بچے نے کسی بہت مہنگی چیز کی فرمائش کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ہم نے تو اپنے لڑکپن میں ان چیزوں کا تصور

نک نہیں کیا تھا۔ بچے نے جواب دیا۔ "لہاجی۔ میرا اور آپ کا کیا مقابلہ ہے۔ آپ بابا جی جیسے موسیقار کے بچے تو نہیں ہیں۔" بابا جی لا جواب ہو گئے اور چپکے سے اس کی فرمائش پوری کر دی۔

"وہ تو ساری زندگی سبکی کی ضرورتیں اور فرمائشیں پوری کرتے رہے مگر کوئی ان کی ایک مصوم خواہش تک نہیں پوری کر سکا اور وہ یہ کہ جب تک وہ موسیقی بنانے کے قابل تھے ان سے کسی نے کام نہ لیا۔ شاید یہی فلم انہیں لے بیٹھا ہو۔ وہ ایک دل شکست اور مایوس انسان کی طرح دنیا سے رخصت ہوئے۔ ایسے بے بہا فنکار کی ہم نے کیا قدر کی کاش انہیں اس شوق اور خدمت سے محروم نہ کیا جاتا۔" یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے؟

☆☆☆

ایک وقت تھا جب فلموں میں احمد رشدی کے گانے ایک لازمی ضرورت سمجھے جاتے تھے۔ ریڈیو سے ان کی میٹھی آواز ہر وقت گونجتی رہتی تھی۔ انہوں نے اپنی گلوکاری کا آغاز آج پرغز سرہلے سے کیا تھا۔ بچپن ہی سے انہیں گانے کا شوق تھا، حالانکہ ان کے خاندان میں کوئی گانے والا یا موسیقی سے دلچسپی رکھنے والا نہیں تھا۔ یہ انگ بات ہے کہ بعد میں ان کے ایک بھائی اور سلمان بھی بطور معاون ہدایت کار اور اداکار فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ ان کا تعلق۔۔۔۔۔ حیدر آباد (دکن) سے تھا۔ کم عمری تھے کہ والدین کے ہمراہ پاکستان آ گئے اور کراچی میں قیام کیا۔ انہوں نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس کا ایک سبب تو معاشی حالات تھے مگر اصل بات یہ تھی کہ انہیں پڑھنے، پڑھانے کا شوق بھی نہیں تھا۔ محض گانے کا شوق تھا۔ جو گانا سننے یا دکر لیتے اور پھر اسی طرز اور ادائیگی کے ساتھ گاتے۔ پہلے ان کی اس خصوصیت کا چرچا ان کے قریبی دوستوں میں ہوا۔ پھر واقف کاروں میں اور پھر یہ بات پچھلی چلی گئی مگر اس شوقین گلوکار کو کسی نے منہ نہیں لگایا۔ اول تو کسی کو ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہی نہیں تھا نہ انہوں نے ہا قاعدہ گانا سیکھا تھا نہ راگ رانگیوں سے واقف تھے اور نہ ہی ریاض کیا تھا۔ کسی نے انہیں یہ نہیں سکھا یا تھا کہ راگ دہری کیا ہوتی ہے اور ایک راگ میں کتنے سُر ہوتے ہیں۔ بس قدرت نے انہیں خدا داد صلاحیتوں سے نوازا تھا اور روح الہی کی حد تک گانے کا شوق تھا۔ ان کے پاس لے دے کر بس سبکی دوا تھا۔

موسیقی ایک ایسا سمندر ہے جس میں بڑے بڑے مگر

ملہنا مسرگزش

مجھ، مچھلیاں اور حیراک غوطہ زن رہتے ہیں۔ یہ لوگ کسی انجی کو اس سمندر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر کسی کا تعلق گانے والوں اور موسیقاروں کے گھرانے سے ہے پھر تو کچھ آسانی ہے مگر جو شخص اس برادری سے باہر کا ہے پھر موسیقی کے رموز و اسرار سے ہا قاعدہ واقف اور تربیت یافتہ بھی نہیں ہو تو اسے کون سمندر میں کودنے کی اجازت دیتا ہے مگر احمد رشدی نے اللہ کا نام لے کر موسیقی کے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ بہت غوطے کھائے۔ کبھی ڈوبے، کبھی گلے مگر سانس پور آس کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ پہلے آج پر، پھر قاریب میں اور اس کے بعد ریڈیو پاکستان کراچی سے گانے لگے۔ رشدی نے ہا قاعدہ اور ہاضابلہ گانا نہیں سیکھا تھا مگر قدرت نے بے حد سرہلے اور شیریں آواز عطا کی تھی۔ سوز، تاثیر اور روشنی یہ تینوں چیزیں رشدی کی آواز میں نکلا ہو گئی تھیں۔ اگر گانا کانوں کو بھلا لگے تو کون پوچھتا ہے کہ گانے والے نے ہا قاعدہ موسیقی کے سبق کسے دیے ہیں یا نہیں چنانچہ بہت جلد رشدی کی آواز قاریب میں گونجنے لگی۔ ریڈیو پاکستان سے انہوں نے کمرشل گیت بھی گائے جو بے حد مقبول ہوئے۔ وہ ریڈیو پر بچوں کے پروگرام میں حصہ لینے لگے اور ایسے ایسے نئے گانے جو بعد میں یادگار بن گئے۔

بندر روڈ سے کیمناڑی، میری جلی ہے گھوڑا گاڑی

بابو ہو جانٹ ہاتھ پر

یہ نغمہ اس قدر مقبول ہوا کہ بچے بچے کی زبان پر آ گیا۔ وہ جو سالوں نے کہا ہے کہ طرہ ہوتا ہے جس کی خوشبو ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ محض عطر کی تعریفوں سے تو کوئی عطر اچھا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو خود اپنے منہ سے بولا ہے لہذا احمد رشدی کی صلاحیتوں کا چرچا بھی ان کی آواز کے ساتھ ساتھ پھیلنے لگا۔ کراچی میں فلم سازی کا ابتدائی دور تھا۔ ایک فلم ساز نے "کارنامہ" بنائی تو اس میں احمد رشدی کی آواز کو شامل کر لیا۔ فلم ساز کے لیے یہ سستا سودا تھا اور آواز بھی اچھی تھی۔ اس کے بعد ان کی فلم "بڑا آدمی" ریلیز ہوئی۔ یہ فلم بہت زیادہ کامیاب تو نہیں ہوئی مگر رشدی کی آواز سننے والوں کے دلوں میں اتر گئی۔ پھر تو کراچی کی اکثر فلموں میں احمد رشدی گلوکاری کا مظاہرہ کرنے لگے۔ اپنا پرایا مواد رے زمانے، انصاف، دو استاد، رات کے رات، زمانہ کیا کہے گا، یہ دنیا، راز، ہر فلم میں احمد رشدی کی آواز شامل تھی۔ ان میں سے بعض فلموں کی شوٹنگ لاہور میں

اگست 2014ء



گلوکار کمال مہنا اور احمد رشدی

چاند سا کھنڈا گورا بدن
گوری لگائے جل میں اک
آج بھی اسی اچھا لگتا ہے جتنا 1960ء میں لگتا
تھا۔ قسمت زوروں پر تھی۔ اس نئے کو 1961ء کے لیے
بہترین گلوکار کا نکارا دیا گیا اور رشدی کی خوش نصیبی اور
مقبولیت پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔ اس کے بعد تو احمد رشدی
کی مصروفیات کا یہ عالم ہوا کہ کبھی لاہور میں گارہے ہیں تو
کبھی کراچی میں نئے ریکارڈ کر رہے ہیں۔ وحید مراد نے
اپنی پہلی فلم "ہیرا پتھر" کا آغاز کیا تو اپنے لیے احمد رشدی کی
آواز کا انتخاب کیا۔ اس فلم کے گانے ہٹ ہو گئے۔ وحید
مراد کو احمد رشدی کی آواز اس قدر پس آئی کہ اسکرین پر
یوں لگتا تھا جیسے وہ خود ہی گارہے ہیں۔ اس کے بعد احمد
رشدی کی آواز اور وحید مراد کی اداکاری ایک دوسرے کے
لیے لازم و ملزوم ہو کر رہ گئی مگر رشدی نے جب محمد علی کے
لیے پس پردہ گلوکاری کی تو ان کی آواز محمد علی کو بھی سوٹ کر
گئی۔ محمد علی کیا، پاکستان کا کوئی ہیرا دیا نہیں تھا جسے احمد
رشدی کی آواز سوٹ نہ کرتی ہو۔ یہ نہ صرف ایک حسن اتفاق
تھا بلکہ احمد رشدی کی فنکاری اور تخلیقی صلاحیتوں کا واضح
ثبوت بھی تھا۔ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر احمد رشدی
کی آواز گونجنے لگی۔ انہوں نے حراجہ ردائی، الیہ ہر حم

ہوئی۔ صدا بندی کے لیے بھی انہیں لاہور آنا پڑا۔ ان کا
تذکرہ ان سے پہلے ہی لاہور پہنچ چکا تھا۔ اس لیے لاہور کے
فلم سازوں نے بھی احمد رشدی کے بارے میں سوچنا شروع
کر دیا مگر لاہور والوں کے لیے مستقل طور پر کراچی میں
رہنے والے فنکاروں کی خدمات حاصل کرنا اکثر اوقات
پریشانی کا سبب بن جایا کرتی تھی مگر رشدی تو خود پاکستان
کے فلمی ہالی وڈ میں آنے کے لیے پرتول رہے تھے۔ وہ
جانتے تھے کہ جب تک وہ لاہور کی فلموں میں نہیں گائیں
تو مستند گلوکار کا مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

جب انسان کوشش اور شہید خواہش کرتا ہے تو
قدرت بھی ساتھ دیتی ہے۔ شاہب کیرانوی اپنی جدت
پسندی اور نئے نئے فنکار متعارف کرانے کے لیے مشہور
ہیں۔ احمد رشدی کو کراچی سے لاہور بلانے کا سہرا بھی ان
ہی کے سر ہے۔ وہ بھی ابھرتے ہوئے فلم ساز اور حمایت کار
تھے۔ نوخیز اور تروتازہ چہروں، آوازوں اور خیالوں کو ترجیح
دیتے تھے۔ انہوں نے میوزیکل فلم "سپیرن" کا آغاز کیا تو
لاہور کے ممتاز اور مکہ بند گلوکاروں کو چھوڑ کر احمد رشدی کا
انتخاب کیا۔ احمد رشدی نے "سپیرن" کے لیے پہلا گانا
ریکارڈ کرایا اور یہ گانا فلم کی نمائش سے پہلے ہی مقبول ہو گیا
اور اس مقبولیت میں آج تک کمی واقع نہیں ہوئی۔

ماہنامہ سرگزشت

اور میڈم نور جہاں کی آوازوں میں بیک وقت صدا بند کئے گئے ان میں بھی وہ اپنی موجودگی کا احساس دلانے میں کامیاب رہے جو ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

احمد رشدی سے میری ذاتی ملاقات اس وقت سے تھی جب وہ کراچی میں گایا کرتے تھے۔ وہ بہت لمبا، منکسر المزاج اور خوش اخلاق انسان تھے۔ بہت جلد مکمل مل جاتے تھے۔ لیکن سنانے پر آمیں تو بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ حاسد نہیں تھے۔ اپنے تمام ہم عصر گلوکاروں کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ میں نے ان کی زبان پر بھی کسی دوسرے گلوکار یا کسی موسیقار کی برائی نہیں سنی۔ لحاظ و مروت کا عنصر ان کے مزاج میں حد سے زیادہ تھا جس کے باعث انہوں نے مالی نقصانات بھی اٹھائے۔ مروت کے بارے میں بہت سے فلم سازوں سے کم معاوضہ لینا قبول کر لیتے تھے اور اگر کوئی وہ بھی گول کر دے تو تلافی کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی جبکہ ان کے دوسرے ہم عصر گلوکار پوری رقم وصول کرتے تھے۔ احمد رشدی اس مقام پر تھے جہاں وہ نہ مالا معاوضہ حاصل کر سکتے تھے مگر اخلاق کے بارے میں لڑنے تک نہیں تھے جس سے بہت سے فلم ساز ناہانزائدہ اٹھاتے تھے۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ احمد رشدی کو اداکاری کا بھی شوق تھا۔ ایک دو فلموں میں انہوں نے بہت اصرار کر کے اپنے گانے خود اپنے آپ پر فلم بند بھی کرائے تھے۔ میں نے بلور فلم ساز کی فلم ”کنیز“ جانی تو اس میں کالج کے مناظر میں رشدی کو بھی ایک طالب علم کے طور پر پیش کیا اور انہوں نے بے ساختہ اور بے تکلفانہ اداکاری کا مظاہرہ کیا مگر اس سے زیادہ اداکاری ان کے پس کی بات نہ تھی۔

رشدی حیدر آباد (دکن) سے تعلق رکھتے تھے۔ حیدر آباد کے لوگ ہرگز شہر والے اور ہر آنے والے والے کو ”پرسوں“ کا واقعہ کہتے ہیں۔ مثلاً اگر دس برس پہلے بھی کوئی واقعہ ہوا ہے تو کہیں گے کہ ”پرسوں کی بات ہے“ اس طرح آنے والے زمانے کے لیے بھی ”پرسوں“ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے حالانکہ اردو زبان اور قواعد کے اعتبار سے پرسوں تیسرے دن کو کہتے ہیں۔ ایک بار میں نے کسی کام کے لیے ان سے وعدہ کیا کہ آپ کا یہ کام پرسوں ہو جائے گا۔ وہ پوچھنے لگے ”یہ پرسوں حیدر آباد والوں کی پرسوں تو نہیں ہے؟“ حیدر آباد کے لوگ کھٹائی بہت پسند کرتے ہیں۔ اچار اور چٹنیوں کے علاوہ ہر کھانے میں کھٹائی

کے گیت گانے اور ہر ایک کے ساتھ انصاف کیا۔ اپنی آواز کی مٹھاس، اتار چڑھاؤ، تاثر اور اظہار احساس پر قدرت کے باعث وہ ہر قسم کے گانے گاتے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے اور اداکار کے لیے احمد رشدی کی آواز ہی سب سے زیادہ سوزوں ہے۔ یہ ایک قابلِ تعریف بات تھی جس کا احمد رشدی کو بہت فائدہ پہنچا۔

احمد رشدی نے کسی تنہا جگہ میں نغمہ سرا کی کا آغاز نہیں کیا تھا یہ بھی نہیں کہ وہ پاکستان میں اکیلے ہی گلوکار تھے۔ جی تو یہ ہے کہ جب رشدی نے اس میدان میں قدم رکھا تو وہ موسیقی اور گلوکاروں کی وراثت کے لحاظ سے پاکستان کی فلمی صنعت کا سنہری دور تھا۔ ذرا غور فرمائیے کہ کیسے کیسے مایہ ناز گلوکاران کے ہم عصر تھے۔ مہدی حسن، سلیم رضا، خیر حسین، مسعود رانا، عجب عالم، رجب علی، اخلاق احمد جیسے گانے والے پاکستان کی فلمی صنعت کو اپنی آوازوں کے حسن سے مالا مال کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی انفرادیت اور مخصوص انداز تھا۔ اس کے باوجود احمد رشدی نے اپنی گلوکاری کا لہجہ منوالیا۔ انہوں نے اپنی آواز کو کسی ایک انداز یا مخصوص سانچے میں نہیں ڈھالا بلکہ وہ ہر قسم کے گانے پر قدرت رکھتے تھے اور اس طرح گاتے تھے کہ جتنی ادا کر دیتے تھے۔ ان تمام آوازوں نے پاکستان کی فلمی صنعت کو پایا سنوارا تھا اور احمد رشدی کی آواز ان سب میں ایک ممتاز اور منفرد آواز تھی۔

احمد رشدی نے قریب قریب ہر قابل ذکر موسیقار کے لیے گانے گائے۔ اس زمانے میں فلم سازی کے تین مراکز تھے۔ لاہور، کراچی اور ڈھاکہ، احمد رشدی نے ان تینوں مراکز کے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا اور ناقابل فراموش نئے تخلیق کیے۔ وہ شاعر کے الفاظ کو معنی اور موسیقار کے سروں کو زندگی بخش دیتے تھے، حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے چند پنجابی نغمے بھی گائے اور وہ بھی مقبول ہوئے لیکن ان کے بیشتر نغمات اردو فلموں کے لیے ریکارڈ کیے گئے۔ انہوں نے بعض فلموں میں نامور آوازوں کے ساتھ دو گانے بھی ریکارڈ کرائے اور بعض ایسے نغمے بھی ہیں جو ہیروئن کے لیے زمانہ آواز میں اور ہیرو کے لیے مردانہ (احمد رشدی کی آواز میں) ریکارڈ کیے گئے۔ ان کے مقابل گانے والوں میں بہت بڑے بڑے نام شامل ہیں مگر میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ انہوں نے اکثر گانے بہتر انداز میں گائے اور وہ مقبول بھی ہوئے۔ یہاں تک کہ جو گانے ان کی

ایک دوسرے کو چھیڑتے رہے اور محمد علی کو "جنگجو" ہیرو کا خطاب دے دیا۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ لاہور میں نوہند محمد علی کی اس دانتے کے بعد لاہور کی فلمی دنیا میں دھماکا مچ گیا۔

احمد رشیدی کا ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ میری فلم "ہاگیر" کے ایک گانے کے لیے موسیقار ثار بڑی صاحب نے رشیدی کو ریہرسل کرائی تھیں۔ گانے کی ریکارڈنگ کا دن آیا تو میں وقت پر معلوم ہوا کہ بے پیک ٹکڑا ایسوی ایشن نے ثار بڑی صاحب کا ہائیڈریٹ کر دیا ہے اور جب تک مصالحت نہ ہوگی ایسوی ایشن کا کوئی رکن ثار بڑی صاحب کے لیے گانا ریکارڈ نہیں کرائے گا۔ میری شکل یہ تھی کہ گانا ریکارڈ کرنے کے دو دن بعد اس کو قہرانا بھی تھا۔ اگر گانا ریکارڈ نہ ہو تو آرٹسٹوں کی تاریخیں ضائع ہو جائیں گی۔ میں نے جنرل میجر شری مسعود رانا کو یہ صورت حال سمجھانے کی کوشش کی۔ رشیدی کو بھی صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کیا۔ رشیدی بے چارہ تو تیار تھا مگر ایسوی ایشن سے لڑتا تھا۔ مسعود رانا نے کہا کہ آپ دو دن کا گانا رکھ لیں مگر یہ ممکن نہ تھا۔ میں نے بڑی صاحب سے کہا کہ کسی نے گانے والے کی خدمات حاصل کی جائیں ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ مالگیر اس زمانے میں ممتاز ہاتھ میں لیے پھرتے تھے۔ روہن گھوش اور جنیم کے گھر میں بھی عموماً نظر آ جاتے تھے مگر کسی نے قسم میں گانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ بڑی صاحب نے کہا کہ اس گانے کے لیے مالگیر بہت سوزوں ہیں۔ چنانچہ مالگیر کو فوراً تلاش کیا گیا۔ ریہرسل کر لی گئیں اور رات کو ریکارڈنگ کا بندوبست ہو گیا۔ رشیدی کو پتا چلا تو پھر مسعود رانا کو لے کر آ گئے۔ اب ان کا یہ کہنا تھا کہ چلیے میں ایسوی ایشن کو مثالوں کا گھر گانا میری نیا آواز میں ریکارڈ کریں۔

انہیں گمان بھی نہ تھا کہ ہم کسی اور نئی آواز میں گانا ریکارڈ کر لیں گے۔ مگر اب اصول کا مسئلہ بن چکا تھا۔ مالگیر ایک نوآموز اور نوادہ گلوکار تھا۔ اس کی دل چاہی ہمیں منظور نہ تھی چنانچہ یہ گانا مالگیر کی آواز میں ریکارڈ کر لیا گیا۔ عذیم اور بیباک اس کی فلم بندی ہوئی اور یہ بہت مقبول ہوا۔ ہم چلے تو ہمارے سنگ سنگ ٹھارے چلے

آج بھی ایک مقبول گانا ہے۔ کئی سال پہلے میں نور ونز میں تھا۔ پتا چلا کہ پاکستانی فنکاروں کا ایک شو منعقد ہو رہا ہے۔ ہال میں گئے تو ننھا، مالگیر، مہنا نے اپنے اپنے

ضرور موجود ہوتی ہے۔ حیدر آبادیوں کے گھارے نشین اور سادہ چاول ایک بے حد لذیذ اور مقبول ڈش ہے۔ رشیدی جب بہت مہمان ہوتے تو دوستوں کو گھر سے گھارے نشین اور چاول منگا کر کھاتے تھے۔ ان کا ابتدائی دور کا ایک گانا بھی کالی مشہور ہوا تھا۔ جس کے بول ہیں۔

کھٹی کڑی میں بھی پڑی
ہائے میری اماں

در اصل یہ حیدر آباد کن کا لوک گیت ہے۔ اصولاً تو یہ گانا کسی زمانہ آواز میں ہونا چاہیے تھا مگر رشیدی نے اپنی گانگی سے اس میں جان ڈال دی اور یہ گانا بھی ان کے ہٹ گانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

رشیدی خوش اخلاق، ہنس کھار صلح جو آدمی تھے۔ لڑائی جھگڑے سے دور بھاگتے تھے۔ مگر ایک بار انجانے میں وہ ایک بہت خوفناک لڑائی کا سبب بن گئے تھے۔ محمد علی نے تھے کراچی سے آئے تھے۔ رات گئے میں اور احمد رشیدی مال روڈ کے ایک ریسٹوران میں کھانا کھانے گئے جہاں اداکارہ حسہ کے شوہر رشید بھٹی بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ موجود تھے۔ رشیدی کی ایک بے ضرورت حرکت پر ان لوگوں نے انہیں گھیر لیا۔ محمد علی جیسا ہیرو بھلا کیسے یہ گوارا کر لیتا۔ یہ فوراً ان کی اداکارہ کو پیچھا اور دھواں دھار جنگ شروع ہو گئی۔ ٹیلی ویژن ایئر لائن، کچے، کانٹے، تھپتھپاؤں کے طوفان پر ہستیاں ہونے لگیں۔ ریسٹوران میں موجود لوگ اور دیگر چشم زدن میں رونچہ ہو گئے۔ بات اتنی بڑھی کہ خلاف پتھول لے کر آ گئے۔ محمد علی نے دفاع کے لیے ہادر چھانکے سے سبزی کاٹنے والی لمبی چھری اٹھالی۔ ٹھکانڈ تو پہلے ہی کٹی گئی تھی۔ ہم مخالفین کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے اور حمایت ملی شاعر کھیل گئی میں جا کر "پولیس پولیس" پکارتے رہے مگر رات کو ہم ایک بجے کون آتا؟ آخر میں جیت ہیرو کی ہوئی۔ مخالف گروپ ہسپا ہو گیا۔ پھر خانساے دوبارہ نمودار ہو گئے اور دیواروں پر سے لٹاؤ بچ اپ کے نشانات صاف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس ہنگامے سے نجات ملی تو ہم نے احمد رشیدی کو تلاش کیا جو نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اگلے دن وہ ملے تو سر پر معمولی سی چوٹ کا نشان تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ریسٹوران سے باہر نکلے تو ایک عکس مل گئی۔ وہ سیدھے گھر پہنچ کر سو گئے۔ انہیں کچھ پتا نہیں کہ بعد میں جو لوگ ریسٹوران میں رہ گئے تھے ان پر کیا گزری تھی؟ اس کے بعد بھی عرصے تک ہم لوگ اس جنگ کے حوالے سے

ماہنامہ سرگزشت

رہیں۔ وہ علاج کے لیے ملک سے باہر جانا چاہتے تھے مگر پیسے کا بندوبست نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام مشکلات نے ان کی بیماری کو مزید بڑھا دیا تھا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ ایک طویل عرصے تک پاکستان کے مقبول ترین مثنیٰ رہے تھے کیونکہ ہر قسم کا گانا انتہائی سہولت اور خوبصورتی کے ساتھ گالیتے تھے۔ ان کی گلوکاری کا عرصہ 25 طویل سالوں پر محیط ہے۔

رشدی کی بد قسمتی یہ ہے کہ وہ اچھے وقتوں کا انتظار نہ کر سکے۔ آنے والے سالوں میں پاکستان میں تقارب اور کیسٹوں کے باعث گلوکاروں کی آمدنی میں بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ ایسے گلوکار بھی ہیں جو کسی ایک تقریب میں گانے کا معاوضہ میں کچیس ہزار وصول کرتے ہیں۔ احمد رشدی نے تو کبھی گیتوں میں بھی اتنی رقم نہیں دیکھی ہوگی۔ بے چارہ رشدی۔۔۔۔۔

☆☆☆

آج آپ کو برصغیر کی دوسروں ہستیوں کی داستان سنائیں۔ وقار، جفا، بے وفائی، وفاداری کے ساتھ ساتھ یہ عروج و زوال کی ایک ایسی داستان ہے جسے اب بھارتی فلمی صنعت (ہالی ووڈ) کے لوگ بھی بھول چکے ہیں۔

شروع کرتے ہیں ایک پری چہرہ ہیرا دکن سے۔ ان کا نام گوہر ہائی تھا۔ اس زمانے میں انہیں کس کو ہر کہا جاتا تھا۔ کس کو ہیرا گوہر ہائی لاہور میں پیدا ہوئی تھیں۔ صورتِ گل ادا تھیں اور اداکارانہ صلاحیتوں سے مالا مال تھیں۔ جب عطران شباب میں قدم رکھا تو ایک قیامت برپا کر دی۔ سارے شہر میں ان کا چہرہ چا ہو گیا۔ لاہور میں فن کاراؤں کی اس وقت کی نہ تھی لیکن گوہر ہائی نے جیسے ہی اس میدان میں قدم رکھا سارا لاہور (مطلب لاہور کے فن کے دلدادہ) نے ان کے نام کی مالا جیٹا شروع کر دیا۔ اداکاری، رقص اور گانے کی صلاحیتیں وہ قدرتی طور پر اپنے ساتھ لائی تھیں۔ اداکاری کا بھی بچپن سے شوق تھا۔ وہی بات تھی کہ خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آتی جاتی ہے۔

فلمی دنیا میں انہوں نے اپنا سطر خاموش فلموں سے شروع کیا تھا کیونکہ اس وقت خاموش فلمیں ہی بنا کرتی تھیں اور ان کے شیدائی انہیں دیکھ کر ہی خوش ہو جاتے تھے اور انہیں یہ بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان میں کون اسٹار ہے اور کون سپراستار۔

فن کا مظاہرہ کیا۔ عالمگیر نے وہی نغمہ سنایا۔ وقتے کے دوران میں ان سے ملاقات ہوئی۔ عالمگیر نے بتایا کہ وہ اسٹیج شو میں اپنے پروگرام کا آغاز ہی اس نغمے سے کرتے ہیں جو ان کے لیے نئی ثابت ہوا اور جس نے فلمی دنیا میں ان کے لیے دروازے کھول دیے۔

رشدی کو اس بات کا بیش السوس رہا۔ عالمگیر کا گانا ہوائی مقبول ہوا اس پر انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ دکھ اس بات کا تھا کہ انہوں نے اپنے ایک دوست کو مایوس کیا۔

رشدی نے ایک فلم سازی کا آغاز بھی کیا تھا اور محمد جاوید فاضل کو اپنی فلم "امانت" کے لیے ہدایت کا منتخب کیا تھا۔ اس فلم کی شوٹنگ بھی شروع ہو گئی تھی مگر مکمل ہی رہی۔ اپنی اداکاری کا شوق بھی وہ پورا کر لیا کرتے تھے۔ جان محمد جی کی فلم "دیکھا جائے گا" آخری فلم تھی جس میں رشدی نے اداکاری کی تھی۔ یہ 1976ء کا ذکر ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ احمد رشدی کے ستارے گردش میں آچکے تھے۔ ان کی فلموں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ فلم سازی کا تجربہ ناکام ہو گیا تھا اور اس میں انہیں مالی نقصان بھی ہوا تھا۔

انہوں نے چار سو کے قریب فلموں میں ہزاروں گانے گائے مگر مالی اور معاشی طور پر بھی خوشحالی سے ہٹکار نہ ہوئے۔ بالی ووڈ میں احمد رشدی کے ذہن و دماغ پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا۔ 8 ہور میں فلموں کی تعداد کم ہو گئی تو وہ کراچی چلے گئے۔ 1978ء میں ان ہدول کا شہید وارہ پڑا اور وہ تقریباً ایک سال تک بیمار رہے۔ صحت یاب تو ہو گئے مگر 1980ء میں انہوں نے گانا قلعا بند کر دیا۔

انہوں نے انہیں مشورہ دیا تھا بہت ممکن ہے کہ دل کھٹکے کے عالم میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہو۔ اس زمانے میں ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ میں ملک سے باہر آنے جانے میں مصروف رہا۔ "ہیرا" آخری فلم تھی جس میں احمد رشدی نے نغمے گائے تھے۔ ستم خیز یہ ہے کہ "ہیرا" وحید مراد کی بھی آخری فلم تھی۔ جنہوں نے گانا کسی ایک فلم میں بھی احمد رشدی کی آواز کے بغیر کام نہیں کیا تھا۔ پہلے شدید ہارٹ ایک کے بعد رشدی پھر بھی سنبھل نہیں سکے آخری دورہ انہیں گیارہ اپریل کو پڑا اور اس قدر شدید ثابت ہوا کہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے دم توڑ دیا۔ گانا ان کا شوق تھا جو انہوں نے ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہسٹریکلات پر دراز ہوئے تو دوستوں کی ملاقات سے بھی گئے۔ پھر مالی پریشانیوں کی لاحق



اداکارہ گوہر

مس گوہر کی پہلی فلم "ہلو اسکل" عرف جھگ سوراں، تھی جس میں وہ پہلی بار پردہ اسکرین پر نمودار ہوئی تھیں۔ اس فلم نے تھلکے چاڑھیا تھا۔ پہلی ہی فلم کی نمائش کے بعد ان کے پرستاروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ یہ فلم انڈین فلم کچھ نے بنائی تھی۔ اس زمانے میں برصغیر میں خاموش فلم سازی کا نیا نیا آغاز ہوا تھا۔

1920ء میں مس گوہر کی دوسری فلم "راہلیا مایا" کی نمائش ہوئی۔ 1922ء میں انہوں نے دو اور

خاموش فلموں میں کام کیا۔ ان دو فلموں کی نمائش کے بعد وہ نکلنے چھوڑ کر بمبئی چلی گئیں کیونکہ وہاں فلمی صنعت تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ وہ بمبئی کی ایک مہینہ کوہ نور فلرز سے وابستہ ہو گئیں۔ بمبئی جانا ان کے لیے خوش قسمتی کا آغاز ثابت ہوا۔ 1925ء میں مس گوہر کی تین فلموں کی نمائش ہوئی۔ فلم "باپ کی کہانی" کرشنا کپنی کی فلم تھی۔

اب انہوں نے بمبئی کی فلمی صنعت میں پاؤں جمالے تھے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1925ء میں انہوں نے دس فلموں میں کام کیا۔ ان میں "ٹائیسٹ گرل"، میں کیوں جیسا بنی، وہی کا ٹھک، شیریں فریاد، عظیم قرمانی (اس میں انہوں نے سلو چائے ساتھ کام کیا تھا) رکاوٹ، پر تھوڑی ہڑا، عسکر محل، جینا کماری، لکھو ونجارہ شامل تھیں۔ ان فلموں میں دوسرے اداکار بھی بہت مشہور تھے اس لیے زیادہ تر فلموں نے کامیابی کا منہ دیکھا۔

1927ء میں ان کی چار فلموں کی نمائش ہوئی۔ پڑھی لکھی بچی کے ہدایت کار چندو شاہ تھے۔ اس فلم میں دکھایا گیا تھا کہ ہندوستانی عورت اپنے حقوق کے لیے کس طرح جان کی بازی لگاتی ہے عورت کے لیے یہ ایک پکار تھی جس میں اس کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے لڑنے اور جنگ کرنے کا سبق دیا تھا۔ فلم پڑھی لکھی لڑکی، میں بھی ہندو خواتین کو بتایا گیا تھا کہ وہ تعلیم حاصل کریں اور دوسروں کی توجہ ہو کر نہ رہ جائیں۔ پڑھی لکھی ماں ہی اولاد کو اچھی تربیت دے سکتی ہے۔ دیکھا جائے تو 1927ء میں بنائی جانے والی فلم ایک انتھابی فلم تھی کیونکہ اس زمانے میں ایسے موضوعات کوئی فلم ساز سوچ بھی نہیں سکتا۔

یہ دھکابی فلم بنانے کا سہرا فلم ساز و ہدایت کار چندو لال شاہ کے سر تھا۔ ایسے ہی انتھابی موضوعات وہ پہلے بھی قلمباز آ رہے تھے۔

جب کامیابیوں نے قدم چومے تو مس گوہر نے 1928ء میں اپنی ذاتی فلم کپنی قائم کر لی۔ انہوں نے ان فلموں میں مرکزی کردار بھی ادا کیے تھے۔ ایک فلم کا نام وشوا موہنی تھا۔ اس فلم میں مس گوہر نے بیک وقت تین کردار ادا کیے تھے جو کہ اس زمانے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسی سال انہوں نے بھکاری شہزادی میں کام کیا۔ یہ بھی بہت کامیاب تھی۔ چندو لال شاہ اس کے مصنف اور ہدایت کار تھے۔

ان کامیابیوں سے متاثر ہو کر ان دونوں نے مل کر ایک فلم ساز ادارہ قائم کر لیا۔ جس کا نام رنجیت مووی ٹون تھا۔ اس دوران میں ایک ساتھ کام کرنے کی وجہ سے گوہر اور چندو لال شاہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ فلمی دنیا میں ایک دن اس خبر نے اچھل چاڑی کہ مس گوہر اور چندو لال شاہ نے شادی کر لی ہے۔ واقعی یہ ایک حیران کن بات تھی مس گوہر ایک حسین و جمیل اداکارہ تھیں جبکہ چندو لال شاہ سیاہ رنگ کے موٹے تھے۔ گوہر کو اس وقت ہندوستان میں بڑے بڑے دولت مند بلکہ راجا مہاراجا بھی ہر قیمت پر اپنانا چاہتے تھے مگر عشق نے اپنا کام کر دکھایا اور مس گوہر نے چندو لال شاہ جیسے سیاہ رنگ موٹے اور بھدے آدمی سے شادی کر لی۔ بار لوگوں نے اس پر کہا۔

پہلے عورتیں تلوار خدا کی قدرت کا فقرہ بھی چست کیا تھا مگر ان دونوں کی شادی کامیابی سے جاری رہی۔

ماہنامہ سرگزشت

اس فلم کہانی میں دونوں برابر کے حصے دار تھے اور مس گوہر کا حکم بھی چلتا تھا رنجیت مووی ٹیون اس اظہار سے ایک کامیاب کہانی ثابت ہوئی۔ اس کہانی نے ہر ماہ ایک بنا کر پیش کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔

مس گوہر نے بھی اس سال چھ فلموں میں کام کیا جو بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد یہ شادی دونوں کے لیے بہت مہلک قرار دی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے رنجیت مووی ٹیون ایک بہت کامیاب ادارہ بن گیا جس نے ہر ماہ ایک فلم بنا کر بڑے بڑے نامور اداکاروں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ مس گوہر اپنی پسند کے کرداروں میں اداکاری کرتی تھیں۔ دولت اور شہرت کی دیوی لن دونوں پر بہت مہربان تھی۔ اس دوران میں مس گوہر دوسری کہانیوں کی فلموں میں بھی کام کر کے شہرت حاصل کرتی رہیں۔

1936ء میں جب ہندوستان کی پہلی بولی فلم "عالم آرا" کی لائسنس ہوئی تو اس فلم نے دھوم مچادی۔ رنجیت مووی ٹیون کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔

1931ء میں رنجیت نے بھی بولی فلم "دیوی دیویانی" بنا کر پیش کی جس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ یہ ایک دھارمک (ہندو مذہبی) فلم تھی۔ اس کے ہدایت کار، چند لال شاہ اور موسیقار اس زمانے کے مقبول ترین فنکار استاد جھنڈے خان تھے۔ یہ اس کہانی کی پہلی بولی فلم تھی جو بے حد کامیاب رہی۔ اس زمانے میں چند لال شاہ کو بھیم کی فلم افسر میں بہت بلند مقام حاصل ہو گیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ کسی بھی اداکار کی نظر سے بڑا پایا جاسکتے ہیں۔

1932ء میں مس گوہر نے تین فلموں میں کام کیا۔ یہ تینوں رنجیت مووی ٹیون کی فلمیں تھیں اور بے حد کامیاب ہوئی تھیں۔ رنجیت کی اکثر فلموں کے ہدایت کار چند لال شاہ اور موسیقار استاد جھنڈے خان ہوا کرتے تھے۔ ان دونوں کے نام کا ڈکٹا بن رہا تھا۔ بھیم فلمی صنعت کے باہمی جھگڑے طے کرنے کے لیے فلم ساز چند لال شاہ کے پاس جاتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بھیم کی فلمی دنیا کے بادشاہ تھے تو غلط نہ ہوگا۔ مس گوہر کی خاموش فلم "دشامولی" میں مس گوہر نے بیک وقت تین کردار ادا کیے تھے۔ اس پر انہوں نے اسی نام سے اس فلم کو بولی فلم بتایا اور وہ بھی بہت کامیاب ہوئی۔ کامیابی کی دیوی مس گوہر پر مہربان ہو گئی تھی۔ رنجیت مووی ٹیون سے وہ بے شمار دولت حاصل کر رہی تھیں اور فلموں میں اداکاری کر کے بھی خوب دولت کما رہی تھیں۔

چند لال شاہ فلموں کی ہدایت کاری کرتے رہے مگر مس گوہر نے ان سے شادی کرنے کے بعد کسی اور فلم کی اور ہدایت کاری میں کام نہیں کیا۔ مس گوہر اب اداکاری کی بجائے فلمیں بنانے پر زیادہ دھیان دینے لگی تھیں۔ اس زمانے میں رنجیت مووی ٹیون ہندوستان کا سب سے بڑا فلم ساز دوبارہ تھا۔

چند لال شاہ اب کروڑ پتی ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں گنتی کے لوگ ہی کروڑ پتی تھے۔ وہ مس گوہر کے لیے خاص طور پر کردار کھواتے تھے اس لیے ہر فلم میں مرکزی کردار مس گوہر کا ہی ہوتا تھا۔

لیکن ہر عروج کے بعد زوال ہوتا ہے اور فلمی صنعت میں تو لوگ راتوں رات دولت مند یا غریب ہو جاتے ہیں۔ رنجیت پر برا وقت آیا تو کہانی کی فلمیں قلاب ہونے لگیں چونکہ بہت سے نئے ذہین اور اچھے ڈائریکٹر اور فلم ساز سامنے آ گئے تھے۔ ان دنوں چند لال شاہ نے مس گوہر کے لیے خاص طور پر ایک کہانی کھسوائی اس فلم کا نام "اچھوت" تھا۔ مس گوہر ہائی سکے ساٹھی سوئی لال، چارلی، منظر خان بھی اس فلم میں کام کر رہے تھے۔ اس فلم کے موسیقار گیان دت تھے۔ مس گوہر کی لاجواب اداکاری نے سب کو چھلکا دیا۔ اس فلم کی موسیقی اور گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔ چند گانے آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔

1۔ رنجیت راگھو راچارام

2۔ اے پی سی سے کو بیچان

3۔ دور خوشی دور شو

4۔ نہیں بولوں لاکھ منائے۔

یہ فلم گہرائی زمان میں بھی بنائی گئی تھی۔

اس فلم کی بے پناہ کامیابی نے رنجیت فلم مووی ٹیون کو ایک نئی زندگی دے دی۔ اداکارہ کی حیثیت سے یہ مس گوہر کی آخری فلم تھی مگر یادگار تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے جسم کی طرف توجہ دینا چھوڑ دیا اور موٹاپا ان پر چڑھ گیا۔ مس گوہر اور مس سلو چنا اپنے زمانے کی دو سپر ہیروئن تھیں اور ان میں مقابلہ جاری رہتا تھا۔

ان کامیاب فلموں کے بعد رنجیت مووی ٹیون ایک بار پھر زوال کا شکار ہو گئی۔ چند لال شاہ کا دیوالیہ لگ گیا اور وہ قرضوں کے بوجھ تلے دب گئے۔ حالات اتنے خراب ہوئے کہ چند لال شاہ پیسے کی محتاج ہو گئے۔ اور مس گوہر کو لوگ بھول چکے تھے وہ لوگ جو دن رات ان کی

اگست 2014ء

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



مقبولیت کے سائے نظر آئے تو علی اعجاز نے بہت رکھ رکھاؤ اور کچھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے وضع داری کے ساتھ فلموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ فلموں میں نروال کے مسئلے کو انہوں نے کوئی جذباتی مسک نہیں بنایا نہ ہی اسے اپنی انا کا سوال بنایا۔ ایسے چلی توازن، حقیقت پسندی اور سوجھ بوجھ کا ثبوت بہت کم اداکار دیتے ہیں۔

علی اعجاز نے شہرت تو مزاحیہ کرداروں کے طور پر حاصل کی مگر میری ذاتی رائے میں، وہ ایک بہت اچھے کیریئر ایڈیٹر ہیں اور ہر قسم کے کردار ادا کرنے پر قادر ہیں۔ مزاحیہ اداکاری میں وہ محض اچھے فنکاروں کے محتاج ہوتے ہیں جبکہ ان کے چہرے اور حرکات و سکنات سے مزاحیہ اداکاری کے لوازمات کے آثار نظر نہیں آتے۔ انہوں نے بعض فلموں میں کیریئر رول کیے ہیں اور بہت خوب کیے ہیں۔ دراصل ان کے پاس فنکاروں کی برہنگی اور وہ ماضی جو اب نہیں ہے جسے اس دور کے دوسرے مزاحیہ اداکاروں نے ایک ضرورت بنادیا تھا۔ انہیں ایک بہت اچھا اداکار کہا جاسکتا ہے۔ مزاحیہ اداکار کہنا ان کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔ ان دنوں ٹیلی ویژن ڈراموں میں بھی وہ مزاحیہ اداکاری کر رہے ہیں۔ بہتر ہو اگر وہ دوسرے انداز

خوشاد کرتے تھے اور ان کی جھلک دیکھنے کے لیے منتظر رہتے تھے اب ان سب نے منہ موڑ لیا۔

25 نومبر 1978ء کو چند ناول کا انتقال ہوا تو ان کی غربت اور بے کسی کا یہ عالم تھا کہ کوئی ان کی آخری رسوم ادا کرنے والا نہ تھا ان کی لاش کو ٹاورسٹ قرار دے کر میونسپل کارپوریشن نے لٹکانے لگا دیا۔ اللہ اللہ ایسا عروج اور ایسا زوال خدا کسی کو نہ دکھائے۔ کسی فلم والے کو ان کے مرنے کی خبر تک نہ ہوئی نہ کسی نے ان کی آخری رسوم میں شرکت کی۔ وہ محض جو بھیسی کی فلمی دنیا کا بادشاہ کہلاتا تھا فقیریوں اور لاوارثوں کی طرح اپنی آخری منزل کو پہنچا۔ مس گوہر بھی دنیا کی نظروں سے دور ہو چکی تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ دنیا کی بے وفائی اور قدرت کی کرشمہ سازی کا نمونہ دیکھنا ہو تو یہ داستان پڑھیے اور عبرت حاصل کیجئے۔

عروج کے بعد زوال تو دیکھا لیکن زوال کی یہ حد نہ دیکھی تھی۔

☆☆☆

اپنے عروج کے زمانے میں علی اعجاز نے اعتدال و توازن سے کام لیا اور کفایت شعاری سے آنے والے دنوں کے لیے پس انداز کرتے رہے۔ چنانچہ جب فیر

ماہنامہ سرگزشت

اگست 2014ء

99

انور اقبال تو بعد میں فلموں میں نمودار ہو گئے مگر ماشی کی شادی ہو گئی اور وہ فلمی دنیا سے دور ہو گئیں۔

حراجہ اداکاروں میں اچھے اور باصلاحیت اداکاروں کی تعداد زیادہ ہے۔ چند حراجہ اداکار کچلے چند سالوں میں بھارتی فلمی صنعت میں بھی خاصے کامیاب رہے لیکن ان کی اداکاری محض اپنے اسٹائل تک ہی محدود رہی۔ مثلاً جانی واکر کا ایک مخصوص انداز تھا مگر وہ اداکار اداکاری کا اسٹائل مختلف تھا۔ جگہ بہ، اسرائیلی طبعہ انداز سے اداکاری کرتے تھے۔ آغا اور اوم پرکاش کا انداز جدا تھا۔ لیکن ان اداکاروں میں وہ ذہانت، حاضر جوابی اور برجستگی نہیں تھی جو پاکستان کے حراجہ اداکاروں کے حصے میں آئی۔ پاکستان کے حراجہ اداکار کسی ایک مخصوص انداز کے پابند نہیں رہے۔ تاثرات کے علاوہ فنروں کی ادائیگی اور فقرہ بازی میں بھی انہیں مہارت حاصل رہی ہے۔ جہان کے بھارتی ہم عصروں کے حصے میں نہیں آئی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں حراجہ اداکاروں کا معیار بھارتی اداکاروں کے مقابلے میں کہیں بہتر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارتی فلمی صنعت میں گزشتہ چالیس سالوں میں خالص حراجہ فلمیں بنانے کا رجحان بالکل ختم ہو کر رہ گیا حالانکہ کسی زمانے میں وہاں حراجہ اداکاروں کو مرکزی کردار بنا کر خالص حراجہ بناتے کاروانج تھا۔ چارلی خوری ڈکشن کی کامیاب حراجہ فلموں کے ہیرو رہے ہیں خصوصاً چارلی نے تو اپنے عروج کے زمانے میں کئی ایسی فلموں میں کام کیا جن میں ان کے سوا کوئی دوسرا ہیرو ہی نہیں تھا۔ یہ فلمیں اپنے طرز مزاح اور چارلی کی اداکاری کی بنا پر بہت کامیاب رہیں لیکن گزشتہ دہائیوں کے دوران میں یہ رجحان آہستہ آہستہ ختم ہو کر رہ گیا اور حراجہ اداکار اپنے مخصوص گئے بندھے کرداروں تک محدود ہو کر رہ گئے اس کے برعکس پاکستان میں حراجہ اداکاروں کے نمایاں کرداروں کے باعث کئی فلمیں کامیابی سے ہٹ کر ہوئیں اور پھر جب منور ظریف، نثار، رگھوپاتی، علی اعجاز جیسے اداکار میسر آئے تو خالص حراجہ فلمیں بھی بنائی گئیں اور بہت کامیاب رہیں۔ شروع میں یہ تجربہ شباب کی لڑائی مرحوم نے کیا۔ منور ظریف اور رگھوپاتی کے کرداروں پر جی ان کی فلمیں بہت کامیاب ہوئیں اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے فلم سازوں نے جس مزاح اور سوچ بوجھ کی جو ضرورت ہوتی ہے وہ ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی تھی اس

کے کرداروں کی طرف بھی توجہ ہوں۔

علی اعجاز کو میں نے ابتدا سے انتہائی (یعنی عروج زمانہ میں بھی) محو کیا ان کی عادت و اطوار میں بھی کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ نہ سادہ سوکھے نہ بھادو ہرے ہر حال اور ہر موسم میں ایک جیسے۔ علی اعجاز نے میرے ساتھ بھی کام نہیں کیا۔ نہ میری فلمیں ہوئی کسی فلم میں ان کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا لیکن جب بھی ملے بہت اخلاق اور خوش مزاجی کے ساتھ ملے، ایک بار میری ایک فلم کے سلیٹ میں ایک نئی کار کا ایکسیڈنٹ دکھانا مقصود تھا اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی خاطر میں نے پہلے تو ایک نئے ماڈل کی ایکسیڈنٹ میں ٹوٹی پھوٹی کار تلاش کی جس میں شبیم اور شاہد کے ساتھ ایک منظر تھا یا گیا۔ یہ بہت ڈرامائی منظر تھا بلکہ فلم کا کلائمکس ہی تھا۔ اس پر تلاش ہوئی کہ اس ماڈل کی ایک لورڈی کار کہاں سے اور کیسے حاصل کی جائے؟ ابھی ہم اسٹوڈیو کے دروازے پر کھڑے یہ باتیں کر رہے تھے کہ علی اعجاز کی چمکتی ہوئی سفید کار اندر داخل ہوئی اور وہ سفید لیس اور سفید چٹون میں لباس پہرہ لگے۔ اسسٹنٹ نے دیکھتے ہی میرے کان میں کہا کہ اگر علی اعجاز کی کار ایک دن کے لیے مل جائے تو ہماری مشکل آسان ہو جائے گی۔ علی اعجاز ایک سلیک اور مزاج پر سی کے بعد جا چکے تھے۔ میں نے اپنے اسسٹنٹ کو ان کے پاس بھیجا اور وہ یہ خبر لے کر آیا کہ علی اعجاز کی اس روز آؤٹ ڈور شوٹنگ ہے اور ظاہر ہے کہ انہیں بذات خود کار کی ضرورت پیش آئے گی مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ میری فلم کے لیے ان کی کار درکار ہے تو انہوں نے کار کی چابی میرے اسسٹنٹ کے حوالے کر دی اور خود سارا دن کرائے کی جگہ میں گھومتے رہے۔ ان کے اس برتاؤ کی وجہ سے میں ان کے حسن اخلاق کا قائل ہو گیا اور ساری زندگی یہ واقعہ میں فراموش نہیں کر سکوں گا۔ ان کی کار مل جانے کی وجہ سے ہماری فلم کے کلائمکس کے مناظر انتہائی چر اثر اور حقیقت سے قریب ہو گئے۔ شبیم اور شاہد کے علاوہ نثار اور تمنا نے بھی اس فلم میں کام کیا تھا۔ علی ورجن کے اداکار انور اقبال کو میں نے پہلی بار اس فلم میں شاہد اور شبیم کے ساتھ ایک مرکزی کردار میں کاسٹ کیا تھا۔ گلوکارہ ملائیم کی بھائی ماشی نے بھی اس فلم میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ ایک دلچسپ معاشرتی اور دماغی فلم تھی۔ انہوں نے فلموں میں بددیہی رہ گئی۔

حسرت ان فلموں پہ ہے جو بن کئے مر جھانگئے



پاکستان کے مزاحیہ اداکاروں کے بارے میں تذکرہ ہانکل نامی ناکمل ہوگا اگر رگھپا کا نام نہ لیا جائے۔ مزاحیہ اداکاروں کی ہماری قلمی صنعت میں کوئی کمی نہیں رہی لیکن رگھپا جیسی شخصیت قدرے منفرد اور مختلف ہے۔ رگھپا اپنی شکل و صورت اور عادت و اطوار کی طرح تخلیقی صلاحیتوں میں بھی دوسروں سے مختلف تھے۔ وہ محض کامیڈین ہی نہیں بلکہ گونا گوں صلاحیتوں کے حامل بھی تھے اور انہوں نے ان تمام شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ مثلاً کامیڈی تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بہت حوصلہ مند قلم ساز بھی رہے ہیں۔ وہ بہت اچھے ہدایت کار بھی تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بعض فلمیں ہدایت کاری کے اعتبار سے نہ صرف بہت کامیاب بلکہ معیاری بھی ثابت ہوئی ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتیں صرف یہیں تک محدود نہ ہیں بلکہ انہوں نے گلوکاری کے میدان میں بھی قدم رکھا اور اپنے مخصوص انداز میں بہت مقبول گیت بھی گائے۔ پھر وہ موسیقی ترتیب دینے کی طرف متوجہ ہوئے اور بہت اچھی دھنیں ترتیب دیں۔ وہ اپنی فلموں کی کہانیاں بھی لکھتے رہے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ہمیشہ رگھپا کا معترف رہا ہوں حالانکہ ہمارے معاشرے میں اور خصوصاً تعلیم یافتہ اور دانشور طبقے میں رگھپا جیسے کم تعلیم یافتہ اور غریب آدمی کی تعریف کرنا ایک آفت کو دعوت دینے کے مترادف ہے لیکن میں نے ہمیشہ ان کی ہمت اور قابلیت کا اعتراف کیا ہے اور کب تو یہ ہے کہ اگر رگھپا کسی ترقی یافتہ مغربی ممالک میں ہوتے اور انہیں بہتر ماحول، بہتر سماجی میسر آتے تو ان کی دولت اور

لیے دوسرے لوگوں کے تجربے زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ پھر تشدد اور قتل و غارت کی فلموں کا دود شروع ہوا تو رفتہ رفتہ ان فلموں سے مزاحیہ اداکار کا کردار بھی خارج ہو گیا۔ ایک زمانے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بھارت اور پاکستان میں مزاحیہ اداکاروں کی شمولیت کے بغیر بھی فلمیں بنائی جاسکتی ہیں کیونکہ ناچ گانے کی طرح کامیڈی بھی ایک کامیاب فلم کا لازمی حصہ قرار دی جاتی تھی مگر کل و غارت کے زور و شور میں مزاح کی گردن پر چھری پھیر دی گئی اور فلموں میں سے مزاح کا عنصر ہانکل قانع ہو گیا لیکن اس اثنا میں ایک ایسا دور بھی آیا جب رگھپا اور علی اعجاز کی مزاحیہ فلمیں کامیاب ہونے لگیں اور بہت سے قلم ساز اس راستے پر چل نکلے لیکن ایک تو ان سب فلموں میں بہت زیادہ یکسانیت تھی دوسرے ہر چیز کی کثرت سے بھی تماثلی اکتا جاتے ہیں اس لیے یہ عرصہ زیادہ طویل نہیں رہا لیکن اس میں مزاحیہ اداکاروں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ لکھنے والے اور ہدایت کار اس کے ذمہ دار تھے ظاہر ہے کہ جب تک مزاحیہ فلم میں تقسیم کردار نگاری اور مناسب پکوشن نہیں ہوگی، فلم کی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا گیا ہے مزاحیہ فلموں کے لیے ذہانت اور حس مزاح کی موجودگی بہت ضروری ہے جو کہ اکثر فلموں میں ناپید تھی چنانچہ یکے بعد دیگرے کامیڈی فلمیں فلاپ ہونے لگیں اور حسب معمول قلم سازوں نے اس کی ذمہ داری بھی تماثلیوں کے گردے ہوئے ذوق پر اہل دی حالانکہ بے چارے قلم ہیں اس معاملے میں بھی ہانکل بے قصور تھے۔

آپ کو بہت سی معلومات حاصل ہوں گی۔

1956ء کا زمانہ تھا میں راقم اسلوب اسکول پشاور میں جماعت ہفتم کا طالب علم تھا۔ عزیزِ جسم، نعمت سرحدی میرے کلاس فیلو تھے ان سے میری بہت اچھی دوستی تھی۔ ان دوستوں نے فلم انڈسٹری میں مقام پیدا کیا۔ عزیزِ جسم کراچی میں وحید مراد کے فلسفہ ادارے "فلمز آرٹس" میں ملازم تھے۔ خط کے ذریعے مجھے فلم انڈسٹری کے حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ جب پرویز ملک "فلمز آرٹس" سے منسلک ہوئے تو وحید مراد نے فلم "ہیرا اور تاجر" کا آغاز کیا۔ پرویز ملک اس فلم کے ڈائریکٹر اور عزیزِ جسم ان کے اسٹنٹ مقرر ہوئے۔ بدرِ ضمیر اور نعمت سرحدی بھی اس ادارے سے منسلک تھے۔ وحید مراد کی بطور فلم ساز "انسان بدلتا ہے" "جب سے دیکھا ہے تمہیں" ان دونوں فلموں میں مکمل نے مرکزی کردار ادا کیے۔ سنٹوش کمار نے "دامن" اور ایس ایف یوسف نے "اولاد" میں وحید مراد کو چھوٹے مگر اہم کرداروں کے لیے منتخب کیا۔ اس سے انہیں حوصلہ ملا اور انہوں نے اپنی ذاتی فلم "ہیرا اور تاجر" میں بطور ہیرا خود کو حعارف کرایا۔ وحید مراد کی پہلی فلم کامیاب رہی اور دوسری فلم "امان" نے تو انہیں مقبولیت کی بلند یوں پر پہنچا دیا۔

دوسری جانب عزیزِ جسم، نعمت سرحدی اور بدرِ ضمیر بھی فلمی دنیا میں آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ عزیزِ جسم سے میری خط و کتابت جاری تھی 1967ء میں عزیزِ جسم نے مجھے وحید مراد کے فلمی ادارے "فلمز آرٹس" کے لیٹرینڈ پر ایک خط میں لکھا "میں پاکستان میں پشتو کی پہلی فلم بنانا چاہتا ہوں، میرے پاس سرمائے کی قلت ہے اگر تم اس فلم میں ساٹھ ہزار روپے کا سرمایہ لگاؤ تو بطور فلسفہ میں انڈسٹری میں حعارف ہو جاؤں گا۔ فلم کامیاب ہونے کی صورت میں وادے نیارے ہو جائیں گے مگر میں نے عزیزِ جسم کی پیشکش کو قبول نہیں کیا کیونکہ میں گرم زمین پر پاؤں نہیں رکھنا چاہتا تھا اور نقدیر کا دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہیے کہ اگر فلم نکل ہوگی تو میرا سرمایہ ڈوب جانے کا اندیشہ تھا۔ میری جانب سے نا اُمید ہونے کے بعد عزیزِ جسم کے دوستوں نے فلسفہ سازی کے لیے ہائی بھری جن میں عکاس نذیر حسین، عکاس مدن علی مدن اور لیہا نذری انجمارچ شفیق قاضی شامل تھے۔ عزیزِ جسم اس فلم کے ڈائریکٹر منتخب ہوئے، وہ ایک تعلیم یافتہ، خوش اخلاق اور مہذب انسان تھے۔ موسیقار ول محمد اقبال کی یہ پہلی پشتو فلم تھی۔

اگست 2014ء

شہرت میں مزید اضافہ ہوتا اور وہ بھی فلم کی تاریخ میں چارلی چپلن کی طرح کہیں نہ کہیں اپنا نام ضرور لکھوا دیتے۔ چارلی چپلن اور رگیلا میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ چارلی چپلن کا بچپن حسرت میں گزرا وہ تعلیم حاصل نہیں کر پائے۔ ان کی والدہ اسٹیج کی اداکارہ تھیں اور چارلی چپلن نے ان سے لوائل عمر ہی سے بہت کچھ سیکھا۔ مگر ان کی اصل درس گاہ زندگی کا اسکول تھا۔ پھر انہیں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا اور کامیابی حاصل ہوئی تو امریکی معاشرے نے ان کی تعریف و توصیف اور بہت افزائی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ سرمایہ کاروں نے انہیں سرمایہ فراہم کرنے کے لیے کسی نکل سے کام نہیں لیا اور انہوں نے بہت فراغت اور آسودگی کے عالم میں فلمیں بنائیں۔ داد پائی اور اپنی ذہانت اور خدا داد قابلیت کی بنا پر دنیا بھر میں ان کی قدردانیت کی گئی۔ بڑے بڑے دانشور سیاست دان اور حکمران ان کے مداح تھے اور ان کے ساتھ ملتا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ جب ایسے سوانح ایسا ماحول اور سہولتیں میسر ہوں تو نام عروج پر پہنچنا ممکن کیوں نہ ہوتا۔ لیکن رگیلا کو اس کے برعکس حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ آئے زما رگیلا کے حالات زندگی ان کی جدوجہد اور ان کی کامیابیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

رگیلا کا اصلی نام سعید خان ہے۔ وہ ایک پشمان تھے بچپن ہی سے انہوں نے اداکاری کے جنون میں گمراہ چھوڑ کر دنیائے کازدار کا رخ کیا اور اپنی جنگ کا آغاز کر دیا۔ رگیلا صحیح معنوں میں ایک سیلف میڈ انسان تھے حقیقت یہ ہے کہ انہیں آگے بڑھانے کے لیے ان کی صلاحیتوں کا احساس کر کے انہیں مناسب موقع فراہم کرنے کے لیے کسی نے بھی کوشش نہیں کی۔ وہ محض اپنی ذاتی صلاحیتوں اور جدوجہد کی بنا پر آگے بڑھے ہیں۔ حوصلہ افزائی تو ایک طرف انہیں مذہق اور تھیک کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہ مناظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ گھر سے لاہور پہنچ کر رگیلا نے تندور نما ہوٹلوں میں کام کاج شروع کر دیا۔ گاہوں کو چائے کھانا پہنچانا برتن دھونا اور رات گئے وہیں کسی تھڑے پر پڑ کر سو جانا یہ ان کی زندگی کا معمول تھا ان کی شکل و صورت ہمیشہ لوگوں کے لیے مذہق کا موضوع بنی رہی لیکن یہ بھی قدرت کی قسم غریبی ہے کہ یہی شکل و صورت فلموں میں ان کی ابتدائی کامیابیوں کا سبب رہی ہے۔

☆☆☆

شوکت رحمان بھنگ کا پشاور سے ایک خط اس میں

مہینا مصر گزشت

کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والد انہیں مذہبی تعلیم سے آراستہ کرنے کے خواہاں تھے۔ اسی سوچ کے تحت انہیں اپنے ایک عالم دوست کے پاس چار سدا کے ایک گاؤں بھیجا۔ اس شخص نے بدر خیر کی ڈیوٹی گھروں سے دیکھنے یعنی سالن روٹی منگوانے کے لیے لگا دی۔ بدر خیر گھروں کے باہر ایک مخصوص آواز لگاتا۔ ”وکیلہ“ پشتو زبان میں اداوی کھانے کو کہتے ہیں۔

بدر خیر اس کام کو عار سمجھتا اور ایک دن صبح سویرے چار سدا سے بھاگ نکلا۔ چادر جانے والی بس میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے لگا کہ کنڈیکٹر نے بہت برا بھلا کہا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک چھوٹے سے ہوٹل کا مالک سفر کر رہا تھا اس نے اپنی جیب سے اس کے ٹکٹ کی ادائیگی کی اس نے انہیں اپنے ہوٹل میں برتن دھونے کی نوکری دی۔ یہ پشاور کے قریب سڑک کے کنارے ایک پُر رونق ہوٹل تھا۔ جہاں کھانے پینے کے لیے مسافر آتے۔ بدر خیر برتن دھونے کے ساتھ تزیین کر کے ویٹر بن گیا ہوٹل میں آئے چند لوگوں سے شناسائی ہوئی جو انگلینڈ کا پروگرام بنا رہے تھے بدر خیر نے ان سے کہا۔ ”میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ انگلینڈ جانا چاہتا ہوں لیکن میرے پاس پیسوں کی کمی ہے۔“ وہ لوگ بہت رحم دل تھے۔ بدر خیر اپنے استاد سے اجازت لیے بغیر ان کے ساتھ لازم سفر ہوا۔ بدر خیر کی یہ داستان آجندہ کی نشست میں لکھوں گا۔

بدر خیر نے عملی زندگی کا آغاز کراچی کی سڑکوں پر ایک رکشا ڈرائیور کی حیثیت سے کیا۔ یہ 1960ء کا عشرہ تھا۔ وحید مراد انگریزی لہجہ میں ایم اے کرنے کے بعد اپنے والد ٹار مراد کے تقسیم کار ادارے میں کام کا تجربہ حاصل کر رہے تھے۔ ان کے دوست پرویز ملک امریکا سے فلموں کا تجربہ لے کر لوٹے تو وحید مراد نے فلم ”میر اور پتھر“ بنانے کا اعلان کیا۔ وہاں سے ان کی کامیابیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ کراچی میں قیام کے دوران میں بدر خیر کو فلمیں



بدر خیر

ہیروئن کے لیے یا مین خان کو منتخب کیا گیا جو اس زمانے میں ایسٹرن فلم اسٹوڈیو میں بطور ایکسٹرا کام کر رہی تھی۔ نعمت سرحدی کو فلم کا ولن منتخب کیا گیا جو اس سے پہلے فلموں میں ڈوہلیکیت کیا کرتے تھے۔ نعمت سرحدی نے جہاں تر وہاں ہم، کے لیے بھی ڈوہلیکیت کیا تھا۔ پشاور سے ریلوے پاکستان کے مشہور گلوکار ہدایت اللہ کو گانوں کے لیے بلا گیا جو گلوکار محمد رفیع کے انداز میں گاتے تھے۔ ہیرو کے لیے قمر غاں بدر خیر کے نام لکھا جو لن دنوں کراچی میں رکشا چلاتا تھا۔ بھی کبھار سڑکوں پر ہوئی چیل فروخت کرتا۔ وحید مراد کے دفتر میں بطور چپڑا اسی ملازم تھا اور فلموں

میں معمولی کردار ادا کرتا تھا جن میں ”روڈ نو سوٹ، جاگ اٹھا انسان، ہیر اور پتھر، میں بطور ایکسٹرا کام کیا۔ یوسف خان شیر بانو کی کامیابی کے بعد عزیز مجسم کی دوسری فلم ”آدم خان درختانی“ کا ہیرو بدر خیر تھا اور فلم کی ہیروئن پاکستانی تھی۔ کراچی میں فلم نمائش کے لیے پیش ہوئی تو گانوں کی وجہ سے نرم جا رہی تھی۔ پروگرام کے مطابق ڈائریکٹر عزیز مجسم، بدر خیر، نعمت سرحدی پشاور آئے اور اس فلم میں مشہور بے بیگ سنگھ گلدار بیگم کے تین مشہور ریلوے گانوں کو فلم میں شامل کرنے کی غرض سے بھول جانے کا پروگرام بنایا جہاں وہ رہائش پزیر تھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہوں گیا۔ گنار بیگم کو پشتو کی لہجہ کا خطاب ملا تھا۔

عزیز مجسم نے پشتو، اردو اور پنجابی کی کئی مشہور فلمیں بنائیں، ان کی تعداد 35 سے زیادہ ہیں۔ 1971ء سے لے کر بیماری تک بدر خیر اکثر پشاور آتے جس ہوٹل میں ان کا قیام ہوتا، مجھے باقاعدگی سے بلا تے، اکثر ویسٹرن ان سے میری ملاقات ہوتی، میں پروفیشنل فوٹو گرافر تھا۔ میں نے اس کے کئی انٹرویوز مقامی اخبارات اور رسائل کے لیے کیے۔ پشاور ریلوے اسٹیشن کے لیے بدر خیر کا انٹرویو لیا یہاں ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو ماہنامہ سرگزشت کے فلمی الف لیلا کے برساتوں کے لیے ٹیلی مرتبہ پیش کر رہا ہوں۔ بدر خیر ان کا اصلی نام ہے۔ 1942ء کے لگ بھگ سوات کے سیاحتی مقام مدین کے نواحی گاؤں شاگرام میں مولوی یاقوت خان

ماہنامہ سرگزشت

کیا۔ بدخیر کو ان کی زندگی میں پشتو فلموں کے ویپ کمار کا خطاب دیا گیا لیکن وہ اکثر کہتے ہیں پشتو فلموں کا بدخیر ہوں۔ بدخیر نے مشہور کہانی توپس یوٹس قیاسی کی پانچ فلموں میں کام کیا جن میں دین، ہائی، ڈریتاج، ہاڑ شہباز، خطرناک قیدی شامل ہیں۔ بدخیر کا نام پرائیڈ آف پرفارمنس کے لیے سال 2008 میں منتخب ہوا۔ زندگی میں تو وہ یہ ایوارڈ حاصل نہ کر سکے لیکن 23 مارچ 2009ء کو حسن کارکردگی کا ایوارڈ ان کے لواحقین نے وصول کیا۔

بدخیر کے نام سے ملک کے اکثر شہروں میں بدخیر فیسٹیشن قائم ہیں۔ بدخیر نے ہدایتکار عظیم خان کے ساتھ شہنشاہ، شیر شاہ، بد معاشی نہ منم، فلم وکلا شکوف، نظام، خانہ دانی بد معاش، خان خیلہ، جشن، ہاڑی گارڈ، میں کام کیا۔ بدخیر کی فلموں کی تعداد اسات سو سے زیادہ ہے۔ ان کا نام گینسرک میں شامل ہے۔ بطور ہیرہ 435 ٹیگنل کروار 160 اور 67 فلموں میں مرکزی کردار ادا کیے۔

25 فلموں میں مہمان اداکار آئے۔ ہاون سینما اسکوپ اور 54 بلیک اینڈ وایت فلمیں شامل تھیں۔ 402 پشتو، 31 پنجابی اور ایک انگریزی فلم میں بھی کام کیا۔ بدخیر نے 33 سال فلم انڈسٹری پر راج کیا۔ کچھ سنوں میں وہ پشتو فلموں کے بے تاج بادشاہ تھے۔ بدخیر نے ابتدا میں کراچی کی آٹھ فلموں میں کام کیا۔ ان کی فلم ”اور تل“ پشاور کے مار سلیم میں ساڑھے تین سال چلتی رہی۔ دیگر فلموں میں کوچوان، دہقان، نوے دیو، چنے نے کامیابی کے ریکارڈ توڑے۔ دین نے پشاور میں دو مرتبہ ڈائمنڈ جوبلی کی۔ ہاڑ شہباز نے بھی دو مرتبہ ڈائمنڈ جوبلی منائی۔ ان کی دیگر فلموں میں زندان، انگارہ ڈوڈہ ہاڑی، چنہ انرام، بڑے ناوے، بدولی کپڑا اور مکان شامل ہیں۔ لیونٹی ان کی آخری فلم بے حد کامیاب رہی۔ پشتو فلم مسافر میں ان کے بیٹے دلیر خیر نے ہیرہ جبکہ بدخیر نے مہمان اداکار کا کردار ادا کیا۔ وہ اپنی فلموں میں دل دہانے والے خطرناک عناصر خود کھاتے تھے۔ اداکار بدولی کے ساتھ بڑے ناوے، میں ہیرہ آئے اس فلم نے گولڈن جوبلی منائی۔ بدخیر چار سال سے قاتل کے مرض میں مبتلا تھے۔ مرنے سے دو روز پہلے چھاتی میں شدید درد اور بکپڑوں میں پانی جمع ہونے لگا۔ انہیں اتحق اسپتال لاہور میں داخل کیا گیا مگر بدخیر نے ہسپتال سے ہاتھ نہ ہٹائے۔ مرنے وقت ان کی عمر 67 سال تھی۔

جاری ہے

دیکھنے کی بات چمکی تھی۔ جو بعد میں فلمیر یا کے مرض کی صورت اختیار کر گئی۔ وحید مراد کے ہاں جانے کے لیے رکشا پر باندھی تھی۔ چنانچہ بدخیر نے رکشا چھوڑ کر وحید مراد کے دفتر میں چائے لانے کے لیے چڑ اسی کے ساتھ ساتھ اداکار کی ملازمت کر لی۔ 1966ء میں وحید مراد کی فلم ”ارمان“ سپر ہٹ ہوئی تو جشن کامیابی کے بعد بدخیر نے وحید مراد کو اپنے فلمی شوق سے آگاہ کیا۔ وحید مراد نے بدخیر کو ”جہاں تم وہاں ہم“ میں چھوٹا سا کردار دیا اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جب وحید مراد کی ناکامیوں کا دور شروع ہوا تو بدخیر نے اپنی فلم ”پختون“ پر ولایت کتبے ”پنجان ولایت میں“ میں ایک اہم کردار دیا جو وحید مراد نے قبول کر لیا۔

1970ء میں دولت دشہرت کی دیوئی بدخیر پر مہمان ہو گئی۔ یاسین خان کے ساتھ بدخیر کی پہلی پشتو فلم ”یوسف خان شیر بانو“ منظر عام پر آئی جو دونوں کے لیے نیک حال ثابت ہوئی۔ اس معروف لوک داستان کے میں برس بعد تک بدخیر اور یاسین خان کی فلمی جوڑی پشتو کے ناظرین سے داد وصول کرتی رہی۔ دو دہائیوں پہنچی عمر میں اس جوڑی نے ستر سے زیادہ فلموں میں کام کیا۔ بدخیر کی پشتو فلموں کی ہیرہ دیکھوں میں ثریا خان، شہباز، سرست شاہین، خانم، نجم، وحیدہ خان، نادر، ممتاز اور فی شامل تھیں۔ اردو فلموں میں نشو، نیلی، ہیرہ شریف، دیبا، پکودی اور راجی ہانو کے ساتھ بطور ہیرہ اداکاری کے جوہر دکھائے۔ بدخیر نے پشتو کے علاوہ پالیس کے قریب اردو فلموں میں بھی کام کیا۔ پنجابی فلموں میں اپنے لہجے کی وجہ سے کام کرنے سے گریزاں تھے لیکن اس کے باوجود کئی فلمسازوں نے انہیں پنجابی فلموں میں سائن کیا۔ بدخیر کی یادگار فلموں میں یوسف خان شیر بانو، دم خاں در خانی، اور تل، کرتار، میر نے دور، نو چک، نرما، قانون، وہ پشتون نشان، رولج، خانہ دانی بد معاش، پڑا نگ، اقرار، جشن، ہاڑی گارڈ اور مسافر کے علاوہ بیکڑوں دیگر فلمیں ہیں۔ فن بڑھ ہونے کے باوجود بطور کہانی توپس انہوں نے کئی فلموں کی کہانیاں لکھیں۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔

بدخیر کو بہترین کارکردگی پر آٹھ نگار گریجویٹ، نور جہان، بولان اور دیگر ایوارڈ ملے۔ بدخیر کی پہلی پنجابی فلم ”نمن ہاوشہ“ تھی فن کی مشہور اردو فلموں میں ”جہاں برف گرتی ہے“ لیکن ایک رات کی بدخیر اور جیج شامل ہے۔ پشتو فلم دین، میں بدخیر نے اندھے کا کردار بڑی خوبی سے ادا

ہی ایک نو فخر لڑکی ڈپریشن میں مبتلا ہو گئی تو اس نے سانب اور چھپکلیاں پالنا شروع کر دیں۔ جب اس کے ڈپریشن میں اضافہ ہوا تو اس نے ہر سائز کے چاقو جمع کرنا شروع کر دیے۔ ایک چاقو سے اس نے اپنے چہرے کو زخمی بھی کر

ڈپریشن سے تو آپ واقف ہی ہوں گے اسے اپنی پسماندگی بھی کہتے ہیں۔ اس پسماندگی میں کوئی شخص اسی وقت مبتلا ہوتا ہے جب وہ کسی زبردست صدمے سے دوچار ہو اور اس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہو۔ ایسی



ڈپریشن سانب اور

شکیل الدریس

زندگی اس کے لیے کائنات کی سیج بن چکی تھی۔ مصائب و آلام اس کی زندگی کا حصہ بن کر اسے سوچنے پر مجبور کر دیے تھے۔ وہ بیمار کے لیے ترستی تھی مگر نہ اسے باپ کا بیمار مل رہا تھا اور نہ ماں اسے بیمار لے پار رہی تھی۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا جب اس پر قسمت کی کرم فرمائی ہوئی اور وہ پوری دنیا کی چہیتی بن گئی۔ دولت گویا ہر سنے لگی۔ تب اس نے اپنی اس کمی کو جمعے وہ قاعمر محسوس کرتی رہی پورا کرتے کے لیے انسانیت کی خدمت پر آمادہ ہو گئی اور آج وہ یو این او کی جانی مانی سفیر ہے۔

ہالی ووڈ کی ایک مشہور اداکارہ کا تذکرہ

لیا۔ اپنی زندگی سے مایوسی اور دنیا سے رنگ و بوسے گریز کی انتہا یہ تھی کہ اس نے ایک اجرتی قاتل کو معاوضہ ادا کیا کہ وہ مناسب موقع دیکھ کر اسے قتل کر دے!

وہ قاتل بدوم تھا کہ معاوضہ وصول کرنے کے بعد بھی اسے قتل نہ کر سکا۔ اس کا دل اسے موت کے منہ میں پہنچانے پر آمادہ نہ ہو سکا۔ وہ اس شہر سے ہی اپنا بوریا لپٹ کر فرار ہو گیا جہاں کہ وہ رہتی تھی۔

وہی بستی میں جلا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اداکار باپ نے اس کی اداکارہ ماں کو طلاق دے دی تھی۔ اسے باپ سے نفرت ہو گئی۔ وہ اس کی صورت بھی دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب شہرت کی دیوی نے اس کے قدم چوم لیے اور اسے لوگوں کے دلوں کی دھڑکن اور آنکھوں کی ٹھنڈک بخا دی۔

مایوسی سے اپنی زندگی کا آغاز کرنے والی اس دہیڑہ کا نام انجلینا جولی واہٹ ہے۔ وہ 4 جون 1975 کو کیلیفورنیا، اس انگلش میں پیدا ہوئی۔ جولی کا مطلب فراموشی میں دل کش ہے۔۔۔۔ وہ فلم اداکار جان واہٹ اور مارشیا سن برٹریڈ کی بیٹی ہے۔ اس کا ایک ہی بھائی ہے جس کا نام جیمز ایون ہے۔ اس کی رگوں میں بھی اپنے ماں باپ کا سچا خون دوڑ رہا ہے اس لیے اسے بھی اداکاری اور ہدایت کاری کا شوق ہے۔ اس کا خاندان کئی بیڑھیوں سے امریکن ہے۔ موروثی طور پر اس کا تعلق ہرون نامی ایک خاتون سے ہے جو 1649ء میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا باپ جرمن اور ماں فرانسیسی تھی۔ وہ نختہ نگار چپ ٹیلر کی بیٹی ہے۔

اس کا باپ جان ہلی ووڈ کا نام ورا داکار تھا۔ جس کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیل چکی تھی۔ اس کی فلموں میں 'لڈنایت کا ڈیوانے' 'ایڈورس اور ہوم کنگ' جیسی شہرہ آفاق فلمیں شامل ہیں۔ آخر الذکر فلم میں اسے آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ ویسے وہ زیادہ تر کا ڈیوانے فلموں میں کام کرتا تھا جس کا مورث اعلیٰ جان وین تھا۔ جان وین پیدا آٹھ اداکار تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لمبی نال والے پستول کے ساتھ بیٹ لگائے پیدا ہوا تھا اور پیدائش کے وقت سے ہی گھوڑے پر بیٹھا سیکھ گیا تھا۔

1967ء میں انجلینا کے باپ نے جب اس کی ماں سے طلاق کی اختیار کر لی تو انجلینا اور اس کا بھائی بے سہارا ہو گئے۔ ان کے پاؤں تلے سے زمین ٹل گئی۔ انہوں نے اپنی ماں کے ساتھ رہنے کو قوت دی ماس لیے کہ ماں کو بھی

اس سانحے کا گہرا صدمہ تھا۔ بچوں کی خاطر اس کی ماں نے ایک فلم ساز مل ڈے سے دوسری شادی کر لی۔ اس کی ماں خود بھی اداکارہ تھی لیکن اس نے بچوں کی پرورش کی خاطر اس بچے کو ترک کر دیا۔ گھریلو ماحول چونکہ بھی تھا اس لیے انجلینا بھی قدرتی طور پر اس سے متاثر ہو گئی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ فلمیں دیکھا کرتی تھی مگر ان فلموں سے صرف مظلوظ ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کا باپ اداکار تھا لیکن وہ اس کی قدر و منزلت سے متاثر نہیں تھی، نہ اس سے متاثر کہ وہ آسکر ایوارڈ یافتہ ہے، بلکہ اداکاری سیکھنے کا جذبہ اس کے دل میں از خود پیدا ہوا تھا۔

اس کی تفصیل میں جاتے ہوئے اس نے بتایا کہ جب اس کی عمر چھ برس تھی تو اس کی ماں اور سوتیلے باپ مل ڈے اپنے خاندان سمیت نیویارک چلے گئے۔ اس کے پانچ سال بعد وہ اس انجلس واپس آ گئے۔

اسے اپنا بچپن بخوبی یاد ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے 'اسٹار ٹریک' کی فلمیں پسند تھیں۔ اسے گھریلو پالتو جانوروں سے محبت تھی۔ خاص طور پر وہ سانپ اور چھپکلیاں پالا کرتی تھی۔ اس کا پسندیدہ سانپ ہیری ڈین اسٹین اور پسندیدہ چھپکلی والڈا میر تھی۔ (چنانچہ جب اس نے فلم 'ایگزیزٹڈ' میں کام کیا تو اسے سانپوں کے ساتھ شوٹنگ کرتے ہوئے قطعی خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ ایسا سکروہ چیزوں سے مانوس جو ہو چکی تھی) اسے دوسرے بچوں کی طرح وارنٹ ڈرنی کا کارٹون کردار فلائنگ ڈیمو لینی اڑنے والا ہاتھی پسند تھا۔ وہ روتی جیتی تھی کہ ہاتھی اڑتا کیوں نہیں ہے؟ اسے چمکدار اور بھڑکیلے کپڑے پسند تھے۔ اس کے علاوہ اسے موت کی سائنس گاہ، یعنی قش خانہ بہت پسند تھا۔ وہ گھنٹوں وہاں وقت گزارا کرتی تھی۔ لاشوں سے اس نے کیا کچھ اکتساب کیا، اس راز سے اس نے ابھی تک پردہ نہیں اٹھایا۔ لیکن ہے اس کا سبب ڈپریشن ہو۔

اس کے خاندان کے سربراہ (گاڈ فادر) اسے سال گرہ پر ہمیشہ ایک گڑیا تحفے میں دیا کرتے تھے۔ یہ تحفہ انہوں نے پہلی سال گرہ سے لے کر سولہویں سال گرہ تک دیا۔ بعض اوقات یہ گڑیا ماڈرن ہوتی تھی اور کبھی کبھار بلاسٹک کی۔ کبھی گڑیا بے حد قیمتی ہوتی اور کبھی لکڑی یا پورسلین کی ہوتی۔

چودہ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے؟ اس عمر میں ایک

انجلیا اس کا ہاتھ خاتی لیکن محض چاہنے سے کیا ہو سکتا تھا۔ تعلیم کا بوجھ تو اس پر نہیں چڑ رہا تھا اس لیے کہ تعلیم تو حکومت کی طرف سے مفت تھی، البتہ خانگی اخراجات اسے ہلانے دے رہے تھے۔ جب تک بائی اسکول کی تعلیم ختم نہ ہو جاتی وہ اداکاری کی طرف نہیں جاسکتی تھی۔

بائی اسکول کی تعلیم انجلیا کے لیے دشوار گزار ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ وہ دینی تھی اور چشمہ پہنچتی تھی۔ اس کے سامنے طالب علم اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ انجلیا ان باتوں کے لیے خود کو مورد الزام ٹھہراتی ہے۔ اس لیے کہ وہ ڈپریشن کا شکار تھی اور اپنے مستقبل سے مایوس۔ تو اس نے تہائی اختیار کر لی۔ وہ باب لوگوں کا سامنا کرنے سے کڑی تھی۔ وہ کہتی ہے کہ غالباً میرے مصائب کا یہی علاج تھا۔ لوگوں کے معاندانہ رویوں سے دل برداشتہ ہو کر اس نے غشیات میں بھی دل چسپی لینا شروع کر دی تھی۔ جس میں ہیروئن کا نشہ بھی شامل تھا۔

ڈپریشن کا سبب اس کا باپ تھا اس لیے انجلیا نے اس کا گہرا اثر لیا اور ذاتی طور پر اپنے باپ سے دور ہو گئی۔ اس نے اپنے باپ سے ہر قسم کا تعلق توڑ لیا تھا۔ کافی عرصے بعد دونوں کی یکجہائی مشہور فلم "لومب رائڈرز" میں ہوئی جو 2001ء میں بنی تھی لیکن ان کے درمیان جو سرد مہری کی ایک اونچی دیوار قائم تھی وہ بدستور حائل رہی۔

جولائی 2002ء میں اس نے عدالت کو باقاعدہ درخواست دی کہ وہ اب اپنا خاندانی نام واہت استعمال نہیں کرنا چاہتی۔ عدالت نے اس کی درخواست 12 ستمبر 2002ء کو منظور کر لی۔ یوں اس نے خاندان سے رہا سہا تعلق ختم بھی کر لیا البتہ وہ صرف انجلیا جی رہی تھی۔ اس کے باپ نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہالی ووڈ کی چکا چوند زندگی نے میری بیٹی کا دماغ الٹ دیا ہے۔ غالباً وہ اپنے حواس میں نہیں رہے وہ نہ کیا کوئی اپنے خاندان سے لاطعلق ہوتا ہے؟

انجلیا نے اس کی وضاحت یوں کی کہ چونکہ اب اس نے ایک بچے میڈوکس کو گودے لیا ہے، اس لیے نہیں چاہتی کہ اس کا خاندانی نام اس بچے تک منتقل ہو۔ البتہ جب اس کی ماں کی وفات 27 جنوری 2007ء میں ہوئی تو اس نے ذہنی صدمے سے ہلکا مارا پانے اور اپنی تہائی کو ختم کرنے کے لیے ایک بار پھر باپ کی اطاعت قبول کر لی اور اس کے ساتھ رہنے لگی۔ ان کے درمیان جدائی، مفارقت اور بے

قر کے ایجنوں سے اس کی دوستی ہو گئی۔ جیسا کہ اس عمر میں لاطعلونی عشق ہوتا ہے وہ ایجنوں کے ساتھ زندگی گزارنے اور دنیا کے آخری کونے تک جانے کو تیار تھی۔ بائی دنیا کو اس نے لات مارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ گھر چھوڑ دیتی۔ اس کی ماں نے کہا اس کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ وہ اسے ایک مکان کرائے پر لے کر دے، لہذا وہ چاہے تو اپنے پرانے فریڈ ایجنوں کے ساتھ اسی مکان میں، اسی چھت کے چمچہ رہ سکتی ہے۔

انجلیا کو یہ بات پسند آئی۔ وہ دوسرے کمرے میں اپنے پرانے فریڈ کے ساتھ رہنے لگی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی حکمت عملی سے دو فائدے ہوئے کہ میں ان کی نظروں کے سامنے ہی رہی اور دوسرے یہ کہ میں نے اپنے اسکول کا کوئی فائدہ نہیں کیا۔ اسی پابندی سے اسکول جاتی رہی اور تصالبی تعلیم حاصل کرتی رہی۔

اسکول کی تعلیم ختم ہونے پر انجلیا نے اداکارہ بننے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے خطہ کر کے لی اسٹرا اس برگ اسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا۔ اس اسٹی ٹیوٹ میں اس نے دو برس تک اداکاری کی تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد اسٹیڈی ڈراموں میں کام کرنے لگی۔ اس کی خوب صورتی دیکھ کر ہر ہدایت کار اسے کوئی چھوٹا موٹا کردار دے دیا کرتا تھا۔ اسکول کا دہلا پن اسٹیج والوں کے لیے قابل قبول تھا۔ ایسی لڑکیوں کے لیے ان کے دروازے ہمہ وقت کھلے رہتے ہیں جن کے جسم پر زیادہ گوشت نہ ہو۔

چودہ برس کی عمر میں جب اس نے اداکاری کی تربیت حاصل کر لی تو ہدایت کاری کی طرف توجہ دی۔ وہ ہدایت کاروں کو کٹ ہوڑاؤ کے کرتے دیکھتی تھی تو یہ خیال اس کے دل میں چکیاں گانے لگتا کہ اسے بھی ایسا کرنا چاہیے۔ ہدایت کار سب پر بھاری ہوتا ہے اور سب اس کے تابع ہوتے ہیں۔ ساری فلم اس کے گرد گھومتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ساری فلم اس کے دماغ میں ہوتی ہے۔

ہدایت کاری کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا، اس لیے کہ اسے ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنا تھی۔ اس کی ماں نے اسے بیورو لے کر بائی اسکول میں داخل کر دیا۔ اگر اس نے اداکاری کی تعلیم حاصل کر لی تھی تو تصالبی تعلیم سے اسے مستثنا قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ وہ اسکول میں دوسرے طالب علموں کی طرح دسی کتابوں میں سرکھپانے لگی۔ اس کی ماں کا ہاتھ بہت ٹھک تھا اور وہ چاہتی تھی کہ

بھری چوہرے تک حامل رہی تھی۔

بھولی بھری باریں اس کے بھائی جھوٹا بھی چھپا کرتی ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ بچپن کے واقعات مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں ہیں۔ البتہ یہ یاد ہے کہ میں نے بچپن میں بہت کچھ کھینچا تھا۔ ہمیں ان کا چھپنا چاہنا ہی نہیں لگتا تھا۔ مگر باپ نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا اسے میں بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میں سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد وہ اسی قصبے میں رہتا تھا۔ گاؤں کے باغ میں کھیل جاتے ہوئے مادھی بھٹی میں اس سے ٹکراؤ ہو جاتا تھا لیکن اس نے کبھی اپنا ہیبت سے ہماری طرف نہیں دیکھا۔ جیسے ہم کسی دوسرے سارے کی غلطی ہوں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں باپ میں علیحدگی کی وجہ کیا تھی؟ اس کا سلوک میں کے ساتھ اذیت ناک تھا مگر اس لیے جب وہ بستر مرگ پر تھی تو اس نے انجلیتا کو وصیت کی تھی کہ اب تم اپنے باپ سے ملنا۔

ماں کے مرنے کا انجلیتا نے بہت اثر لیا۔ اس نے کھانا تقریباً ترک کر دیا۔ حالانکہ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ کھانا نہ چھوڑے ورنہ زندگی کی گاڑی کیسے چلے گی؟ وہ کھاتی تو تھی لیکن بہت کم، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ روز بروز دلی ہوتی چلی گئی۔ قلم والے ایسے چہرے سے بدن کو پسند کرتے ہیں مگر جب قلم "فلیپنگ" پائی پورٹ" کی قلم بندی شروع ہونے لگی تو اس کا جسم ہدایت کار کو ضرورت سے زیادہ چھریا لگا۔ اس نے انجلیتا سے کہا کہ وہ کپڑوں کے نیچے سوتی پینڈ ہاتھ لے تاکہ اس کا جسم کچھ بھاری ہو جائے۔

لوگ، خاص طور پر عورتیں اس کی پتلی کمر اور چہرے سے بدن کے بارے میں جاننے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ دوسری اداکاراؤں کی طرح اس کا ہیٹ باہر کیوں نہیں آتا یا وہ اب تک پہلوان کیوں نہیں دکھائی دیتی؟ وہ سادہ سی غذا نہیں کھاتی اور ورزش بھی کرتی ہے۔ خصوصی طور پر بھاپ سے گل ہوتی ٹیڈنا چھل اور بھاپ سے گل ہوتی بنریاں استعمال کرتی ہے۔ دیا ملک جتنی ہے۔ اس کے علاوہ یوگا ورزش کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یوگا سے اسے ڈپریشن سے چھٹکارا پانے میں مدد ملی ہے۔ وہ باقاعدہ بافتا نہیں کرتی بلکہ میج کے ہفت صرف کافی ایک پیالی پی لیتی اور دو سگریٹ پھونکتی ہے۔

اس کے جسمانی احاطے پر لوگ بحث مباحثہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ ہالی وڈ کی دوسری اداکاراؤں کی نسبت قیامت خیز اور خطرناک ہے۔ وہ اب

بھی دلوں پر حکمرانی کر رہی ہے۔ مگر بہت سے لوگوں کو اس سے اختلاف ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اگر وہ چند پوٹو اپنا وزن بڑھالے تو صحت مند دکھائی دے گی۔ وہ سلیطے میں دیکھ لیتے ہیں کہ انجلیتا کا قد 5 فٹ 10 انچ ہے جب کہ وزن 97 پونڈ۔ قامت کے لحاظ سے یہ وزن کم ہے۔

انجلیتا جیک نوڈز اور فاسٹ فوڈز سے پرہیز کرتی ہے۔ اس کے سوا وہ پانی کھرت سے پیتی ہے اور اپنے بچوں کو بھی اس کی تلقین کرتی رہتی ہے۔ بھولوں اور بنریوں پر اس کی خاص نگاہ ہے۔ وہ دن میں تین بار بھاری کھانے کی بجائے چھ بار ہلکا کھانا کھاتی ہے اور کل 600 کیلو پز (حرارے) والی غذا نہیں کھاتی ہے۔ اس طرح سے سلم رہتی ہے اور ہدایت کاروں کو اس کا سراپا پسند ہے۔

بھاری ماں نے ساری بڑے دلدیاں نبھائیں۔ کھانے پینے اور بڑھانے میں ان کی توجہ زبردست تھی۔ اگر وہ گاڑی کے متعلق بتانا چاہتی تھیں تو پہلے بچن سے گاڑی کال کر لاتی تھیں اور پھر پردہ کرکے کہتی تھیں کہ گاڑی کیسے ہوتی ہے۔ اب بھی طرح پر انجلیتا نے اپنے بچوں کے ساتھ بھی رکھا ہے۔

سب سے بڑا الب یہ تھا کہ سولہ برس کی عمر میں ہمارے پاس کوئی کار نہیں تھی۔ ہمارے سارے دوستوں کے پاس کاریں تھیں اور ہم ان کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اس لیے کہ سولہ سال کی عمر میں اس انجلیس میں کار ڈرائیونگ کا لائسنس مل جاتا تھا مگر میرے پاس کوئی کار ہی نہیں تھی۔ میں لائسنس لے کر کیا کرتا؟

میں نے اپنے باپ کے پاس جا کر کئی بار مفلسی کا رونا رو دیا لیکن اس نے روکھا سا جواب دیا کہ میں کیا کروں؟ میں اور انجلیتا ہر موقع پر ایک دوسرے سے بہت قریب رہے۔ اسی لیے میں اب کسی انجمن میں جگا ہوتا ہوں تو اس سے جا کر مشورہ ضرور کرتا ہوں۔ وہ عظیم ہے۔ اس نے اتنے دفاعی کام کیے ہیں کہ اقوام متحدہ کا ادارہ اس کی عزت کرتا ہے۔ حال ہی میں اس نے اعلان کیا ہے کہ وہ یوگینڈا میں ایڈز کے مریضوں کے لیے بھی کام کرے گی۔ وہ جتنی معنوں میں مددگار سادوم بننا چاہتی ہے۔ اس کے دل میں غریبوں اور مفلسوں کا درد جھنجھکا ہے۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اسے بام عروج تک پہنچانے میں برائے پٹ کا پورا ہاتھ ہے۔ اس سے شادی کرنے سے پہلے وہ آسودہ نہیں تھی۔ اب دل جی سے وہ لگائی اسودہ نشا رہی ہے، بچے پال رہی ہے اور غلوں میں کام

کر رہی ہے۔ اس کا رد یہ اب مٹی کے بجائے ثبت ہے۔

☆☆☆

چودہ برس کی عمر میں انجلیا ماڈلنگ بھی کرنے لگی۔ لیکن اس میں اسے بہت محنت کرنا پڑی اس لیے کہ جب بھی کوئی اس کی طرف دیکھتا تھا تو ناگواری سے منہ پھیرتا تھا کیوں کہ وہ بدلتی تھی اور پڑیشن کی وجہ سے اس کا چہرہ مرمیلا رہتا تھا۔ ہائی اسکول کی تعلیم جاری نہیں رہ سکی۔ اس نے سماجی طلبہ کی وجہ سے اسکول چھوڑ دیا۔ پھر اپنے طبقے میں تہذیبی کی اور بالوں کو قرعہ ری رنگ دے دیا۔

ماڈلنگ میں اس کا دائرہ کار صرف لاس اینجلس تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ نیو یارک اور لندن کی اشتہاری فلموں میں بھی کام کرنے لگی تھی۔ ماڈلنگ کے دوران میں اس نے سیاہ لباس بھی پہنا جس سے اس کے حسن میں چار چاند لگ گئے۔ لیکن اس سلسلے میں اسے کوئی بڑی کامیابی نہیں ملی۔ کم از کم ایسا نہیں ہوا کہ میگزین، اشتہاری ایجنسیاں اور روزنامے اسے خاص طور پر اپنے لیے بک کرتے۔ انجلیا نے اسکا کر ماڈلنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کیوں کہ ماڈلنگ اسے کچھ نہیں دے رہی تھی۔

انجلیا نے ایک پارٹنرٹ کرائے پر لے لیا جو ایک کیریئر کے اوپر تھا۔ یہ پارٹنرٹ اس کی ماں کے مکان سے بالکل قریب ہی تھا۔ یہاں وہ اپنی ماں سے جدا نہیں ہوئی اور اس کی شفقت اور محبت کے زیر سایہ رہی۔ امریکا میں بچے اپنے باپوں پر کھڑے ہونا چاہتے اور اس سلسلے میں اپنے والدین سے کوئی مدد نہیں لینا چاہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماں پر بوجھ بن کر بھی نہیں رہنا چاہتے۔ اپنے اغراضات و خواہشات پر پورے کرتے ہیں چاہے انکی اخلاقیات ہی کیوں نہ چننا پڑیں۔

اس نے فیئر کے بارے میں دوبارہ تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس کا دل ابھی تک اپنی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھا اور وہ بہت کچھ کرنا چاہتی تھی، لیکن اسے کیا کرنا چاہیے یہ اسے خود معلوم نہیں تھا۔ اب تک وہ مختلف کشتیوں میں قدم رکھ رہی تھی اور اس کی جدوجہد کی کوئی ست نہیں تھی۔ کبھی کبھار بھی کچھ!

فیئر میں تربیت لینے کے دوران میں اس نے مشاہدے پر زور دیا۔ ہر چیز کو غور سے دیکھنا اور اسے اپنے دماغ میں بٹھانا اس کی عادت ہو گئی تھی۔ جب وہ سات برس کی تھی تو اس نے اپنے باپ جان واہٹ کے ساتھ ایک فلم میں اکتھا کام کیا تھا جیسے باقاعدہ طور پر اس نے سولہ برس کی عمر سے

فلموں میں کام کرنا شروع کیا۔ یہ اس کے کیریئر کا آغاز تھا جاسکتا ہے۔ اس کی طرح اس کا بھائی جیمز بھی اداکار اور ہدایت کار بننا چاہتا تھا اس لیے اس نے طالب علموں کے لیے پانچ فلمیں بنوا لیں۔ جس میں انجلیا نے مختلف کردار ادا کیے۔ یہ 1991ء سے لے کر 1993ء کا دور تھا۔

اسے معلوم تھا کہ اس نے جو کچھ کیا ہے وہ محض مذاق ہے۔ وہ تو اسے مکالمہ لکھ کرنا آتا ہے اور نہ چہرے کے تاثرات دینا آتے ہیں۔ اس کے لیے اسے تربیت لینا پڑے گی۔ چنانچہ اس نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ اس کے باپ کا کہنا تھا کہ اداکاری مشاہدے سے آتی ہے۔ ہم اپنے کرد و پیش میں چلتے پھرتے لوگوں کو خود سے دیکھیں تو ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جیسوں کسی نابینا کا کردار ادا کرنے کے لیے دیا جائے تو تم اسے محض اندازے سے کر دو گی لیکن اگر تم نے کسی نابینا شخص کو دیکھ رکھا ہے تو اس جیسی حرکات کرنا تمہارے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہوگی۔ جن لوگوں کو کوڑھ ہوتا ہے ہم ان کے مسائل سے اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتے جب تک کہ کچھ عرصہ ان کے پاس نہ گزاریں اور ان کا مشاہدہ نہ کریں۔ جب کسی کو سرطان ہو جاتا ہے تو اس کے تاثرات کیا ہوتے ہیں اور وہ کیسی کیفیت سے گزر رہا ہوتا ہے، ہمیں اس سے کوئی آگاہی نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں کسی ایسے شخص کا کردار دے دیا جائے جو سرطان میں مبتلا ہے تو ہم کمرے کے سامنے کیا کریں گے تاہم فیکلہ اس کی زندگی کا بھرپور مشاہدہ نہ کر چکے ہوں۔

علاقہ اسٹوڈیوز کے چکر کاٹنے کے بعد اسے ایک فلم مل گئی۔ اس کی پہلی فلم نے ہاکس آفس پر ایمپائر فیس نہیں کیا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے ایک برس تک کسی فلم کے لیے آڈیشن نہیں دیا۔ اپنے باپ کے بھانے پر اس نے دوسری فلم میں کام کرنا منظور کر لیا۔ یہ 1995ء میں بننے والی "ہیکرز" تھی۔ دوسری فلم نے بھی ہاکس آفس پر قابل ذکر پرنس نہیں کیا۔ مگر انجلیا کا دل نہیں ٹوٹا، اس لیے کہ روزنامہ نیو یارک ٹائمز کے ایک رپورٹر نے فلم میں اس کے کردار کی تعریف نہایت اچھے الفاظ میں کی تھی۔ صرف وہی نہیں بلکہ فلم انڈسٹری کے بہت سے ہدایت کار وہ تجربہ جڑ کر متاثر ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے پے در پے کی فلمیں مل گئیں۔

اس کی لمبی ترقی کا دور اس وقت شروع ہوا جب اسے

طور پر صحت مند نہیں ہے۔ طر سے طلاق حاصل کرنے کے بعد یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی۔ بچپن میں اس نے ایک بار اپنے رخسار پر چاقو سے زخم بھی لگا لیا تھا جو اس کی دماغی علامات کی دلیل ہے۔

اس کے علاوہ آسکر ایوارڈ کی چند سوسائٹیز میں وہ کمرنگ کلا گون ہوٹن کرائی۔ پھر میں اس وقت جب کہ ایوارڈ تقسیم ہو رہے تھے وہ کئی بار اسٹیج پر آئی اور اس نے اپنی ایک ٹانگ گولن سے باہر نکال لی۔ معلوم نہیں اس حرکت کا کیا مقصد تھا؟ فوٹو گرافروں نے دھڑا دھڑا اس کی تصویریں کھینچیں شروع کر دیں۔ اگلے دن کے اخبارات اس کی تصویریں سے بھرے پڑے تھے۔ کیا اس نے یہ حرکت محض تصویریں کھینچانے کے لیے کی تھی؟ یا اس کا دماغ الٹا چلنے لگا تھا؟

☆☆☆☆

اپنی شادی کی تقریب میں انجلیتا نے ربر کی چٹلون اور سفید فی شرٹ پہنی جس پر اس نے اپنے خون سے دھلا لی طر کا نام لکھا تھا۔ دونوں کا روماس کافی دنوں تک چلا۔ جیسا کہ ہال دوا کا اصول ہے تو نہیں اور سکی۔ اور نہیں اور سکی۔ محبت جب زیادہ ہو جاتی ہے تب بھی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ انہوں نے ستمبر 1997ء میں طر کی طر اختیار کر لی۔ باقاعدہ طلاق 3 فروری 1999ء میں ہوئی۔ محبت دو گہن جائے تو اس کو چھوڑنا بہتر اور بہر حال اب بھی اچھے دوست ہیں۔

انجلیتا نے بعد میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا "میں دھوک سے نہیں کہہ سکتی کہ طر کی کیا وجہ تھی، بہر حال ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کم عمر اور نا تجربے بھرے تھے۔ دونوں کی طر کے بارے میں جب بھی کوئی پوچھے گا تو میں یہی کہوں گی کہ وہ ایک اچھا شوہر تھا۔ ہر نو جوان لڑکی کو ایسا شوہر نصیب ہو۔ میرا خیال ہے کہ میں اب بھی اس کی محبت میں گرفتار ہوں۔"

ایک اخباری نمائندے نے اس سے استرجاع کے دوران میں طر سے چٹ مگنی پٹ جیوا اور اس کے بعد طلاق اس بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ "مجھے خود بھی اس بڑی اور طلاق پر حیرت ہے۔ اس لیے کہ چند ہی راتیں گزرنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم دونوں یکدم تبدیل ہو گئے ہوں۔ پھر چند دن اور گزرے تو ایسا لگا کہ ہم میں کوئی بات سرے سے مشترک ہی نہیں ہے۔ بات انوکھی ضرور ہے، لیکن ناقابل یقین نہیں کہ مرد و زن تیزی سے ایک دوسرے سے قریب آتے جاتے ہیں لیکن بعد میں عقدہ کھلا

ٹیل وڈن کی دو تین فلموں میں اچھے اور جاندار کردار ملے جن میں 2007ء میں بننے والی دو فلمیں "لرو" و "من" اور "جارج ویس" شامل ہیں۔ ان میں سے جارج ویس برائے گوڈن گلوب ایوارڈ ملا۔ جو ناقدین نے اس کی اعلیٰ کارکردگی کا اعتراف کرتے ہوئے دیے تھے۔

1995ء میں جب وہ "سیکرٹ نامی فلم" میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا رہی تھی تو اس کے مقابل برطانوی اداکار جونی لی طر تھا۔ اوائل عمری کے بعد اب یہ انجلیتا کا عقیدان شباب تھا۔ وہ لی طر کے قریب آتی چلی گئی۔ وہ اسے زندگی کا پیلا روماس قرار دیتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آتے اور شوٹنگ کے بعد دور بھی ہو جاتے۔ کئی بار تک ان کی ملاقات نہ ہو پاتی۔ جب ان کی دوبارہ ملاقاتیں ہوئیں تو انہوں نے 28 مارچ 1996ء کو شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیوں کہ یہی ایک طریقہ ہے کہ جس سے دوری کو نزدیکی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس کی شادی پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبارات نے لکھا تھا کہ اس نے طر سے محض اس لیے شادی کی ہے کہ وہ زندگی میں استحکام چاہتی تھی۔ اپنے باپ کے معاونانہ رویے سے وہ ڈپریشن میں مبتلا ہو چکی تھی، اس لیے شادی کر کے اس کیفیت سے باہر آنا چاہتی تھی۔

جونی طر برطانوی اداکار ہے جو 1972ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے "سیکرٹ نامی فلم" میں 1995ء میں کام کیا تھا جس کی بنا پر اسے شہرت حاصل ہوئی۔ وہ دنیائے فلم میں کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا، اس لیے اس نے فلم "لور" کو نوڈھنا پھوٹا بنائے رکھا۔ پھر اسے اپنی وڈن کی ایک سیریز مل گئی۔ اس کا چہرہ سنجیدگی کا مرقع ہے، اس لیے اسے ایک بار ڈرامے میں شرلاک ہو کر کی حیثیت سے بھی منتخب کیا گیا تھا۔ اسے فلموں میں کام کرنے کے علاوہ ہدایت کاری سے بھی دل چسپی ہے۔ وہ مظرنامہ بھی لکھ سکتا ہے۔

انجلیتا سے اس کی شادی کامیاب نہیں ہوئی اور صرف اٹھارہ ماہ تک ان کا ساتھ رہا۔ اس کے بعد اس نے اداکارہ اور ماڈل مانگی بکس سے شادی کر لی جس کے نتیجے میں اس کا بیٹا ہے۔

مرکٹ ہال کلب کا ممبر ہے اور اسے میرا تھن وڈن نے سے بھی دل چسپی ہے۔

شادی کا کام ہونے کی وجہ پر اس نے بتایا ہے کہ انجلیتا کا سلوک اپنے شوہر کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس کے باپ نے ایک بار کہا تھا کہ اس کی بیٹی انجلیتا دماغی

ہے کہ ہم جو کچھ سمجھ رہے تھے وہ حقیقت میں کچھ اور تھا۔"

☆☆☆

نوم رانڈر کی شوٹنگ پیرپ کے اہم مقامات پر ہوئی۔ جب لندن میں اس کی شوٹنگ ہو رہی تھی تو انجلیتا اور لیٹر ساتھ دیکھے گئے وہ قہقہے لگاتے، پارکوں میں چال تھی۔ کرتے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے کیڈل لائٹ ریستورانوں میں کھانا کھاتے تھے۔ یہ سب کیا تھا؟ ماضی کا بچہ ستارا، اعادہ عشق یا فساد ماضی کو یاد کرتے ہوئے اپنی شاموں کو گنتیں مانتا؟

ہل دوڑ حیرت، دل چھٹی اور اسکینڈل کی سرزمین ہے۔ 1996ء میں جب وہ "نوکس فائر" کی شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھی تو ماڈل اداکارہ جینی شیزو کے ساتھ اس کا دوستانہ ہو گیا۔ اس نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: "میں جینی شیزو سے اتنی محبت کرنے لگی ہوں کہ اسے لنگھوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ اگر میرا شوہر نہ ہوتا تو میں غالباً اس سے شادی کر لیتی۔" (یہ سوچے بغیر کہ وہ بھی ہماری طرح لڑکی ہے)

جینی ایک جاپانی۔ امریکن نژاد عورت ہے۔ اس نے موزمبیک کی حیثیت سے اپنا کیریئر شروع کیا اور اس کے بعد ماڈلنگ کرنے لگی۔ اس کی سب باتیں الونگی اور حیرت انگیز ہیں۔ وہ ماڈلنگ کے مرہبہ اصولوں پر پوری نہ اترنے کے باوجود بہت بڑی ماڈل ہے اور اشتہاری ایجنسیاں ہر وقت اسے فون کرتی رہتی ہیں۔ وہ واز قاست ہے، نہ اس کی آنکھیں شرمیلی ہیں اور نہ اس کے جسم پر گوشت ہے۔ وہ دلی پتلی اور سینک سلائی ہے اور اس کے ہازو گدے ہوئے ہیں۔ اس وقت اسے سپر ماڈل کہا جاتا ہے۔ مشہور رقاصہ میڈونا سے بھی اس کے خفیہ تعلقات رہ چکے ہیں۔

غالباً انہی باتوں کی بنا پر انجلیتا، میڈونا سے نفرت کرتی ہے اور رقابت میں جگا ہے۔ وہ دونوں ایوارڈ کی ایک تقریب میں مدعو تھیں۔ صحافی برادری کا خیال تھا کہ ان میں سے ایک اس تقریب میں شریک نہیں ہوگی۔ قوی قیاس تھا کہ انجلیتا اس پروگرام کو ملتوی کر دے گی۔ حالانکہ اسے خود بھی ایوارڈ لینے کی امید تھی۔

☆☆☆

ایک فلم "نوکس فائر" میں انجلیتا کے انوکھے کردار پر لاس انجلس ناٹرنے جان داد تھرہ لکھا تو لوگوں نے اسے اداکارہ تسلیم کر لیا۔ اس طرح اس نے 1996ء تک تقریباً

دس فلموں میں کام کیا۔ تاہم اب تک وہ اوپری سٹار کی اداکاراؤں تک نہ پہنچی تھی۔ گویا اس نے ابھی تک خود کو فلم دیکھنے والوں سے تسلیم نہیں کر لیا تھا اور بقول ٹھٹے کوئی تھیلک نہیں چاہتا تھا۔

اس کے بعد آنے والی ایک اور فلم "جیا" میں بھی اس کے رول کی تعریف اخبارات نے کی اور اس کو ایمری ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔ انجلیتا نے اس فلم میں ایسی عورت کا رول ادا کیا تھا جسے ایڈز ہو جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ فلم کا کردار اس کی شخصیت کو دیکھ کر لکھا گیا تھا، اس لیے فلم میں کام کرنے کا مزہ آیا۔ اخبارات نے تھرہ کیا کہ اس نے ایڈز کے کسی مریض کا بغور مشاہدہ کیا ہے، ورنہ اس کے ہلیر یہ ناممکن تھا۔ یہ فلم ایچ آئی وی کی محدود سرمایہ کاری سے ٹیلی ویژن کے لیے تیار کی گئی تھی اور ایک سپر ماڈل جیا کرینگی کی زندگی پر بنائی گئی تھی جسے 26 سال کی عمر میں ایڈز ہو گیا تھا۔

انجلیتا نے بتایا کہ اس نے شوٹنگ کے دوران میں لوگوں سے ملاقات کرنی چھوڑ دی تھی اور کردار کو خود پر طاری کر لیا تھا۔ فلم کی ریلیز کے بعد اپنے شوہر سے طلاق لینے کے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ اب وہ فلموں میں کام نہیں کرے گی، اس لیے اس کا خیال ہے کہ وہ اس سے بہتر اداکاری نہیں کر سکتی۔

وہ نچ پارک چلی گئی اور اس نے یونی ورسٹی میں ہدایت کاری سیکھنے کے لیے داخلہ لے لیا۔ وہ منظر نامہ لکھنے میں بھی دل چھپی رکھتی تھی۔ یونی ورسٹی سے ایک چھوٹا سا کہرس کرنے کے بعد وہ پھر فلم انڈسٹری میں لوٹ آئی، کیونکہ اداکاری اس کا اور حنا بھونابن چکا تھا۔ اب وہ کیرے کے سامنے آئے بغیر وہ نہیں سکتی تھی۔ فلم میں دلچسپی کا سال 1998ء تھا۔

اس نے اس سال دو فلموں میں کام کیا۔ دوسری فلم قابل ذکر تھی جس میں شون کنری نے اس کے ساتھ کام کیا تھا۔ سان فرانسسکو کروئیکل نے اس کی اداکاری کو پسند کیا اور اس پر مثبت تبصرہ لکھا۔ نیشنل بورڈ آف ریو آف موٹون پکچرز نے اسے عمدہ کارکردگی پر بہترین اداکارہ کا ایوارڈ بھی دیا۔

1999ء میں نئے دہلی فلم "دی یون کلکٹر" جو جھری اید کے کرائم ناول پر مبنی تھی، انجلیتا نے لیڈی پولیس آفیسر کا رول ادا کیا تھا۔ فلم ایک جنسی سٹری سے شروع ہوتی تھی، اس لیے انجلیتا نے اس میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر ہدایت کار کے سمجھانے پر اس نے فلم نہیں چھوڑی۔ اس فلم

نے دنیا بھر میں 151 ملین ڈالر کا بزنس کیا اور دھوم مچا دی۔ انجلیتا نے اپنے رول کے ساتھ انصاف کیا تھا، اس لیے اخبارات نے اس کی تقریروں کے بل واعدہ دیے۔

فلم ”گرل انترپرائز“ میں کام کر کے انجلیتا نے ساری دنیا کو چمکا دیا۔ اس فلم کی ریلیز کے بعد اس نے تیسری بار گولڈن گلوب ایوارڈ جیتا، اس کے علاوہ بہترین معاون اداکارہ کے طور پر اسے اکیڈمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ فلمی دنیا نے اس کی اداکاری کا لوہا مان لیا تھا اور اب میڈیا نے اسے سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اس پر مضامین، اس کی تصاویر اور انٹرویوز شائع ہو رہے تھے۔ وہ ہر میگزین کے سرورق کی زینت بنی جا رہی تھی۔

2000ء میں اس نے ”گولڈن ان سکسٹی سیٹرز“ میں کلوئس کچ جیسے بڑے لوہا کار کے ساتھ کام کیا۔ اس کا فلمی کردار اس میں ہلکا تھا مگر اسے شائقین نے پسند کیا۔ اس فلم کا دنیا بھر میں بزنس 237 ملین ڈالر تھا۔ یہ یاد رہ جائے دلی جرم و سزا پر مبنی ایک دل چسپ فلم تھی۔ جس میں لڑائی دنگا اور لساد کی بھرمار تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایکشن فلموں کی ہیروئن بنی جا رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بھیڑ چال ہے جس سے اس کی اداکاری بھروسہ ہو سکتی ہے۔ شون کونری کی طرح سے وہ بھی ٹائپ ہو کر رہ جائے گی۔ اس نے کہا کہ جہاں تک ایکشن کا تعلق ہے تو ہیرسین فوراً ہی کچھ کر رہا ہے اور بہتر طریقے پر کر رہا ہے تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں بھی ایسے کردار ادا کرنے لگوں؟

2001ء سے لے کر 2005ء تک اس نے جن فلموں میں کام کیا انہوں نے اسے بین الاقوامی طور پر دنیا بھر میں روٹیاں کرا دیں۔ ان میں ’لومب رائڈرز‘ فلم تھی جس نے اسے عالمی شہرت یافتہ ہیروئن کے طور پر لوہا کاری کے بلند پائے پر بٹھا دیا۔ اسے سپر اسٹار کہا جانے لگا۔ فلم میں انجلیتا نے لارا کروٹ کا کردار ادا کیا۔ فلم بنگلی سے پہلے اس نے مارشل آرٹ کی تربیت حاصل کی۔ انجلیتا اس فلم میں کام کرتے میں کوئی دل نہیں نہیں رکھتی تھی لیکن دوستوں کے سمجھانے پر اس نے آخر قبول کر لی۔ لارا کروٹ کا کردار جیم ہاٹر اور اٹھ پانا جونز کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ ریلیز ہونے پر فلم، تنقید نگاروں کو بالکل پسند نہیں آئی۔ بہر حال پبلک نے اسے سر پر اٹھا لیا۔ اس فلم نے دنیا بھر میں 257 ملین ڈالر کا بزنس کیا۔ انجلیتا کو لائیڈ ایکشن اسٹار کا خطاب دیا گیا۔ وہ لوگوں کی آنکھوں کا تارہ بن چکی تھی۔ ایسے میں تنقید نگاروں

کو سنہ کی کٹائی پڑی۔

فلم ’لومب رائڈرز‘ کی شوٹنگ زیادہ تر کپہ چیا میں ہوئی تھی۔ انجلیتا نے وہاں کی زندگی کو بے حد قریب سے دیکھا۔ ہر طرف مطلقاً بے چارگی اور فاقہ کشی تھی۔ وہ ان روح فرسا مناظر سے لرزہ بر اندام ہو گئی۔ یہ اس کی زندگی کا حیرت انگیز موڑ تھا۔ اس نے اقوام متحدہ کے آفس میں جا کر خود کو رجسٹر کرایا اور پھر ان کے نمائندے کی حیثیت سے تقریباً بیس ملکوں کا دورہ کیا۔ وہ عملی طور پر مظلوم الحال لوگوں کے لیے جو کچھ کر سکتی تھی، کر رہی تھی۔ فلموں سے ہونے والی آمدنی سے وہ ایک تہائی بچا رہی تھی، ایک تہائی عطیے کے طور پر دے رہی تھی اور ایک تہائی سے وہ اپنے اخراجات پورے کر رہی تھی۔

اس نے بتایا کہ جب میں کپہ چیا میں پہلے ریلیف کیمپ میں گئی تو میں نے اندازاً چار لاکھ افراد کو دیکھا۔ وہ مصائب اور مجبور ہیں کا ایک بے شمار سمندر تھا۔ اسی طرح سے میں نے سیریلینون میں لاکھوں افراد کو ہاتھ پاؤں کٹی حالت میں دیکھا۔ (وہشت گردوں نے ان کو اس حالت میں پہنچایا تھا) ان کے قریب خیم بچے ہلکے رہے تھے اور ان کی طرف توجہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ میں ان کی حالت دار دیکھ کر رونے لگی۔ اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ محض رونے سے کیا حاصل؟ مجھے ان کے دکھ درد کا مداوا کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ان کے لیے عطیات جمع کیے اور کپہ چیا اور تھائی لینڈ کی حکومت کو ایک سال بعد پچاس لاکھ ڈالر دیے۔

☆☆☆

کسی ساتھی کے بغیر زندگی خشک اور بے حرہ تھی۔ بے کیف اور بھینکی۔ چنانچہ اسے ملی بوب قمر تنون اچھا لگنے لگا۔ انجلیتا نے اسے آنکھوں کے راستے دل میں اتار لیا۔ پھر وہ اس کی زندگی میں مکمل طور پر داخل ہو گیا۔ دو ماہ تک وہ پیار و محبت اور اقرار و بیاں کرتے رہے اس کے بعد انہوں نے 5 مئی 2000 میں لاس ویگاس میں شادی کر لی۔ ان کی ملاقات 1999ء میں ’پشنگ ٹین‘ کے سیٹ پر ہوئی تھی۔ دل چسپ بات یہ کہ ملی بوب اس سے بیس برس بڑا تھا اور انجلیتا اس کی پانچویں بیوی تھی۔

ممکن ہے ملی بوب واقعی محبت کرنے والا شخص ہو مگر اس نے جب انجلیتا سے اپنے تعلقات کو طشت از بام کیا تو کسی کو اس کی باتیں پسند نہیں آئیں۔

ملی بوب امریکی ترازو ہے۔ وہ ایک مفلس گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے گھر میں بجلی تھی اور نہ واش ٹین۔ 1973ء میں اس نے ہائی اسکول کی پڑھائی ختم کر لی۔ تعلیم کے علاوہ اس کے مشاغل میں ہیں ہال کھیلنا شامل تھا۔ اس نے بعد میں یونیورسٹی میں نفسیات کے شعبے میں داخلہ لیا مگر ایک سال بعد اس نے پڑھائی ترک کر دی۔ 1980ء میں اس نے ایس بیس چلا گیا۔ وہاں اس نے فلمی لوکار بننے کے لیے ہمدرد شروع کر دی۔ فلموں میں آسانی سے کام نہیں ملتا اس لیے اسے ہول و ہرر بھی بنانا پڑا۔ اس کے بعد اس نے ہدایت کاری کی بھی اور منظر نامہ لکھنے میں دل جمعی لی۔ اس کی زندگی مصائب میں بھی گزری جس میں کم کمانا بھی شامل ہے۔ جس کی بنا پر وہ کئی بار بیمار بھی ہوا۔

پہلے اسے فلموں میں چھوٹے موٹے کردار ملے لیکن پھر بعد میں وہ بڑے کرداروں میں آنے لگا۔ ایک فلم میں اسے آسکر ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا گیا اس نے گانگ میں بھی حصہ لیا اور اس کا ایک البم فروخت کے لیے مارکیٹ میں آیا۔

ہالی ووڈ کے راک آل فیم میں اس کے نام کا تارہ بھی نصب کیا گیا ہے۔ اس نے پانچ شادیاں کیں اور ان کا انجام طلاق کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تین بیویوں سے اس کے چار بچے ہیں۔

انجلیٹا سے شادی کے ناکام ہونے کے بعد اس نے میک اپ کرنے والی خاتون سے شادی کر لی جس سے اس کی ایک لڑکی ہوئی۔ ملی بوب کا کہنا ہے کہ اب اگر اس کی شادی ناکام ہوئی تو وہ آئندہ شادی نہیں کرے گا۔

انجلیٹا اور ملی بوب، دونوں کا شادی کرنا اور بیویاں شوہر چھوڑ کر میڈیا کو بہت پسند آیا۔ ان کی تصاویر شائع کرنا اور ان کے بارے میں کراہے اور ٹکٹیں واقعات شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ ازدواجی بندھنوں میں بندھے تھے۔ انہوں نے سیاطان بھی کر دیا تھا کہ وہ مارچ 2002ء میں کپوچیا جا کر ایک بچے کو گود لیں گے۔ مگر نہ جانے کیا ہوا کہ تین ماہ بعد انہوں نے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ قانونی طور پر ان کی علیحدگی کا اعلان عدالت نے 27 مئی 2003ء کو کیا۔ اس شادی سے انجلیٹا کو ایک قائمہ ضرور ہوا کہ اس نے نفسیات سے کنارہ کئی اختیار کر لی تھی اور وہ ایک معزز شخص کی بیوی تھی۔

2001ء میں اس نے اقوام متحدہ کے ادارے میں

رقائی کاموں کی ڈسٹے وہاں سنبھالیں۔ اس نے اس موقع پر کہا تھا۔ ”جب دنیا کے کسی خطے پر ظلم و زیادتی ہوتی ہے یا وہ مظلومی اور دبانے کی باتوں کے سچے پسے لگتا ہے تو ہم بے حس ہو کر اس کی طرف سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ لاکھوں افراد کو ایک وقت کی ردی مشکل سے نصیب ہوتی ہے اور وہ مظلومی کی آخری سطح سے بچنے کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں، کیا ہمیں زیب دینا ہے کہ ہم ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں؟ میں انٹر کنٹیننٹل گاڑیوں میں سارے ڈی حثیت لوگوں سے ملتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتے پر تو آپ مجھ سے کوئی اختلاف نہیں کریں گے کہ قانون اور انصاف سب کے لیے برابر ہے اور اس کے اثرات ملکی سطح تک پہنچنا چاہئیں زندگی کا بہرہ حال کوئی مقصد بھی ہونا چاہیے۔ آخر ہم ایک دوسرے کے کام کیوں نہیں آتے؟ جب ہم کرب و اہت میں مبتلا ہوتے ہیں تو دوسروں سے توقع کرتے ہیں کہ وہ ہماری مدد کریں۔ اسی طرح سے دوسرے بھی ہم سے یہی توقع رکھتے ہیں۔“

2001ء میں جب وہ کپوچیا میں ٹوبس رائڈز کی شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھی۔ اس نے اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن برائے پناہ گزین سے رابطہ قائم کیا کہ اسے اس بارے میں معلومات دی جائیں کہ دنیا میں لوگ کہاں کہاں پسماندگی اور لاچاری کا شکار ہیں۔ اقوام متحدہ نے اس کا تفصیلی جواب دیا۔

فروری 2001ء میں انجلیٹا نے بن ممالک کا دورہ شروع کیا جو غربت میں ڈوبے ہوئے تھے اور دو وقت کی روٹی کے لیے ہاتھ پھیلائے پر مجبور تھے۔ اس نے اٹھارہ دن سیریا لیون اور تنزانیہ میں گزارے۔ بعد میں اس نے اپنی مددگار المناک سے خوش حالی دنیا کے لوگوں کو آگاہ کیا۔ وہ اس وقت رنجیدہ مظلوم تھی۔

دو مہینوں بعد وہ کپوچیا گئی اور اسی دورانیہ میں پاکستان میں افغان پناہ گزینوں کے کیمپ میں بھی اس نے وقت گزارا۔ اس نے سفر کے اخراجات خود برداشت کیے، اسٹاف کے لوگوں کے ساتھ عام لوگوں کی طرح اٹھنا بیٹھنا رکھا۔ ان خدمات کی خاطر اقوام متحدہ نے اسے اپنے جینز ایبل کوآرڈر میں 27 اگست 2001ء کو خصوصی تمغہ عے کا درجہ دیا۔ لب وہ کسی بھی ملک میں اقوام متحدہ کے نمائندے کی حیثیت سے جاسکتی تھی اور رفاہی کام کر سکتی تھی۔ یہ بہرہ حال ایک بڑا اعزاز تھا۔

کی درخواست فوراً قبول نہیں کی گئی اس لیے کہ امریکی حکومت نے کپو چیا کے بچے گود لینے پر پابندی مائد کر دی تھی۔ حکومت کا خیال تھا کہ بچوں کو گود لینے کی آڑ میں کوئی خاص قسم کا لین دین ہو رہا ہے۔

جب اس پر سے پابندی ہٹائی گئی تو انجلیتا نے بچے کو نیپیا میں گود لے لیا، جہاں وہ 2003ء میں فلم 'جائڈ ہارڈرز' کی شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھی۔ لی باپ اور انجلیتا نے بچے کو مشترکہ گود لینے کے لیے اعلان کیا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ انجلیتا نے تھا اس کی ماں بننے کے لیے کاغذات پر دستخط کیے تھے۔

2003ء اور 2006ء کے دور میں امریکا کے صدر مقام پر اس نے 'کاگر میس' کے ممبران سے میس کے قریب ملاقاتیں کیں اور ان کی توجہ اس مالکی مسئلے کی طرف مبذول کرائی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ تیسری دنیا کے بچوں کی خاص طور پر مدد کی جائے، جو اپنے والدین کے انتقال کے بعد یتیم اور بے سہارا ہو جاتے ہیں۔ وہ جن ممالک میں گئی اور اس نے لوگوں کی توجہ کے لیے جو قدم اٹھائے وہ اس نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیے۔ 2003ء میں جب اس کی فلم 'جائڈ ہارڈرز' ریلیز ہو رہی تھی اور اس کی ڈائری 'میرے سفر' کے نام سے شائع ہوئی۔ 2005ء میں اس نے اپنی ڈائری پر فلم بھی بنائی، جس کا بڑا حصہ مغربی کینیا میں فلمبند کیا گیا تھا۔ 2003ء میں اس کی فلم 'گریٹل آف لائف' ایک معرکتہ آواز فلم تھی جس نے اسے دنیا کی سبکی ترین اور اکاؤنٹ کی سب سے زیادہ لکڑا کیا۔ ساری دنیا میں اس فلم نے 156 ملین ڈالر کا کاروبار کیا۔

2004ء میں اس کی فلم 'سیٹلنگ لائف' نے بڑا بزنس نہیں کیا لیکن فلم میں اس کے کردار کو پسندیدگی کی سند ملی۔ اسی سال اس نے 'ایلیگزینڈر دی گریٹ' نامی فلم میں کام کیا اور اولمپیا اس کا کردار ادا کیا۔ امریکا میں فلم کا بزنس کامیاب نہیں تھا لیکن باقی دنیا میں اس فلم نے 139 ملین ڈالر کا بزنس کیا۔ اس کے تاریخی کردار کو بھی فلم کے شائقین نے سراہا۔ فلم میں یکساں انکشن کردار ادا کرتے کرتے یہ ایک نیا موڈ تھا جس سے اس کی اداکاری میں توجہ پیدا ہو گیا۔

فلموں میں کام کرتا ہی اس کی زندگی کا مقصد نہیں تھا وہ اس کے متوازی دفاعی کاموں میں بھی حصہ لے رہی تھی۔ 2005ء اور 2006ء میں اسے ڈیوٹ کے مقام پر 'ورلڈ انکس فورم' میں خصوصی مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا

اس روز کے بعد سے انجلیتا خاص طور پر دنیا بھر میں پناہ گزینوں کے کیمپوں میں جاتی ہے ان کے دکھ درد سنی اور حتی الوسع ان کی مدد کرتی ہے۔ وہ اب تک تقریباً تیس لکھوں کا دورہ کر چکی ہے۔ ایک اخباری نمائندے نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے؟ اس نے جواب دیا: "میں چاہتی ہوں کہ دنیا کو ایسے لوگوں کا علم ہو جائے۔ یہ ہماری دنیا کے انسان ہیں اور ہمیں ان کے لیے کچھ کرنا ہے۔ ان کی والدہ کی کے لیے کوئی مرنے سے تو نہیں آئے گا؟ سیریلیون کے دورے کے وقت میں نے ایک ایسا کیمپ بھی دیکھا جہاں تو مولود بچے فرش پر پڑے دور ہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کس کے بچے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ ان ماؤں کے بچے ہیں جن کی آمدورہ بڑی حملہ آور فوجیوں نے کی تھی۔ میں پوچھتی ہوں کہ ان بچوں کا مستقبل کیا ہے؟ ان کی پرورش کون کرے گا۔ میں نے اس سلسلے میں ایک تفصیلی رپورٹ لکھ کر اقوام متحدہ کو دی ہے۔

انسان، انسان کو اسلئے اور ہم بارود سے نہیں نہیں کیے ڈال رہا ہے اور اس کا خیال ہے کہ صرف اسی کو زندہ رہنے کا حق ہے اور باقی سب کو مر جانا چاہیے بلکہ وہ حالت جنگ میں رہتا ہے۔ ایسے لوگوں سے ملنے اور ان کا موقف معلوم کرنے کے لیے انجلیتا نے کئی دور دورہ علاقوں کا دورہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ مارنے والے کو یہ نہیں معلوم کہ وہ کیوں مار رہا ہے اور مرنے والے کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کس لیے مر رہا ہے۔ ہر طرف مفادات کی جنگ چا رہی ہے جس میں کوئی شخص 'موقف' نہیں ہے۔

2002ء میں اس کی ریلیز ہونے والی فلم "لائف آر سم ٹھیک لائیک لٹ" بزنس کے اعتبار سے کمزور رہی لیکن اس کے کردار کو پریس نے سراہا اور یہ کہا کہ اس نے دل لگا کر اپنا رول نبھایا ہے۔ سی این این نے تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کے لیے وہ کردار خاص طور پر لکھا گیا تھا۔

10 مارچ 2002ء میں انجلیتا نے پہلا بچہ گود لیا جس کی عمر سات برس تھی اور نام میڈوکس شیوان تھا۔ وہ بچہ یتیم تھا اور اس کے والدین کپو چیا سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک مضامین کی گاڑی میں 5 اگست 2001ء میں پیدا ہوا تھا اور اس کا پیدائشی نام روچھو وائل تھا۔ انجلیتا نے اسے گود لینے کی درخواست 2001ء میں کی تھی جب وہ ٹوبس رائڈر کی شوٹنگ کے دوران میں دوسری بار کپو چیا گئی تھی۔ اس

انجلیٹا کی وہ فلمیں جن میں اس نے اپنے فن کے جوہر دکھائے۔

1. CYBORG 2
2. GLASS SHADOW
3. HAKERS
4. FOXFIRE
5. LOVE IS ALL THERE IS
6. GEORGE WALLECE
7. PLAYING GOOD
8. CIA
9. PUSHING TIN
10. PLAYING BY HEART
11. GIRL INTERPRETED
12. BONE KILLER
13. GONE IN SIXTY SECONDS
14. TOMB RIDER
15. THE CRADLE OF LIFE
16. BEYOND BORDERS
17. TAKING LIVES
18. TOMORROW
19. ALEXANDER
20. MR & MRS SMITH
21. THE GOOD SHEPHERD
22. A MIGHTY HEART
23. THE CHANGELING
24. WANTED
25. ATLAS SHRUGGED
26. SALT
27. THE TOURIST

کی کا شکار تھی۔ نومبر 2007ء میں اخبارات میں یہ افواہ پھیلنے لگی کہ زاہرہ کی حلقی ماں اپنی بیٹی کو دواؤں لیتا چاہتی ہے لیکن جب اس نے اس بات سے انکار کیا تو اخبارات نے جب سادہ لی۔ اس کی ماں کا کہنا تھا "میں بھگت ہوں کہ زاہرہ خوش قسمت ہے کہ اسے انجلیٹا نے گود لے لیا ہے۔"

انجلیٹا کی ملاقات اور پھر دواؤں پر ملائی نزلہ لگا کر براڈ پٹ سے کیسے ہوا یہ جاننے کے لیے ہم کچھ پیچھے چلتے

گیا۔ بین الاقوامی فلموں کے لیے کام کرنے کے سوا اس نے اپنے طور پر بھی 2003ء میں ایک خیراتی فاؤنڈیشن بنائی جس کا نام میڈوس جولی فاؤنڈیشن ہے۔ یہ فاؤنڈیشن 2007ء تک فعال رہی۔ یہ فاؤنڈیشن اس لیے قائم کی گئی تھی کہ کچھ چھوٹے اور اس کے شمال مشرقی علاقوں میں ملاقاتی کام کیے جاسکیں۔

دہلی لوگوں کی خدمت کے سلسلے میں اس نے 2004ء میں سوڈان کے انسانی ملاقاتی کا دورہ کیا۔ 2005ء میں اپنے بوائے فرینڈ براڈ پٹ کے ساتھ کیمبر میں آنے والے زلزلے کے موقع پر گزشتہ حبیب اللہ کا دورہ کیا اور خواتین اور بچوں سے ملاقات کی۔ اس زلزلے پر اس نے اپنے شدید دکھ کا اظہار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو ہر شخص کو گھر بنا کر دوں۔ اس نے ایک بچے کو نیکی کو پٹر میں بٹھا کر آسمان کی سیر بھی کرائی۔ اس کی بہن بچے کھڑی اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اخبارات نے انجلیٹا کے اس عمل کو سراہا۔

اس نے انگریزی روزنامہ ڈان کے نمائندے سے کہا کہ زلزلے سے متاثر ہونے والے افراد کے لیے سردی کے موسم سے پہلے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے ورنہ ان لوگوں کو شدید مصائب گھیر لیں گے۔ اس ملاقات کے دورے کے بعد وہ براڈ پٹ کے ساتھ اسلام آباد گئی اور اس نے صدر پاکستان پرویز مشرف اور وزیراعظم سے بھی ملاقات کی۔

پاکستان سے واپسی پر انجلیٹا نے اقوام متحدہ کو جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا گیا تھا کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ ایک کروڑ شہری بھوک سے تڑپ رہے ہوں، اس کے لیے وزیراعظم ہا اس میں شاہی دسترخوان بچایا گیا۔ وزیراعظم کا خاندان اپنے مخصوص طیارے میں سفر کر کے اس سے ملنے اور تحفے دینے کے لیے آیا۔ رپورٹ ایک ایسا طمانچہ ہے کہ انسان کا خون سفید نہ ہو تو اس کے گالوں کی سرخی پوری قوم کو نظر آئے۔

☆☆☆

6 جولائی 2005ء کو انجلیٹا نے چھ ماہ کی بیٹی زاہرہ مارے کو ادیس ابابا مانتھو بیلا میں گود لے لیا۔ زاہرہ مارا ساما میں 8 جنوری 2005ء میں پیدا ہوئی تھی۔ اسے گود لیتے وقت اس کے بارے میں خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ بچپن ہی سے ایڈز کی مریض ہے مگر بعد میں جب اسے ٹیسٹ کیا گیا تو نتیجہ اس افواہ کے برعکس نکلا۔ انجلیٹا جب اسے لے کر اسرائیل آئی تو اسے اسپتال میں داخل کرنا پڑا اس لیے کہ بیٹی پانی اور غذا کی

ہیں۔ 2005ء میں انکشن فلم "مسٹر ایڈمز" میں براڈ ہیٹ کے ساتھ کام کیا۔ لوگوں کو فلم بہت دل چسپ لگی، اس لیے کہ ہیرو، ہیروئن حقیقی زندگی میں برائے فریڈ تھے لیکن فلم میں ایک دوسرے کے مخالف اس لیے ایک دوسرے پر گولیاں برساتے رہے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سیکرٹ ایجنٹ ہیں اور ایک دوسرے کو ہلاک کرنے پر مامور ہیں۔ ساری دنیا میں اس فلم کا بزنس 478 ملین ڈالر تھا۔ 2005ء میں ریلیز ہونے والی فلموں میں یہ فلم بزنس کے اعتبار سے ساتویں نمبر پر رہی۔ یہاں اب انجلیکا کا طویل بولنے لگا اور وہ اداکارہ کی حیثیت سے بالائی سطح پر پہنچی گئی۔

فلم انڈسٹری کا طعنہ نہیں سے بھی ہو پالی ووڈ، ہالی ووڈ یا کسی اور ملک سے، اس کیٹل ضرور بنتے ہیں۔ ہالی ووڈ ان سب میں بہت آگے ہے۔ گیسر دولت کی چکاچند اور تصویر میں رہنے کا جنون اداکاروں سے سب کچھ کراتا ہے۔ 2005ء کے لوائل میں انجلیکا پر ایک بار پھر الزام تراشیاں مائد ہونا شروع ہو گئیں۔ سب اس پر انگلیاں اٹھا رہے اور بیٹیاں بجا رہے تھے۔ پرنس سب سے آگے آگے تھا۔ انہوں نے سالہاں خبریں لگنا شروع کر دیں کہ ہمالیہ پٹ جو برطانوی اداکار ہے اس نے اپنی بیوی جیلر ہرسٹون کو اس لیے طلاق دے دی ہے کہ وہ انجلیکا کی اداکار کا شکار ہو چکا ہے۔ ان کے درمیان کچھ بڑی پک رہی تھی اور کچھ کچھ اور ہاتھ۔ اخباری نمائندے جب چٹکیاں لینے لگے تو انجلیکا صاف کمر گئی مگر جب بات بڑھ گئی اور دونوں جتنے مسکراتے دیکھے مجھے پھر انہیں کسی نے گلے میں بائیں ڈالے بھی دیکھ لیا تو انجلیکا کو اعتراض کرتے بنی "ہاں، میں ایک دوسرے سے محبت ہو گئی ہے۔"

یہ اعتراض اس نے شوٹنگ کے دوران ایک سیٹ پر کیا تھا۔

ولیم براڈ لے پٹ 1963ء میں پیدا ہوا تھا۔۔۔ پیدا ہونے امریکن ہے۔ اداکار کے علاوہ فلسفہ ساز بھی ہے۔ اسے چار بار آکیڈمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا جا چکا ہے اس نے ایک بار گولڈن گلوب ایوارڈ حاصل کیا ہے، لیکن پانچ بار نامزد ہوا۔ میڈیا نے اسے "دنیا کا سب سے عجیب شخص انسان" کا خطاب دے رکھا ہے۔ وہ اوکلاہاما میں پیدا ہوا تھا اور اس کا باپ ہالی اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک لڑک پٹنی کا مالک بھی تھا۔ براڈ پٹ نے کلاچ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ اسے

گولف، ہیراکی، فٹنس اور ریسنگ سے دل چسپی تھی۔ وہ کیمبل کے علاوہ اسکول کے تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیا کرتا تھا۔ اسے ابتدائی سے موسیقی سے بھی دل چسپی تھی۔ ہالی اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اس نے یونیورسٹی آف مسوری میں صحافت میں داخلہ لیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ صحافی بنے گا اور اس کے بعد ویرجین تعلیم اپنی ایک اشتہاری کپڑی کھول لے گا۔

تو اس نے بہت سے ڈراموں میں حصہ لیا۔ پھر اچانک بیٹھے بٹھائے نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے فلم اداکار بننے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈگری کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی، لیکن ڈگری پٹنے میں دو دن تھے کہ وہ مسوری سے لاس اینجلس چلا گیا اور اداکاری کی تربیت حاصل کرنے لگا۔ اس کے بعد جب وہ آکیڈمی سے باہر آیا تو اسے فلموں میں چھوٹے چھوٹے کردار ملنے لگے۔ اس کے بعد ایک ٹیلی ویژن کپڑی نے اسے اپنے ڈرامے میں کاسٹ کر لیا۔ رفتہ رفتہ ہدایت کاروں نے اس میں اداکاری کے جوہر دیکھ کر ہیرو کی حیثیت سے بھی فلموں میں کاسٹ کرنا شروع کر دیا۔ مگر عرصہ تک کام کرنے اور کیرئیر کے سامنے آنے کے باوجود اس کی فلمیں نہ تو اچھا بزنس کر رہی تھیں اور نہ تاہم بین اس کی تعریف میں طابے طابے تھے۔ البتہ چند فلمی صحافیوں نے یہ اعتراف ضرور کیا تھا کہ اس میں نیکیں ابھل رہی ہیں اور وہ خواتین کے لیے کشش کا باعث ہے۔ قسمت کی دیوی کو اس پر رحم آگیا۔ 1995ء میں بننے والی فلم "سین" میں اس کی اداکاری کو سراہا گیا اور اس فلم نے ساری دنیا میں 327 ڈالر کا بزنس کیا۔ پٹ میں کئی فلموں میں اس کی اداکاری تہرہ نگاروں کو پسند نہیں آئی لیکن جب اس کی فلم "ہانگ تاکو" وٹس کے عالمی فلمی میلے میں پیش کی گئی تو سب نے اس کی تعریف کی اور اسے "بڑا اداکار" تسلیم کر لیا۔ پھر اسے جولیا رابرٹ بھی بڑی اداکاراؤں کے ساتھ کاسٹ کیا جانے لگا۔ اس کی فلم "اوٹو الیون" نے باکس آفس پر کامیابی کے ریکارڈ توڑ دیے۔ اس فلم نے ساری دنیا میں 450 ملین ڈالر کا بزنس کیا۔ براڈ پٹ نے لوگوں سے اپنا لودا منوالیا۔ اس کے بعد فلم "ٹرائے" بنا شروع ہوئی جس کے لیے اس نے چھ ماہ تک شمشیر زنی کی تربیت حاصل کی۔ یہ فلم ریلیز ہونے پر براڈ لے پٹ کے کیریئر کی بہترین فلم قرار دی گئی۔ اس کا بین الاقوامی بزنس 497 ملین ڈالر تھا۔

و بہبود کے لیے قائم کی گئی تھی۔ انجلیتا کا لباس کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھی، اس لیے اس نے 2007ء میں اکثریتی اسپرنگ کے تعاون سے بچوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے ایک فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی جو جنگ کی ہولناکیوں کے سبب تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ گئے ہوں۔

اب تک اس نے جنسی قلموں میں کام کیا تھا اس کے تناظر میں تنقید کاروں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ درجہ اول کی ہیروئن ہے۔ اسے اداکاری کرنا آتی ہے۔ چنانچہ اس تھرے کی روشنی میں اسے ہالی ووڈ کے بڑے اداکاروں کے ساتھ کاسٹ کیا جانے لگا۔ 2006ء میں اسے "گنڈ شیفرڈ" میں رابرٹ ڈی نیرو کے مقابل کاسٹ کیا گیا۔ یہ فلم سی آئی اے کی لڑائی تاریخ سے متعلق تھی۔ اس فلم کی کہانی سی آئی اے کی ایک اسرائیلی ورڈ ورسن نے لکھی تھی۔ تنقید کاروں نے انجلیتا کا رول پسند کیا۔ ٹاکس ایڈیٹور نے لکھا کہ وہ یقیناً دیکھنے والوں کی ہمدردی سیٹ لے گی۔ فلم میں اس کا کردار حقیقت سے بالکل قریب ہے۔

اب تک اداکاری کرتے ہوئے اس نے کالی وقت گزار لیا تھا۔ چنانچہ انجلیتا نے ہدایت کاری کی طرف توجہ دی اور 2007ء میں ایک دستاویزی فلم "اے ٹیم" میں ان کا نام "ہٹلر" جو اس نے ایک فلمی میلے میں پیش کی۔ فلم پسند کی گئی اور فلم سنی نے فیصلہ کیا کہ ساری دنیا میں اس کی نمائش کی جائے۔ صرف سنیما ہالوں میں نہیں اس کی نمائش اسکولوں میں بھی کی جائے۔

2007ء میں اس نے "مانیٹری ہارٹ" میں اپنی لداکاری کے جوہر دکھائے۔ یہ فلم پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی سے متعلق تھی۔ وال اسٹریٹ جرنل کے رپورٹر داخل پل نے لکھا کہ انجلیتا نے اپنا کردار بہتر طریقے سے نبھایا ہے اور فلم پر اس کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ انجلیتا کو اس فلم میں گولڈن گلوب ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔

2008ء میں وہ ایک ایکشن ٹھیکر وٹلیڈ کی ہیروئن تھی جو ہارک طر کے ٹاؤل پر مبنی تھی۔ فلم کامیابی سے منسلک ہوئی اور اس نے ساری دنیا میں 342 ملین ڈالر کا کاروبار کیا۔ اخبارات اس کی تعریف و توصیف سے بھر گئے۔ وہ ہر طرح سے گزرتی تھی کیمروں کے پس منظر سے بچنے لگتے تھے۔

2008ء میں بننے والی ایک ایلی میڈ فلم "سنگ نو پاڈ" میں ماسٹر پیگرس کے کردار کے لیے انجلیتا نے اپنی آواز دیکارڈ کرائی۔ اس فلم نے ٹیکس لدا کرنے کے بعد

مسٹر ایڈ مسز اسٹوڈ میں اس کے مقابل انجلیتا جولی ہیروئن تھی۔ اس کی کہانی کسی کو پسند نہیں آئی لیکن اس فلم نے ساری دنیا میں ہماری بڑس کیا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ 2005ء میں انجلیتا نے ایک پریس کانفرنس میں کہا "اگر میں ایک شادی شدہ مرد کی طرف متعلق ہوں تو یہ کوئی شرم ناک بات نہیں ہے، اس لیے کہ میرے باپ نے میری ماں کے ساتھ بھی حرکت کی اور دھوکے بازی کی تھی۔ میں یہ بات کیسے بھول سکتی ہوں۔ میں اس میدان میں تنہا نہیں ہوں۔ مجھ پر پھر وہی پیچھے جو خود صاف ستھرا اور پاکیزہ ہو۔"

انجلیتا جب اس بچی زاہرہ کو گود لینے استعویا جاری تھی تو براڈ لے پٹ اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے بعد میں انکشاف کیا کہ صرف اسی نے نہیں بلکہ براڈ لے پٹ نے مشترکہ طور پر اس بچی کو گود لینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ براڈ لے پٹ کی پیشگی سکرٹری نے ایک بیان جاری کیا کہ براڈ لے پٹ۔ میڈکس اور زاہرہ دونوں کو گود لینا چاہتا ہے۔ چنانچہ انجلیتا نے حکومت کو درخواست دی کہ قانونی طور پر گود لینے والی کا نام صرف انجلیتا کے بجائے انجلیتا براڈ لے پٹ لکھا جائے۔ یہ درخواست 19 جنوری 2006ء کو منظور کر لی گئی۔ اس طرح سے دونوں ہی ان بچوں کے قانونی والدین بن گئے۔

وہ دونوں ساتھ رہائش اختیار کیے ہوئے تھے لیکن انہوں نے اپنے رشتے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بچی کی پیدائش کے سلسلے میں نیسیا گئے۔ 27 مئی 2006ء کو انجلیتا نے ایک بچی کو جنم دیا جس کا نام اس نے شیلوہ ڈیوئل جوہر کیا۔ یہ نام اس نے انجیل مقدس سے لیا تھا۔ براڈ لے پٹ نے اس بات کی تصدیق کی کہ اس کی بچی کے پاس نیسیا کا پاسپورٹ ہوگا۔ انہوں نے بچی کی تصاویر کسی فوٹو گرافر کو اتارنے کی اجازت نہیں دی۔ البتہ جب میگزین پبلیش سے معاہدہ ہو گیا تو انہوں نے چالیس لاکھ ڈالر کے بدلے یہ سودا کیا کہ اس بچی کی تصویر صرف شمالی امریکا کے رسالوں اور اخبارات میں شائع کی جائے گی۔ جب کہ میگزین پبلیش نے اس کی حقوق اشاعت برطانیہ کے لیے ساڑھے تین لاکھ ڈالر میں خریدے۔ یہ ساری رقم افریقا کے خیراتی اداروں میں صلے کے طور پر جمع کرائی۔

2008ء میں اس نے ایک اور عظیم سے اشتراک کیا جس کا نام شیدان چلڈن سینٹر تھا۔ جو خاص طور پر بچوں کی فلاح

632 ملین ڈالر کا کاروبار کیا تھا۔ اس طرح سے یہ فلم دنیا میں بزنس کے اعتبار سے اس سال ریلیز ہونے والی فلموں میں تیسرے نمبر پر رہی۔ 2008ء میں ہی اس نے گھنٹہ ایسٹ ووڈ کے ڈرامے 'میلنگ' میں کام کیا۔ اس کی اداکاری بے حد پسند کی گئی اور ناقدین نے اسے سراہا۔ ایک تنقید نگار نے تو یہاں تک لکھا کہ یہ ڈراما ناظرین کے لیے اس طرح ضروری ہے جیسے شام کی چائے!

2009ء میں شائع طاری رہا اور وہ حسن اتارنی رہی۔ 2010ء میں اسے 'سالت' نامی فلم میں کاسٹ کیا گیا۔ وہ اس فلم میں سی آئی اے کی سیکرٹ ایجنٹ تھی۔ لیکن اس وقت بھاگ دوڑ اور پکڑ دھکڑ شروع ہو جاتی ہے جب اس پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ KGB کی ایجنٹ ہے اور ڈبل ایجنٹ کا کردار ادا کر رہی ہے۔ یہ فلم باکس آفس پر کامیاب رہی اور اس نے بین الاقوامی طور پر 294 ملین ڈالر کا بزنس کیا۔ مجموعی طور پر اس کا کردار ناقدین نے پسند کیا اور اس کی تعریف کرتے ہوئے تو سنی کالم تحریر کیے۔ 2010ء میں بننے والی فلم 'نورسٹ' اس کی دوسری فلم تھی جس میں نہ تو اس کے رول کی تعریف کی گئی اور نہ اس نے باکس آفس پر تسلی بخش کامیابی حاصل کی۔ مجموعی طور پر 'نورسٹ' کا کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا۔ فلم کب ریلیز ہوئی اور کب سینما ہالوں سے اتر گئی، یہ کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔

2011ء میں اس نے ایک ہار پھر ماسٹر پیگس کی آواز میں اس کردار میں جان ڈال دی۔ فلم کا نام 'کنگ فو پاٹھ' رکھا گیا۔ یہ 2011ء کی بزنس کے اعتبار سے چوتھی بڑی فلم تھی۔ بین الاقوامی طور پر اس فلم نے پروڈیوسر کو 666 ملین ڈالر کا کر دیے۔ 'کنگ فو پاٹھ' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بچوں کے لیے بنائی جانے والی فلم تھی۔

نورسٹ 2013ء میں اعلان کیا کہ وہ دوسری جنگ عظیم کی کہانی پر فلم بنائے گی۔ کہانی لاؤس ایٹلین براڈ کی تاریخی کتاب سے اخذ کی گئی ہے۔ فلم کا ہیرو ولکی ڈیسنزٹی ہوگا۔

2007ء میں جب لیپیا کے علاقے چاڈ میں خانہ جنگی ہو رہی تھی تو اس نے وہاں کا دورہ بھی کیا۔ 2007ء سے 2009ء کے درمیان میں جب دوسری ہارگلف میں جنگ ہو رہی تھی تو اس نے عراق کا دورہ کیا۔ وہ افغانستان بھی گئی جہاں امریکی استقامت 2008ء سے 2011ء کے درمیان میں ملک پر غیظ و غضب و جارحی تھی۔ 2011ء میں جب لیپیا میں انتخاب آیا ہوا تھا تو انجلیتا وہاں بھی گئی۔

ماہنامہ سرگزشت

اسے اقوام متحدہ کے خیر خواہ نمائندے کی حیثیت سے مظلوم اہل خلیوں کا دورہ کرتے ہوئے دس برس ہو چکے تھے۔ اقوام متحدہ نے 17 اپریل 2012ء میں اس کا عہدہ بڑھا دیا اور اب وہ خصوصی قاصد کہلاتی ہے۔ وہ ممالک جو حالت کرب میں مبتلا ہیں اور ان کا اہل تلاش کرنے کے لیے طویل منصوبہ بندی کرنا لازم ہے جن میں افغانستان اور سوڈان شامل ہیں، وہ خصوصیت سے دل چسپی لیتی ہے۔ اسے کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اس لیے کہ عام لوگ اس سے واقف ہیں اور اسے اپنا مونس و غم خواہ سمجھتے ہیں۔ اب وہ ہر سال دو فٹن ای سی میں ورلڈ فوٹو ڈے بھی مناتی ہے۔ کسپری میں جلا لوگوں کی علاج کے لیے وہ گا ہے گا ہے اطلاعات کرتی اور پروگرام بھی بناتی ہے۔ اس نے ایک براؤزنگ قائم کی جو ان بچوں کا قانونی طور پر دفاع کرتی تھی جو غیر قانونی طور پر امریکا کی سرحد پار کر کے وہاں سکونت اختیار کر چکے ہوں۔

اپنی ان دفاعی سرگرمیوں کی بنا پر انجلیتا ساری دنیا میں مشہور ہو چکی ہے اور اسے انسانیت کا بیڑا بھر سکھا جانے لگا۔ اس کی خدمات کے صلے میں اسے 2002ء میں جرمنی اور متحدہ سرگرمی کی تنظیم نے ایوارڈ سے نوازا۔ اسی طرح سے 2003ء میں اقوام متحدہ کو اسپاٹرنٹ ایسوسی ایشن نے اسے سٹیزن آف دی ورلڈ ایوارڈ سے نوازا۔ یہ ایوارڈ پہلی بار کسی شہری کو دیا گیا تھا۔

اس کے ان تعمیری کاموں اور پروگراموں کے صلے میں اسے اقوام متحدہ ہی نہیں بلکہ امریکا نے بھی ایوارڈ اور انعامات سے نوازا۔ 2005ء میں اسے گولڈن ہیرو منٹیرین ایوارڈ دیا گیا جو اقوام متحدہ اور امریکا کے اشتراک سے دیا گیا تھا۔ 31 جولائی 2005ء میں شاہ نور محمد شاہ سوئی نے کپوچیا کے لوگوں کے خدمات کے صلے میں اسے کپوچیا کی شہریت پیش کی۔

2011ء میں اقوام متحدہ نے اسے طویل عرصے تک لوگوں کی قیادت و بہبود کے لیے کام کرنے پر ایک منبری پنا سے نوازا۔ اب تک اس کا سفر لاکھوں اور کوششوں سے سمجھا گیا ہے۔ برائے پٹ اور انجلیتا نے اب تک اپنے تصانیف کی نوعیت کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ البتہ جنوری 2006ء میں "ٹیمپل" نامی سکرین کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ وہ حاملہ ہے اور اس کے شکم میں ایک بچہ ہے۔ سات برس تک ساتھ رہنے کے بعد انہوں نے اپریل 2012ء میں صرف اپنی

اگست 2014ء

مکمل کا اعلان کیا۔ اس کی طرز پھیلائے والے اخبارات اور میگزینوں نے انہیں 'میرنگلیٹا' (انجلیٹا اور براڈ پٹ کا مرکب) کا خطاب دے دیا۔ یہ ساری دنیا کے پریس کے لیے ایک الوکھا خطاب تھا۔ ان کی شادی کے بارے میں آئے دن افواہیں اڑتی رہتی ہیں اور پریس یہ جاننے کے لیے بے قرار رہتا ہے کہ وہ شادی کب کریں گے؟ اس بارے میں وہ اپنے قیاسات کی بنا پر مختلف تاریخوں کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔

15 مارچ 2007ء میں انجلیٹا نے تین سالہ لڑکے عکس تھامین کو گود لے لیا۔ یہ لڑکا قیصوں کی پرورش کرنے والے ایک ادارے سے لیا گیا تھا جس کا آئس ہوچی من سویت نام میں تھا۔ پیدائش کے وقت اس لڑکے کا نام لیم تو انگ تھا جو 29 نومبر 2003ء کو پیدا ہوا تھا اور اپنی پیدائش کے بعد ہی خیم ہو گیا تھا اس لیے اس کے والدین بہرحال کے میں ہلاک ہو گئے تھے۔

مئی 2008ء میں کانز کے لکسی میلے کے موقع پر انجلیٹا نے اس کی تصدیق کی کہ وہ 72 واں بچوں کو جنم دینے والی ہے۔ دو ہفتوں بعد اس نے ٹیس، فرانس کے ایک ساحلی اسپتال میں داخلہ لیا اور 12 جولائی 2008ء کو ایک بچے اور بیٹی کو جنم دیا۔ ان کی تصاویر کچھنے کے لیے ٹیلی ویژن میگزین کو اشاعت کے حقوق ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈالر میں دیے گئے۔ بعد میں یہ ساری رقم جولی پٹ فاؤنڈیشن میں جمع کرادی گئی۔ ایسوی اینڈ پریس نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالمی بیسٹ سٹار کے بعد دنیا کا ترقی ترین اور مقدس بچہ ہے!

2010ء میں برطانیہ کے اخبار نے یہ خبر لگا دی کہ براڈ لے پٹ اور انجلیٹا اب طیہر کی اختیار کرنے والے ہیں۔ امریکا اور یورپ میں سنسنی دوزگی اور ان کے چاہنے والوں نے فون کر کے ان کا ناخوش بند کر دیا۔ انجلیٹا نے یہ خبر پڑھی تو غصے میں آگئی اور اس نے کہا کہ خبر میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ لہذا اخبار کو چاہیے کہ وہ معافی مانگے اور جرمانہ ادا کرے۔ اخبار نے اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ جرمانہ ادا کرنا تو دور کی بات، اس نے معافی بھی نہیں مانگی۔ چنانچہ انجلیٹا نے اس پر مقدمہ دائر کر دیا۔ تب اخبار کے مالکان نے نہ صرف معافی مانگی بلکہ جرمانہ بھی ادا کیا۔

18 فروری 2013ء کو جب کہ انجلیٹا کی عمر 37 برس تھی اسے سینے کے سرطان پر تباہ پانے کے لیے

دونوں پستانوں کو سرجری کے ذریعے سے نکالنا پڑا۔ ڈاکٹروں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اسے سرطان ہونے کے 87 فی صد امکانات تھے جو اب گت کر پاگئی صدرہ گئے ہیں۔ جب ڈاکٹروں نے اس کی فیملی رپورٹ طلب کی تو معلوم ہوا کہ اس کی ادا کارہ ماں مارشلائن 56 برس کی عمر میں رحم کے سرطان سے ہلاک ہوئی تھی۔ (اس کا انتقال 27 جنوری 2007ء میں ہوا تھا) جب کہ اس کی نانی بھی 45 برس کی عمر میں رحم کے سرطان سے ہلاک ہوئی تھی۔ اس کی ایک خالہ 61 برس کی عمر میں 2004ء میں موت کی خیم سوئی تھیں، سبب رحم کا سرطان ہی تھا۔ انجلیٹا نے سرجری کرائی تو سرطان ہونے کے امکانات کم ہو گئے۔ البتہ اس کی ماں اور خالہ رحم کے سرطان سے ہلاک ہوئی تھیں اس لیے جینیاتی طور پر اسے بھی رحم کا سرطان ہونے کے 50 فی صد امکانات تھے!

اس نے اپنے بیان میں کہا "میں نے اس بات کو داز میں نہیں رکھا کہ میں سرطان کا شکار ہو سکتی ہوں۔ اس لیے کہ اس ملک میں سیکڑوں ایسی خواتین موجود ہیں جنہیں یہ تک علم نہیں ہے کہ وہ کسی وقت بھی سرطان کا شکار ہو سکتی ہیں۔ انہیں اس سلسلے میں ہوشیار رہنا چاہیے اور گا ہے گا ہے اپنا جینیاتی ٹیسٹ کرانا چاہیے۔ جب انہیں اس کا علم ہو جائے تو اس کا حق القدر علاج کرانا چاہیے۔ ایسی کفر ہے۔ ہمیں اس موذی مرض کے خلاف ضرور جنگ کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں انہیں نیٹ سے بھی مدد لینا چاہیے۔" سوردی طور پر اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ میں اسے بھی رحم کا سرطان نہ ہو جائے اس لیے کہ اس کی ماں اور نانی بھی اس موذی مرض میں جلا رہ چکی تھیں، لہذا انجلیٹا نے اپنا رحم بھی نکلا دیا۔ اب اس کے پاس اولاد ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے۔

نام نے اپنے فائل پر اس کی تصویر اور اندر کے صفحات پر ایک مضمون شائع کیا۔ جس میں بتایا گیا کہ اس نے جتنے بھی ٹیسٹ کیے وہ اس بات ثابت میں کرائے ہوا کہ عام لوگ بھی اس مرض کو پیشہ نہ دیکھیں اور اس سے آگاہی حاصل کریں۔ لوگوں نے اس کے اس اقدام کو بہت پسند کیا۔

انجلیٹا کا کہنا ہے کہ جب اس نے اب تک پبلک سے کوئی بات نہیں چھپائی تو اب کیا ہوا ہے؟ اس کو سرطان ہونے دس برس گزر چکے ہیں۔ اس نے سلسلے میں کسی نامحدود کی خدمات حاصل نہیں کی ہیں۔ اگر کچھ کہا مقصود

فیجر ضرور ہے لیکن اس نے اپنی پہلی کے لیے کوئی ایجنٹ نہیں رکھا۔ شہرت خود اس کے تعاقب میں رہتی ہے لہذا وہ اپنی شہرت کے حصول نہیں بیٹھا چاہتی۔ اس کا کہنا ہے کہ میں پبلک پراپٹی نہیں ہوں اس لیے ہر وقت گنج میں نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے تمہائی بھی درکار ہے۔

ایک بڑے تنقید کار کا کہنا ہے کہ آج کل کے زمانے میں ہر شخص انجلیبا کی باتیں کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے 1951ء میں لوگ اترتے ٹیلر کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔ یہ اس کے فن کا عروج ہے کہ لوگوں کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا چاہتے ہیں۔ وہ کیا کھاتی ہے، کیا جیتی ہے اور آج اس نے کیا ہنسنے دکھا ہے؟

اس نے اپنی ماں کے مذہب کے بارے میں بتایا کہ وہ کیتھولک تھی مگر اس نے قادر کے پاس جا کر احترام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ مذہب کیا ہے لیکن اس بارے میں تبلیغی اعداد اختیار نہیں کیا۔ اگر کوئی چیز اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی تو وہ وہی طور پر اسے قبول نہیں کرتی تھی۔ قائلہ اسی لیے اس نے مجھ پر بھی دباؤ نہیں ڈالا کہ میں چرچہ جاؤں۔ اس کا کہنا تھا کہ مذہب ڈالنی معاملہ ہے۔ جس کا دل جیسا چاہے کرے، بعد میں خدا تعالیٰ روز قیامت خود اس سے سوال و جواب کرے گا۔

میرا شو ہر بلا لے پٹ کچلی کر مس پر کتابوں کا ایک فہرست لے آیا تھا۔ اس میں ہم نے دنیا کے سارے مذہب کی کتابیں شامل ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم بچوں کو سارے مذاہب کی تعلیم دیں گے۔ وہ چاہیں گے تو ان میں سے ایک کا انتخاب کر سکتے ہیں یا پھر سارے مذاہب پر چل سکتے ہیں۔ مگر میں ہم سارے مذاہب کی تقریبات مناتے ہیں۔ ہم انہیں چرچہ لے جاتے اور دنیا بھر میں ساری مذاہب کا خفا ہوں میں بھی لے جاتے ہیں۔

میرے بچوں کا خیال ہے کہ جنت کی ہر چیز مفید ہے اور وہ بہت خوب صورت ہے۔ جہنم کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ظلم کیسیس کی طرح ہوگی جہاں ہر طرف بھوت پریت ہوتے ہیں۔ جہاں کوئی جانا پسند نہیں کرتا۔

بچوں کے خیالات معلوم نہیں کیا ہوں گے اور وہ کیا بننا چاہتے ہیں لیکن ہم ان کے لیے آرٹ پسند کرتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا کوئی نہ کوئی بیٹا شنگل ضرور بنائے۔ بچوں کو ہم اچھے لباس پہناتے ہیں اور سحر انگیز لٹے

ہو تو اس نے ہمیں سے براہ راست کہہ دیا۔ مثال کے طور پر اس نے جتنے بھی مشق کرائے وہ ملتاز ہام کر دیے۔ اپنی دوہری منہی حرکات کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ اس نے اب تک جو نشہ بازی کی اس بارے میں بھی لوگوں کو آگاہ کر دیا۔

میڈیا اس کے خدو خال اور جسمانی خاص کی تعریف میں رطب اللسان رہتا ہے اور اسکو اتر، پٹیل، پٹیل، ہار پر ہار اور ایسٹ اور ویسٹ فیجر نے اسے دنیا کی حسین ترین خاتون اور سب سے زیادہ منہی کشش رکھنے والی خاتون قرار دیا۔

ہمیں زیادہ تر اس کے جسم پر گدے ہوئے نشانات (TATTOOS) کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور اس بارے میں سوالات کرتا رہتا ہے۔ ایک بار انجلیبا نے گن کر بتایا کہ اس کے جسم پر چودہ نشانات ہیں۔ ان میں سے ایک تو لائسنس کہاوت ہے، دوسرا لٹنسی ولیم کا قول ہے، اس کے علاوہ ایک شیر کی تصویر ہے۔ اس کے علاوہ اپنے جینے کی پیدائش کا نام اور اپنے منگیتیر برڈ لے پٹ کی تصویر ہے۔ بہت سے نشانات کو اس نے لیزر سے ختم کر دیا ہے جس میں اس کے دوسرے شوہر ملی باب کا نام شامل ہے۔

اس کے پاس پرائیویٹ پائلٹ کا لائسنس ہے اور ایک انجن کا چھوٹا طیارہ۔ لائسنس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ طیارہ اڑا سکتی ہے۔

اس وقت وہ دنیا کی پسندیدہ ترین ہستی ہے۔ جب اس نے 2006ء میں آسکر ایوارڈ حاصل کیا تو اس وقت دنیا کے 81 فی صد افراد اس سے واقف ہو چکے تھے۔ 2008ء میں ٹائم میگزین نے 100 سب سے زیادہ بااثر شخصیتوں کی فہرست بنائی تو اس فہرست میں انجلیبا جولی کا نام بھی شامل تھا۔ میگزین فوربس کے معاہدہ ادوار کی رو سے وہ ہالی ووڈ کی 2009ء سے 2011ء کی سب سے زیادہ معاوضہ پانے والی اداکارہ ہے۔ جب کہ اس کی اوسط آمدنی تین کروڑ ڈالر سالانہ تھی۔

انجلیبا کے پسندیدہ گلوکاروں میں میڈونا، الیوس پریسلے، فرینک سائرا اور رونک اسٹون شامل ہیں۔ اس نے لوگوں کی ہدایت کاری کی ہے۔ جن میں دستاویزی فلموں کی اکثریت ہے۔

وہ ایک بڑی اداکارہ ہے اور اس کے چاہنے والوں کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کر چکی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ موبائل فون نہیں رکھتی۔ وہ کھائی پر گھڑی نہیں باندھتی۔ اس کا کوئی ای میل ایڈریس نہیں ہے۔ اس کا ایک

سج کی مگی تھی۔ حال ہی میں انہوں نے اٹلی کے ملاتے
وینٹو میں ایک اور مکان خریدا ہے جس کا رقبہ چار ایکڑ ہے۔

☆☆☆

اس نے ایک فلم کی ہدایت کاری بھی کی جس کا نام
"ان بومکن" ہے۔ یہ "ان دی لینڈ آف بلڈ اینڈ ہنی" کے
بعد دوسری فلم ہے جو اس نے اپنے سرمائے سے بنائی ہے
اور خود ہی اس کی ہدایت بھی دے رہی ہے۔ "ان بومکن" کے
لیے پہلے شوٹنگ جزیرہ ہوائی میں کرنے کا خیال تھا، لیکن اس
کو لوکیٹن پسند نہیں آئی اور اب اس نے آسٹریلیا کے کچھ
علاقوں کو شوٹنگ کے لیے چنا تھا۔

پہلی فلم میں انجلیتا کی ہدایت کاری بمشورہ کو بہت
پسند آئی تھی۔ انہوں نے تہرہ کیا تھا کہ جب اداکارہ کی
حیثیت سے اس کا کیریئر ختم ہو جائے گا تو وہ ایک اچھی
ہدایت کاری ثابت ہوگی۔ محبت اور جنگ کے پس منظر میں
بنائی جانے والی اس فلم نے اچھا بڑا نمونہ کیا تھا۔

وہ "مینلیسٹ" کی شوٹنگ میں بھی حصہ لے رہی
ہے۔ مرکزی کردار انجلیتا ہی ادا کر رہی ہے۔ یہ بھی انہوں
جنگلی ہوئی ہیں کہ ایک فلم ساز 'سالٹ-2' تیار کرنے کا
مضبوطہ بنا رہا ہے جس میں وہ ہیروئن کا رول ادا کرے
گی۔ براڈ لے پتھ نے اس کی ماں پر ایک فلم بنانے کا
اعلان کیا ہے جس میں انجلیتا جولی اپنی ماں کا کردار ادا
کرے گی۔ جو رحم کے سلطان سے 2007ء میں 56 برس
کی عمر میں موت کا شکار ہوئی تھی۔

وہ بہت پہلو شخصیت کی مالک ہے۔ پریشن کا
فکار، خود کو نظم اور فن رکھنے کا جذبہ، دوسروں کا دکھ درد ہانٹنے
والی اور اس سلسلے میں ہزاروں میل کا سفر کرنے والی، پوائین
کی لماندہ، علاقائی کاموں میں پیش پیش، درد مندوں کی
مسحاہوئیوں کی خدمت گزار فلموں میں کام کرنا یا ہدایت
کاری کرنا اس کا پیشہ ہے جس سے وہ بچا نہیں چھڑا سکتی، اس
لیے کہ چٹے فخرک نہیں جاتے ہیں۔ انسان بھلے ہی بد وقت
کی روٹی نہ کھائے لیکن اپنے مسائل کو ترک نہیں کر سکتا۔ اسی
طرح سے اس کا معاملہ ہے۔ گویا فلم اس کی ضرورت بھی
ہے۔ مگر حقیقت میں وہ اپنا اسی خدمت گزار کی حیثیت سے
بنا چاہتی ہے۔ اس کے پیش نظر ہے کہ لوگ اس کی ساری
باتوں کو بھول جائیں اور صرف یہ یاد رکھیں کہ وہ بدترین مادیوم
ہے۔ تنگساری اور چارہ سالاری اس کا وصف ہے۔



اگست 2014ء

121

ماہنامہ سرگشت

ملاتے ہیں تاکہ ان کی بحالیاتی مس تازہ رہے۔

2007ء میں دیے گئے ایک انٹرویو میں ریلرڈ
ڈائجسٹ کے نمائندے نے اس سے پوچھا کہ جنگلی بار جب
میں نے تمہارا انٹرویو لیا تھا تو تمہارے ساتھ صرف ایک بیٹا
میڈوکس تھا۔ اب تمہارے چار بچے ہیں۔ یہ فیصلہ تم نے
کب کیا کہ خاندان خوب بڑا ہونا چاہیے؟

انجلیتا نے اس کا جواب یہ دیا کہ براڈ لے پتھ حقیقی
معنوں میں ایک سلجھا اور مقبول آدمی ہے۔ اس کے ساتھ
زندگی گزارتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں کسی اور
سارے میں پہنچی گئی ہوں۔ براڈ لے پتھ اور مجھ میں ہم
آہنگی ہے۔ دواور میں گھر لے جوڑے کی طرح چاہتے ہیں کہ
ہمارے بہت سے بچے ہوں اور ہم انہیں اسکول لے جائیں
اور بعد میں ان کے کپڑے واشنگ مشین میں ڈال کر
دھوئیں۔ جب ہم ان بچوں کو ہاتھ روم میں لے جا کر غسل
دیتے ہیں تو بہت حرا آتا ہے۔ پہلے تو نہیں مگر اب یہ سب
کچھ اچھا لگتا ہے۔ ہم سارے بچوں کی یک وقت خدمت
نہیں کر سکتے اس لیے ہم نے 25 آیاؤں کی خدمات حاصل
کر لی ہیں۔ یہ بڑی تعداد ہے لیکن بچے ان سے قابو نہیں
آتے اس لیے کہ انہیں اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ بچوں کو
ڈانٹیں یا ماریں۔ بچے ہم سے خوش ہیں اس لیے کہ ہم بچوں
سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ براڈ لے پتھ کی طرف سے
سب کو پیشنگ کرنے کی اجازت ہے مگر کیڈس کی بجائے
بچے گھر کی دیواروں پر اپنے آرٹ کے نمونے بکھیرتے
ہیں۔ جیسے جیسے بچے بڑے ہو رہے ہیں، گھر چڑھا گھر میں
تبدیل ہوتا جا رہا ہے ایک نئے بچوں نے اتنا لوہم بچایا کہ
دو آیاؤں میں تو گھر چھوڑ کر ہی چلی گئیں۔

چھ بچوں کو پلانا آسان نہیں ہے۔ ہم ان کے خواہات
پر مجموعی طور پر ایک کروڑ ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ جس میں ہن
کے کپڑے، نئے تعلیم، کھانا پینا، تفریحات اور پرائیویٹ
یونیورسٹی شامل ہے۔ جب وہ سچا اٹھتے ہیں پورے مائٹھی کی میز پر
بیٹھتے ہیں تو سب کا مطالبہ طلبہ طلبہ ہوتا ہے۔ ایک کہتا ہے
کہ اڑا فرائی چاہیے، جب کہ دوسرے کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ
اسے آلیٹ بنا کر دیا جائے۔ تیسرا ایک ڈسٹری کے سوا کچھ
نہیں چاہتا۔ اسے ناشتے میں شلہ پسند ہے۔

انجلیتا اور براڈ لے پتھ کا بنیادی مکان لاس اینجلس میں
ہے۔ جب کہ دوسرا مکان قصبہ بریکول ہلر انس میں ہے جو
ایک تاریخی تعمیر ہے۔ اندازہ ہے کہ اس کی تعمیر 121 قبل



امید پرست

صائمہ اقبال

اس نے عصرت بھری نرسنتی ہوئی زندگی گز اری تھی۔ مصائب اس کے ہمرکاب تھے۔ غم و آلام نے اس کی شاہراہ زندگی پہ کانٹے بچھا رکھے تھے مگر وہ حوصلہ مند تھی۔ دکھ درد کے غمریت کو وہ پہچاننا جانتی تھی۔ اس نے بس اس کو دکھایا۔ ہر قسم کے مصائب کو چٹ کرتے ہوئے وہ آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔

دنیا بھر میں سب سے زیادہ کئے والی کتاب کی مصنفہ کا احوال

جھیل کنارے چری کے بیڑوں کی قطار تھی۔
درختوں پر گلابی رنگ چھاپا تھا۔ لہنیاں جھول رہی تھیں۔
پرٹی سر جھکائے تنکا پر بیٹھ گئی۔ ذہن مصائب میں
الجھا ہوا تھا۔ کسی بھی وقت اسے ملازمت سے درخواست کیا
جاسکتا تھا۔ عرصے سے ہاتھ بھی ٹھک تھا۔ صحت تیزی سے گر
رہی تھی۔ سر درد، سینے میں تکلیف، دھڑکن میں تیزی کے
عارضے نے گھیر لیا تھا۔ اس کے ازدواجی تعلقات شدید
کشیہ کی زد میں تھے اور نئے واردہ ہو گئی۔ لیکن احساس

اگست 2014ء

122

ماہنامہ سرگزشت

براست اسے کھارہا تھا۔ کچ تو یہ ہے کہ وہ زندگی سے مایوس تھی۔

”آہ۔ کتنا حسین دن ہے۔“ اچانک کانوں سے ایک شیریں آواز گرائی۔

وہ چمکی۔ پہلو میں سفید لباس میں ملیں ایک بوزی عورت بیٹھیں تھیں۔ بال سفید، چہرے پر جھریاں مگر ہونٹوں پر پُرسکون مسکراہٹ۔

”ارادہ کیونو؟“ وہ چمکی۔ ”جھیل پر بھی پہلوں کا رنگ اتر آیا ہے۔“

”ہاں۔“ بونٹی برکی اعجاز میں مسکرائی اور دل میں کہا۔ محترمہ خود کو بھری جگہ کھڑکیں، پھر پچھوں گی کہ دن کتنا حسین ہے۔

”بچہ کبھی گیت گارہے ہیں۔“ عورت نے آسمان کی سمت اشارہ کیا۔ ”وہ لگرات سے آزاد ہیں۔ فقط آج میں زندہ ہیں۔“

”کیوں کہ وہ انسان نہیں۔“ جولیا نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”مستقبل کی منصوبہ سازی ہی انسان کو دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔“

”میری بیماری بنی۔“ عورت کے لبے میں شفقت تھی۔ ”نروشن مستقبل کے لیے لمحہ حال کی زمین میں خوش خلقی کا بیج بویا جاتا ہے۔“

جولیا شہنائی۔ یہ الفاظ وہ پہلے بھی سن چکی تھیں۔ شاید اپنی دادی سے سنے تھے یا شاید کسی مذہبی کتاب میں پڑھے تھے۔

”مگر میرے لیے تو لمحہ حال پریشانوں سے بڑا ہے۔“ اُس نے آہ بھری۔

”نہیں میری پیاری۔“ اس نے بونٹی کے کانوں پر ہاتھ رکھا۔ ”یہ تو موجودہ لمحے سے مسلسل فرار کا عمل ہے، جو تمہیں دکھ سے بڑا ہے۔ تمہارا جسم تو یہاں ہے مگر ذہن کہیں اور الجھا ہے۔ اگر تم گہرا سانس لو۔ اس پہلو پر توجہ مرکوز کرو تو یہ گلابی جنت تمہارے سامنے آشکار ہو جائے گی۔“

عورت کا سانس جاوڑی تھا۔ بونٹی نے آنکھیں بند کر لیں۔ گہرا سانس لیا۔ فرحت کے احساس نے یہ عمل دہرانے کی تحریک دی۔ دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

ہوا کا لطیف جھونکا چہرے سے گرایا۔ درختوں پر ہر غمے جھپکار ہے تھے۔ جھیل سے منعکس ہونے والی کرنیں خفیف تھیں۔ ایک لٹنے پر جھٹکے۔ پانی کے قطرے موتیوں کی

طرح اس کے پردوں سے جھڑے۔ ایک گلابی پھول اس کی گود میں آن کر۔ اس نے پھول اٹھایا۔ وہ قدرت کا شاہکار تھا۔

”یہ لمحہ۔ خوبصورت ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔ ”آپ کا شکر ہے۔ آپ نے۔۔۔“ وہ عورت کی سمت حڑی، مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اب وہ وہاں کھڑی ہے۔ وہ جا چکی تھی۔

اچانک بونٹی کے ذہن میں جھماکا ہوا۔۔۔ وہ اس عورت کو پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ شاید کسی اخبار میں اس کی تصویر دکھائی تھی۔ دوڑی دوڑی مگر سچی۔ آج کا اخبار سامنے بچھالیا۔ ایک کونے پر اشتہار تھا:

”زندگی آپ کی منتظر ہے!“ عورت کی تصویر کے ساتھ اس کا نام درج تھا۔ ”لوہڑا ہائے۔“ آج ایما ایم سکین ہاؤس میں اس کا سیمینار تھا۔

”لوہڑا ہائے۔“ اس نے نام دہرایا۔ اب وہ کپیٹر کے سامنے بیٹھ چکی تھی۔ انٹرویو پر عورت کا نام ٹائپ کرتے ہی کئی صفحات کھل چکے۔

وہ ایک رات تھی۔ ایک روحانی راہنما ایک تربیتی ماہر۔ اس کے ذکر کے ساتھ ایک کتاب You Can Heal Your Life کا بھی تذکرہ تھا۔ بونٹی نے اس کے بارے میں پڑھا تو بھونچک رہ گئی۔

تیسرہ نگاروں نے کتاب کو شان دار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا یہ کتاب ان گنت انسانوں کی زندگی بدل چکی ہے مگر ان باتوں نے جولیا کو حیران نہیں کیا۔ تھیر خیر امر یہ تھا کہ اس کتاب کی اب تک چار کروڑ کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ اور یہ ایک ریکارڈ تھا۔ آج سے قبل کوئی سیلف ہیلپ کتاب اس تعداد میں فروخت نہیں ہوئی تھی۔ وہ بوزی عورت دنیا کی مقبول ترین لکھاری تھی۔

جولیا نے اخبار کی سمت دیکھا۔ لوہڑا کی مسکراتی ہوئی تصویر۔ پہلو میں اُس کا بیچام ”زندگی آپ کی منتظر ہے!“

☆☆☆

جونہی وہ اسٹیج پر نمودار ہوئی، ہل تالیوں سے گونج اٹھا۔

اس شام ایما ایم سکین ہل میں گل دھرنے کو جگہ تھی۔ وہ کھانچا بھرا ہوا تھا۔ بونٹی اگلی صف میں تھی۔ پہلو میں ایک ضعیف العمر سیاہ قام عورت بیٹھ چکی تھی۔ زینے پر اُن دونوں کی

کھڑے ہو گئے تھے۔ سرت ان کی روح میں دوڑ رہی تھی۔
برٹنی پر لوہے کے جادوئی الفاظ نے گہرا اثر چھوڑا۔
اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اسے اپنے پہلو میں ایک سسکی
سنائی دی۔ وہ ہنسی۔ بوڑھی سیاہ قام عورت اپنے آنسو
پر فحش رہی تھی۔ برٹنی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ عورت
سکرائی۔

کچھ دیر بعد برٹنی بک اسٹال پر کھڑی تھی۔ سامنے
لوہے کی مشہور زمانہ جھلک **You Can Heal Your**
Life رکھی تھی۔ اس پر 40 دیں ایڈیشن کا ٹگ مسکرا رہا تھا۔
اس نے انتہائی تجسس کے ساتھ وہ کتاب اٹھائی۔

"اچھی کتاب ہے۔" ایک مانوس آواز کانوں سے
سکرائی۔ سیاہ قام عورت پہلو میں کھڑی تھی۔ "فرید لو،
گھالے میں نہیں رہو گی۔"

"تو آپ نے یہ کتاب پڑھ رکھی ہے؟" برٹنی نے
سوال کیا۔

"ہاں۔ شائع ہونے سے قبل اس کا مسودہ پڑھا
تھا۔"

"کیا؟" وہ بری طرح چوکی۔ "نہر۔"

"لوہے نے میرے ہی اپارٹمنٹ میں بیٹھ کر یہ کتاب
لکھی تھی۔" وہ ہنسی۔ "کچھ لو کہ ہم دونوں بہنیں ہیں۔ فرق
بس رنگت کا ہے۔"

"اور تو آپ انہیں ج سے جانتی ہیں؟"
"اس سے بھی پہلے سے پیاری۔" عورت نے
گردن ہلائی۔ "اس وقت سے، جب تمہوں نے میری
پیاری لوہے کو گھیر رکھا تھا۔"

"دیکھ کر لگا تو نہیں کہ انہیں کبھی غم نے چھوا بھی
ہوگا۔" برٹنی کے لیے میں تعجب تھا۔

"اور۔۔ تو تم اس کی کہانی سے واقف نہیں۔" عورت
چوکی۔ "جب تو تمہیں یہ سنی جا چکے۔ یہ دلچسپ ہے۔ کیوں
ناں ہم باہر لان میں چل کر بیٹھیں۔"

"ضرور کیوں نہیں۔" یہ کہتے ہوئے برٹنی نے ایک
خاص نوع کا تجسس محسوس کیا۔

☆☆☆

اسے بد قسمتی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔
جس رات وہ پیدا ہوئی، چاند کو گرہن لگا۔ اگلے روز
لاس اینجلس میں گرد کا طوفان آیا۔ چار روز بعد اس کے
باپ کو ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ گھر میں قاتلے

ملاقات ہوئی۔ برٹنی بوڑھی عورت کو سہارا دے ساتھ لے
آئی۔

"خوش آمدید۔" لوہے کی شیریں آواز ہال میں
گونئی۔ "میں آپ کی آمد کی شکر گزار ہوں۔"

برٹنی بہت خوش تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ آج کچھ
الو کھا ہوئے کو ہے۔

لوہے نے پیکر کا آغاز انتہائی پراثر الفاظ سے کیا۔
"زندگی بہت سادہ ہے، ہم جو بڑے ہیں، وہی کاتے
ہیں۔"

اگلے مرحلے میں اس نے زندگی بدل دینے والی
سادہ مگر اثر انگیز تکنیکوں کا تذکرہ کیا۔ فصد کے معرعات
پر روشنی ڈالی۔ خود سے محبت کرنے، دشمنوں کو معاف
کرنے کا پیغام دیا۔ آئینہ جی کی مشق کا طریقہ بیان
کیا۔ دلائل کے ساتھ مثبت خیالات کی اہمیت پر روشنی
ڈالی۔ حقیقی یادوں کے بد اثرات بیان کیے۔ جوں جوں
پیکر آگے بڑھ رہا تھا، لوگوں کے جوش و خروش میں اضافہ
ہوتا جا رہا تھا۔ سامعین کے چہرے دکھ رہے تھے۔ وہ
سرور تھے۔

"میں اب 87 برس کی ہو گئی ہوں۔" لوہے نے کہا۔
"میرے آج خود کو پہلے سے زیادہ تروتازہ اور خوش محسوس
کر رہی ہوں۔ جانتے ہیں کیوں؟" اس نے لوگوں کے
چہروں پر نظر ڈالی۔ "کیوں کہ میں نے خود سے مہد کر رکھا
ہے کہ ہر نیا دن، میری زندگی کا بہترین دن ہوگا۔ آپ بھی
خود سے یہ مہد کر سکتے ہیں۔ یاد رکھیں، ہر ایک خیال ہمارا
مستقبل تعمیر کرتا ہے، اس لیے لازم ہے کہ ہم مثبت خیالات
کا چناؤ کریں۔ آئیں، مہد کریں کہ آج سے آپ خوش رہیں
گے۔"

اس نے ہاتھ بلند کر لیے۔ "کیا آپ مہد کرتے
ہیں؟"

"ہم مہد کرتے ہیں۔" لوگوں نے یک زبان ہو کر
کہا۔

"اور میں شاید بوڑھی ہو گئی ہوں، سن نہیں سکی۔" اس
نے قہقہہ لگایا۔ "آپ ذرا بھر سے کہیں گے۔"

"ہم مہد کرتے ہیں۔" ہال گونج اٹھا۔
"تو ت کا مرکز کچھ موجود ہے۔ ہم اس لیے میں
رہے ہوئے خود سے محبت کریں گے۔" لوہے نے کہا۔

ہزاروں لوگوں نے ان الفاظ کو دہرایا۔ وہ اپنی نشستوں سے

اس کی وجہ سے میرا۔۔۔ پورا گھرانہ اسٹرب ہو رہا ہے۔“
جیٹ ایک کونے میں خاموش اور اداس بیٹھی تھی۔
میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔
”اودہ بھری ہوئی۔ مجھے دکھ ہے۔“ بوڑھی عورت نے
آہ بھری۔

”آپ کو دکھ ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے
دویرے سے کہا۔ ”آپ نے جو کچھ کیا، اس کے لیے میں
ساری زندگی آپ کی احسان مند رہوں گی۔“

☆☆☆

”یہ فیس تو بہت زیادہ ہے۔ کچھ تو رعایت کیجیے۔“
”اس کا تو امکان نہیں۔ آپ کسی اور ڈے کیئر سینٹر کا
دفعہ کریں۔“ شکر یہ۔ ”استقبال پر بھی عورت نے منہ بنایا۔
دوسرے جگہ کے سینٹر سے باہر آئی۔ لوہے کے گود میں تھی اور
اپنی ماں کی پریشانی سے لاشعور اٹھ چکا تھا۔

اس نے کچھ اور سینٹر سے بھی رابطہ کیا مگر ان کی
فیسیں سن کر اُسیدوں پر اس پر گئی۔ پھر خوش قسمتی سے بس
میں سڑک کرتے ہوئے اس کی ایک ایسی عورت سے ملاقات
ہوئی جو اپنے گھر میں ڈے کیئر سینٹر چلاتی تھی۔ اس نے جو
فیس بتائی وہ نہایت مناسب تھی۔

میں اس کے ساتھ ہوئی مگر جب وہ اس کے گھر پہنچی تو
اسے شدید دھچکا لگا۔ وہ ایک غریب بستی کی تنگ گلی میں داخل
ہوئے۔ سامان مکان تھا۔ بچوں کے لیے کوئی طیجہ کرا نہیں
تھا۔ بس ایک کونے میں چند جھولے، کرسیاں اور کھلونے
رکھے تھے۔

عورت نے اس کی آنکھیں پڑھ لیں۔ ”میں جانتی
ہوں کہ یہ کوئی اچھا انتظام نہیں، مگر میں تمہیں یقین دلاتی
ہوں کہ تمہاری بیٹی کا بھرپور خیال رکھا جائے گا۔“
میں کا دل تو نہیں مان رہا تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ
نہیں تھا۔

اس روز وہ دن بھر خاصی بے چین رہی۔ ہمیشہ کے
بعد ریٹائرمنٹ سے گولی کی طرح ٹپکی اور اس بستی میں پہنچ
گئی۔

وہاں ایک حیرت اس کی منتظر تھی۔ لوہے اس عورت کی
گود میں کھیل رہی تھی۔

”بہنوئی تو نہیں؟“ اس نے سوال کیا۔
”تھوڑی بہت روٹی تھی لیکن پھر کھیل میں لگ گئی۔“
عورت مسکرائی۔ ”میں نے کافی بتائی ہے پی کر جانا۔“

رہنے لگے۔
لوہے کی پیدائش کے ایک اٹھارہ ماہ بعد اس کے
ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی۔ اس کی ماں میں ایک
چھوٹے سے تاریک اپارٹمنٹ میں ٹھہر گئی۔ اس کا اپنا
کوئی نہیں تھا اور ایسے میں اس کے سر پر ایک بچی کی ذمہ
داری تھی۔

میں کو ملازمت کی تلاش میں باہر نکلا چکا مگر سامان
نہیں تھا۔ امریکا ویرے ویرے دوسری جگہ عظیم کی
جانب بڑھ رہا تھا۔ مالیاتی بحران کی ابتدائی علامات ظاہر
ہو گئی تھیں۔

اسے یہ مشکل ایک ریٹائرمنٹ میں ویٹریس کی
ملازمت ملی۔ تنخواہ معمولی تھی، مگر گز اڑے گا امکان پیدا
ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ بھی لوہے کو کس کے پاس
چھوڑے۔ اس نے پڑوسیوں سے مدد مانگی۔ تمام لوگوں
نے معذرت کر لی۔ وہ پہلے ہی اپنے مسائل میں الجھے
ہوئے تھے۔ اپنے میں ایک سیاہ فام عورت جیٹ اس کی
مدد کے لیے آگے آئی۔ ”تم بے فکر ہو، میں اسے سنبھال
لوں گی۔“

ملازمت کا پہلا دن دھاؤں سے بھرپور تھا۔ جونہی چھٹی
ہوئی، وہ بھاگی بھاگی اس عورت کے گھر گئی۔ دروازے پر
لوہے کے رونے کی آواز سن لی۔ عورت نے اداس
شکر اہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

”تمہاری بیٹی تو بہت ہی شرمیلے ہے۔“ اس نے کہا۔
”خیر، شرم تو نہیں۔“ جیٹ کی بھو نے منہ بنایا۔
”بہن روٹی بہت ہے۔“

جب وہ اپنی بیٹی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو رہی
تھی، بوڑھی عورت نے آواز لگائی۔ ”میں کل صبح تمہارا
انتظار کروں گی۔“

اگلے دن جب وہ ریٹائرمنٹ پہنچی، تو پتا چلا کہ آج
شام خصوصی دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے، تمام ملازمین کو
اضافی کام کرنا ہوگا۔

برطانیہ حال میں رات نو بجے ہی مہربان چینز کے
گھر پہنچ سکی۔ لوہے اس وقت بھی بری طرح رو رہی تھی۔ بیٹی
کو سنبھالنا سیاہ فام گھرانے کے لیے مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

چند روز تو یہ سلسلہ چل رہا، مگر تین ہفتے بعد جیٹ کی
بھو نے معذرت کر لی۔ ”معامتہ ملنا، مگر تمہاری بیٹی روٹی
بہت ہے۔ میری ساس نے اخلا قلاتے داری تو لے لی مگر

☆☆☆

لوہیہ اب بڑی ہو رہی تھی۔

گودہ خاصی خوبصورت تھی، مگر ماں کی توجہ سے عروسی کے اثرات اس پر عیاں تھے۔ رنگت لڑو۔ جسم تختی۔ گال ہلکے ہوئے۔

میں کو بھی اس بات کا ادراک تھا، مگر وہ کبھی کیا سکتی تھی۔ اگر ملازمت چھوڑ دیتی، تو چند روز میں ماں شی فاقوں سے مر جاتے۔ 1930 کا لہرناک مالیاتی بحران امریکا پر نازل ہو چکا تھا جس نے کاروبار تباہ کر دیا۔ ملازمتوں کا دیسے بھی کال تھا۔

ایسے میں میں بھی کی ملاقات مشرق جرمنی کے ایک نوجوان پوڈسکی سے ہوئی۔ وہ کسرتی بدن والا ایک لالہالی نوجوان تھا۔ لڑکیوں کو بھاننا اسے خوب آتا تھا۔ اس نے اپنی چٹکی چڑی باتوں سے میں کو محبت کے دام میں پھانس لیا۔ مصائب میں گمری لڑکی اس کی شادی کی پیشکش رد نہیں کر سکی۔ ذہن میں کہیں یہ خیال تھا کہ اس طرح اُس کی بیٹی کو ایک باپ مل جائے گا۔ پھر مضامعات میں لڑکے کا ذہنی اپارٹمنٹ بھی ہے۔ محبت بھی مل جائے گی۔

شادی کے ایک ہفتے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک لٹلا لیصلہ تھا۔ وہ ایک سخت گیر شخص تھا، جس کے مزاج پر خاگی زندگی کوئی خاص اثرات مرتب نہیں کر سکی۔ لوہیہ اس کے لیے بھی اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ جب وہ لمبے میں بے کاہر ہو جاتا تو چٹخا، چٹاتا۔ چیزیں توڑ دیتا۔ اپنی بیوی پر تشدد کرتا۔

میں حاملہ تھی۔ اس نے ملازمت چھوڑ دی۔ اب وہ کلی طور پر اپنے شوہر کی محتاج تھی۔ لوہا بعد وہ ایک لارڈ لڑکی کی ماں بن گئی۔

یہ واقعہ بھی پوڈسکی کو بدل نہیں سکا۔ اس میں احساس رتے دہری پیدا نہیں ہوا۔ خاندان کی کفالت میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

مالیاتی بحران شدت اختیار کر گیا۔ کھانے کے لالے پڑ گئے۔ مجبوراً میں کو پھر ملازمت تلاش کرنی پڑی۔ اب اسے اپنی اور اپنی دلوں غلیوں کی کفالت کرنی تھی۔ پوڈسکی جو کچھ کھاتا وہ تو شراب اور جوئے میں اڑا دیتا۔ لوہیہ اس کے لیے یہ سب بہت ہیبت ناک تھا۔ زندگی بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی مگر اصل سانحہ تو ابھی رونما ہونا تھا۔

☆☆☆

چونکہ وہ اس تاریک کمرے میں داخل ہوئی، دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ اس کے بدن میں سسٹنی دوڑ گئی۔ وہ مڑی۔ ایک طعنت سامنے کھڑا تھا۔ چہرے پر حیرانیت رکھتا تھا۔

سرمایہ کی اُس منحوس شام سات سالہ لوہیہ گھر کے قریب ایک پارک میں کھیل رہی تھی۔ اچانک جیک سامنے آن کھڑا ہوا۔

”کیسی ہو لڑکی۔ میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ تمہارے ڈیڑی بلا رہے ہیں؟“ ہونٹوں پر شاعرانہ مسکراہٹ تھی۔ اس کی عمر چھ تینالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ چہرے پر چمک کے داغ اور بالاد پر نیٹو تھے۔ وہ ایک موڈر میکینک تھا۔

”ڈیڑ؟“ بیٹی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں۔ تمہارے گھر والے آج میرے گھر ہو رہے۔ کیا انہوں نے تمہیں نہیں بتایا؟“ چہرے پر معنوی حیرت تھی۔ ”چائے لگ چکا ہے۔ سب تمہارے ہی منتظر ہیں۔ چلو۔“

مصوم لوہیہ اچپک کے ساتھ ہولی آگے جو کچھ ہوا، وہ ایک ڈرافٹنے خواب کی صورت برس ہا برس اُس کا تعاقب کرتا رہا۔

اس درمیان۔۔۔ بیٹی کو اپنی ہونٹوں کا نشانہ بنایا۔ اس کی روح کو مجھڑ ڈالا۔ ایسا زخم دیا، جو برسوں رستا رہا۔

لوہیہ اگر کرتی پڑتی گھر چکی۔ دروازے پر دستک دینے کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔ میں اسے دیکھ کر بوکھلا گئی۔ اسے گود میں بھر لیا۔ دوڑی دوڑی ڈاکٹر کے پاس گئی۔

اس کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر کے ماتھے پر غل پڑ گئے۔ معاینے کے بعد اس نے میں کو یہ تا کرہیت میں جھٹا کر دیا کہ کسی نے اس کی مصوم بیٹی کی آمدورہ پڑی کی ہے۔ عورت کو اپنے کانٹوں پر یقین نہیں آیا۔ ”مگر یہ کس طرح ممکن...“ الفاظ ساتھ نہیں دے سکے۔

”ہمیں پولیس میں رپورٹ کرنے ہوگی۔“ ڈاکٹر نے بات کاٹ دی۔

جب بیٹی کو ہوش آیا، وہ اسپتال کے بستر پر تھی۔ ماں سر ہانے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بستر کے دائیں جانب دو پولیس اہل کار کھڑے تھے۔

پولیس کے سوالات اسے ماضی میں لے گئے۔ اسے وہ اذیت ناک لمبے یاد آئے۔ بیٹی رونے لگی۔ اس نے پورا واقعہ من دمن بیان کر دیا۔

”جیک... ناممکن۔“ پوڈسکی بھڑکیا۔ ”وہ میرا دوست ہے۔“

”ایسے معاملات میں قریبی رشتے دار ہی ملوث ہوتے ہیں۔“ تجربہ کار افسر نے کہا۔ ”مکرم کیا آپ کیس درج کروانا چاہئیں گی؟“

”ہاں۔ میں اس آدمی کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں۔“ عورت نے سر ہلایا۔

اسی رات جیک کو گرفتار کر لیا گیا۔ معاملہ عدالت میں گیا۔ یہ جاننے کے لیے کہ کیا واقعی نیکی کی آبروریزی ہوئی ہے، اس کا میڈیکل ٹیسٹ ہوا۔ یہ بھی لوہڑا کے لیے ایک انتہائی اذیت ناک عمل تھا۔ اس دوران میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

اس پورے معاملے میں پوڈسکی کا کردار خاصا متنی رہا۔ میڈیکل جانچ والے روز گھر لوٹنے کے بعد جب یہی اپنی بیٹی کو دلا سے دے دی تھی وہ وحشی دہاڑا۔ ”یہ سب اس کا قصور ہے یا اس کے ساتھ کی چیزیں؟“

”کیا؟“ ”میں بوجھلا تھی۔“ ”لڑے... یہ بیٹی ہے۔ اور وہ درندہ۔“

”کوئی بیٹی نہیں۔ یہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی تھی۔“ الفاظ عورت کے دل پر گھونسنے کی طرح گئے۔ لوہڑا بھی سکے میں تھی۔

”پوڈسکی تمہیں شرم۔“ عورت نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ آدمی نے اس کے منہ پر پتھر سید کیا۔

”چپ ہو جاؤ۔ میرے سامنے زبان چلانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ چٹایا۔ ”ہاں کا قصور ہے۔ اسے ساتھ جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ بے شرم۔“

اس رات اس انجیل میں طوفانی ہارن ہوئی۔ لوہڑا بستر پر پڑی روئی رہی۔ اس کی روح ڈھکی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک ڈری ہوئی، احماد سے محروم، نالائق لڑکی تھی، جسے کوئی استانی پسند نہیں کرتی تھی۔

پوڈسکی تو اسے پڑھانے کے سخت خلاف تھا مگر میں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ حوصلہ طبع کے نسبتاً بہتر اسکول میں داخل کر دیا مگر اسکول کا ماحول اس کے کچھ کام نہیں آیا۔

وہ اندر سے سکھ ہوئی تھی۔ غربت اور بے چارگی اس کے لباس، چال احوال اور اطوار سے عیاں تھی۔ لباس خست ہوتا۔ ہاتھوں کا انداز بھونٹا۔ جوتے پٹے ہوئے۔ دیگر بچے

ماہنامہ سرگزشت

اس سے دور ہی رہتے۔ اسکول سے لوٹنے کے بعد وہ پڑوس میں ایک بوڑھی عورت کا ہاتھ ٹاپا کرتی۔ اس کے حوص اسے ہر مٹنے دس سینٹ ملتے۔ بوڑھی عورت ساگرہ اور کرکس والے روز اسے ایک ڈالر دیا کرتی۔ ہفتہ وار ملنے والے دس سینٹ تو گھر کے بجٹ کی تذرہ ہو جاتے۔ ساگرہ اور کرکس پر ملنے والے بیسوں سے اس کے کپڑے خرید لیے جاتے۔ اب دو ڈالر میں ابھی پوشاک کہاں آتی ہے۔

جب لوہڑا چھٹی جماعت میں تھی، اس کے اسکول میں ایک بڑی دھوت کا اہتمام کیا گیا۔ بہت سے بچے گھروں سے یک لائے۔ لوہڑا نے بھی ایک نہیں چمکا تھا۔ وہ اس کے ذائقہ سے نا آشنا تھی۔ بیٹ بیکری کے اندر بچے یک اور بیٹریوں کو حسرت سے دیکھا کرتی تھی۔

گو دھوت میں خاصا ایک تھا مگر اس کا اندرون پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ وہ آج بھی اس خوش شکل شے کو چمکنے سے محروم رہے گی۔

جب استانی یک کے بھوے لیے آئی، تو بچے فطرتی پر جھپٹ پڑے۔ کسی نے دو گلوے اٹھائے، کس نے تین۔ لوہڑا قطار میں آخری تھی۔ جب استانی اس تک پہنچی، ایک ختم ہو چکا تھا۔

”کوہ، تم رہ گئیں۔ میں دیکھتی ہوں، شاید اور ایک ہو۔“ یہ کہہ کر استانی اندر دوڑی۔ کچھ دیر بعد وہ خالی ہاتھ لوٹ آئی۔ ”سواری لوہڑا۔ ایک ختم ہو گیا۔“

”مئی کوئی بات نہیں۔“ آنسوؤں سے اس کی آواز رنہ گئی۔

☆☆☆

زندگی کیا تھی، تکلیفوں کی زنجیر تھی۔ غربت گھر میں پھٹارنے لگی۔ یہی جو کچھ کاتی، اس سے پہ مشکل گزارہ ہو جاتا۔ لوہڑا نے بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ ہر معاملے میں چھوٹی بہن کو ترجیح دی جاتی۔ اس کا بچا ہوا کھانا لڑکی کے سامنے رکھا جاتا۔ اسے اسکول سے بھی اٹھایا گیا تھا۔

دھیرے دھیرے اس کا سوجھا ہوا ایک حیلان میں تبدیل ہو گیا۔ وہ رات گئے شراب کے نشے میں دھت گھر لوٹتا اس پر تھک د کرتا۔

اس دورے نے لوہڑا کو دھکی دی تھی کہ اگر اس نے زبان کھولی تو وہ بھی کو طلاق دے ڈالے گا۔ بے چارگی نے

اگست 2014ء

127

تھا۔ وہ اب بھی ایک لڑی ہوئی، سہی ہوئی لڑکی تھی۔ کوئی آہٹ ہوئی تو اچھل پڑتی۔ کوئی ڈانٹا، تو قہر قہر کاٹنے لگتی۔ کوئی محبت کے دو ہول کہہ دیتا تو اس کے سامنے لاجیر ہو جاتی۔

بہت سے بد معاشوں نے اسے محبت کے دام میں پھنسا دیا۔ رات بسر کی اور گھر چھوڑ دیا۔ پھر بہت حال تکلیف دہ ضرور تھی مگر ماضی کے برعکس آزادی اور خود مختاری کا ایک احساس تھا۔ مگر یہ احساس اس وقت چمکا چر ہو گیا، جب یہ انکشاف ہوا کہ وہ حاملہ ہے۔

لوہڑا کے بیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے ڈاکڑوں سے مدد مانگ کر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہ جو لیا ہی تھی، جو اس موقع پر کام آئی۔ اس نے ایک بے لونا دھوڑا لٹا لٹا، جو بچہ گود لینے کے لیے تیار تھا۔ وہ بچے کی پیدائش تک لوہڑا کو اپنے گھر رکھنے پر بھی راضی ہو گئے مگر شرط یہ تھی کہ لوہڑا اپنے کو جنم دینے کے بعد پھر اس سے کبھی نہیں ملے گی۔

یہ ایک کڑی شرط تھی۔ اسے سخت جگر سے یوں جدا ہونا کوئی ماں کیسے گوارا کر سکتی ہے مگر بچے کے بہتر مستقبل کے لیے لوہڑا کو اس کرب سے گزرنا تھا۔ اپنی سولہویں سالگرہ سے تین روز قبل اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس کے بعد اپنی ماں کی طرح بڑے اور چوڑے تھے۔

وہ بہت دہلی۔ "آہ تمہاری بد قسمت ماں تمہیں محبت اور وقت دینے کے قابل نہیں۔ مجھے صاف کر دینا۔" بچے کے رخسار پر الوہائی بوسہ دے کر اسے جو لیا کے حوالے کر دیا۔

سایہ قلم لڑکی کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ "اس کے اچھے مستقبل کے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اسے بھول جاؤ۔" وہ چار روز اسپتال میں رقی اور اس دوران میں اس نے چند اہم فیصلے کیے۔ اسپتال سے وہ سیدھی اپنی ماں کے پاس پہنچی۔ یہی نے اسے سنے سے لگا لیا۔

"تم کہاں ملتی تھی تمہیں میری بیٹی؟" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "تمہاری جدائی میں مجھ پر کتنے ہی عذاب گزرے۔"

"اب عذابوں کو بھول جاؤ میری بیٹی ماں۔" اس نے عورت کے آنسو پونچھے۔ "چلو میرے ساتھ۔ اس جہنم میں رہنے کی اب ضرورت نہیں۔"

لوہڑا کو اس بری طرح گھیر لیا تھا کہ وہ اس قلم کے نکال آواز نہیں اٹھا سکی۔ چپ چاپ طرب سکتی رہی، یہاں تک کہ اس کی عمر چھوڑ کر برس ہو گئی۔ اور تب اس کی ہمت جواب دے گئی۔

اس نے روتے ہوئے اپنی دوست جو لیا کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ جو لیا ایک پڑا ہوا لڑکی تھی۔ لوہڑا کی آنے والی زندگی میں وہ اہم کردار ادا کرنے والی تھی۔ جو لیا اسے اپنی دلدلی کے پاس لے گئی۔ یہ وہی عورت تھی، جس نے کئی برس قبل۔۔۔ کچھ روز ماضی لوہڑا کی دیکھ رکھی تھی۔

گوشت خامی پڑھی ہو چکی تھی، مگر اس نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ "تم تو یہی کی لڑکی ہو۔" اس نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "خدا یا۔ کتنی بڑی ہو گئیں۔ اس وقت تو تم بہت دیر کرتی تھیں۔ اب تو نہیں رہیں ہیں؟" عورت کی شفقت کسی مرہم کے مانند تھی۔ لوہڑا نے اسے اپنے کرب سے آگاہ کیا۔ وہ خاموشی سے سنی رہی۔ جب وہ کہہ چکی تو عورت گویا ہوئی۔ "تمہاری زندگی سچ ہے میری بیٹی۔ مگر رونے سے کچھ حاصل نہیں۔ تمہیں فیصلہ کرنا ہے۔ یا تو اس زندگی کو قبول کر لو، یا اسے تبدیل کرنے کے لیے کچھ کرو۔"

"میں یہاں کیا کر سکتی ہوں؟" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کیوں نہیں کر سکتیں۔" اس نے حیرتی سی کہا۔ "تم جوان ہو۔ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا اختیار رکھتی ہو۔ بس تھوڑا ہمت کرنی ہوگی۔ ہائی سب اوپر دلا سنبھال لے گا۔" یہ کہتے ہوئے بڑھیلے آنکھ ماری۔

لوہڑا بات سمجھ گئی۔ ایک صبح اس نے بیگ میں کچھ کپڑے ڈالے اور گھر چھوڑ دیا۔ سیدھی جو لیا کے گھر چلی آئی۔ کچھ روز وہ جوش کے لہر میں رہی۔ پھر ایک ہاسٹل میں منتقل ہو گئی۔

اس کی نئی زندگی شروع ہونے لگی۔

☆☆☆

حالات یکسر تبدیل تو نہیں ہوئے مگر ان میں بہتری ضرور آ گئی۔

لوہڑا کو ایک ہوٹل میں دیرینہ کی ملازمت مل گئی تھی۔ دن بھر وہاں کام کرتی۔ رات میں اپنی اسکول کے امتحانات کی تیاری کرتی۔ اتحاد کی بحالی میں ابھی خاصا وقت

”مگر... میرا گھر۔ میرا شوہر۔“ صورت متذبذب تھی۔

”کون سا گھر؟ کون سا شوہر؟“ اس نے غیری سے کہا۔ ”یہ ایک جہنم ہے۔ تمہارا یہاں کوئی کام نہیں۔“

اس نے اپنی چھٹی ہاتھ کو قاطب کیا۔ ”تم بھی میرے ساتھ چلو۔“

”نہیں۔ میں اپنے گھر کے ساتھ رہوں گی۔“ بچی نے کہا۔

”ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی سمت بڑھی۔ اس اثنا میں نشے میں دھت پڑ گئی گھر میں داخل ہوا۔ کچھ دیر تو کچھ کچھ ہی سا مگر جیسے ہی صورت حال کا جائزہ ہوا وہ کف اڑاتا ہوا اس کی سمت بڑھا۔

لوہجہ اختر تھی۔ اس نے فراتی جین اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ پڑ گئی پکڑا کر گرا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی۔ اور اپنی ماں کا ہاتھ تھامے باہر نکل گئی۔

اس نے ایک دوست کے ہوٹل میں اپنی ماں کے لیے ملازمت کا انتظام کروا دیا۔ ایک اپارٹمنٹ کرایے پر لے دیا۔ کچھ آزادی اور سکون ملا تو بھیگی جفاکشی ٹوٹ آئی۔ وہ ہنسنے مگرانے لگی۔ بوڑھی جیٹ سے بھی ملنے لگی۔

”بڑے عرصے بعد ملاقات ہوئی لڑکی۔“ جیٹ جھکی۔ ”آج تو جشن ہونا چاہیے۔“

ماں کی لستے داری سے سبک دوش ہو کر وہ اپنے اگلے سنے کی جانب متوجہ ہوئی۔ اس نے سامان سمیٹا، ماں کے رخسار پر بوسہ لیا اور شکا گورونہ ہوئی۔

”میں جلد لوٹ آؤں گی۔“ جاتے ہوئے اس نے کہا۔ ”زیادہ سے زیادہ تین ہفتے۔“

وہ غلط تھی۔ لوہجہ اب نے 30 برس بعد ہی لاس اینجلس لوٹی۔

☆☆☆

جب اس نے شکاگو میں قدم رکھا، دوسری جنگ عظیم اپنے اختتام کی سمت بڑھ رہی تھی۔

جیاشہر نئے نئے دولے، نئی زندگی۔ مگر ماضی اپنی آرام سے کہاں بچھا چھوڑتا ہے۔ لوہجہ نے ایک نئے زندگی گزار دی تھی، جس نے اس میں احساس ہے چارگی کا بیج بوی دیا۔ احادی کی تو بچپن سے تھی۔ کم میں گزارہ کرنے کی

ماہنامہ سرگزشت

عادت رائج۔ گولڈ رائڈ نے خواب مدھم پڑ گئے تھے، مگر ختم نہیں ہوئے تھے۔ ماضی میں ہونے والے جسمانی و روحانی تشدد کا طریت کبھی کبھار سرد راتوں میں پھٹکارتا، تو وہ ڈر جاتی۔ اکثر بیٹھ کر اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر کڑھا کرتی۔

شکاگو میں وہ چھوٹی موٹی ملازمتیں کرتی رہی۔ کچھ اچھے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ کچھ ایسے نوجوان بھی ملے جو اس سے محبت کے دلوں سے بھر گئے۔ چھ کے ساتھ معاملہ آگے بھی بڑھا، مگر جلد ہی لوہجہ کو احساس ہو گیا کہ انہیں خط اس کے حسن سے سروکار ہے۔ وہ بھی اس کی طرح نفسیاتی طور پر ٹوٹے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک ڈراؤنا بچپن گزارا ہے اور ان کے موجودہ رویے ان کے ماضی کے عکاس ہیں۔

کتابوں سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، مگر پھر چند صفحات پر پہلا ایک طویل مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا۔

یہ بھڑکی موت سے چند ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ اس روز بارش ہو رہی تھی۔ بارش رکھنے تک لوہجہ کو دھڑکی میں ٹھہرنا پڑا۔ وقت گزرنے کے لیے ایک رسالے کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اس میں ایک معروف مذہبی مبلغ نورمن ونس پینل کا مضمون چھپا تھا۔

تحریر دلچسپ تھی۔ نورمن نے عام پادریوں کی مانند مذہبی مباحث نہیں پھیلے، بلکہ زندگی میں بھڑکی کے لیے مثبت سوچ اپنانے اور خود پر یقین رکھنے کا پیغام دیا تھا۔ مصائب اور بری حادثوں سے نجات کے لیے اس نے دعا کی تکنیک پیش کی۔

اس مضمون نے اس پر گہرے اثرات چھوڑے۔ پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے مصائب شاید اس کے کرب ناک خیالات کا پر تو ہیں۔ اگر اس نے اپنے خیالات نہیں بدلے، احساس غرامت اور خود اذیتی سے جان نہیں چھڑائی تو اس کا اختتام کسی پاکل خانے میں ہوگا۔

لوہجہ کی زندگی میں دھیرے دھیرے سدھار آنے لگے۔ خلی خیالات کے حامل افراد سے اس نے قلمب پیدا کیا۔ رجائیت پسندوں میں اٹھنے بیٹھنے لگی۔ اور ان ہی میں سے ایک شخص نے اسے شائع وار مشورہ دیا۔

وہ ٹیلی آکھوں والا ایک پتہ مرآوی تھا جو بات بات پر چپکا کرتا۔ لوہجہ کو وہ کچھ کراس نے کہا۔ ”لوہجہ تم بلا کی حسین

اگست 2014ء

روز تک خاموش رہنے کے بعد ایک روز بھر... یا سیت لوٹ آئی۔

لن ہی دنوں اس کی ملاقات ایک انگریز بزنس مین اینڈریو ہائے سے ہوئی۔ وہ ایک بااخلاق اور خوش مزاج آدمی تھا۔ اس سے مل کر لوہے نے خود سے کہا اصل تہذیب تو انگریزوں میں ہے، ہم تو بالکل ہی ناچڑ اور گنوار ہیں۔

ملاقاتوں میں جلد ہی مسلسل آگیا۔ 1954 میں اینڈریو نے اسے شادی کی پیشکش کر دی۔ اس نے اتنے اچھے ڈھب پر میرے کی انگوٹھی پیش کی کہ لڑکی ششدر رہ گئی۔

شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں شادی کی تقریب کا انتظام کیا گیا۔ ملک کی نامور سیاسی، سماجی اور فلمی ہستیاں نے اس میں شرکت کی۔ جولیا اور اس کی ماں بھی بھی لاس انجلس سے تقریب میں شرکت کرنے آگئیں۔ جوڑے کو بے شمار تحائف سے نوازا گیا۔

وہ ایک یادگار ایونٹ تھا۔ اگلے کئی روز تک میڈیا میں اس کا چرچا رہا۔ شادی کے بعد دونوں کا سلسلہ چل نکلا۔ نیویارک کی تمام جہلی مانی ہستیاں نے اس نئے نوپے جوڑے کو مبارکبادیں اور مبارکبادیں پیش کیں۔

ان تقریبات میں شرکت ایک حیران کن تجربہ رہا۔ میڈیاں اتنی محبت سے پیش آتے کہ وہ نہال ہو جاتی۔ مگر بھی کبھی دل میں احساس کتری کا ناگ سر اٹھاتا۔ وہ اس طبقے کے آداب نہیں جانتی تھی۔ لن کی طرح دنیا بھر کے موضوعات پر بے لاک تجربہ نہیں کر سکتی تھی۔ سیاست کا علم نہیں رکھتی تھی۔ وہ تو ایک عام کیڑی تھی جس نے سچا بچپن گزارا جو مصائب کی وجہ سے تعلیم مکمل نہیں کر سکی، جسے شدید روحانی اور جسمانی تشدد برداشت کرنا پڑا تھا۔

احساس کتری اسے اواسی میں دھکیل دیتی۔ بھیل میں بھی وہ تنہا ہو جاتی۔ ڈیون اینڈریو کو اس بات کا اوراک تھا، وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا مگر برسوں کے زخم چھ ماہ میں تو مندمل نہیں ہوتے۔

ایک دن... ایک انوکھا بلاوا موصول ہوا۔ انہیں وائٹ ہاؤس میں مدعو کیا گیا تھا۔ ڈنروالے روز ہنگی ہنگی بارش ہو رہی تھی۔ صدر امریکا سے ملاقات یادگار رہی۔ خاتون اول اتنی سادہ مزاج اور شفیق تھیں کہ لوہے کو کسی نوع کی دقت پیش نہیں آئی۔ اس دعوت کے بعد اس نے خود کو بہت ہلکا محسوس کیا۔

”صدر صاحب تو شان دار آدمی ہیں۔“ واپسی میں

”شکریہ۔ میں پہلے بھی یہ سن چکی ہوں۔“ اس نے سر دھری سے جواب دیا۔ یہ سر دھری بلا سبب نہیں تھی۔ لوگ اس کی تعریف کر کے اس کا قرب ہی تو حاصل کرنا چاہتے تھے۔

آدمی لہجہ تھا۔ اس نے برا نہیں منایا۔ ”ممکن ہے کہ تم پہلے بھی یہ سن چکی ہو مگر کسی نے یہ نہیں بتایا ہوگا کہ میں اپنے حسن کو مالنگ کی دنیا میں استعمال کرنا چاہتا ہوں۔“

”مالنگ کی دنیا؟“ وہ چونکی۔

”ہاں پیاری لڑکی۔“ وہ مسکرایا۔ ”یہ بے کار کی ملازمتیں چھوڑو۔ فلاگو سے رخصت سفر ہاؤس۔ نیویارک تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

کیا لوہے نے فلاگو کو چھوڑ دیا۔ اس کا جواب اثبات میں ہے۔

☆☆☆

وہاں روشنی تھی، رنگ تھے، خوشیاں تھیں۔ لوہے کی کمروں کی توجہ کا مرکز تھی۔ اس نے پرکشش لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ چہرے پر روشن مسکراہٹ تھی۔ وہ ہلاکی حسین لگ رہی تھی۔

نیویارک آتے ہی زندگی یکسر بدل گئی۔ پہلے ہی آڈیشن میں اسے منتخب کر لیا گیا۔ اوائل میں تھکا چھوٹے براڈ کے لیے مالنگ کی، مگر جوہریوں نے جلد اس ہیرے کو پہچان لیا۔

کچھ روز بعد وہ کمرے کے سامنے کھڑی لوگوں کو ایک مشہور شہید استعمال کرنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ تیسری بار وہ ایک کاسیک کمپنی کے اشتہار میں نظر آئی۔ پھر تو ایک سلسلہ سا چل نکلا۔ اس نے کئی بڑے براڈز کے لیے مالنگ کی۔ اخبارات میں اس کی تصاویر نظر آنے لگیں۔ مل بورڈز پر اس کی مسکراہٹ جلوے بکھیرنے لگی۔

مالنگ کے عوض اسے ٹھیک ٹھاک پیسے ملے۔ اس نے اپنی ماں اور جولیا کے نام کی تحائف روانہ کیے۔ زندگی اچھی ڈگر پر آگئی تھی مگر اب بھی کسی چیز سے کمی کی تھی۔ کبھی کبھار وہ اداس ہو جاتی۔ سچ یا دیو لوٹ آئیں۔ یادیں دلچسپ کے مانند ہوتی ہیں۔ ایک شخص یاد... دوسرے کریمہ مٹھو کو جنم دیتی ہیں۔ دوسرے مٹھو سے تیسری جی جنم لیتی اور اس پر ڈیویشن طاری ہو جاتا۔

اپنی قوتِ ارادی کے ذریعہ وہ خود کو سنبھال لیتی مگر کئی

وقت ختم کیا۔
اس رات طوفان آیا۔ طوفان کا طوفان۔ ماضی کے زخم
بھر رہے تھے۔ بھیا نک خواب لوٹ آئے۔ آسیب
چکھاڑنے لگے۔

ایڈریو دو ماہ کے لیے یورپ کے دورے پر گیا تھا۔
بس اس کے لوٹنے کی دیر تھی، لویزا ہر سہولت سے محروم
ہو جاتی۔ پُر آسائش زندگی چھن جاتی۔ پتا لوٹ جاتا۔

کیا وہ پھر سے شوہر کی دنیا میں لوٹ سکتی تھی؟ نہیں۔
بچوں کے بچے سے بہت سا پانی بہ چکا تھا۔ اُس کا حسن ماند
پڑ رہا تھا۔

"مجھ سے کہاں لفظی ہوئی؟" اس نے خود سے سوال
کیا۔ "کیا میں ایڈریو کی محبت کا جواب نہیں دے سکتی؟ کیا
میں نے اُس کا خیال نہیں رکھا؟ میری زندگی کب تک
مصائب چھلکتی رہے گی؟"

وہ رو پڑی۔ صدمے سے دل کی دھڑکن رک گئی۔
پت جھڑک رہا ہو چکا تھا۔ درختوں کی شاخیں ویران
ہو چکیں۔ ہر سو اداسی تھی۔ ایسے میں لویزا کی زندگی میں ایک
عجیب واقعہ ہوا۔

اس نے شوہر سے کہا۔
"ہاں لکل، جب ہی تم لوگوں نے انہیں روٹ دیا۔"
ایڈریو نے کہا۔ "ہم انگریز تو بھٹی ملک کے وفادار ہیں۔"
گاری میں ایک تہہ بند ہوا۔

☆☆☆
وقت کو جیسے پرگ گئے۔ موسم بدلے۔ ماہ سال بیتے
رہے۔

زندگی اپنی ڈگر پر آ گئی تھی۔ کچھ برس بعد لویزا نے
ماڈنگ کی دنیا چھوڑ دی۔ اب وہ ایک خوشگوار ازدواجی
زندگی گزار رہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ غم مٹ گئے، مصائب
اُسے بھول گئے ہیں، خوشی داغی ہے۔ مگر وہ غلط تھی۔ ایک
بھیا نک موڑ آنے والا تھا۔

شادی کے چودہ برس بعد، جب وہ یقین کر بیٹھی تھی کہ
ہر شے درست سمت پر جا رہی ہے، اس کے شوہر نے ایک
کرب ناک انکشاف کیا۔ "میں کسی اور سے محبت کرتا
ہوں۔"

وہ بھونچکا رہ گئی۔ ان گنگ ہو گئی۔
"مجھے نہیں چھوڑنا پڑے گا۔ آئی ایم سوری۔" یہ کہہ
کر وہ چلا گیا۔ اور لویزا کو لگا کہ خوشی چلی گئی۔ مسرت کھو گئی۔

طاہر جاوید محل

کے وہ ان تیز سحر آفریں قلم کا پاشا ہیں

ستاروں پر کمند

چاہتوں کو درد و بام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں
کہ انہو نیاں بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہیں..... روزنوں کو
کریدنے والے اپنے حوصلے سے انہیں وہانہ بنا دیتے ہیں
حسن و عشق اور رقابت و رفاقت کی چاشنی لیے ایک دل ربا داستان

سلسلہ ڈائجسٹ
ماہنامہ

کے صفحات بہار جولائی 2014 سے ملاحظہ فرمائیں



نہ پادک ٹی کی 148 شرع سے گزرتے ہوئے اس کی نظر قدیم طرز کی ایک عمارت پر پڑی۔ وہاں سے پر Church of Religious Science لکھا تھا۔ لوہا لڑائی عورت نہیں تھی مگر اس وقت وہ اس قدر مطمئن تھی کہ کسی سہارے کی تلاش اسے عمارت کے اندر لے گئی۔ وہاں حیرت اس کی منتظر تھی۔

وہ کوئی گرجا نہیں تھا۔ لڑہی پیغامات کی بجائے وہاں سائنسی اصول زیر بحث تھے۔ فکری حیرانے میں بات ہو رہی تھی۔ پادک کی جگہ دوستانہ حراج کے حامل اساتذہ تھے۔ ہر شخص کے چہرے پر شادابی تھی۔ ہر کوئی مسرور تھا۔ لوہا کے اندرون نے کہا۔ ”ذرا توجہ دو۔ یہاں کچھ الوکھار دیکھا ہونے کو ہے۔“

اور پھر ایسا ہوا۔ ایک پیغام اس کے کانوں سے گرایا۔ ”نظا اپنے خیالات تبدیل کر کے انسان اپنی زندگی بدل سکتا ہے۔“

”کیا ممکن ہے؟“ وہ چونکی۔ ایک گہرا سانس لیا۔ توجہ سلا پر مرکوز کی جو کسی کالج کا پروفیسر مطمئن ہوتا تھا۔

”ہمارے نظریات اشیاء کے مانند ٹھوس ہوتے ہیں، وہ نہ صرف ہمارے جسم بلکہ ہمارے ماحول، ہمارے ارد گرد بسنے والوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔“

یہ الفاظ سن کر وہ شپٹا گئی۔ ٹھکی باران خیالات سے اس کا واسطہ چڑھا۔ ذہن میں نور مین ونسٹ شپٹل کا مضمون گھوم رہا تھا۔

پھر کے اہتمام پر وہ خود کو بیٹا بہتر محسوس کر رہی تھی۔

وہاں موجود لوگوں سے بات کر کے اسے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ New Thought تحریک کے پیروکار تھے۔ 19 ویں صدی میں شروع ہونے والی اس تحریک میں مذہب کے

روحانی عناصر کو نفسیاتی، سائنسی اور فلسفیانہ اصولوں میں گوندھ کر پیش کیا گیا تھا۔ معروف فلسفی فیلکس کیم نے اس تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی۔ ولیم جیمز اور ایمرسن کی تحقیقات نے اسے آگے بڑھایا تھا۔

تحریک کا بنیادی فلسفہ کچھ یوں تھا: ”لاتناہی آفاقی قوت کائنات میں ہر جگہ موجود ہے۔ روح حقیقی اشیاء کے مانند ہے۔ خیالات روح سے جنم لیتے ہیں، جو ہماری دنیا میں واقعات کی صورت میں شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مثبت اور نیک خیالات نہ صرف جسمانی اور نفسیاتی امراض کا علاج کر سکتے ہیں، بلکہ ہماری دنیا کو بہت سے بھر سکتے ہیں۔“

یہ تحریک بچھلکی گئی۔ لاکھوں لوگ اس سے وابستہ ہو گئے۔ مختلف ممالک میں اس کے چرچ کھلنے لگے۔ اور بہت جلد ہی اس شام لوہا ایسے ہی ایک چرچ میں موجود تھی جس کے پیروکار فلورنس سکول بورڈ ایسٹ ہوکر کے انکار سے استفادہ کر رہے تھے۔ فلورنس کا نظریہ تھا کہ پختہ خیالات انسانوں کی زندگی میں حقیقی واقعات کو جنم دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف Religious Science نامی حکیم فگر کی داغ بیل ڈالنے والے اریسٹ کو یقین تھا کہ پاکیزہ خیالات امراض کا علاج کر سکتے ہیں مدغم بھر سکتے ہیں۔

لوہا کے لیے یہ نظریات جتنے انوکھے تھے، اتنے ہی دلچسپ۔ وہ باقاعدگی سے ان اجتماعات میں شرکت کرنے لگی۔ وہ ابھی شاکر د ثابت ہوئی۔ ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ نین نلتے بعد اس کی حالت خاصی سنبھل چکی تھی۔

جلدی وہ یہ سمجھ گئی کہ اس کے مصائب کا ذمہ دار کوئی اور نہیں، وہ خود ہے۔ وہ اپنی تلخ تجربات سے دامن چھڑانے کی بجائے انہیں جیت جیت کر دھکی رہی۔ ان کی پیدوش کرتی رہی۔ ساڑ گار ماحول میں ان انخوس یادوں نے اٹھنے دیے، جس سے مزید مصائب نے جنم لیا۔

وہ عمارت اس کا لیا گھر بن گیا۔ زیادہ وقت وہیں گزرتا۔ جب اینڈریو نے یورپ سے لوٹ کر اسے طلاق دی، وہ ذرا نہیں روئی، بلکہ کھڑی مسکراتی رہی۔ جب اپنے سابق شوہر کو مطمئن پایا، تو آگے بڑھ کر اس کا کامدھا چھپتایا۔

”میں تمہاری شکر گزار ہوں اینڈریو۔ تمہارے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ آج ہم جدا ہو رہے ہیں تو میں تمہیں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔“

اینڈریو حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ لوہا بالکل نئی تھی۔ آج سے قبل تو وہ اتحاد سے محروم ایک گھبرائی ہوئی عورت ہوا کرتی تھی۔

لوہا نے بات جاری رکھی۔ ”تم ایک نئی زندگی شروع کرنے والے ہو، اس میں ماضی کی پرچائیں نہیں ہونی چاہیے۔ اسے محبت سے بھرتا۔ غموں سے دور رہنا۔ آج سے ہم اچھے دوست ہیں اینڈریو۔ اچھا الوداع۔“ یہ کہہ کر وہ اس پر آرائش گل سے لکل گئی۔ قہر دور اینڈریو اسے جاتے ہوئے دیکھا رہا۔ لوہا اپنے کی نئی زندگی کا آغاز ہونے کو تھا۔

☆☆☆

وہ ایک چھوٹا سا کراٹھ۔ عام سا بستر۔ سادہ سی میز۔
الہامی میں چند ہی کپڑے مگر لوہیزا خوش تھی۔ شاہانہ زندگی
چھوڑنے کا ذرا براہمہ دکھ نہیں تھا۔

وہ تحریک کی سرگرم کارکن بن چکی تھی۔ اس نے دیگر
طالب علموں سے بھرکار کردگی کا مظاہرہ کیا۔ فقط تین سال
بعد اس نے ان سے انکار کی سیٹھ بننے کے لیے اپلائی کر دیا۔
اس کا ہا کاہرہ نمیش ہوا۔ اعزہ یوز ہوئے، جن میں وہ سرخرو
نظیری سب وہ چرچ کی کوشش تھی۔

یہ ایک نیا سفر تھا۔ ایک نیا آغاز۔ وہ حریت تعلیم حاصل
کرنا چاہتی تھی، سو ریاست آئینہ کی ایک یونینڈش کا حصہ
بن گئی۔ وسائل محدود تھے، جن کے پیش نظر اس نے اپنی
ضروریات کو سیکڑ لیا۔ جو کچھ میسر تھا، اس پر قناعت کرنا سکھ
لیا۔ جتنا کڑھنا ترک کر دیا۔

یونینڈش کا تجربہ یادگار رہا۔ ہاں ہر سو پے سکون
خاموشی تھی۔ مرا تھے اور غور و فکر کے لیے بہت وقت میسر تھا۔
شراب نوشی، دھولوں اور رقص کی محافل بھی خرافات سے
جان بھوٹ گئی۔

وہ روحانی اللہ سے پڑھتی تھی۔ کیمیا، طبیعیات اور
جیاتیات جیسے مضامین انوکھے انکشافات کر رہے
تھے۔ روحانی تجربات کے وسیلے قانون کشش اس پر نئے
نئے معنی آشکار کر رہا تھا۔

آئینہ میں حاصل ہونے والا روحانی تجربہ یارک
لوٹنے کے بعد بھی قائم رہا۔ ٹریک کا بے پناہ شور، بھانت
بھانت کی بولیاں اور ساتھی کہاں گئی اس سکون کو توڑ نہیں
سکیں۔

وہ ماضی والی لوہیزا نہیں تھی، جو لوگوں کے سامنے
بات کرتے ہوئے گھبرا جاتی۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی
تھی۔ اس نے کونسلنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دیگر افراد کے
برعکس وہ بولنے سے زیادہ سننے پر یقین رکھتی تھی۔ مریض اس
کے سامنے خود کو آرام دہ محسوس کرتے۔ اس کے مشورے ان
پر مثبت اثرات مرتب کرتے۔

اب اس نے عوامی اجتماعات میں بھگرو پنے شروع
کیے۔ اس کا شیریں انداز، سلجھا ہوا جان لوگوں کو بہت بھلا
لگا۔

کچھ عرصے بعد اس پر ایک عجیب انکشاف ہوا۔
وہ کرکس کی شام تھا۔ لوہیزا اکثر کی میں کھڑی تھی۔

باہر برف گر رہی تھی۔ اجاگ ایک بھماکا ہوا۔ ایک خیال
ذہن میں کودا۔ وہ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ لائبریری کے سفید ورق
پر سیاہ الفاظ ابھرنے لگے۔ اس نے لکھا:

”کئی افراد کا سیلاب طبعی علاج کے باوجود یاسیت کا
فکار رہتے ہیں۔ محنت سیلاب ہونے کے باوجود پیادوں جیسے
حالات بنائے رکھتے ہیں۔ نتیجتاً طبعی علاج بے اثر ثابت
ہوتا۔ کبھی کبھار تو مرض لوٹ آتا ہے اور ان کی زندگی جہنم بن
جاتی ہے۔“

لوہیزا کو پہلی بار اس کا بات کا احساس ایک ایسی
محنت سے مل کر ہوا تھا جو چہرے کی پلاسٹک سرجری سے
گزری تھی۔

بچپن میں ہونے والے خوفناک حادثے میں لمبری
اپنے حسین چہرے سے محروم ہو گئی تھی۔ برسوں وہ احساس
کستری کا فکھ رہی۔ وہ تنہا اور اداس رہتی تھی۔ پھر وہ
پلاسٹک سرجری سے گزری۔ اس کا چہرہ اسے واپس مل گیا مگر
حیرت انگیز طور پر یاسیت کے آسیب سے جان نہیں بھولی۔
احساس کستری کا مرض اب بھی ساتھ تھا۔

اس محنت سے ہونے والی طویل گفتگو کے بعد ہی
لوہیزا کو اندازہ ہوا کہ اگر چہاری کا نفسیاتی اور روحانی علاج
نہ کیا جائے تو طبعی علاج دیر پا ثابت نہیں ہوتا۔ پھر اس کا
سامنا ایک لوجان سے ہوا، جو کینسر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا
آپریشن ہوا، تاہم سہل دیا گیا مگر وہ ہنوز خود کو پیاد محسوس
کرنا لگی اور بھی مٹا نہیں گئی۔

بہت غور و فکر کے بعد لوہیزا نے اس نفسیاتی کیفیت کو
(انگریزی میں برتے جانے والے لفظ Disease کے
ڈزن پر) ”Dis-ease“ کا نام دیا۔ یعنی ایسی کیفیت جس
میں انسان خود کو بے آرام محسوس کرتا ہے۔

دیر سے دیر سے اس کے مشورے کی تصدیق
ہونے لگی۔ مریضوں کے ذہنی علاج پر توجہ مرکوز کی۔ انہیں
احساس کستری اور احساس عداوت سے نجات حاصل کرنے
اور خود سے محبت کرنے کا پیغام دیا۔ ان ہی مریضوں کے
علاج کے دوران میں ہی پر آئینہ بنی کی اہمیت آشکار ہوئی۔
ثبت الفاظ مسلسل دہرانے کے عمل کے باوجودی اثرات کا
اندازہ ہوا۔

لگ بھگ دو برس وہ مریضوں پر اپنی تکنیک استعمال
کرتی رہی۔ نتائج حیران کن رہے۔ اس کا چہرہ ہونے لگا۔
لوگ شفا کی تلاش میں اس کے پاس آنے لگے۔

احتمال برداشت کیا، کسپری میں زندگی گزار رہی۔ اور آج وہ ایک نئی شکل کے دروہی جو ماضی کی ہر مشکل سے بڑی تھی۔

کینسر کا سوزی مرض سامنے تھا۔ تھیں سے چا چلا کہ مرض خاصہ بگڑ گیا ہے۔

طالع بہت ہنگامہ تھا اور کامیابی کا امکان خاص کم۔ اسے زندگی کا چراغ بجھتا ہوا محسوس ہوا۔

ریپورٹس میز پر بکھری پڑی تھیں۔ وہ اپنے دفتر میں سر تھامے بیٹھی تھی۔

اچانک فون بجا۔ اس نے بے دلی سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف اس کی ایک کلامت تھی۔

"لوہ بیاری لوہا۔ میں جیسا بول رہی ہوں۔" لوہا کو یاد آیا کہ جیسا اس کے پاس جھڑوں کے درد کی شکایت لے کر آئی تھی۔

"میں نے شکر ادا کرنے کے لیے فون کیا ہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "تمہاری کتاب نے میری زندگی بدل دی۔"

اب میں کچھ کہتی ہوں کہ میری بیماری کا سبب میرے ماضی کے عجیب گمراہات اور خفی خیالات تھے۔ وہ تو شکر ہے کہ تم سے ملاقات ہوئی۔ اندازہ ہوا کہ میری بیماری، بیماری سے زیادہ

بے آرمی ہے۔ وہ تم کیا کہتی ہو اسے۔۔۔ ہاں یاد آیا۔ "Disease"۔ کیا خوب نام دیا۔

خیر، تو میں اب بالکل صحت یاب ہوں۔ نہ صرف چل، بلکہ دوڑ سکتی ہوں۔ شکر یہ لوہا۔"

"تمہارا شکر جیسا۔" ریسیور رک کر اس نے ایک نظر میز پر پڑی میڈیکل رپورٹس کو دیکھا۔ کھڑکی سے آنے والی کرنیں چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

دیر سے مسکرائی۔ خود کو مخاطب کیا۔ "جن نظریات پر تم یقین رکھتی ہو، جن کا پرچار کرتی ہو، انہیں ثابت کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ تمہیں اس مرض میں جلا

تو ہونا ہی تھا۔ تم برسوں ماضی کا یہ جھڑوئی رہیں۔ ٹھیک ہے، تلخ یادیں ناسور بن گئی۔ تو اب ان کا مقابلہ کرو۔ چلو، کام پر لگ جاؤ۔"

طالع کے پیچھے تو اس کے پاس تھے نہیں۔ پھر آپریشن کی کامیابی کا امکان بھی کم تھا، تاہم اس کے پاس مثبت سوچ تھی، جو ماضی سے لال کر نئے امکانات کی سمت لے آئی۔

اس نے ریسرچ شروع کی، تو اندازہ ہوا کہ کینسر کے علاج کے کئی فیورس یا غیر سائنسی طریقے بھی رائج ہیں۔ کچھ

ان ہی دلوں بے چہرگی کے مرض سے نجات حاصل کرنے والے ٹھہری نے اسے ایک مشورہ دیا۔

"لوہا، تمہارے الفاظ میں شفا ہے۔ خدا نے تمہیں ایک عظیم نعمت سے نوازا ہے مگر یہ محدود ہے۔ ہر کوئی تم تک پہنچ نہیں پاتا، اسے عام کرنا چاہیے۔ کیوں ناں تم ایک

کتاب لکھو۔"

"کتاب۔" وہ زہر لب بڑبڑائی۔ اور ایک منصوبہ بنو پانے لگا۔

اگلے عین ہفتے اس نے اپنے مریضوں کی کیمسٹری کے تفصیلی جائزے میں مرل کیے۔ اندازہ لگایا کہ کچھ خاص نوع کی پریشانیوں، کچھ خاص قسم کے امراض کو ختم دیتی

ہیں۔ احساسِ رائگاں سے مردود ختم لیتا ہے، انتقامی جذبات سے امراضِ قلب۔ طے سے چٹائی متاثر ہوتی ہے اور نفرت سے یادداشت۔

"جب ایک مخصوص خفی خیال ایک خاص قسم کے مرض کو ختم دینے کی قوت رکھتا ہے، تو اس بات کا بھی امکان ہے کہ ایک مخصوص مثبت خیال ایک خاص مرض کا علاج کر سکے۔"

اس نے امراض کی لہرست مرتب کی اور ان الفاظ کا تعین کیا۔ جنہیں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دہرائی سو رہا

ہے۔ ہوں اس کی پہلی کتاب "Heal your Body" مکمل ہوئی۔ یہ کتاب 1976 میں شائع ہوئی۔

اس کاوش کو بہت پسند کیا گیا۔ غارتوں کے ساتھ ساتھ ماہرین نے بھی بہت تعریف کی۔ اب اسے چند نئے شکایات کی کہ بہت مختصر ہے۔ مثبت الفاظ کا استعمال سودمند

ہے مگر کچھ اور ٹھیکوں کا بھی ذکر ہونا چاہیے تھا۔ کیوں ناں اگلے ایڈیشن میں کچھ اضافے کیے جائیں۔

خیال اس کے دل کو لگا۔ اس نے بیماری بھی شروع کر دی مگر پھر۔۔۔ ایک سانحہ ہوا۔ ایک امتحان اس کے سامنے آن

کھڑا ہوا۔ ایک مفہم نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس مفہم کا نام تھا کینسر

☆ ☆ ☆

اداسی کا موسم تھا۔ شام زرد پڑ گئی۔ بڑوں کے بچے جھلپکے تھے۔

وہ ایک طلاق یافتہ عورت تھی، جس کی کم عمری میں آمدور پڑی تھی، جس کی مدد پر نظم لگے اور جسمانی

سے شراب اور اپنے بستر پر پڑی تھی۔ اس نے ایک خوف ناک
پہنا دیکھا تھا۔

اس نے تباہی جلائی۔ ٹھنڈا پانی یا مگر حالت میں
سدا حد نہیں آیا۔ دھڑکن چیز تھی۔ جسم کے ہر مسام سے پھینا
بہہ رہا تھا۔

اچانک چرچ کی تھقی تھی۔ آنکھوں کے سامنا ایک
تھما کا ہوا۔ کتاب مقدس کے الفاظ کانوں میں گونجنے۔
"جب تم اپنے دشمن کو معاف کر دو گے، تو خدا بھی تمہیں
معاف کر دے گا۔"

اس نے گہرا سانس لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ کون سے
اصول بھول چکی تھی۔

"اگر تم اپنے دشمن کو معاف نہیں کر دے گے۔" اس نے
کتاب مقدس کے الفاظ دہرائے۔ "تو خدا بھی تمہیں معاف
نہیں کرے گا۔"

اس نے سر جھٹکا۔ "مجھے نہیں معاف کرنا ہوگا۔ اس
لئے نہیں کہ میں اس مرض سے نجات چاہتی ہوں، بلکہ اس
لئے کہ اب میں جانتی ہوں کہ دونوں بیمار تھے۔ لوگوں کی
طرح نچا پاؤں نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ انہیں وحشی بنا
دیا تھا۔ حیوان کے قالب میں داخل دیا تھا۔ ان کے دلوں کو
پتھر کر دیا تھا۔ ورنہ وہ بھی انسان تھے۔"

وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ آسمان پر ستارے دک
رہے تھے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ وہ بھی مسکرا دی۔

کینسر کی تشخیص کے چھ ماہ بعد اس کا دوبارہ ٹیسٹ
ہوا۔ ڈاکٹر متحج و کچھ کر حیران رہ گئے، مگر لوہے کو فکس حیرت
نہیں ہوئی۔ وہ مسکراتی رہی۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے؟" ڈاکٹر ہلکا یا۔
"یہ ممکن ہے۔" اس نے کاغذ سے اچکائے۔ "وہی

انتکار سے پیدا ہوئے امراض کا ثبت خیالات سے علاج
کیا جاسکتا ہے۔"

ڈاکٹر کھڑا ہلکیں جھپٹا رہا۔ لوہے نے ہات جاری
رکھی۔ "حادثات میں سبکی پوشیدہ ہوتا ہے ڈاکٹر۔ اس سائے
نے بھی مجھے ایک سبق دیا ہے، ہمیں زندگی کو زیادہ سے زیادہ
اہمیت دینی چاہیے۔"

وہ کھینک سے نکل کر سیدھی اپنے اپارٹمنٹ پہنچی۔
بیک تیار کیا۔ اپنے کلائش کے نام ایک مسٹر کہ پتہ نام تیار کیا:
"دوستو، میں کیلیفورنیا جا رہی ہوں۔ بے فکر رہیں۔
میں آپ سے رابطہ میں رہوں گی۔ آپ کسی بھی وقت مجھے

ماہرین مخصوص قسم کی غذا کا استعمال مفید خیال کرتے ہیں۔
کچھ دواؤں سے علاج کی حمایت کرتے ہیں۔ کچھ چینی طرحیہ
علاج کو معادن خیال کرتے ہیں۔

لوہے نے ہر طریقے سے مدد لی۔ تم زدہ رہے، اپنی
قسمت پر رونے دھونے کی بجائے خود سے ٹوٹ کر محبت
کی۔ ہر وقت کے لیے قدرت کا شکر یہ ادا کیا۔ ساتھ ادویہ
بھی لیتی رہی۔

وہابی طور پر وہ خاصا اتفاق محسوس کر رہی تھی مگر جب
اگلے میڈیکل ٹیسٹ کی رپورٹ آئی، تو اندازہ ہوا کہ اس کی
حالت میں کوئی خاص بہتری نہیں آئی۔ تاہم اسے کھارہا
تھا۔

یہ خبر ایک دھچکا ثابت ہوئی۔ ذہن حشر ہو گیا۔
"کیا جن نظریات پر میں یقین رکھتی ہوں، وہ بے
مستی ہیں، جھوٹ ہیں؟" دل میں ایک اندیشے نے جنم لیا۔
"کوئی بات میں بھول رہی ہوں۔ کوئی بنیادی کلیہ، کوئی اہم
اصول مجھ سے نظر انداز ہو گیا۔"

کیا لوہے اور اسی کچھ بھول گئی تھی۔

وہ تاریک اور سرد رات تھی۔ ستارے رینگ رہا تھا۔
قبرستان پر کھرا چھایا تھا۔

اچانک کمرے کے درمیان ایک چمک زدہ طریت
ظاہر ہوا۔ وہ جیک تھا۔ وہی شخص جس نے بچپن میں لوہے کو
نشانہ بنایا تھا۔

وہ اس کی سمت بڑھا۔ خوف زدہ لوہے اچانک سمت
میں دوڑ پڑی۔ اس کا پاؤں ایک قبر سے ٹکرایا۔ وہ زمین پر
آ رہی۔ جب اٹھنے لگی، تو ایک پتلا لگا۔ کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ
لیا تھا۔ وہ مڑی۔

قبر سے نکلا ہوا ایک کمرہ ہاتھ سامنے تھا۔ اچانک قبر
شق ہوئی۔ ایک ہیٹ ناک شخص اس سے باہر آیا۔
یہ پوڈنگ تھا۔ اس کا سوتلا باپ۔

اس کے سینے پیچھے جیک کھڑا تھا۔ دونوں کے چہروں
پر کمرہ مسکراہٹ تھی۔ وہ تیزی سے چلی۔ کچھ دیر دوڑتی
رہی۔ پھر ہانپنے لگی۔ ناگوں سے جیسے جان نکل گئی تھی۔ وہ
ایک درخت سے ٹک گیا کہ کھڑی ہوئی۔ اچانک کمرہ ہنس
سنائی دی۔ اس نے اوپر دیکھا۔ جیک شاخوں پر بھول رہا
تھا۔ اس نے ہنس نکائی۔

لوہے اندر سے چلائی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پہنے

فون کر سکتے ہیں۔ مجھے علم ہے کہ میرا یوں اچانک جانا آپ کو ناگوار گزرے گا مگر میں معذرت چاہتی ہوں۔ مجھے جانا ہو گا، آبائی وطن مجھے بلاتا ہے۔"

ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے اسے قلم لکھیں تھا کہ یہ سڑا سے دنیا کی مقبول ترین مصنفہ بنانے والا ہے۔

☆☆☆

اس انجلس سرد تھا۔ بریلی ہوا میں جل رہی تھی۔ دیرِ حرارت نقطہ انجماد سے گر گیا۔

یہ اس کا آبائی وطن تھا مگر وہ یہاں نقطہ بین انفر لڈ کو جانتی تھی۔ ایک اس کی ماں، دوسری بہن اور تیسری چھوٹی۔

اس کی ماں اپنی چھوٹی بیٹی کے ساتھ مضامینات میں مقیم تھی۔ اس چھوٹے سے مکان میں اجنبیت چھائی تھی۔

بہن سردھری سے ملی اور ماں... وہ تو اسے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ یوزمی بھی تیزی سے اپنی بیٹائی کھور ہی تھی۔ وہ انتہائی خستہ حال تھی۔

وہ اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ دونوں گھٹنوں ہاتھیں کرتی رہیں۔ ماضی کی حسیں یادیں کھنگلیں۔ بری یادوں سے اعتبار برتا۔ لوہے والے اسے یقین دلایا کہ اب وہ آگلی ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔

بھر وہ جویلا سے ملنے گئی، جو وسطی علاقے کے ایک اپارٹمنٹ میں اپنے خاندان کے ساتھ مقیم تھی۔ وہ اسے دیکھ کر پھولی نہ سالی۔ دونوں سہیلیں کئی چہرہ ہاتھیں کرتی رہیں۔ جب جانے کے لیے اٹھی، سیاہ فام عورت نے کہا۔

"کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ایک کمرہ خالی چڑا ہے۔ تمہارا بستر وہاں لگ جائے گا۔"

"تم کیوں زحمت کرو گی۔ میں کرایے پر اپارٹمنٹ لے لوں گی۔" اس نے تھوڑی مزاحمت کی۔

"جو کرایہ مالک مکان کو دو گی، وہ مجھے دے دیتا۔" عورت کے لہجے میں شوخی تھی۔ "اور ہر شام دکان میں چھاڑ دے دیتا۔"

وہ اپنی دوست کے گلے لگ گئی۔ واقعی اچھے دوست بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں۔

لوہے کے پاس اپنی کتاب کی چند کاپیاں تھیں اور ایک واضح منصوبہ تھا۔ اس نے ہم خیال لوگوں کی کھوج شروع کی۔ وہ ان کے سینما راز اور روک شاہیں میں شرکت کرنے لگی۔ وہ لوگوں سے جادو خیال کرتی۔ اپنے نظریات اور حیران کن تجربات سے انہیں آگاہ کرتی۔ اپنی کتاب پیش

کرتی۔

اس عرصے میں وہ خوب گویا بھری۔ روزی ساحل کی سمت جاتی۔ لہروں کو کنارے سے گمراہ کرتے، پردوں کو پرواز کرتے دیکھتی۔ اس نے مرکزی علاقے میں ایک چھوٹا سا دفتر لے لیا تھا۔ دیرے دیرے لوگ مشوروں کے لیے اس کے پاس آنے لگے۔ نوبل پارک میں جہاں سے پریکٹس کا سلسلہ منتقل ہوا تھا وہیں سے دوبارہ شروع ہو گیا۔

وہ حقیقی تجربات سے لیس تھی۔ روحانی احساس الفاظ میں موجزن تھے۔ اس کے افکار کی رسائی بڑھنے لگی۔ اسے سینما راز میں بہ طور اسپیکر مدعو کیا جانے لگا۔

اسی طرح دو برس گزر گئے۔ پھر اسے ایک غیر حتمی فون کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف اس کی بہن تھی اور اس کے پاس ایک مذہبی ناک خیر تھی۔

"مماسٹریوں سے گر گئی ہیں۔ ان کی کمر کی ہڈی ٹوٹ... وہ سسکیاں لے رہی تھی۔" وہ شدید تکلیف میں ہیں۔ مجھے کچھ نہیں پتا کہ میں کیا کروں۔"

"تم خود کو سنبھالو میری بہن۔" اس نے دیرے سے کہا۔ "میں آ رہی ہوں۔"

اپنی ماں سے ملنے سے قبل لوہے نے اپنی چھوٹی بہن کو گلے لگایا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ خود بھی خاصی بیمار تھی مگر اپنی پریشانوں کا کسی سے تذکرہ نہیں کرتی تھی۔

لوہے نے اسے حوصلہ دیا۔ پھر وہ اپنی ماں سے ملی۔ اس نے یوزمی عورت کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔" اس نے دیرے سے کہا۔ "کیا تم کچھ کہہ رہی ہو؟" عورت کے لہجے میں بے چینی تھی۔

"ہاں، میں کچھ کہہ رہی ہوں۔" اس کی کوششیں کارگر رہیں۔ اُمید سے لبریز الفاظ، سادہ سی محکموں نے یوزمی عورت پر چادری اثر کیا۔ وہ تیزی سے صحت یاب ہونے لگی۔ ایک ماہ بعد اسے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ وہ اسے اپنے اپارٹمنٹ لے آئی۔

کسی بیمار کی حوصلہ داری ایک بیماریا لے دیتی ہے۔ لوہے کے پاس اتحاد اور یقین کی قوت تھی، مگر معاشی طور پر ابھی وہ مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ پھر اسے اپنے کام کے سلسلے میں اکڑ کر سے باہر ہٹا دیا تھا۔ ایسے میں ماں کی دیکھ دیکھ کون کرتا۔

لوہیزا ہائے کی تعلیمات

”خود سے محبت کریں۔“ یہی دنیا کی مقبول ترین معنی کا بنیادی پیغام ہے۔ یہ پیغام کو تم بدھ کی تعلیمات کے بے حد قریب ہے، جن میں خدا ان کے لیے اپنی ذات سے محبت کو لازم ضروری کیا ہے۔

وہ آئینہ عینی کی مشق کا مشورہ دیتی ہے، تاکہ ہم خود کا سامنا کریں۔ اپنی ذات سے فائدہ حاصل کرنے کی بجائے خود کو قبول کرنا سیکھیں۔

وہ عداوت اور احساس گناہ سے نجات حاصل کرنے پر زور دیتی ہے۔ خوف، طمع اور انتقامی جذبات کو مکمل طور پر رد کرتی ہے۔ کیوں کہ اسے یقین ہے کہ ان عوامل سے نہ صرف روحانی اور نفسیاتی مسائل پیدا ہوتے ہیں، بلکہ ان سے جسمانی امراض بھی جنم لیتے ہیں۔

وہ مثبت خیالات پر یقین رکھتی ہے۔ انہیں دھما فوٹا دہرانے کی نصیحت کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کامل انسان بننے کے لیے نہ صرف ہمیں اپنے دشمن کو معاف کرنا پڑے گا، بلکہ اپنی خود خطائیں بھی معاف کرنی ہوں گی۔ یعنی انہیں بھولنا ہوگا۔

اس کے نزدیک بیماری یعنی Disease وہ حقیقت ہے آرمی کی ہی شکل ہے۔ ہم بے آرمی کے اسباب (حفظ کران کا تذکرہ کر سکتے ہیں۔ اسے یقین ہے کہ جن باتوں پر ہم اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں، ان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس لیے ہمیں مثبت عوامل پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ وہ برتر قوت پر یقین رکھتی ہے مگر معائب کے نجات کے لیے عملی کوششوں کو اہمیت دیتی ہے۔

خواتین کا اس مسئلے کا تصور ملتا تھا۔

تمام ناشروں نے عظمت کر لی۔ ایک نے حضور دیا کہ وہ کتاب سے سادگی نکال دے، سنسنی خیزی کا تذکرہ لگائے۔ غلامی کہاں بیان کرے۔

کیا لوہیزا ایس ہوگی؟ قطعی نہیں۔ کینسر کو شکست دینے کے بعد اب وہ ہر مشکل کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ قدرت کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکالے گی۔

اگست 2014ء

ہر ماہی کا امکان ہی نہیں تھا۔ اس نے سر جھکا کر دیا کی۔

قدرت نے ساتھ دیا۔ دو دن بعد اسے سان فرانسسکو میں ہونے والی ایک بڑی ورک شاپ میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ یہ ایک بڑا موقع تھا، جسے وہ ضائع نہیں کر سکتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں ماں کا کون خیال رکھے گا؟

تیک دل جو لہانے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ ”تم بے فکر ہو کر جاؤ، میں یہاں موجود ہوں۔“

یہ سن دین ویں الفاظ تھے جو اس کی دماغی جوش نے برسوں پہلے لوہیزا کی ماں سے کہے تھے۔

سان فرانسسکو میں اس کی بہت پرانی ہوئی۔ ایک نئی کتاب کا خاکہ ذہن میں بننے لگا۔

لوہیزا نے وہ کلمے لے کر بیٹھ گئی۔ اس نے سلیڈ کاغذ پر پہلی سطر لکھی۔

”زندگی بہت سادہ ہے جو ہم کائنات کو دیتے ہیں۔ کائنات ہمیں دہی لوٹا دیتی ہے۔“

یہ اس کتاب کی پہلی سطر تھی... جو لوہیزا ہائے کو امر کرنے والی تھی۔

☆☆☆

کتاب کی تکمیل میں ایک برس لگا۔

وہ کرائے کا اپارٹمنٹ چھوڑ کر اپنی ماں کے ساتھ جولیا کے گھر منتقل ہو گئی۔ دفتر میں بیٹھنے کا دورانیہ مختصر کر دیا۔ اپنی کئی توجہ اور صلاحیت کلم کو سونپ دی۔ اس دوران میں کئی رکاوٹیں آئی۔ ایک بار اس کی ماں شدید طبل چڑ گئی، اسے اسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ معاشی مسائل بھی تھے۔ پھر لوہیزا خود بھی ایک ٹریک حادثے کا شکار ہو گئی۔ الطرض کتاب لکھتے ہوئے وہ طرح طرح کے مسائل سے گزری مگر اس نے کسی بھی مرحلے پر لکھنا ترک نہیں کیا۔

کوئی کالوں میں سرگوشیاں کرتا رہا۔ ”یہ کتاب ہر صورت مکمل ہونی چاہیے۔ دنیا کو اس کی ضرورت ہے۔“

1984 میں لوہیزا ہائے کی دوسری کتاب You Can Heal Your Life کا مسودہ مکمل ہو گیا۔ جو سادہ مگر بڑا تکنیکیوں پر مشتمل ایک عملی پروگرام تھا۔

کتاب تو لکھ لی، مگر اسے شائع کروانا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ آج کے برس اس وقت سلیڈ ہلپ کتابیں اتنی مقبول نہیں تھیں۔ پھر اس شعبے پر مرد چھائے ہوئے تھے۔

ماہنامہ سرگزشت

کئی فلمز ہاں پائی جاتی تھیں۔ مریض کا سہمی ہائیٹ کر دیا جاتا اور یوں وہ اپنی طبی موت سے کل نفسی طور پر مر جاتا۔

جیس کا خیال تھا کہ لوہڑا اپنے پڑا اثر پیغام کے درپے نہ صرف ایڈز کے مریضوں میں جینے کی امنگ پیدا کر سکتی ہے بلکہ معاشرے میں اس حوالے سے سماجی شعور بھی بیدار کر سکتی ہے۔

غیر خواہوں کا مشورہ تھا کہ لوہڑا کو اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ایڈز کے مریضوں سے وابستگی اس کی شہرت کو نقصان پہنچا سکتی ہے مگر اس نے تاج کی باتوں پر کان نہیں دھرا۔

اگست کی ایک خاموش شام وہ اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں ایڈز کے مریضوں کے دو مہمان ٹیٹھی تھی۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ چہروں پر اسی چھائی تھی۔

”ہم نئے سفر پر روانہ ہونے کو ہیں دوستو۔“ اس نے ہاتھ رگڑے۔ ”اور ایسے میں اداسی کچھ مناسب نہیں لگتی۔“

وہ ان سے ہاتھ کرتی رہی۔ انہیں یاسیت کی کھائی سے نکالا۔ جینے کی آس پیدا کی۔ رخصت ہوتے وقت وہ سب خاصا بہتر محسوس کر رہے تھے۔

اگلے ہفتے چھ کی بجائے گیارہ افراد اس کے اپارٹمنٹ میں بیٹھے تھے۔ تیسرے ہفتے ان کی تعداد اکیس ہو گئی۔ جب کم ہونے لگی۔ وہ ایک سماجی تنظیم کے ہال میں اکٹھے ہونے لگے۔ پھر ایسا وقت بھی آیا، جب اس مرض میں جھ 800 افراد کو لوہڑا ہانے نے امید سے لبریز پیکر دیا۔

یہ کیلیفورنیا کی تاریخ کا ایک حیران کن واقعہ تھا۔ اس گروہ کو ”ہائیر اینڈ سپورٹ گروپ“ کا نام دیا گیا۔ لوہڑا کی ملامتی کوششوں نے ملک گیر توجہ حاصل کی۔ ہر جگہ اس کا چرچا ہونے لگا۔ اخبارات میں مضامین شائع ہوئے۔ اور پھر ایک روز... اسے ایک غیر حتمی فون کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف اوپرا ونفری تھی۔ امریکا کی سب سے جتنی ٹی وی میزبان۔

وہ لوہڑا کو اپنے شو میں مدعو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ہ خوشی پائی بھری۔

اس نے اپنے گروپ کے چند سینئر ارکان کے ساتھ شو میں شرکت کی۔ ایک کھٹنے کے اس پروگرام میں جہاں

اور ایسا ہی ہوا۔ سرما کی ایک مدت اسے ایک اشارہ ملا۔ وہ ایک خواب تھا جس میں وہ ایک پیٹنگ ہاؤس کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ عمارت کے ماتھے پر لکھا تھا ”ہائے ہاؤس“

اگلے صبح وہ نشر و اشاعت کے محکمے پہنچی مگر وہ یہ نام رجسٹرڈ کروا دیا۔ بینک میں کچھ پیسے تھے، تھوڑا خرچہ لیا اور پرنٹر کی سست روانہ ہو گئی۔

ماہ دسمبر میں یہ کتاب مارکیٹ میں آئی۔ آگے جو کچھ ہوا... وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

کتاب کو حیران کن پڑائی ملی۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ”نیو یارک ٹائمز“ کی بیسٹ سیکرٹ میں یہ لگا ہوا 4 1 ہفتے پہلے نمبر پر رہی۔

چند ہی ماہ میں پہلا ایڈیشن مارکیٹ سے غائب ہو گیا۔ ”ہائے ہاؤس“ کو بھاری تعداد میں آرڈرز ملے۔ خرید لوں کی دلچسپی دیکھتے ہوئے تمام بڑے بک اسٹورز نے لوہڑا کے اعزاز میں تقریبات کا اہتمام کیا۔ ریڈیو اور ٹی وی کے تمام نمائندے انٹرویوز کے لیے دوڑے چلے آئے۔

جلد ہی اس کتاب کی شہرت ریاست کیلیفورنیا کی سرحدیں عبور کر گئی۔ دیگر ریاستوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔

لوہڑا شہر کی مقبول ترین لکھاری بن گئی تھی۔ شہرت اور دولت کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی، مگر وہ اپنا اصل فریضہ نہیں بھولی۔ اس کا مقصد حیات انسانیت کے کام آنا تھا۔ اس لیے جب جیسٹن اس کی مدد مانگتے آیا، تو اس نے ایک لمحے کا بھی توقف نہیں کیا۔ فوراً ہاں کہہ دی۔ یہ ایک پُر خطر فیصلہ تھا۔

☆☆☆

80 کی دہائی دنیا کے لیے ایک صیبت لے کر آئی۔ ایک نئی وبا کا انکشاف ہوا۔ ایک مرض، جس کا کوئی علاج نہیں تھا... ماسوائے موت کے۔

آج تو حالات سے بدل گئے ہیں مگر اس زمانے میں امریکا میں جب کوئی ایڈز کا نام سننا تھا تو قہر قہر کا پیٹ لگتا۔ مریض سے دور بھاگنے کی کوشش کی جاتی۔ ساتھ بیٹنا تو درکنار ایڈز میں مبتلا شخص سے بات کرنا بھی کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے گناہ گار خیال کیا جاتا۔ اور جیسٹن... اسی موذی مرض میں مبتلا تھا۔

اس وقت یہ بیماری تھی جی تھی۔ اس کے حوالے سے

اشاعت کا اہتمام کیا۔ وہ پہلی کتاب سے بھی زیادہ کامیابی
ٹھہری۔ خوب دلوں والی ہوئی۔ الطوفان "ہائے ہاؤس" کا تجربہ
روحان ساز ثابت ہوا۔

☆☆☆

کچھ ہی برس میں لوہڑا ہائے نے سیلف ہیپ
اضطرب کی صورت بدل دی۔

You Can Heal Your Life کی
اشاعت سے قبل بک اسٹورز میں گلشن، تاریخ اور شاعری
کے فیکشن ہوتے تھے، مگر سیلف ہیپ کتابوں کا کوئی
سیکشن نہیں تھا۔ اس کتاب کو لے کر قابل یقین پذیرائی
کے بعد ہی بک اسٹور مالان نے یہ سیکشن قائم کیا۔ کئی بڑی
دکانوں میں ان سیکھو کا اختراع لوہڑا ہائے ہی نے کیا۔
سیلف ہیپ رائٹنگ کے میدان میں سے سے لوگ آنے
لگے تھے۔

اس مرحلے میں لوہڑا کی دیگر کتب بھی شائع ہوئیں،
مگر You Can Heal Your Life کی شہرت
مائع نہیں ہوئی۔ کسی پراسرار قوت کے سہارے اس کی رسائی
بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک ایڈیشن شائع
ہوتا تھا۔ اس کی شہرت یورپ سے ہوئی ہوئی، ایشیا اور
لاٹینی امریکا میں پھیل چکی تھی۔ کئی بڑی زبانوں میں اس کا
ترجمہ ہو گیا۔ اس نے ہزاروں انسانوں کی زندگیوں بدل
دیں۔ دنیا بھر سے لوہڑا کو احساسِ تشکر سے لبریز خطوط آنے
لگے۔

لوگ اسے اپنی کہانیاں لکھ کر بھیجتے۔ بتایا کرتے کہ
کیسے ان کی زندگیوں کو بک اور مصائب میں ابھی تھیں
اور اس کی کتاب نے انہیں بکس بدل دیا۔

سات برس تک وہ اینڈز کے مریضوں کی علاج و بہود
کے لیے کام کرتی تھی۔ اسی کوششوں کے فیل ان دھکارے
ہوئے انسانوں کو ساج نے قبول کیا۔ ان کے سلب شدہ
حقوق انہیں واپس ملے۔ لوہڑا کو سماجی عقیموں کی جانب
سے کئی اعزازات سے نوازا گیا۔

اس نے جانوروں کی حفاظت اور علاج و بہود کے
لیے بھی ایک منصوبہ شروع کیا۔ یہ اس کے کرشماتی پیغام ہی کا
اثر تھا کہ امریکا کی کئی قدر آور شخصیات اس مہم میں شامل
ہو گئیں۔ جانوروں کے تحفظ سے متعلق قوانین پاس ہوئے۔
ادارے قائم کیے گئے۔ سماجی شعور بلند ہوا۔

سیلف ہیپ کتب کی تاریخ میں، فروخت کے لحاظ

اگست 2014ء

ایڈز کے مریضوں کے مسائل پر روشنی ڈالی، وہیں ان افکار
اور فکروں کا بھی ذکر کیا، جو مریضوں کے لیے معاون ثابت
ہوتے ہیں۔ اس کی کتاب کا بھی تذکرہ آیا۔

شو کے اگلے روز اسے اطلاع ملی کہ بک اسٹورز سے
اس کی کتاب قاعب ہو گئی ہے۔ لوگ لوٹ پڑے تھے۔
اشاک ختم ہو گیا۔ "ہائے ہاؤس" کو سب آرڈرز موصول
ہوئے۔ نہ صرف یورپ بلکہ لاٹینی امریکا اور ایشیا کے بھی
چھوٹے پبلشرز نے اس سے رابطہ کیا۔

شہرت نے لوہڑا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اگلے پختے اسے
ڈاکٹر برنی سہگل نے اپنے پروگرام Donahue میں مدعو
کیا۔ وہیں بھی بہت پذیرائی ہوئی۔ مزید ٹی وی شو سے بھی
بلا دے آئے۔

لاس اینجلس کے ایک غریب گھرانے میں آنکھ
کھولنے والی لوہڑا کچھ ہی روز میں ایک ملنگ گیر شخصیت بن
گئی۔ اسے امید کا استعارہ تصور کیا جانے لگا۔

کتاب کی شہرت تیزی سے پھیلی۔ فرانس، جرمنی اور
دیگر یورپی ممالک سے اسے حیران کن کالز موصول ہونے
لگیں۔ کچھ لوگ ان کا مقامی زبانوں میں ترجمہ کرنا چاہتے
تھے۔

"خوشی سے کیجیے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اس کا پبلشنگ ہاؤس، جسے قائم کرنے کے لیے اس
نے قرضہ لیا تھا، تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ فقط ایک کتاب کی
اشاعت نے اسے سال میں سب سے زیادہ منافع کمانے
والے پبلشنگ ہاؤس کی فہرست میں لاکھڑا کیا۔

پھر ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ سیلف ہیپ کے
موضوع پر قلم اٹھانے والے بے لکھاری اپنی کتابوں کی
اشاعت کے لیے اس سے رابطہ کرنے لگے۔ ابتدا میں تو
وہ تھوڑی حذبذب تھی۔ سوچ رہی تھی کہ نہ جانے اس
فیصلے کا کیا نتیجہ نکلے گا مگر پھر خیال آیا، اگر وہ بھی ان سے
رائٹرز کا ہاتھ نہیں تھامے گی، تو کون تھامے گا؟ قدرت
نے اس کی مدد کی، اب اسے لوگوں کی مدد کرنی ہوگی۔

بس یہی سوچ کر اس نے اپنے پبلشنگ ہاؤس سے ایک
نوجوان مصنف کی کتاب چھاپنے پر رضامندی ظاہر کر
دی۔ پیش لفظ خود لکھا۔ نتائج مثبت رہے۔ لوگوں نے اس
نوجوان کی فکر کو سراہا۔

مثبت رد عمل دیکھتے ہوئے اس نے دوبارہ کتابوں کی

ماہنامہ سرگرتشت

ہوا آگلی۔ لوہے کے پیغام میں جا رہا ہے۔“
2013 کے اعداد و شمار کے مطابق یہ کتاب 132 ممالک میں فروخت کے دیکھنا 6 نام کر چکی ہے۔ 42 بی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ اس کی 4 کروڑ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔

سب سے مقبول مصنف کار بکاڑا کی برسوں بعد میری ہر فری مصنفہ کے درونک نے توڑا مگر اس نے اعتراف کیا کہ وہ خود لوہے کی مداح ہے۔ اس نے کہا ”بے شک میری کتابیں فروخت کے معاملے میں ان کی کتب سے آگے نکل گئی ہیں، مگر ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ میرے قلم نے کسی کی زندگی نہیں بدلی، دوسری جانب لوہے کے قلم نے کروڑوں انسانوں کو یکسر بدل دیا جن میں شاید بے کے رونک بھی شامل ہے۔“

☆☆☆

بڑی کہانیاں ہوا کے دوش پر بھول رہی تھیں۔ ان پر گلابی پھول کھلے تھے آسمان میں پھرا جاتا تھا۔
کہانی ختم ہو چکی تھی۔ برقی کی آگھوں میں غمی تھی۔
بڑھی جی لپٹنے کی پشت سے لپک لگائے بیٹھی تھی۔ بڑ سکون خاموشی تھی۔ چاندنی میں قدرت کے کرشمے دک رہے تھے۔

”آپ کی دوست کی کہانی تو... الوکی ہے۔“ برقی نے خاموشی توڑی۔

”جسپیں پسند آئی؟“ بڑھی نے گردن موڑی۔
لڑکی نے سر ہلا۔ حوریت مسکرائی۔ ”پھر ایک وعدہ کرو کہ تم کم از کم دو آدمیوں کو ضرور یہ کہانی سناؤ گی۔ یہ اُمید کی کہانی ہے۔ اور اسے عام کرنا ہم پر فرض ہے۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں۔“ اس نے حوریت کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اور یہ عہد بھی کرتی ہوں کہ میں نہ صرف لوہے کی کتاب پڑھوں گی بلکہ اپنے جیسے اور دکھیاہروں کو بھی اسے پڑھنے کا مشورہ دوں گا۔“

بڑھی حوریت کی فطری شرمی لوٹ آئی۔ ”واہ۔ یعنی اس برس بھی اسے پیشکش ہاؤس منافع میں رہنے والا ہے۔“
دونوں نے قہقہہ لگایا۔ چاند انہیں دیکھ کر مسکرایا۔
کہانیاں رقص کرنے لگیں۔ پھر اس نے کہا ”مجھے بچپان میں ہی اس کی اگھوتی دوست ہوں جس کی ولہی نے اسے بچپن میں اپنے پاس رکھا تھا۔“

==

سے، لوہے اپنے نمبر پر آگئی تھی۔ اس نے نیلین مل اور نورسن وسٹن شیل جیسے مشہور روزگار نگار ہیں کو میلوں پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ 2006 میں اسے ایک الوکھا اعزاز ملا۔ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والے خاتون نگار کا تاج اس کے سر رکھ دیا گیا۔

کمزور جب آل ورلڈ ریکارڈ نے تسلیم کر لیا کہ آج سے قبل کسی ادیبہ کی کتابیں اس تعداد میں فروخت نہیں ہوئیں۔

لگے ہی برس ایک دلچسپ معاملہ ہوا۔ دونوں جوان اس سے ملنے آئے۔ ایک دعاوت کا رہتا ہوسرا مصنف۔ وہ اس کی زندگی کو قلم کے قالب میں ڈھالنا چاہتے تھے۔
ان کی پیشکش سن کر لوہے انہیں پڑی۔ ”میرے بچے، یہاں 35 برس کی خواتین کو قلم میں کام نہیں ملتا۔ اور تم مجھ 81 سالہ بڑھیا کو کاسٹ کرنا چاہتے ہو۔“

دونوں جوان مسکرائے۔ ”جی ہاں، کیوں کہ اس بڑھیا نے لاکھوں زندگیوں بدل دی ہیں۔“

2008 میں قلم You Can Heal Your Life ریلیز ہوئی، جو قلم لوہے کی کتاب پہنچی نہیں تھی، اس کی کہانی اور مصائب کا بھی احاطہ کیا گیا تھا۔

قلم نے بین الاقوامی توجہ حاصل کی۔ اثر پڑ میری کے معاملے میں اس نے کتاب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ لاکھوں انسانوں کی زندگی بدل دی۔ نیپال کے پہاڑی علاقوں سے، جاپان کے بیگار کیمپوں سے، افریقی ملکوں سے لوہے کو شکرے کے پیغامات موصول ہونے لگے۔

قلم کی حیران کن مقبولیت دیکھتے ہوئے لوہے پر ادھری نے اسے دو مشروں بعد پھر اپنے پروگرام میں مدعو کیا۔ ادھر بھی اب لوہے اپنے کی طرح بین الاقوامی شخصیت بن چکی تھی۔

وہ دونوں اب بھی دوستوں کی طرح ملیں۔ پروگرام کے شرکانے ٹکڑے ہو رہا اس کا استقبال کیا۔

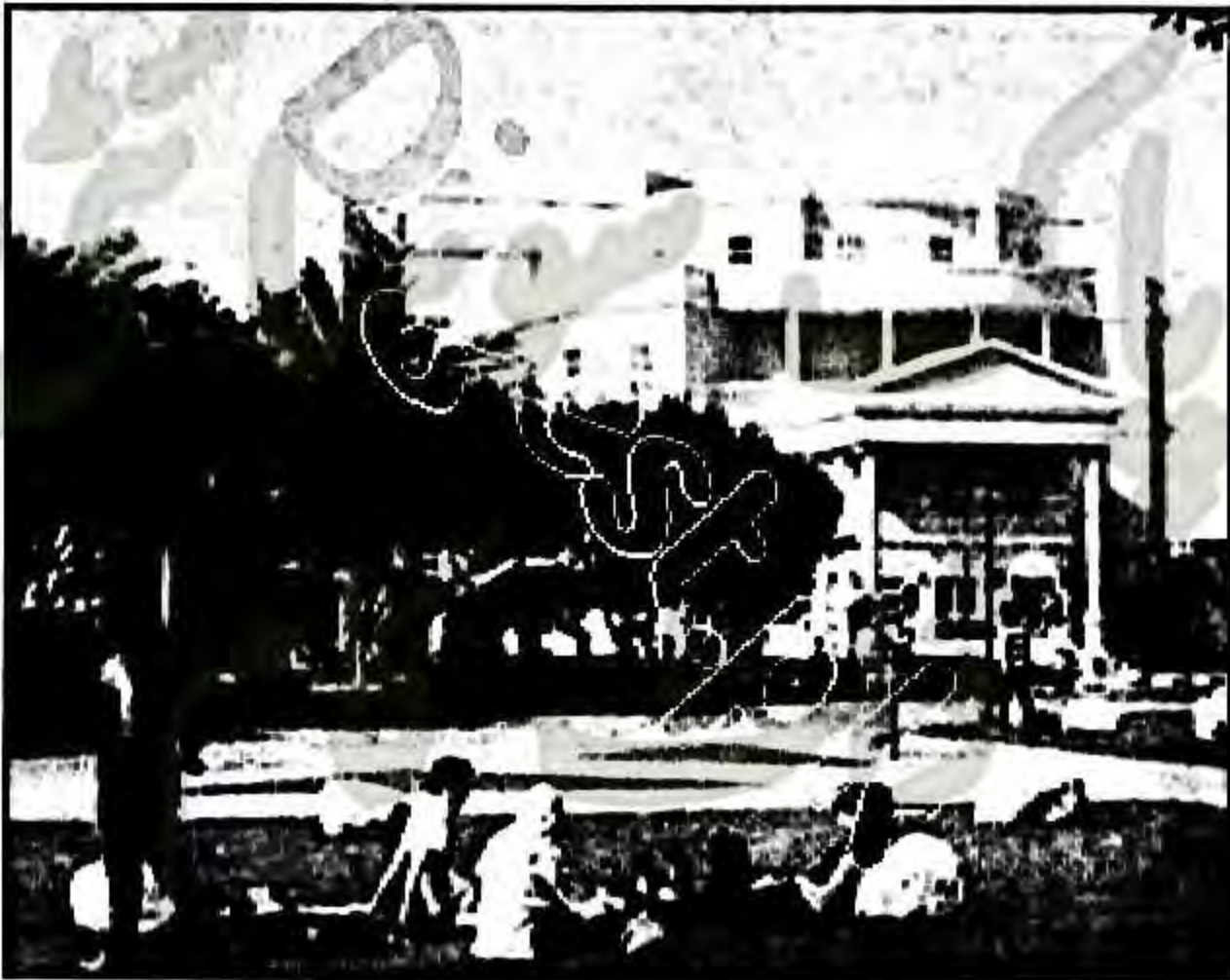
پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوا، لوہے کی کتاب میں نئی مداح آگئی۔ دو مشروں قبل وہ نیو یارک، نیو یارک بیٹ سٹریٹ میں 14 مئی نمبر دن رہی تھی۔ اس بار وہ اس اہم فہرست میں 22 مئی اول نمبر پر دیکھی رہی۔ میگزین میں شائع ہونے والے آرٹیکل میں کتاب کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ”یہ پہلا موقع ہے کہ جب کوئی کتاب 22 سال کے طویل عرصے بعد اپنی فہرست میں پھر پہلے نمبر

الوداع

حسن رزاقی

اپنی قومی ایئر لائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئر لائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب و روز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

ماذوق قارئین کے لیے خوشہ خاص



”جانا لاپس آنا“ ہمارے خاندان کی ایک ذاتی اصطلاح ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں پاکستان میں ہی نوکری کر رہا تھا۔ میرے بہنوئی ڈاکٹر امین الدین نور دہشتہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد عمرہ کرتے ہوئے براستہ جدہ پاکستان واپس آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ میری بہن اور ان کا بیٹا کمال بھی تھے۔ کمال جب نور دہشتہ گئے تو شیر خواہ تھے مگر اب ماشا اللہ ”چار سال کے گہرو جوان“ ہو چکے تھے اور نور دہشتہ کے غیر مانوس ماحول میں رہنے کی وجہ

سے گودا شای اردو بولتے تھے۔ وہ اپنی مانی یعنی میری والدہ کو اپنے عمر کی تفصیل بتانا چاہتے تھے۔ پہلے خانہ کعبہ کی بابت بتایا "ای! ہم لوگ" اللہ پاؤں" مجھے تھے۔ "پھر سنا ویرا کے درمیان سلی کی تفصیل بتائی۔ "ای وہاں کچھ نہیں بس جانا پس آنا پھر جانا پھر لا پس آنا۔ اس دن کے بعد سے جب بھی کسی ایسی جگہ کا ذکر ہو جہاں بار بار یا کی بار جانا ہو تو ہمارے گھر میں اس جگہ کے لیے جانا لا پس آنا کی اصطلاح استعمال ہونے لگی۔

برہمگھم کو الوداع کہنے کے بعد مجھے انگلستان پاکستان اور کینیڈا کے درمیان کئی دلدہ جانا لا پس آنا پڑا۔

برہمگھم سے ٹورونٹو کا سفر، ٹورونٹو سے برہمگھم کا الوداع پھر اٹھائیں برہمگھم لندن، ڈورڈ، اوکسٹنڈ، برسلز، موٹریل، ٹورونٹو اس سفر کے ابتدائی ٹکڑے برہمگھم سے لندن کا قاصد غلبت کے ساتھ اس کی گاڑی میں طے کرتا تھا۔ میں اپنا تمام مال و متاع اپنے واحد سوٹ کیس میں بند کرنے کے بعد محنت کا انتظار کر دیتا تھا۔ گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو بیوان خسرو شای کو سامنے کھڑا پایا۔ ہم دونوں باورچی خانے میں میز کے اطراف آ کر بیٹھ گئے کہ قلیٹ کا یہ باورچی خانہ ہاس کھانے کا کمرائیٹک کا کام بھی دیتا تھا۔

گھنٹی دوبارہ بجی۔ محنت آچکا تھا۔ اب باورچی خانہ ہاس جینک میں RCD کا کورم پورا ہو چکا تھا۔ یعنی ترکی پاکستان اور ایران کا ایک ایک نمائندہ باورچی خانے میں موجود تھا۔ میں نے اس باورچی خانے میں آخری دلدہ چائے پائی۔ ہم لوگ چائے پی رہے تھے کہ روزلین آگئیں مٹی ہوئی باورچی خانے میں داخل ہوئی۔

"تم ابھی سے جا رہے ہو؟ تمہاری فلائٹ تو رات میں ہے۔"

"ہاں رات میں ہے۔ مگر برسلز سے ہے۔ وہاں پہنچنے کے لیے مجھے اسی وقت لکنا پڑے گا۔"

"اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا وہ عثران سے مخاطب ہوئی۔ "اب تمہارے کمرے پر میرا قبضہ ہے تم وہاں داخل نہیں ہو سکتے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں میں تم سے کرائے کا قضاہ نہیں کروں گا تم میری مہمان ہو۔"

روزلین نے جماعی لیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "ہائی ہائی" اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ پھر اس کو کچھ یاد آگیا۔ "رات ٹوٹی تم کو ہائی ہائی کرنے آیا تھا مگر تم سوچتے

تھے "ٹوٹی روزلین کا مگیتر تھا۔

"ہائی ہائی۔ اب تم جا کر دوبارہ سو جاؤ مگر ٹوٹی کے خواب مت دیکھنا۔"

چائے ختم کرنے کے بعد میں نے اپنی آسٹن مٹی کی چابی بیوان کے حوالے کی کہ وہ یہ گاڑی مجھ سے ستمبر 1966 پاؤڈر مکہ راج الوقت حکومت برطانیہ میں خرید چکا تھا۔ اور محنت کے ساتھ لندن کے لیے روانہ ہو گیا۔ برسلز تک کا سفر لیا تھا۔ میں عین وقت پر برسلز انٹرپرائٹ پہنچا۔ کچھ دیر اور ہوئی تو قحطیٹ چھوٹ جاتی۔ آج میرے لیے اس ٹکٹ کو استعمال کرنے کا آخری دن تھا۔ انٹرکینیڈا کے جہاز میں داخل ہوا تو ایک انجمانی سی اپنائیت کا احساس ہوا جیسے اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت ہوتا ہے۔ سارے دن کے سفر نے تھکا دیا تھا۔ جیسے ہی کھانا ختم ہوا اور جہاز کے کپتان کی لائسنس دہی کی گئیں میں نے کپل لوڈھا اور بی بی تان کر سو گیا۔ خواہوں میں خدا جانے کہاں کہاں کی سیر کرتا رہا۔

میں گہری نیند میں تھا کہ بیوان نے مجھے شانے سے پکڑ کر جھنجھڑا "جلدی اٹھو آج تمہارے امتحان کا پرچہ ہے۔ کیا پرچہ دینے نہیں جاؤ گے؟"

آٹھ بجی تو انٹرپرائٹ ہوسٹس مجھے شانے سے پکڑ کر جھنجھڑی تھی۔ "اپنی سیٹ کی پشت سیدھی کر لیں۔ ہم جلد ہی موٹریل کے انٹرپرائٹ پر اترنے والے ہیں۔"

میں نے کرسی کی پشت سیدھی کر لی۔ تھوڑی دیر بعد جہاز موٹریل کے ہوائی اڈے پر اتر چکا تھا۔ سات آٹھ گھنٹے کا سفر گزر چکا تھا مگر موٹریل میں ابھی اندھیرے کا راج تھا۔ رات کا ایک یا دو بج رہا تھا۔

جہاز سے اتر کر ایئرکیشن ہال کا قصد کیا مگر کیشن کے کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں ایک نئی مصیبت پائی کہ پھیلانے مجھے اپنی آغوش میں لینے کے لیے تیار کڑی تھی۔

کینیڈا کا یہ قانون تھا کہ اگر کسی شخص کے پاس کینیڈا کا ایئرکیشن ویزا ہے اور وہ کینیڈا سے باہر جاتا ہے تو اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ ایک سال کا وقفہ گزرنے سے پہلے "بے کینیڈا میں واپس داخل ہو جائے ورنہ اس کا ایئرکیشن ویزا کینسل ہو جاتا ہے۔ وہ دوبارہ کینیڈا میں داخل نہیں ہو سکتا۔

میں موٹریل سے 23 ستمبر کو برسلز کے لیے روانہ ہوا تھا۔ میرے لیے لازم تھا کہ میں 22 یا اس سے پہلے کینیڈا کے کسی شہر میں داخل ہو جاؤں ورنہ میرا ویزا کینسل ہو جائے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

سے روک دیتا تو میرے اوپر اس کا کوئی منفی اثر نہ پڑتا۔ مجھے چنداں السوس نہ ہوتا۔ میں اپنا چیتا سوٹ کیس اٹھا کر ٹھنڈے ٹھنڈے پاکستان واپس آ جاتا۔ وقت وقت کی بات ہے السوس کا کیا خاتم!

السوس تو صرف اس بات کا تھا کہ اس دلفرد بھی مجھے اتر پورٹ پر انٹرکینیڈا کا جلوس نہیں دکھائی دیا جو مجھے پھولوں کے ہار پہنا کر کانٹھوں پر اٹھا کر ڈنگر لے جا کر مجھ سے استدعا کرتا کہ میں اپنی خدمات سے انٹرکینیڈا کو مستفید کروں حالانکہ لب کی دلفرد تو میرے پاس مغربی ملک کی ڈگری کا امکان بھی موجود تھا بشرطیکہ ڈاکٹر کوئس اپنی ٹانگ جگ میں نہ اڑائے۔ خیال ہوا کہ رات کے تین بجے والے ہیں شاید امیر کینیڈا والے سوگئے ہوں گے ورنہ وہ اس طرح سے اس نادر موقع کو ضائع نہ ہونے دیتے جیسا انہوں نے میرے استقبال کا بعد و بست نوڈلٹو کے اتر پورٹ پر کر رکھا ہوگا لیکن وہاں بھی مایوسی ہوئی۔

حسب سابق میں نے ایک دلفرد بھرا انٹرکینیڈا کو ان کی کوتاہی پر معاف کر دیا اور سوچا کہ میں خود جس شخص ان کے دفتر جا کر ان نادانوں کو ان کی غلطی اور کوتاہی کا احساس دلاؤں گا کہ وہ ایک دلفرد بھری ملا جیتوں سے مستفیض ہونے کا جیش بہا موقع گنوار ہے ہیں۔ میں ان کی خطاؤں کو درگزر کرتا ہوا کمال مہربانی سے ان کے دفتر پہنچ گیا۔

اس دلفرد کو کہ کا ڈنٹر پر صاحبزادی بھی دوسری تھیں اور سپروائزر بھی نیا تھا لیکن ان کا جواب وہی پرانا اور گھسا پٹا تھا۔

"آج کل کینیڈا کی معیشت بہت خراب دور سے گزر رہی ہے۔"

جب وہ لوگ خود اپنے ہاتھوں سے ایک دلفرد بھرا اپنے ہی پاؤں پر کھڑی مارتا چاہتے تھے تو میں ان کو کیسے روک سکتا تھا۔ اپنے کیسے پر ایک دن خود ہی دیکھتا تھیں گے و میرا کیا۔

میں نے طے کر لیا کہ اب میں دوسرے اداروں کو اپنی ملا جیتوں سے فائدہ اٹھانے کی دوز میں حریہ رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ آخر ان کا بھی میرے اوپر کوئی حق نہ تھا۔ وہ بھی درخور احتیاج تھے۔ ابھی میں کینیڈا کی دوسری کمپنیوں کو اپنی کینیڈا واپس کی خوش خبری سے مطلع کرنے کا ارادہ مصمم کر ہی رہا تھا کہ مجھے میری ماں کا خط ملا۔ تلافی تھا۔ "تین سال ہو گئے ہیں آکر شل دکھا جاؤ۔"

گا۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کی بھی یہی پابندی تھی۔ اسی لیے میں 22 ستمبر کو برطانیہ سے کینیڈا واپس کے لیے روانہ ہو چکا تھا مگر جس وقت ہمارا ہوائی جہاز مونٹریال کے ہوائی اڈے پر اترنا۔ اس وقت خدمات کا ایک بج چکا تھا۔ قانونی طور پر 23 ستمبر کی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔ میرا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ ایئر لائنز آفیسر نے میری توجہ اس طرف دلائی "قانونی طور پر وہ وقت گزر چکا ہے جس وقت کے اندر اندر تم کو کینیڈا واپس آ جانا چاہئے تھا۔ وقت پر نہ آ سکتے کی سزا۔ اب تم کینیڈا میں داخل نہیں ہو سکتے!"

"پھر اب کیا ہوگا؟" میں نے پریشان ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تم یہاں انتظار کرو۔ میں اپنے سپروائزر کو بلا کر لاتا ہوں۔" وہ اپنے سپروائزر کو بلا نے چلا گیا۔

ہر قوم کا اپنا اپنا حراج ہوتا ہے۔ اگلے ملک میں اگر آپ کسی سرکاری یا نیم سرکاری دفتر میں کسی کام کی فرض سے جائیں تو وہاں کام کرنے والوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آپ کا کام آج نہ ہو سکے۔ کوئی نہ کوئی خافی نکال کر یا بہانہ تلاش کر کے آپ کو کل آنے کا حکم دے دیں گے۔ کینیڈا امریکا اور برطانیہ میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ ان ملکوں میں کام کرنے والوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اگر کسی طرح سے آپ کا کام آج ہو سکتا ہے تو ہو جائے، آپ کو دوبارہ آنے کی رحمت نہ کرنی پڑے۔

ایئر لائنز انٹر واپس آیا تو اس کے ساتھ اس کا سپروائزر بھی تھا۔ سپروائزر نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور گویا ہوا "پڑھائی ایک ٹیک کام ہے۔ تم ایک ٹیک مقصد کے لیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ یہ صرف ایک یا دو گھنٹے کی بات ہے۔ ان حالات کے پیش نظر یہ سہولت موجود ہے کہ تم کینیڈا میں داخل ہو سکتے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے میرے پاس پورٹ پر لٹھا لگا دیا جس نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

یہ صورت حال اگر مجھے اس وقت پیش آئی ہوتی کہ جب میں پہلی دلفرد کینیڈا میں داخل ہوا تھا تو میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے لیکن اب معاملہ کچھ اور تھا۔ مجھے میرا کینیڈا آنے کا اصل مقصد یعنی اپنی تعلیم مکمل کرنا حاصل ہو چکا تھا۔ میرا مستقل طور پر پاکستان چھوڑنے کا اور کسی دوسرے ملک میں مستقل طور پر بس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس وقت اگر ایئر لائنز انٹر واپس آ کر مجھے کینیڈا میں داخل ہونے

ایک اور عجیب بات ہوئی۔ جس شہر پر منظم کو اور اس کی پونجی کو چھوڑنے کے لیے میں بے چین اور بے تاب ہو رہا تھا۔ اسی شہر اور اسی پونجی کی یادیں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں حالانکہ برصغیر سے جدا ہوئے مجھے ایک ہفتہ بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ میں نے ٹریول ایجنسی جا کر ٹکٹ خرید لیا۔ کراچی براستہ لندن۔

برٹش ایرویز کا جہاز لندن ایئر پورٹ پر لینڈ کر چکا تھا۔ ایئر ٹینس سے فارغ ہو کر میں نے بس اسٹاپ کا رخ کیا اور اے ون ایئر بس پکڑ کر لندن شہر میں وکٹوریہ اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گیا۔ کرایہ صرف پچاس پینس۔ 1995ء میں یہ کرایہ بڑھ کر پانچ پاؤنڈ ہو چکا تھا۔ آج کل یہ کرایہ کتنا ہے معلوم نہیں۔

مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ وکٹوریہ اسٹیشن پہنچ کر میں اسی ایئر ایڈ پر یک غاصت ہوئی پہنچ گیا جہاں ایک سال پہلے مجھے ایک پاؤنڈ کا حیدر آبادی اسکاؤٹ ملا تھا۔ یہ اسکاؤٹ آج بھی میرا تحفہ تھا۔ ہوٹل کے مالک نے شکوہ کیا۔

"اوپاشاء آپ تو ایسا غائب ہوئے جیسے گمہ (گمہ) کے سر سے سینگ (سینگ)۔ کیا پلٹ کر پوچھا کرو؟" (کیا آپ کو پلٹ کر پوچھا نہیں چاہیے تھا) میں نے جواب دیا۔ "سینگ تو میں آج بھی بھول آیا ہوں۔ گدھا حاضر ہے۔"

وہ ہنسنے لگے۔ میرا حیدر آبادی اسکاؤٹ نکلا ہو چکا تھا۔ ناشتا پیش کی طرح نکلا تھا۔ ناشتا ختم کرنے کے بعد میں برصغیر جانے کے لیے ایئر سٹیشن روانہ ہو گیا۔

برصغیر کے نیو اسٹریٹ کے ریلوے اسٹیشن پر اترا تو ایک انجانی سی غوغا محسوس ہوئی۔ لگتا تھا جیسے برسوں بعد پھڑپھڑے ہوؤں سے ملاقات ہوئی ہے حالانکہ اسٹیشن پر میرا ایک بھی جاننے والا نہیں تھا۔ محنت میرے کینیڈا امداد ہونے کے تھیں، چار دن بعد اسٹینبول کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر میں نے ٹیکسی پکڑی اور عطران کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا کرا میرا دیکھا ہوا تھا۔ وہاں کافی کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازے کے ساتھ ساتھ عطران کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

"تم تو طے مگے تھے پھر کہاں سے آگئے؟"

"تمہاری محبت مجھے گھنٹا لاتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

جب میں اور عطران ایک ساتھ گرٹن گلوز کے قیث میں رہے تھے تو بڑھائی کے وقت کے علاوہ عطران زیادہ تر وقت ساتھ گزارا کرتا تھا۔ میں اور عطران اس وقت کو یاد کرتے رہے پھر میں نے عطران سے اس کی گاڑی کی چابی لی اور گرٹن گلوز روانہ ہو گیا۔ یہ گاڑی میں نے پچھلے ملے گرٹن گلوز میں ہی عطران کے حوالے کی تھی۔ میری دوسری پاؤنڈ کی خریدی ہوئی گاڑی کے عطران نے 1986 پاؤنڈ دیے تھے۔ تین مہینے میں صرف چار پاؤنڈ کا گھٹا۔

اپنے پرانے قیث پر پہنچ کر میں نے گھنٹی بجائی۔ میں جبری سے ملنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ابھی تک قیث میں ہوگا لیکن دروازہ جبری کی بجائے روز لین نے کھولا۔ وہ شاید ابھی تک دوسرے قیث میں محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں بہت ہو کر روز لین کو دیکھا رہ گیا۔

روز لین کا شمار حسین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ میں اس کو کل دلوں کی چکا تھا بل چکا تھا۔ پچھلے ملے اس نے مجھے نورتنو کے لیے رخصت بھی کیا تھا لیکن اس وقت وہ کچھ اور علی چیز لگ رہی تھی۔ کھرے بال، لالہ لالہ، اس نے سر سے ہر رنگ ایک گاؤں پہن رکھا تھا۔ دروازے کے ایک طرف اندھیرا تھا، روشنی بائیں طرف کی کھڑکی سے چھن چھن کر آرہی تھی اور اس کے اوپر دھوپ چھاؤں کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرے دل میں اس وقت ایک ہی خیال آ رہا تھا۔ شاید جنت میں جن حوروں کا ذکر ہے وہ بھی ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔

روز لین مجھے اس طرح گھورتے دیکھ کر ہنسا لگی کہنے لگی۔ "اگر تم حسن سے لٹائے ہو تو وہ کینیڈا چکا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں ہی حسن ہوں کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟"

وہ بھرگی، کہنے لگی۔ "پہچانا کیوں نہیں مگر تم کو اپنے آپ کو اس طرح گھورتے دیکھ کر میں بھی کہ کوئی اور ہے۔ کیا تم نے مجھے اس سے پہلے بھی دیکھا نہیں جو مجھے اس بد تمیزی سے گھورتے تھے؟"

"میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا پھر اپنی معافی پیش کی۔ "میں جیسا تم کو پہلے دیکھ چکا ہوں۔ اسی قیث کے بارہابی خانے میں ہم ایک آدھ بار کھانا بھی کھا چکے ہیں۔ تصویر بہت کہیں بھی ہا تک چکے ہیں۔ چند دن پہلے تم نے مجھے نورتنو کے لیے ہالی ہالی بھی کہا تھا لیکن آج کی بات ہی کچھ اور ہے۔" پھر میں نے اس کی تعریف

رہوٹ۔ تم مجھ سے ملے لہجہ یہ رپورٹ میری ٹیکرٹری کو تھا
کردنو چکر ہو گئے۔

میرا دل حلق میں دھڑکنے لگا کہ اب یہ مجھ سے تیسری
دفعہ اس رپورٹ کو گھسنے کا نفاذ کریں گے۔ میں نے حربہ
مطلوبات حاصل کرنے کی خاطر پوچھا۔

”کیا میری پروجیکٹ رپورٹ آپ کو پسند نہیں
آتی؟“

جھٹکا کر بولے۔ ”میں پسند آنے یا ناپسند آنے کی بات
نہیں کر رہا ہوں۔“

”پھر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ میں نے ڈرتے
ڈرتے پوچھا۔ ”تیسری دفعہ رپورٹ لکھنے کی جان لیوا ٹکوار
مجھے اپنے سر پر لٹائی دکھائی دے رہی تھی مگر ان کا جواب سن کر
جان میں جان آئی۔“

”تمہاری غیر موجودگی میں یہ رپورٹ تمہاری بجائے
مجھے کتنی کو پیش کرنا پڑی۔“ پھر لہجہ کچھ خوشگوار ہو گیا۔ ”ان
لوگوں کو پسند آئی۔“

کتنی کا میری رپورٹ کو پسند کرنا یا ناپسند کرنا میرا
مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ میرے کام سے
مطمئن تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے اس طرح سے بھی کیا
تھا کہ میرے بتائے ہوئے کئی مشوروں پر انہوں نے عمل
درآمد بھی شروع کر دیا تھا۔ ان کی پسندیدگی کا اعتراف مجھے
یوں بھی تھا کہ جب میں نے ان کے پاس اپنا پروجیکٹ مکمل
کر لیا تھا تو انہوں نے مجھے نوکری کی پیشکش بھی کی تھی جو میں
نے شکرے کے ساتھ مسترد کر دی تھی۔ میں صرف جہاز ران
کپیتنوں میں کام کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ انگلستان مجھے
مستقل رہنے کے لیے بالکل پسند نہیں آیا تھا پھر مجھے اس کپنی
کے مستقبل کے بارے میں بھی شکوک تھے (ان معلومات کی
بنیاد جو مجھے پروجیکٹ کے دوران میں معلوم ہوئی تھی)۔

اس کتنی کی بنیاد دو دوستوں نے والٹر ڈکنز اور ٹام
ہیمل نے 1904ء میں اٹلی تھی۔ ان کا کارخانہ ڈارٹن شائر کی
ٹیل اسٹریٹ پر واقع تھا۔ 1907ء میں انہوں نے اپنا پہلا
ہائیڈرو ایک پرکس بنایا۔ اس کے بعد ان کا کاروبار اتنا بڑھا
کہ ٹیل اسٹریٹ کا کارخانہ ان کو اپنے کاروبار کے لیے چھوٹا
پڑنے لگا۔ 1910ء میں وہ موجودہ لیکسٹری میں منتقل
ہو گئے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ان کا کام بہت بڑھ
گیا لیکن 1970ء کی دہائی میں ان کا کام بتدریج تنزل
پزیر ہوتا گیا۔ 1980ء میں یہ کتنی ریٹائرمنٹ میں چلی گئی

کی۔ ”آج تمہارا حسن ملکوتی ہے۔ تم حدود کی طرح حسین
لگ رہی تھیں۔“ پھر میں نے دوبارہ اس طرح گھبرنے کی
مذرت کی۔ ”میں تم سے ایک دفعہ گھبراہٹ بدھنری کی سہائی
چاہتا ہوں۔“

اس کے چہرے پر شفق بکھل گئی۔ یہ تو بچی تعریف تھی۔
محوریت اپنی جھولی تعریف پر بھی سارے خطا تصور مٹا
کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ ایک لڑکے نے اپنی محبوبہ کی تعریف کر دی۔
وہ خوش ہو گئی اور بولی۔ ”اگر تم ایک دفعہ اور یہی الفاظ دہرا
دو تو میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جاؤں۔“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”خیر دار کرنے کا شکریہ۔“ یہ
بھی ایک کئی سال وچتر سنی سنائی کہانی ہے۔

جیری ہار گیا ہوا تھا۔ میں تھوڑی دیر روز لین سے
ہاتھیں کرتا رہا مگر بیڑا ان کے پاس لوٹ آیا۔ آج کی رات
میں عمران کا سہانہ تھا، کھانے کے لیے بھی اور سونے کے
لیے بھی۔

صبح ناشتا کرنے کے بعد میں پوچھویشی کی طرف نکل
گیا۔ میں ڈاکٹر کوئٹس سے ملنا چاہتا تھا کہ اپنی پروجیکٹ
رپورٹ کا اہتمام معلوم کر سکوں لیکن صحت بھی نہیں ہو رہی
تھی۔ آخر کار دل کڑا کر کے ان کے دفتر میں قدم رکھا۔ میں
نے ان کی ٹیکرٹری سے پوچھا۔

”ڈاکٹر کوئٹس کیسے موڈ میں ہیں؟“
جواب ملا۔ ”نارمل۔“

معلوم نہیں نارمل سے اس کا کیا مطلب تھا مگر میں نے
ایک دفعہ پھر اپنے دل کو مضبوط کیا اور دروازے پر دستک
دے کر ڈاکٹر کوئٹس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنا
محبوب اخبار کا پتھنل ناٹمز پڑھنے میں غرق تھے۔ مجھے دیکھ
کر چمکے۔

”تم تو کینیڈا واپس جا رہے تھے پھر کیا ہوا؟“

”کینیڈا تو میں چلا گیا تھا لیکن اب وہاں سے
پاکستان جا رہا ہوں سوچا لو پھر بھی پھر لگا لوں۔“

مجھ بھلا کر بولے۔ ”یہ بھی خوب رہی پھر لگا لوں اگر
واپس ہی آتا تھا تو اپنی بلا میرے سر کیوں چھوڑ گئے تھے؟“
مجھے معلوم نہ تھا کہ ڈاکٹر کوئٹس کا اشارہ کس بلا کی
طرف تھا۔ میں نے وضاحت چاہی۔

”کون کی بلا؟“
کہا جانے والے انداز میں بولے۔ ”اپنی پروجیکٹ

جس کے بعد اس کا دیوالیہ ہونے لگا تو اس کو 1982ء میں ایک امریکن کمپنی نے خریدا لیا۔

میں نے ڈاکٹر کوٹس کو مخاطب کیا۔ ”ڈاکٹر کوٹس، مجھے کبھی کی پسند یا ناپسند سے کوئی خاص غرض نہیں ہے۔ آپ مجھے صرف اتنا بتا دیجیے کہ کیا آپ نے میری رپورٹ کو پاس کر دیا ہے؟“

وہ اپنی گھونٹنے والی کرسی پر بیٹھ گئے ہار دوہوں ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر آپس میں ملائیں اور کمال بے نیازی سے گویا ہوئے۔ ”پاس کیوں نہ کرنا مانجی خاصی رپورٹ تھی۔“

میرا دماغ ہلک سے اڑ گیا۔ قصداً بچے عروج پر تھا مگر اسے حراج کو قابو میں رکھنا ضروری تھا۔ استاد کے سامنے کوئی بے لوثی نہ ہو جائے میں نے دھیرے سے ڈاکٹر کوٹس کو مخاطب کیا۔

”کیا آپ کو اندازہ ہے کہ پچھلے تین ہفتوں سے آپ نے میرا خون خشک کر رکھا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ محض اس رپورٹ کی وجہ سے شاید میں وہ پہلا امیدوار بنوں اس لیبارٹسٹ کا کہ جس کو پروجیکٹ رپورٹ کی خاطر لیل ہونے والے پہلے امیدوار کا اعزاز حاصل ہوا۔“

کہنے لگے۔ ”ہاں تو پھر کیا ہو اس طرح تم رپورٹ لکھنا تو سیکہ جاؤ گے۔“

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ ہے ہم ہی کو آپ کے شکوے جانتے تھے بے شک سم جناب کے سب دوستانتے تھے میں نے ڈاکٹر کوٹس سے ہاتھ ملا دیا۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور دروازے سے باہر نکل کر حنظل کی طرف چل دیا۔

سہ پہر کو میں نے لندن جانے والی ٹرین پکڑی۔ وکٹوریہ اسٹیشن پہنچ کر ہر رپورٹ جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ لن ڈون لندن کی اطراف گراؤنڈ ٹرین لیو پ رپورٹ تک نہیں جاتی تھی کہ بعد میں جانے لگی تھی۔ انڈس ٹریڈر کی ٹرمینل ٹرین پر پہنچی تو میں وہیں اتر گیا۔ کراچی کے لیے پی آئی اے کا جہاز ہمیں سے روانہ ہونا تھا۔

لن ڈون پی آئی اے کی ٹورنٹو کے لیے براہ راست پرواز کا آغاز ابھی نہیں ہوا تھا۔ یا تو نیو یارک سے پرواز پکڑنی پڑتی تھی یا یورپ کے کسی شہر سے۔ میں نے برصغیر جانے کی خاطر لندن کو ترجیح دی تھی۔ لندن سے کراچی جانے والی پرواز کا اعلان ہو چکا تھا۔ میں پی آئی اے کے طیارے میں داخل ہوا تو اپنا تھک کا احساس ہوا۔ اردو زبان

سننے کو ملی۔ طیارہ لفٹ میں بلند ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد ٹوائٹلٹ جانے کی حاجت محسوس ہوئی۔ ٹوائٹلٹ میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا تو خیال ہوا کہ یہ وہی بوئنگ B707 جہاز ہے جس میں میں لگی دوسرا کام کر چکا تھا اور شاید یہ وہی ٹوائٹلٹ ہو جس کی ٹوائٹلٹ موٹر میں تبدیلی کر چکا تھا اور یہ موٹر تبدیل کرتے وقت میں ایسے ہڈ میں رہا ہوں گا کہ

دنیا کسی کا ساغر نہ یاد ہے نظام منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ واپس آ کر میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کراچی صرف چند گھنٹے دور تھا۔

کراچی انٹرپورٹ پر اتر کر جہاز نے جیسے ہی رن وے کو چھوا۔ لوگوں نے اپنے سیٹ بلیٹ کھول کر اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھ اٹھ کر جلدی جلدی... اپنا سامان اوپر کے خالوں سے لٹکانا شروع کر دیا۔ اتر ہوئیں بے چاری اعلان کرتی ہی رہی کہ لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ جائیں اور جہاز کے رکنے کا انتظار کریں۔ مگر کسی ایک بھی شخص نے اس کی آواز پر کان نہیں دھرا۔ اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میں اپنے ملک پہنچ چکا ہوں کیونکہ یہ صرف میری ہی قوم ہے جو اس قدر نظم و ضبط اور صبر جمیل کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔

جہاز سے اتر کر امیگریشن کی لائن میں کھڑا ہونا تھا۔ مگر یہاں بھی لوگ بھاگ دوڑ کر ایک دوسرے سے آگے لائن میں گھسنے کی سعی میں مصروف تھے بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اگر وہ جلد سے جلد امیگریشن سے فارغ ہو بھی گئے تو ان کو اپنے سامان کا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔

میں امیگریشن کی لائن میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ حزر دیکھا تو حسن انگل کھڑے تھے۔ حسن انگل کشم میں ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے میرا پاسپورٹ لے کر امیگریشن کو تھما دیا۔ امیگریشن کا مرحلہ فوراً طے ہو گیا۔ دی آئی پی ٹی۔ ہمارے یہاں جان بچکان یا اثر و رسوخ زندگی کا ہر مرحلہ آسان بنادیتی ہے۔ میرے ماں باپ کو حسن انگل کی ضرورت یوں محسوس ہوئی تھی کہ ان کا بیٹا تین سال امریکا، کینیڈا اور لندن میں گزرا کر آ رہا تھا۔ کم از کم آدھا جہاز تو ضرور اس کے سامان سے بھرا ہوا ہونا چاہئے مگر حقیقت ان کی توقعات کے برخلاف تھی۔ میرے ساتھ صرف ایک سوٹ کیس تھا۔ وہ بھی بڑا والا نہیں بلکہ درمیانے سائز کا۔

صاحب تھے جو ملکینک کو عملی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ایک ہفتہ بعد میرے سیکرٹری نے میرے سامنے ان کا اسٹنٹل رکھا جس کو میں نے منظور کر لیا۔ اس پر میرے سیکرٹری نے پوچھا۔ ”آپ نے اس کا اسٹنٹل بغیر اس سے بات کیے ہی منظور کر لیا؟“

میں نے لاشعری سے جواب دیا ”اگر وہ یہاں تو کڑی نہیں کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کا حق ہے۔ میں کیوں اس کا اسٹنٹل یا منظور کروں؟“

”میرا مشورہ ہے آپ اسے بلا کر بات کر لیں۔ اس کے بعد فیصلہ کریں۔“

”اچھا اس کو بلا لو۔ فی الحال یہ اسٹنٹل ایک طرف رکھ دو۔“ میں نے جب ان سے بات کی تو معلوم ہوا کہ ان کے کچھ دیر پہلے حقیقی مسائل تھے جس کی بنا پر انہوں نے اسٹنٹل دیا تھا۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ ان کا کسی شعبہ سے مستقل تعلق نہیں تھا۔ ادارہ جب چاہتا ان کا شعبہ تبدیل کر دیتا۔ وہ بلحاظی طور پر اپنے آپ کو میٹل سٹریٹجی سوشل اولاد سمجھتے تھے۔ میں نے متعلقہ ڈائریکٹر وغیرہ سے باہمی مشورہ کے بعد ان کے مسائل حل کروادے جس کے بعد انہوں نے اپنا اسٹنٹل واپس لے لیا۔

اس واقعہ نے میری سوچ پر گہرا اثر ڈالا۔ جنٹ میں MSC کی ڈگری میرے پاس تھی۔ لیکن جب جنٹ کا عملی مسئلہ درپیش ہوا تو میں نے اس کو بہت سرسری طور پر اور سطحی طور پر دیکھا جبکہ میرے سیکرٹری نے جس کی تعلیم صرف انٹرمیڈیٹ تھی۔ اس مسئلہ کی گہرائی میں جا کر اس کی اہمیت کو جاننا۔ کتابوں میں چند اصول پڑھ لینا الگ بات ہے اور ان کا عملی اطلاق بالکل ہی جدا چیز ہے۔ کتابیں ایک مشعل کی مانند ہیں کہ یہ اپنے اطراف نور پھیلاتی ہیں مگر جب تک اس نور سے مستفید ہونے کے لیے عملی جہد نہ ہو یہ نور بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرے سیکرٹری نے مجھے وہ سبق پڑھایا تھا جو یونیورسٹی نہ پڑھا سکتی تھی۔

چند ماہ بعد میں نے یہ نوکری چھوڑ دی یہ میرا گہرا مقصود نہ تھا۔ مجھے دیر پا سو پر پاکستان میں پاکیزہ اور ہوائی جہاز کی نوکری چاہئے تھی۔ میں کینیڈا ”گلاپس“ آ گیا۔

لیکن ان کینیڈا کی بد نصیبی کی کوئی حد نہیں وہ اس دلہ بھی میری خدمات سے استفادہ کرنے سے محروم ہو گئی۔ اس نے لگاتار تیسری دلہ اپنے پاؤں پر کھلائی ماری تھی۔ میں ان کی قسمت پر صرف افسوس کر سکتا تھا۔ جو میں نے کیا۔

حسن النکل بہت مایوس ہوئے۔ ہار جا کر انہوں نے میرے ماں باپ کو بتا دیا کہ ان کا بیٹا کینیڈا امریکا اور لندن سے نہیں بلکہ غم آوار سے آیا ہے۔

کسٹم سے فارغ ہو کر گاڑی میں بیٹھ کر جیسے ہی اشارہ گیت سے نکل کر شہر اہل فعل پر داخل ہوئے تو ٹریفک کے ایک طوفان بے قبیری نے خوش آمدید کہا۔ ٹریفک کے اس بے ضبط اور بے اصول سیلاب کو دیکھ کر ایک دفعہ اور یقین ہو گیا کہ ”لوٹ کے بدحوہ مگر کرائے۔“

میں نے پچھلے تین ... سال کینیڈا اور برطانیہ میں گزارے تھے۔ ٹورونٹو اور لندن کی ٹریفک کا شمار دنیا کی بہترین اور قاعدہ والی ٹریفک میں ہوتا ہے۔ اس قسم کی ٹریفک کا عادی ہو جانے کے بعد کراچی کی بے حکم ٹریفک کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ میں ایک قسم کا تھکاؤ محسوس کرنے لگا تھا۔ اس تھکاؤ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ چند دن بعد جب کسی نے مجھ سے کینیڈا کے بارے میں جانا چاہا تو بجائے اس کے کہ میں ان کو کینیڈا کی زندگی اور تہذیب کے بارے میں کچھ کہتا میں نے جواب دیا۔ ”ٹورونٹو کی ٹریفک بہت سسٹمیک ہے۔“ میرے اس بے عمل اور بے سنجے جواب کا اور میرے انگریزی کے لہجہ کا مذاق کافی دنوں تک اڑتا رہا۔ مگر میں پاکستان ”لاپس“ آچکا تھا۔

پاکستان آنے کے بعد میری خواہش تھی کہ میں دوبارہ لی آئی اے میں ملازمت کر لوں۔ لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب میں تین سال قبل پڑھائی کی غرض سے امریکا گیا تھا تو میری کلاس شروع ہو چکی تھی۔ مجھے فوراً سے جوشٹر یونیورسٹی پہنچنا تھا اس لیے میں اپنا اسٹنٹل منظور ہونے سے جوشٹر ہی امریکا کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ یہ چیز لی آئی اے کے ضابطے کے خلاف تھی۔ لیکن میری مجبوری تھی۔ لی آئی اے میں میری واپسی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن میرے ذہن پر ہوائی جہاز سوار تھا۔

ان ہی دنوں مجھے کراچی میں واقع میٹل سٹریٹجی جاتے کا اتفاق ہوا۔ وہ لوگ ان دنوں ایک نیا شعبہ ”ورک اسٹڈی“ کے نام سے کھولنا چاہ رہے تھے۔ میری برہنہ کی تعلیم اس سے مطابقت رکھتی تھی۔ انہوں نے مجھے اس شعبہ کو چلانے کی پیشکش کی جسے میں نے منظور کر لیا۔ اس شعبہ کی ابتدا کے لیے مجھے ایک دفتر اور ایک سیکرٹری مہیا کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ میرے ساتھ ایک دم چلا بھی لگا دیا گیا جس کا ”ورک اسٹڈی“ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ایک اسٹریکٹر

ان کو ابھی تک اس سے اسٹیج حاصل ہے۔ لیکن اس کے لیے قانون سازی کی جاسکتی ہے۔

میں فریڈ سے برٹھم سے "لاپس" آنے اور پاکستان "لاپس" جانے سے پہلے مل چکا تھا اور اس سے اس ملاقات کی فرض و قاعدت سے بھی آگاہ کر چکا تھا مگر یہ اب سے تقریباً ایک سال پہلے کی بات تھی۔ میں چاہتا تھا کہ فریڈ سے دوبارہ مل کر اس کی یاد دہانی کروا دوں۔ اس مقصد کی خاطر میں اور کو ایلڈ مشرین کے دفاتر میں پہنچ کر فریڈ کے کمرے میں داخل ہوا۔ ہر میٹ بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے فریڈ سے اپنا مدعا بیان کیا۔ ہر میٹ نے سن کر کہا "مجھے پہلے ہی احساس ہوا ہے کہ اس کی تعلیم سے شکایت تھی۔ اب اس کی تصدیق ہو گئی۔ اگر کچھ سطحوں میں پڑھائی کرنا چاہتے ہو تو کسی جرمن یونیورسٹی میں جا کر پڑھائی کرو۔"

جرمن یونیورسٹی جانا تو اب ممکن نہیں تھا۔ لیکن میں نے ہر میٹ کو بتایا کہ NED کالج جانے سے پہلے میرا جرمنی جانے کا خیال تھا۔ میں نے وہ صبحے جرمن زبان بھی سیکھی تھی۔ اب بھی جرمن زبان میں گفتی کن سکتا ہوں۔

اگلے ہفتہ کی شام پر سیدھے ہاتھ سے دروازے سے اندر گئے ہوئے ہر میٹ نے اپنے لمبے کا اٹھارہ کیا۔ "یہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ تم نے جرمنی میں تعلیم حاصل کرنے کا سنہری موقع ضائع کر دیا۔"

ہر میٹ نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اگر جرمنی اتنا ہی اعلیٰ اور مہنگا ملک تھا تو وہ جرمنی کو چھوڑ کر کینڈا میں کیا کر رہا ہے۔ میں نے تو جرمنی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ضائع کر دیا تھا۔ لیکن ہر میٹ کے لیے تو اب بھی سنہری موقع موجود تھا۔ وہ کینڈا کو خیر باد کہہ کر اب بھی جرمنی واپس جاسکتا تھا۔ لیکن جرمنی واپس جانے کی بجائے ہر میٹ نے کینڈا میں ایک کھوٹا اور گاڑ لیا تھا۔ کہنے لگا "تم نے جرمنی میں پڑھنے کا موقع تو ضائع کر دیا مگر میں تم کو جرمن ماحول سے لطف اندوز ہونے کا ایک نادر موقع فراہم کر سکتا ہوں۔ ہفتہ کی رات تم میرے گھر گھرمانے کی پارٹی میں شرکت کر سکتے ہو۔" یہ تھا ہر میٹ کا کینڈا میں نیا کھوٹا۔ اس نے نو روٹوں کے مضافات میں نیا گھر خرید لیا تھا۔

ہر میٹ کا پارٹی میں شمولیت کا دعوت نامہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ "ہاں شراب کی بوتل لامنت بھولنا۔ تم فریڈ کی پارٹی میں انصاف کی طرح خالی ہاتھ چلے آئے تھے۔" میں اگر پارٹی میں گیا تب بھی میرا شراب کی بوتل

کینڈا اور امریکا اور ہمارے ملک میں نوکریاں حاصل کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ پاکستان میں سب سے پہلے سٹارٹس پر زور دیتا ہے۔ اگر وہاں کامیابی قدم نہ چڑھے تو پھر دوسرے حربے آزمائے جاتے ہیں۔ کینڈا ابھی اس دور میں ہم سے بہت پیچھے ہے۔

اس سے صرف نظر ابھی تک ان کے یہاں ہمارے ارکان پارلیمنٹ کی طرح جعلی ڈگریاں منظمی کرنے کا رواج بھی نہیں ہے۔ جعلی ڈگریوں کے فہان کا یہ ناقابل یقین فیمازہ ہے کہ آج تک میں نے کینڈا میں جتنے بھی انٹرویو دیے اس میں سے کسی ایک میں بھی ایک دفعہ بھی کسی نے میری ڈگریوں پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔ ان کی سوچ بہت سادہ ہے۔

نوکری جس وقت ملتی ہے اس وقت وہ یہی نہیں ہوتی ہے۔ وہ سے چار پختے تک کا آزمائشی دورانیہ ہوتا ہے۔ اس دوران میں مکمل کر اس بات کا پتا چلتا ہے کہ آپ کے دعوؤں میں کس قدر سچائی ہے۔ آپ کتنے پالی میں ہیں۔ آپ میں اپنا کام کرنے کا طم اور صلاحیت ہے یا نہیں۔ اگر آپ کے دعوے سچ ہیں تو نوکری یہی دور نہ باہر جانے کا دروازہ سامنے کھلا ہوتا ہے۔

کینڈا میں نوکری حاصل کرنے کے لیے جو ایک بہت زیادہ اہم چیز ہے وہ ہے ان سابقہ اداروں کا حوالہ جہاں پر آپ پہلے کام کر چکے ہیں۔ یہ معاملہ میرے لیے ٹیڑھا ہو سکتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں اپنے سابقہ پاس لمبے کو آگاہ کر دوں کہ میں نوکری کی تلاش میں ہوں اور اس ضمن میں اس کا حوالہ استعمال کروں گا۔ وہ کسی قسم کی جھوٹی معلومات میرے پچھلے کارناموں کے بارے میں نہ دے مگر غیر ضروری معلومات سے ضرور گریز کر سکتا تھا۔ ان کا فرد میں بھی ایک خرابی ہے۔

ان میں سے اسی بچھاری لوگ سچے اور ایماندار ہوتے ہیں۔ ہم ان کی بہتری کے لیے ان کو مسلمان بنا کر اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ باقی اللہ کے ہاتھ ہے۔ یہ تو عام آدمیوں کا معاملہ ہے حکومت اور اس کے اداروں میں کام کرنے والے اس سچائی اور ایماندار سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ حکومتی لوگ ہمارے حکمرانوں کے ہم قبیلہ ہیں۔ لیکن اُمید کی کرن یہاں بھی موجود ہے۔ وہ لوگ ابھی حوام کا بیسا اور دولت لوٹنے کے اس درجہ کمال کو نہیں پہنچے ہیں کہ جس درجہ کمال پر ہمارے حکمران اور ان کی لڑائی دین قاتل ہیں۔

معاوضہ

ایک دوپہر کو ایک بہت ہی پرانی پٹھری کا ایک دستور ان کے سامنے آ کر رکھ جانے والا ان کو قریب کھڑے ہوئے ایک شخص سے پولا۔

"بھائی! دروازہ کا خیال رکھنا، میں بھی ٹیلی فون کر کے واپس آتا ہوں۔"

کار کا مالک ٹیلی فون کر کے واپس آیا تو اس نے کار کا خیال رکھنے والے شخص کے ہاتھ پر دو روپے انعام کے طور پر رکھ دیے۔ اس آدمی نے گڑ گڑا کر کہا۔

"نکس روپے دیجیے جناب!"

کار کے مالک نے حیران ہو کر کہا۔

"اگر روپے — ایسے سراسر زیا دتی ہے۔ میں نے تو یہ دستور ان میں پانچ سوٹ بھی نہیں لگائے۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "جناب! میں وقت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس شرمندگی کا معاوضہ طلب کر رہا ہوں جو مجھے اس کار کے پاس کھڑے ہونے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ دوسرے گزرنے والے لوگ بھی کچھ بچتے کہ یہ کار بھری ہے۔"

ساتھ بچنے کی فرمائش کی۔ میرے شانے سے لگ کر اس نے مجھے اس زور سے بھینچا کہ اگر کچھ اور طاقت لگاتی تو میری پسلیوں کی خیر نہیں تھی۔ میوزک ختم ہوا تو میں نے اپنا کا شکر یہ ادا کیا اور باہر آ گیا۔ سامنے پال کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "ہیٹر ک کہاں ہے؟"

پال نے جواب دیا۔ "ابھی یہیں تھا، کہہ رہا تھا کہ میری بیوی حسن کے۔۔۔" پھر پال کو ایک دم خیال آیا کہ وہ تو حسن سے ہی مخاطب ہے۔ اس نے فوراً ہات پلٹ دی۔ "میرا مطلب ہے ہر مٹ کے ساتھ باقی رہی ہے۔ اس کو رجھانے کی کوشش کر رہی ہے۔" مجھے یہ سن کر سخت عداوت محسوس ہوئی۔ اگر یہ واقعہ پاکستان کے کسی اندرونی گاؤں میں ہوتا تو وہاں خون خرابہ ہو چکا ہوتا۔ ایک دو گھنٹے ہوئے کہ کسی کی بیوی کسی غیر آدمی کو رجھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن ہیٹر ک اس بات کو پال کے سامنے غریب انداز میں بتا رہا تھا۔ مجھے ڈھاکے کا وہ دکشا چلانے والا یاد آ گیا جس کی بیوی خود بھوسہ دیتی تھی، جو ان تھی اور وہ اپنی عزت کو پانچ روپے کے عوض فروخت کرنے کو تیار تھا۔ غریب اس کی بھوسہ دیتی تھی۔ لیکن ہیٹر ک کا اپنی بیوی کا اس طرح سے ذکر کرنا اس کی بے حسی اور بیوی کے مقدس رشتے کی توہین تھی۔ یہ مغرب کے سماج اور ماحول کا بدترین رخ تھا۔ ان کی سچائی، ایمان داری، محنت اور احساسِ ذمہ داری قابلِ ستائش خوبیاں ہیں کہ ہم ان خوبیوں سے محروم ہیں لیکن زندگی کے سماجی کے ساتھ یہ بے حس نا قابلِ معافی ہے۔ یہ اور لکسی ہی چند اور خرابیاں مغرب کے ماحول میں ہیں جن کی وجہ سے میں نے فیصلہ کیا کہ جتنی جلد ہو سکا میں اس ماحول سے نکل جاؤں گا۔

لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اسکینڈینیویائی پارٹی کا لطف تو میں فریڈ کے گھر کرمانے کی پارٹی میں دو سال پہلے اٹھا چکا تھا مگر مجھے جس طرح پارٹی میں اس سے پہلے بھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب موقع تھا، پختے کی رات کو میں تیار ہو کر ہر مٹ کے گھر کی طرف دو انا ہو گیا۔

ہر مٹ مجھے بیرونی دروازے پر ہی مل گیا۔ مجھے دیکھا۔ میرے ہاتھوں کو دیکھا پھر کہنے لگا۔ "آگئے ہیں تم پھر خالی ہاتھ اسی لیے میں نے تم کو فریڈ کے گھر سے میں یاد دلایا تھا کہ شراب کی بوتل لانا مت بھولنا۔" ہم دونوں فٹے ہوئے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔

گھر کے اندر وہی شور غوغا اور وہی شراب کی بو اور سگریٹ کا دھواں تھا جو فریڈ کی پارٹی میں تھا لیکن یہاں پر ایک حدت تھی۔ عام لائٹوں کی بجائے اودے رنگ کی خوب لائٹیں جل رہی تھیں جن کی روشنی کے اثر سے لوگوں کے چہرے اور کپڑے عجیب سے رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

یہاں پر فریڈ کے علاوہ میرے چائے والوں میں پال، ہیٹر ک اور ہیٹر ک کی بیوی اپنا شامل تھی۔ فریڈ کی پارٹی میں جو لباس انجیل نے پہنا ہوا تھا بالکل وہی لباس اس وقت اپنا نے پہنا ہوا تھا۔ یا تو انجیل سے لیا ہوگا یا شاید یہ پارٹی ڈریس تھا جو کرایہ پر ملتا ہوگا۔ کچھ اور انجیل مجھے کہیں نہیں دکھائی دے رہے تھے۔

دو گواہ مشرقی میں ملازمت کے دوران میں، میں اپنا سے دو ہار مل چکا تھا۔ میوزک شروع ہوا تو اپنا نے میرے

ہارلی ختم ہو چکی تھی۔ میں گھبرا کر سو گیا۔

☆☆☆

نوکری کی تلاش جاری تھی۔ میں نے کئی جگہ درخواستیں بھیج رکھی تھیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، میں نے ریسیور اٹھایا۔ فون کرنے والے نے اپنا تعارف کروایا۔ "میں سٹوڈینٹ سے بات کر رہا ہوں۔ میرا نام مرے ہوف مین ہے۔ آپ نے ہماری کچھ میں نوکری کے لیے درخواست بھیجی تھی۔"

میں نے اقبال جرم کیا کہ جی ہاں، یہ خطا مجھ سے سرزد ہوئی تھی۔ کہنے لگے "کل رات آٹھ بجے آپ مجھ سے فلاں فلاں ہوئے میں ملاقات کریں۔" ہٹاؤ نزدیکی کے ایک ہوٹل کا تھا۔ ڈاؤنزدوی لور تو کا ایک محلہ ہے۔

بات ختم کرنے سے پہلے سٹوڈینٹ مین نے اپنی شناخت بتائی۔ "میں برساتی پہنے ہوئے ہوں گا۔ سر پر فلیٹ ہیٹ ہوگا اور ہاں میرے منہ میں تمباکو کا پائپ ہوگا۔"

جواب میں نے ان کو اپنے طبقے سے آگاہ کر دیا۔ مجھے وقت کی پابندی کا ہمیشہ سے احساس رہا ہے کینیڈا جا کر اس کو اور زیادہ تقویت مل چکی تھی۔ میں ٹھیک آٹھ بجے ہوٹل کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ میرے ساتھ ہی ساتھ ایک اور صاحب بھی اسی دروازے سے ہوٹل میں داخل ہو رہے تھے۔ برساتی پہنے ہوئے تھے۔ سر پر فلیٹ ہیٹ تھی اور منہ میں تمباکو کا پائپ۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں نے ہاتھ ملایا اور ایک ساتھ ہوٹل میں داخل ہو کر ایک خالی میز پر قبضہ کر لیا۔ مرے نے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے پینے کے دوران میں وہ مجھ سے سوال جواب کرتے رہے۔ چائے ختم ہوئی تو مجھ سے گویا ہوئے۔ "مجھے اُمید ہے آپ ہمارے ساتھ کام کر کے خوش ہوں گے۔"

اتر دوی ختم ہو چکا تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ سٹوڈینٹ آفس پرنٹس شہر میں تھا۔ میں نے ٹورنٹو شہر کو خیر باد کہا اور پرنٹس شہر منتقل ہو گیا۔ یہ نہایت بڑا شہر تھا اور پرنٹس سے صرف دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ صبح اٹھنے کے بعد میں سب سے پہلا کام یہ کرتا تھا کہ اپنے بیلڈم کی کٹری کا پردہ سر کا کر یہ دیکھ لوں کہ کہیں رات میں برف نے وحاداً تو نہیں بول دیا۔ کسی کسی رات... رات بھر میں ایک فٹ سے بھی زیادہ برف گر چکی ہوتی تھی۔ ہائی وے تو جلد صاف کر دی جاتی تھی مگر چھوٹی

سڑکوں پر گاڑی چلنا اصحاب کی آزمائش ہو کر پڑتی تھی۔ سٹوڈینٹ اسٹور کھل رہا تھا۔ پھر کے دن اس کا افتتاح تھا۔ آج اتوار تھا۔ سٹوڈینٹ کا زیادہ تر سامان چاچکا تھا لیکن کچھ سامان ابھی باقی رہ گیا تھا۔ باب کو فارغ کرنے کے بعد وہ ہاؤس کی ساری دتے داری میرے سر آ پڑی تھی۔ اگر سامان وقت پر اسٹور نہ پہنچا تو اس کی جواہری میرے ہونے لگی۔

سٹوڈینٹ کا کاروبار میرے کے بھائی ڈیوڈ ہوف میں نے بہت ہی ادنیٰ پیمانہ پر اپنے گھر سے شروع کیا تھا۔ پھر جب کاروبار نے ترقی کی تو ڈیوڈ نے باب کو بحیثیت وہ ہاؤس مینجر ملازمہ رکھ لیا۔ ڈیوڈ اور مرے کی دن رات کی محنت نے کاروبار کو نکس سے نکس پہنچا دیا۔ کینیڈا کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں اس کے اسٹور کھل گئے۔ اسنے بڑے کاروبار کو سنبھالنے باب کی صلاحیتوں سے ماسوا تھا۔ اس کی کمزوریوں کی بنا پر کچھ کے منافع میں کمی واقع ہوتی جا رہی تھی۔ ڈیوڈ کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ منافع کی سطح کو برقرار رکھنے کے لیے باب کی جگہ دوسرا مینجر ملازم رکھا جائے۔ ڈیوڈ اور مرے نے باب کو فارغ کرنے کا فیصلہ میرے سٹور میں شمولیت اختیار کرنے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ میری ملازمت شروع ہونے کے ایک ہفتہ بعد مرے نے مجھے اپنے دفتر میں بلا دیا۔ "تمہیں باب کو ملازمت سے فارغ کرنا ہے۔ اس کو نوٹس کی بجائے دو ہفتہ کی تنخواہ دے دینا۔ یہ کام آج ہی کر لینا اور کل سے تم کو باب کے فرائض بھی انجام دینے ہوں گے۔"

"لیکن میں باب کو کس بنا پر فارغ کر دوں۔ میرے پاس اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "تم کو جواز تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ڈیوڈ کا فیصلہ ہے۔ وہ تم سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کو یہ کاروبار کیسے چلانا ہے۔ باب اسنے بڑے کاروبار کو چلانے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے۔ اس کو جانا ہوگا۔"

باب چلا گیا۔ لیکن آنے والے ڈیوڈ سال کے اندر احمڈ یو ڈاف مین کو بھی منافع کی کمی اور نقصان کا اندیشہ ہی راستہ دکھانے کا جو ڈیوڈ ڈاف مین نے باب کو دکھایا تھا قطع نظر اس حقیقت کے کہ ڈیوڈ ڈاف مین نے ہی سٹوڈینٹ کو جنم دیا تھا اور اس ہاؤس کو اپنے خون بھر سے بچا تھا۔ یہ قدرت کی قسم تھی۔ لیکن سرمایہ داری نظام کسی کے خون کی پیدا نہیں کرتا وہ صرف منافع پر چلتا ہے۔ جب سٹوڈینٹ کا نقصان کا

اگست 2014ء

150

ماہنامہ سرگزشت

سامنا کرنا پڑا تو کبھی نے لپوڑ ہاٹ میں کو فارغ کر دیا کہ اب وہ کبھی کو سود مند طریقے سے نہیں چلا رہا تھا۔

باب کی چٹائی ہو چکی تھی۔ نیا اسٹور کل کھلنا تھا۔ اسٹور کا باقی ماندہ سامان بیچنا میری ذمہ داری تھی۔ میں نے سامان دین میں لود واپا اور نئے اسٹور جانے کے لیے ہائی وے 401 کا رخ کیا۔ صبح سویرے برف پڑ چکی تھی لیکن ہائی وے صاف کر دی گئی تھی۔ میں آرام سے اسٹور پہنچی گیا۔ اسٹور پر سامان اتروانے کے بعد میں واپس ہائی وے پر آ گیا۔ اب میں برٹشٹن واپس جا رہا تھا۔ سامان اتروانے کے بعد دین بالکل خالی ہو چکی تھی۔ اس کے پچھلے حصے میں کوئی وزن نہیں تھا۔ انجن سامنے ہونے کی وجہ سے دین کا سارا وزن آگے کی طرف تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے غلام محل کا مرکز (سینٹر آف گریوٹی) بالکل آگے کی طرف آ چکا تھا۔

ہائی وے 401 کینیڈا کی معروف ترین ہائی وے ہے۔ تین لین آنے والی ٹریک کے لیے اس کے بعد بیچ کی کھائی جس کے بعد جانے والی ٹریک کے لیے تین لین 401 تیز رفتار ہائی وے ہے لیکن برہاری کے سبب میں دین کو میں بکپس میل سے زیادہ کی رفتار سے نہیں چلا سکتا تھا۔ میں آرام آرام سے دین چلا رہا تھا کہ یکایک سڑک پر سامنے ہی ہوئی برف کا ایک گھوا آ گیا۔ جیسے ہی دین کا اگلا پیچا برف پر سے گزرا۔ دین گھوم گیا۔ اس نے جانے والی تینوں لین گراس کیں۔ اس کے بعد درمیانی کھائی کو پار کر کے آنے والی تینوں لین گراس کیں پھر مخالف سمت میں گھوم کر آنے والی تینوں لین دوبارہ گراس کیں پھر آخر کار درمیانی کھائی میں آ کر اور دین کا انجن بند ہو گیا۔ یہ سب کچھ صرف چند سیکنڈ میں ہو گیا۔

ہائی وے 401 اتنی معروف شاہراہ ہے کہ اس پر اگر خدا خواستہ کوئی گاڑی ایک لین بھی گراس کر جائے تو وہ احوالی سو گاڑیوں کا گھراؤ ہو جاتا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ یہاں تو چھ کی چھ لین گراس ہو چکی تھیں۔ زعمہ نیچے کا کوئی امکان نہ تھا اگر 401 کی معمول کی ٹریفک ہوتی۔ اس وقت اگر ہزار گاڑیوں کا بھی آئیں میں گھراؤ ہو جاتا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ اتنا بڑا برف ہاری کے باعث میرے آس پاس کوئی گاڑی نہیں تھی۔ کسی گاڑی کا ہائی وے 401 پر نہ ہونا بھی ایک غیر معمولی بات تھی کہ اس پر ہر وقت گاڑیوں کا اتنا بندھا ہوتا ہے۔

پندرہ میں منٹ تک میں دین میں ساکت و صامت

کم صم بیٹھا رہا۔ میری کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا۔ کوئی آدمی کھٹے کھٹے بعد حواس ٹھکانے آئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ گاڑی کو کھائی سے باہر نکالا اور برٹشٹن کا رخ کیا۔ اللہ نے آج بڑا کرم کیا تھا۔

کینیڈا میں سردی، برف ہاری میں سڑکوں کے حادثات بہت واقعات ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ ہو چکے ہیں۔ اسنو اتنی خطرناک نہیں ہوتی ہے جتنی نجد ہارٹس ہوتی ہے۔ یادہ اسنو جو کھٹلے کے بعد دوبارہ جم جاتی ہے۔ دوبارہ جمی ہوئی اسنو برف کی ہلکی سی تہ بن جاتی ہے جس کی پملاہٹ انتہائی خطرناک ہو سکتی ہے۔ ایک دفعہ مجھے اس صورت حال سے بھی گزرنے کا اتفاق ہوا۔

نورڈنٹو کے مضافات سے نورڈنٹو شہر جانے کے لیے ایک ہائی وے ہے جس کا نام ہے گارڈز انکمپرس دے۔ نورڈنٹو شہر سے چند میل پہلے اس پر ایک گھماؤ آتا ہے جو تقریباً دو کلومیٹر لمبا ہے۔ ایک شام میں اس گھماؤ سے گزر رہا تھا۔ اسنو پھسل کر دوبارہ جم چکی تھی۔ گاڑی کی رفتار کم کرتے کرتے کوئی چار پانچ کلومیٹر فی گھنٹہ رہ گئی تھی۔ اس وقت اس سڑک پر ہزاروں گاڑیوں کے بس دکھائی دے رہا تھا۔ گاڑیوں کو گھماؤ کے مطابق موڑنا بھی تھا لیکن اگر اسٹیرنگ پر ڈراما بھی زیادہ دباؤ ڈالا تو گاڑی پھسل کر آس پاس کی گاڑیوں سے جا گرائے۔ برف لگانا موت کو دعوت دینا تھا کہ گاڑی اس زور سے پھسلتی کہ ڈرامیڈ اور گاڑی دونوں کا پچھا مشکل ہو جاتا۔ ہزاروں گاڑیوں کے ڈرامیڈ کو بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ صرف اُمید تھی۔ خدا خدا کر کے یہ موڑ کٹا۔ دو کلومیٹر کا فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ یہ قیامت کے ڈیڑھ گھنٹے تھے۔

نئے اسٹور کا سامان چھوڑ کر میں گھر واپس آ چکا تھا۔ لیکن آج کی مشکلات کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ میں سودا تھا۔ رات کے تین بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”آپ کے وہ ہاؤس میں چور گھس آیا ہے۔ فوراً پہنچیں۔“ یہ ٹیلی فون سکیورٹی کی طرف سے آیا تھا۔

میں نے منہ پر گرم پانی کے چھینٹے مارے۔ کوٹ پہنا۔ اس کے اوپر اوور کوٹ پہنا۔ سر پر ایسی ٹوپی پہنی جو کانوں کو بھی چھپاتی تھی اور ہاتھ میں دستالے۔

ویز ہاؤس پہنچا تو وہاں پر دو گاڑیاں پولیس والوں کی اور ایک گاڑی سکیورٹی کی گھنٹی کی گھڑی تھیں۔ میرا انتظار ہو رہا

مجھے خیال آیا کہ اگر یہ یونٹ پاکستان میں ہوتے تو یہ سارے کے سارے یونٹ مرمت کر لیے جاتے۔ شاید ان میں سے کوئی ایک جگہ بھی ضائع نہ جاتا۔ ہمارے ملک میں بہترین واپس موجود ہے۔ صرف اعلیٰ سطح اور تعلیم میں ہی نہیں بلکہ کم ترین سطح پر بھی۔ بات صرف اتنی ہی ہے کہ ہماری دہانت مٹی راہوں پر نکل پڑی ہے۔ دولت کی بوس نے ہمارے ہر جذبہ کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

ہم طالب "دولت" ہیں ہمیں تنگ سے کیا کام
ہنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا
(اصل معرہ: ہم طالب شہرت ہیں.....)

پچھلے دو سال سے سڑکوں کو مرمت نہیں ہوا تھا۔ کبھی مسلسل گھاتے میں جاری تھی۔ یہ بات کبھی کے اسٹیک ہولڈرز کے لیے ناقابل قبول تھی۔ انہوں نے ڈیوڈ ہلف مین کو اسی راستے پر بھیج دیا جس راستے پر ڈیوڈ نے باب کو بھیجا تھا۔ اس بات کو کوئی اہمیت دیے ہوئے کہ ڈیوڈ نے ہی اس کبھی کی وارنٹیل ڈالی تھی۔ اس کو ختم دیا تھا۔ اس کو اپنے خون سے بچ کر پردان چڑھایا تھا۔ اگر ڈیوڈ اس کبھی سے مرمت نہیں کما سکتا ہے تو اس کی جگہ کسی اور کو لگایا جاسکتا تھا۔ کبھی کا نیا پینڈیٹنٹ جان گرین۔ جان سے پہلی ملاقات کے دوران میں ہی ہم دونوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کام نہیں کر سکتے تھے۔ ہم دونوں کی سوچ کا انداز مختلف تھا۔ چند دن بعد میں نے اپنا مقصد جان جان کے ہاتھ میں پکڑا لیا اور عارضی طور پر پاکستان "لاہیں" آگیا۔ چند مہینے کے لیے۔ پاکستان میں کچھ وقت گزارنے کے بعد جب میں پاکستان سے کینیڈا "لاہیں" آیا تو اس کے چند مہینے بعد میری کینیڈا میں قیام کی دہ مدت پوری ہو چکی تھی جب میں وہاں کی شہریت کے لیے درخواست دے سکتا تھا۔ میں نے درخواست دے دی۔ اب صرف شہریت کے لیے انٹرویو اور شہریت کی طرف بروہاری کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔

جب دو مہینے انتظار کے بعد بھی انٹرویو کی کوئی سن گن نہیں ملی تو میں نے اپنا سامان پانی کے جہاز سے پاکستان روانہ کیا اور خود ہوائی جہاز پر بیٹھ کر جدہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ جہاز فضا میں بلند ہو چکا تھا۔ نیچے نورتنو شہر کی روشنیاں جھلملارہی تھیں۔ میں نے ان روشنیوں پر آخری نظر ڈالی۔ کینیڈا..... اللہ وادع۔

(جاری ہے)

تھا۔ وہ ہاؤس کی چاہاں میرے پاس تھیں۔
وہ ہاؤس میں جو سکیورٹی سسٹم لگایا گیا تھا اس میں آواز جیسے چاپ، ہاتھیں وغیرہ محسوس کرنے کے آئے۔
(سنسز) بھی موجود تھے۔ کوئی کڑی ہو یا چاپ کی آواز ہوتو وہ بھی پکڑ میں آ جاتی تھی۔ انہیں صوتی سنسز کے سسٹم سے معلوم ہوا تھا کہ وہ ہاؤس کے اندر کوئی موجود ہے۔
پولیس والے اسلحہ کے ساتھ وہ ہاؤس کے اندر داخل ہوئے۔ میں باہر ہی کھڑا رہا۔ ٹھہرنا رہا۔ چند منٹ کے بعد ایک پولیس والا باہر نکلا تھا اس نے کل کر مجھے آواز دی۔ "آ جانیں چور پکڑا گیا۔"

میں اندر گیا تو دیکھا کہ چور پولیس والے کی گود میں بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے اقبال جرم کیا۔ "میل ڈالو"۔ ایک ملی تھی جو کسی طرح وہ ہاؤس کے اندر رہ گئی تھی۔ اور باہر نکلنے کی جدوجہد میں ابھر کر بھاگ رہی تھی۔ اس کی اس بھاگ دوڑ سے صوتی سنسز کے سسٹم نے سکیورٹی کبھی کو آگاہ کر دیا تھا۔ اس چور کو پھنسی لگانا ہے سو دھوتا۔ میری نیند خراب ہو چکی تھی۔

چند دن بعد میں کسی کام سے دھڑ شاپ گیا۔ دھڑ شاپ کے باہر تین چار اسلکڈ رکھے ہوئے تھے جو ہارڈ ویئر سے لدے ہوئے تھے۔ اس میں کارڈ ریڈیو، شپ، پلیئر، کیسٹ پلیئر وغیرہ شامل تھے۔ میں نے معلوم کرنا چاہا کہ آخر اتنی بڑی تعداد میں یہ ہارڈ ویئر کے یونٹ کیوں رکھے ہوئے ہیں تو مجھے بتایا گیا کہ یہ تمام کے تمام یونٹ کھالوں کو دینے کے لیے ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ آخر یہ تمام کا تمام مال کہاں میں کیوں بچا جا رہا ہے کیونکہ ان میں سے تقریباً تین چوتھائی جگہ ایسے تھے جو دیکھنے میں بالکل نئے لگ رہے تھے۔ مجھے کہا میں بیچنے کی وجہ بتائی گئی۔
"یہ تمام کے تمام جگہ یونٹ وارنٹی کے تحت مرمت کے لیے آئے تھے۔"

"تو پھر ان کی مرمت کیوں نہیں کی جا رہی ہے۔"
"اس لیے کہ جتنا خرچ مرمت کرنے میں آئے گا۔ اس سے کم پیسوں میں ہم ان کو نیا یونٹ دے سکتے ہیں اور کہاڑی سے جو پیسے ملیں گے وہ اس کے علاوہ ہیں۔"
سنسز کی زیادہ تر ہارڈ ویئر جاپان سے بن کر آتی تھی اور بہت سستی پڑتی تھی۔ اس کے برعکس کینیڈا میں ہر دوری اتنی سبکی تھی کہ نیا یونٹ وارنٹی میں دے دینا سستا پڑتا تھا۔ بہت اس کی مرمت کرنے کے۔



اگست
منظور امام

عہد سوی سن کا یہ مہینا کئی معنوں میں اہم ہے۔ ہمارے لیے تو بطور خاص اہم ہے کہ اس مہینے کی چودہ کو ہم نے دو سو سالہ غلامی کی زنجیر کو کاٹ کر اپنا ملک آزاد کرایا تھا، اس مہینے میں اور کتنے اہم واقعات رونما ہوئے اس کا مختصر سا جائزہ۔

مطلوبہات حاصل کرنا جنہیں پسند ہے ان کے لیے کلک کریں

یہ عیسوی سال کا آٹھواں مہینا ہے۔ لاطینی میں اس مہینے کو Sextilis کہتے ہیں کیونکہ کسی زمانے میں رومی کیلنڈر کے مطابق یہ سال کا چھٹا مہینا ہوتا تھا۔ 753 BC تک یہ سال کا چھٹا ہی مہینا رہا۔ جبکہ اس زمانے میں مارچ سال کا پہلا مہینا ہوتا تھا۔ پھر 700 BC میں یہ سال کا آٹھواں مہینا ہو گیا۔ اس کے دنوں کی تعداد میں بھی الٹ پھیر ہوتی رہی ہے۔ یہ پہلے اٹھائیس دنوں کا ہوا کرتا تھا۔ پھر جو لیس بیزرنے اس میں اس وقت کو وسیع کر دی۔ جب

وہ جو لیکن کینڈر ترتیب دے رہا تھا۔

جب سے پیدائشی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مہنا خالی کیا ہو جب انسانی تہذیب نے انقلابات نہ دیئے ہوں۔ دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہا ہے۔

اسی مہینے 14 اگست کو دنیا کے نقشے پر ایک نئے ملک کا اضافہ ہوا۔ وہ ہے میرا اور آپ کا پاکستان۔ جسے لاکھوں جانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا گیا۔ چودہ اگست پاکستان کا یوم آزادی ہے، جبکہ چودہ اگست ہندوستان کا۔ اسی مہینے ایلن ہوگ اسٹاٹ لینڈ میں مشہور آرٹ فیسٹول بھی ہوا کرتا ہے۔ اس فیسٹول میں دنیا بھر سے آرٹ کے دلدادہ اور پرفارمر شامل ہوا کرتے ہیں۔ موسیقی، پینٹنگ، ہمسہ سازی، اسٹیج اور اسٹیریٹ قصیر، شاعری، کیا نہیں ہوتا۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا فیسٹول ہوتا ہو جہاں ادب اور آرٹ کے عیسے الٹی پیاس بجا سکیں۔ یہ مہینا ثقافت پیاریوں کے خلاف لگے لگانے کی مہم سے آگاہی کا مہینا ہے۔ فلپائن میں یہ مہینا ان کی اپنی زبان لہان سے آگاہی کا ہوا کرتا ہے۔ (جو کہ اس میں تاریخ کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس لیے میں نے تاریخ نہیں لکھی)

اوپر میں اس مہینے ایک بہت دلچسپ جشن ہوا کرتا ہے اور وہ ہے بڑاواں بچوں کا جشن۔ ملک بھر سے جڑواں خاص طور پر اس جشن میں شریک ہوا کرتے ہیں۔ جتن میں بھی ایک فیسٹول ہوتا ہے۔ یہ ایک بہت قدیم بدھ روایت ہے۔ اس میں پورا خاندان ایک ساتھ ہو کر خوشیاں منا تا ہے۔ ایک دوسرے کو اپنے حالات سے باخبر کرتا ہے۔ اگست کے اس مہینے سے تھارل کے بعد آئیں اگست کی تاریخوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

پہلی اگست

Francis Scott Key کی پیدائش۔

1779ء

یہ امریکی وکیل جارج ڈاؤن میں پیدا ہوا۔ ایک اچھا مصنف اور شاعر بھی تھا۔ اس نے امریکا کے لیے ایک ترانہ لکھا تھا The star-spangled Banner۔ امریکی تاریخ میں اس لحاظ سے اس کی بہت اہمیت ہے۔

پہلی اگست 1949ء کو کینیڈا کے سائنس دان جارج ڈاؤسن کی پیدائش ہوئی۔

1884ء میں جان مایون کی پیدائش ہوئی۔ اس نے

امراض میں بائسلین کا استعمال شروع کیا۔

1938ء میں فرانس کے مشہور فیشن ڈیزائنر اور ہند کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا فیشن ڈیزائنر کہا جاتا ہے۔

پہلی اگست 1981ء کو دنیا کا سب سے مشہور اور مقبول ٹی وی میوزک چینل MTV شروع ہوا۔ اس کی ابتدا نیویارک شہر سے ہوئی۔ ایک ادارہ تھا Viacom Media Network جس نے یہ چینل شروع کیا۔ دنیا کے تقریباً ہر ملک میں اس کی نشریات دیکھی اور پسند کی جاتی ہیں۔ میوزک کے شائقین کے لیے اس سے بہتر اور مستند کوئی میوزک چینل نہیں ہے۔ ایک مکمل میوزک چینل کا تصور بہت پرانا ہے۔ 1960ء کی میں کچھ اداروں نے اس پر سوچنا اور کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

مشہور گروپ Beatles کے گانوں سے متاثر بنانے پر ایک گانے کی ابتدا ہوئی۔ چلو نے اپنے مشہور گانے اس گانے سے پردھوٹ کیے جیسے A hard Days Night اور Cant buy me love۔

ایک میوزک چینل MTV سے پہلے بھی آچکا تھا۔ مشہور فلم ساز لورے وارنر برادرز نے میوزک ٹی وی شروع کیا تھا۔ MTV سے دکھایا جانے والا پہلا ویڈیو Video killed the Radiostar تھا۔

پہلی اگست کو Respect Parents Day یعنی اپنے والدین کی عزت کرنے کا دن منایا جاتا ہے (ہم خدا کے فضل سے کسی دن کے تکلف کے بغیر والدین کی عزت کرتے ہیں)

پہلی اگست 1291ء میں سوئٹزر لینڈ کا قیام عمل میں آیا تھا۔

سوئٹزر لینڈ کو دنیا کی جنت کہا جاتا ہے۔ یہ ملک اپنی بے پناہ نظری خوبصورتی کی وجہ سے مشہور ہے۔ 1291ء میں تین رہائشی اس میں شامل ہوئی تھیں۔

یہ ایک بہت چمکدار اور غیر جانب دار ملک ہے۔ یہ اب تک کسی جنگ میں شریک نہیں ہوا۔ چھوٹا ہونے کے باوجود اس کی اکالوی بہت مضبوط اور با اثر ہے۔

اس کی آبادی بھی زیادہ نہیں ہے۔ مشکل سے ایک کروڑ کے قریب ہوگی۔ اس کے باوجود صرف اپنی مضبوط

اکالونی کی وجہ سے اسے اقوام عالم میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

یہاں جرمنی، فرنگی، انگلیس اور سوئس زبانیں بولی جاتی ہیں۔

پہلی اگست کو The wonbar Ful Wizard of oz فرینک ہم نے رجسٹرڈ کر لیا تھا۔ 1941ء میں ولیمز ٹک کھن نے پہلی جیب سامنے لائی تھی۔ پاکستان میں 1960ء میں حکومت پاکستان کا مرکز اسلام آباد قرار پایا۔

دو اگست 1834ء کو مشہور فرانسیسی مجسمہ ساز اسٹی برتھ ہولڈی کی پیدائش ہوئی تھی، اس نے امریکا کا مشہور مجسمہ آزادی Statue of Liberty بنوائے۔ اسی نے 1835ء میں ایشیا گرے کی پیدائش ہوئی۔ اسی نے ابتدائی فون کا تجربہ کیا تھا۔ 1926ء میں ایک کامیاب بزنس مین Betsy Blooming کی پیدائش ہوئی۔ اس نے امریکا کا مشہور ڈیپارٹمنٹ اسٹور قائم کیا۔ 1904ء میں مانگیل اردوون نے شیشہ سازی کی صنعت کی ترقی کے لیے شیشے کو ڈھالنے کا فریم بنایا۔ اس کے بعد شیشہ سازی کی صنعت کو ترقی ہوئی۔ اسی تاریخ کو میری ہودن کی پیدائش ہوئی تھی۔

1492ء۔ 3 اگست یہ وہ تاریخ ہے جب مشہور جہاز دان کولمبس اپنے پہلے سفر پر روانہ ہوا تھا۔

3 اگست 1897ء کو ولیم پارلور ولڈ ٹائٹ نے اسٹریٹ کار کنٹرولر متعارف کروایا تھا۔

1961ء میں 4 اگست کو امریکی موجودہ صدر باراک اوباما کی پیدائش ہوئی۔ اسی تاریخ کو 1755ء میں گولڈن جیک کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے نسل انہاد کی تھی۔

1857ء میں ناروے کے ادیب نٹ ہان سن کی پیدائش ہوئی۔ اپنے بے مثال کاموں پر ہان سن نے 1920ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

پانچ اگست 1930ء میں ادیب میں ٹیل آرٹ اسٹرونگ کی پیدائش ہوئی وہی چاند پر جانے والا مشہور عکاس باز۔

1902ء میں رابرٹ برائنٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔ رابرٹ برائنٹ امریکی مصنف اور تصویر نگار۔ بچوں کے ادب کے حوالے سے اس کو جانا جاتا ہے۔ اس نے 40 سال میں 26 کتابیں لکھیں اور وہ سب کی سب مقبول

ہیں۔

1944ء میں اس نے "جارج" لکھا تھا۔ اس کتاب کا شریچوں کے کلاسک میں کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بچے اور ایک شریچے بھوت کی دلچسپ کہانی ہے۔ اس کی دوسری کتابوں میں Travel of Ching اور The Olivars وغیرہ ہیں۔

5 اگست 1540ء میں جوزف جھٹن کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس شخص نے جو لین کیلنڈر کو تیار نہیں دیں۔ 1802ء میں ٹیل آکٹل کی پیدائش ہوئی۔ یہ ناروے کا مشہور ریاضی دان تھا۔

5 اگست 1904ء کو مشہور ماہر نباتات Kauneth thi man کی پیدائش ہوئی۔ جڑی بوٹیوں پر اس نے بے مثال کام کیا تھا۔

1906ء میں ماہر معاشیات ویسل کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1973ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

5 اگست 1997ء کو ٹھنڈی ہاسکن نے اپنی ایجاد Talking Patty رجسٹر کروایا تھا۔

6 اگست 1917ء میں ہاربر ما کوئی کی پیدائش ہوئی تھی۔

ہاربر ما کوئی۔ بچوں کے ادب پر کام کرنے والی امریکی مصنفہ ہاربر ما کوئی ایک میں پیدا ہوئی تھی۔ اشغال 10 مارچ 2000ء کو ہوا۔ اس کی کتابوں نے اسے دو بار بہترین مصنفہ کا اعزاز دلوا یا۔

اس کی مشہور کتابوں میں Dx-Cort man, Miss Ranm Ptlus وغیرہ ہیں۔ اس تاریخ کو اوڈی کی برتھ ڈے منائی جاتی ہے۔ بچوں کا پسندیدہ کارٹون کردار گارلیٹ کی دوست لی وی دیکھنے والا ہر بچہ گارلیٹ کو جانتا ہے۔

1809ء کو افریقہ لارڈ ٹینی سن کی پیدائش ہوئی۔ بہت اچھا شاعر، مناظر لطیف پر اس کی شاعری کلاسک کا درجہ رکھتی ہے۔

8 اگست 1859ء میں جے آر تھری کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ ایک مشہور میگزین ایڈیٹر تھا۔ اس نے ایمیزن پارکرنے کے لیے گرم ہوا کا ظہار بنایا تھا۔

6 اگست 1976ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے پورٹ نام کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔

1928ء میں Betsy Byars کی پیدائش

اگست 2014ء

155

ماہنامہ سرگوشٹ

1902ء میں مشہور برطانوی ٹرسٹ (ممبر فزکس) ارسٹ لارنس کی پیدائش ہوئی۔ اس نے کوانٹم میکینکس بنایا اور 1933ء میں نوبل انعام حاصل کیا۔
8 اگست 1922ء میں مشہور فیشن ایڈیٹر ڈوڈی گریش کی پیدائش ہوئی۔ اس نے پیلا تیرا کی کالہاس اور مٹی اسکرٹ بنایا۔
8 اگست 1911ء میں فرانس ہرٹن نے گاڑیوں کے لیے ایک نیا ڈیزائن حریف کر دیا۔
1819ء میں ولیم تھامس گرین کی پیدائش۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دندان سازی میں سب سے پہلے انجریکا استعمال کیا۔
9 اگست 1898ء میں رڈلف ڈیڈل نے ڈیڈل انجن بنایا تھا۔
1910ء میں آسٹرو فرسٹ ولیم ڈاکٹر کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1983ء میں نوبل انعام حاصل کیا تھا۔
1927ء میں مارٹن سٹیک کی پیدائش ہوئی۔ اس نے کمپیوٹر کے لیے Artificial Intelligence بنایا تھا۔
1909ء میں مشہور زمانہ فورڈ موٹر کار پوریشن نے ٹریڈ مارک فورڈ رجسٹرڈ کرایا۔
اس ہاروی اگست کو ماحولیات حسین کا عرس لاہور میں ہوگا۔ ماحولیات حسین اکبر اور جہانگیر کے عہد میں تھے۔ ان کا حرارہ چھرا لاہور میں ہے۔ آپ اپنے حال میں مست رہے دالے صوفی بزرگ تھے۔ ان کی شاعری رندانہ قصوف کی شاعری ہے۔
آپ ایک جگہ فرماتے ہیں: ”رہا میرے حال داعرہم تو۔“
اعزقوں ہیں ہاتھوں ہیں روم روم وق قوں۔ قوں
یہاں ہوتی ہاں سب کچھ پیدائشوں۔
1921ء میں مشہور مصنف ایٹکس پیلے پیدائش ہوا تھا۔
ایٹکس پیلے کی کئی کتابیں بیٹ سکر کی لہرست میں رہی ہیں۔
گیارہ اگست 1958ء میں کرشن اسٹیک مین کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک مشہور ہانڈ ورڈ لوہست تھا۔ اس نے 1929ء میں نوبل پرائز حاصل کیا۔
1926ء میں برٹش ایئر لائنز کی پیدائش۔ فیشن ایڈیٹر

ہوئی تھی۔
ایک مشہور امریکی مصنف ہے۔ اس نے بچوں کے ادب پر بہت کام کیا ہے (کلاہر ہوتا ہے کہ مطرب میں بچوں کے ادب پر باقاعدگی سے کام ہوتا ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں بچوں کے لیے لکھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے)
Summer of The Betsy
1971 Swan کی بہترین کتاب قرار پائی تھی۔
7 اگست 1779ء میں Carl Ritter کی پیدائش ہوئی۔ اس نے علم جغرافیہ کو جدید نظریات دیے۔
1783ء میں جان اچو کاٹ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے لیس بنانے کی مشین بنائی تھی۔
سات اگست 1880ء میں گسٹاویو کی پیدائش ہوئی۔ اس نے انسانی جسم میں ایک خاص قسم کے جنسی ہارمون کا پتہ چلا دیا تھا۔
1886ء میں لیوی ہزل ٹائن کی پیدائش ہوئی۔ اس نے ایک سرکٹ بنایا جو نیوٹن ڈائن سرکٹ تھا۔ اس کی وجہ سے آگے جا کر دیو کی ایجاد ممکن ہو گئی تھی۔
1903ء میں ایک مشہور انجریکا لوہست لیوی کی پیدائش ہوئی۔
7 اگست 1935ء میں ولیم کولج نے Cat Hose Ray Tube حریف کر دیا۔ یہ آلہ فی وی اور دیگر برقی مصنوعات میں استعمال ہوتا ہے۔
7 اگست 1944ء میں پیلا پروگرام سکرورڈ کیلکولیٹر سامنے آیا۔ اسے پروڈاکٹ انجن نے مشہور ادارے IBM کے تعاون سے بنایا تھا۔
17 اگست 1955ء میں اس وقت کے وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے استعفیٰ دیا تھا۔
7 اگست کو (یعنی 2014ء) کے حساب سے اسلامی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ جنگ حنین پیش آیا تھا۔ (بہ مطابق اس سوال)
8 اگست 1861ء میں ایک برطانوی ہاپلوہست ولیم بیٹ مین کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے ٹیلی ہارڈیو کو جنگ کی اصطلاح دی۔
1901ء میں ایک مشہور سائنس دان ارسٹ لارنس پید ہوا۔ اس نے 1939ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

فرخ سیر

۱۶	۱۶۸۳-۱۷۱۹ء	۱۶
۱۷	شہنشاہ عظیم الشان کا چٹا، شاہ عالم کا	۱۷
۱۸	پاتا۔ لہ آباد کے صوبیدار عبداللہ خان بارہ	۱۸
۱۹	اور اس کے بھائی سید حسین علی خان کی مدد	۱۹
۲۰	سے فوج تیار کر کے اپنے باپ کے خون کا	۲۰
۲۱	بدلہ لینے کے لیے جہاندار شاہ امین شاہ عالم	۲۱
۲۲	بہادر شاہ اول سے کجوا میں لڑا۔ فتح پالی، پھر	۲۲
۲۳	آگرہ میں دوسری مرتبہ سے شکست دے کر	۲۳
۲۴	قتل کیا۔ ۱۷۲۳ء میں بادشاہ بن گیا لیکن	۲۴
۲۵	تمام اختیارات سید برادران کے ہاتھ میں	۲۵
۲۶	تھے جنہیں لوگ "بادشاہ گر" کہنے لگے	۲۶
۲۷	تھے۔ لوگوں کے بھڑکاوے میں آکر بادشاہ	۲۷
۲۸	نے ان سید بھائیوں سے دشمنی پیدا کر لی جبکہ	۲۸
۲۹	وہ انہی کی مدد سے بادشاہ بنا تھا۔ حسین علی	۲۹
۳۰	خان دکن سے مرہٹوں کو چڑھا لایا اور انہیں	۳۰
۳۱	دکن میں چوتھ وصول کرنے کا حق دے دیا۔	۳۱
۳۲	مرہٹوں کی مدد سے سید بھائیوں نے فرخ سیر	۳۲
۳۳	کو قید کر کے قتل کر دیا۔ رنج المدد جات اور	۳۳
۳۴	رنج اللہ کو بکے بھد دیگرے تخت پر بٹھا پودہ	۳۴
۳۵	تین تین مہینے میں فوت ہو گئے۔ پھر سیدوں	۳۵
۳۶	نے شاہ عالم بہادر شاہ کے ایک پوتے روشن	۳۶
۳۷	آخر کو محمد شاہ کے قہب سے بادشاہ بنا دیا۔	۳۷
۳۸	مرسلہ: نعمان اختر، راولپنڈی	۳۸

میں حصہ لینا شروع کیا اور کامیاب ہوتی چلی گئی۔ مشہور شو
Wils West شو کی میزبان بھی رہی۔
۱۳ اگست ۱۶۵۵ء میں جوبان کرسٹوف کی
پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے ایک مشہور ساز کا دھبہ بنایا تھا۔
اسی تاریخ کو ۱۸۱۹ء میں ہاروج گہرمل کی
پیدائش۔ اسکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والا یہ شخص فخرست اور
ریاضی دان تھا جبکہ ۱۸۸۸ء میں اسکاٹ لینڈ میں جان
لاگ ہیرڈ کی پیدائش۔ اس نے ٹی وی کا ایک سسٹم بنایا۔ اسی
تاریخ کو ۱۹۰۲ء میں جرمنی کے ٹیکس وائلر کی پیدائش۔
اس شخص نے وائلر ڈوٹری اسٹیشن سسٹم بنایا۔
۱۹۱۸ء میں برطانوی ہایو کیسٹ فریڈرک سامک

اگست ۲۰۱۴ء

157

مشہور براڈ "لارڈ شیلے" کا خالق۔

گیارہ اگست ۱۹۵۳ء میں مشہور ریسلر ہلک ہوگن
کی پیدائش ہوئی۔

یہ ریسلر جابر جی میں پیدا ہوئے۔ اس کا پورا نام ٹیری
جیمز جو لیا ہے۔ لیکن شہرت ہلک ہوگن سے پائی۔ اس کے
بارے میں مشہور ہے کہ اس نے کبھی فائل پے نہیں کیا۔ یعنی
ریسلنگ میں غلط طریقے نہیں اپناتے۔ ہلک ہوگن ریسلر
ہونے کے علاوہ منگر اور کپڑا بھی رہا ہے۔ اس کے ٹریزر کا
نام Itioto ہے۔ ہلک ہوگن نے دوبارہ ۱۹۹۰ء اور
۱۹۹۱ء میں راکر ریسل جیت کر ریکارڈ بنایا تھا۔

گیارہ اگست ۱۹۹۹ء میں مکمل سورج گرہن ہوا
تھا جبکہ پچھلے سورج گرہن ۳ نومبر ۲۰۱۳ء کو دیکھا گیا
تھا۔ یہ گرہن یورپ کے کچھ حصوں، شمالی امریکا ایشیا اور
افریقہ کے کچھ علاقوں میں دیکھا گیا تھا۔

گیارہ اگست ۱۹۷۳ء کو چوہدری فضل الحق
پاکستان کے صدر قرار پائے تھے۔

گیارہ اگست ۱۹۵۰ء میں پیدا ہونے والے
Steve wozniak نے اپیل کیپیوٹر تصدیق کر دینے
تھا۔

بارہ اگست ۱۹۳۰ء کو کلیئر لیس برڈ نے خوداک کو پختہ
کر کے ان کی پیکنگ کا طریقہ دریافت کیا۔ اس طرح ہم
ڈبوں میں بند خوداک کو مینوں بعد بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

بارہ اگست ۱۹۸۱ء میں IBM کے PC کا اعلان
ہوا۔

یہ ملائی نیشنل ٹیکنالوجی اور کسٹمٹنگ کا بہت بڑا ادارہ
ہے۔ اور تقریباً پوری دنیا کو اپنی سرورس فراہم کرتا ہے۔ اس کا
پورا نام International Business
Mactinas ہے۔ IBM کا ہیڈ کوارٹر نیو یارک میں
ہے۔ اس کا قیام ۱۹۱۱ء میں ہوا تھا۔

پہلے اس کا نام Computer Tabulating
Recording Compny تھا۔ پھر یہ IBM ہو گیا۔

۱۳ اگست ۱۸۶۰ء میں Annie oaklery
کی پیدائش ہوئی تھی۔ اپنی ادائگی کو وہیں پیدا ہوئی۔

اس کی شہرت عام ہوائے جھپکی تھی۔ اپھل کود،
گھڑ سواری، نشانہ بازی اس کے مشاغل تھے۔ بلا کی ہم
جو تھی۔ اس نے اپنی حرکتوں سے ایک دنیا کو دیوانہ بنا رکھا
تھا۔ اس نے اسکول کے زمانے ہی سے شوٹنگ کے مقابلوں

مہینہ ستمبر گزشت

کی پیدائش ہوئی اس نے وہاں ملے پرانے حاصل کیا تھا۔ ایک بار 1958ء میں اور دوسری بار 1980ء میں۔

1512ء Aztec کا خاتمہ ہوا تھا۔ یہ وہ تہذیب ہے جو مرنے ہوئی۔ یہ تہذیب وسط میکسیکو کی تھی۔ چودھویں سے سولہویں پختہ ہوئی۔

اس لفظ کا مطلب ہے وہ لوگ جو Aztlan سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی زبان لوہائی کہلاتی تھی جو لب معصوم ہو چکی ہے۔ یہ سرخ ہندی Red Indian کہلاتے تھے۔ شمالی امریکا کی سابقہ تہذیبوں میں سے ایک یہ قوم بہت ذہین تھی۔ اس نے اپنی ذہانت کے کئی ثبوت دیے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی درست تقویم کا استعمال کرتے تھے جو 365 دنوں پر مشتمل ہوتا تھا جبکہ ایک مذہبی تقویم بھی تھا جو 260 دنوں کا ہوتا تھا۔ آرکیک کا صدر مقام "تینوں جیلان" تھا۔

یہ شہر ایک بڑے بڑے پر بنا دیا گیا تھا۔ اس وقت یہ شہر دنیا کے بڑے شہروں میں سے ایک ہوا کرتا تھا۔ ان لوگوں کے بنائے ہوئے ابھرام آج بھی میکسیکو میں موجود ہیں اور دیکھنے والوں کو حیران کرتے رہتے ہیں۔ اس تاریخ کو پیدائش کریم اے بھی منایا جاتا ہے۔ اسی تاریخ کو 1917ء میں Alica Provinsen کی پیدائش ہوئی۔ آلاسکا کو میں پیدا ہوئی۔ اس کے شوہر کا نام مارٹن پردون سینا تھا۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان بے انتہا مودت تھی۔ دونوں برسوں تک مل کر کام کرتے رہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے چالیس کے قریب کتابیں لکھیں اور تصویروں بھی بنائیں۔ دونوں اپنے آپ کو ایک جان اور دو قالب نہ صرف کہا کرتے بلکہ اس کا ثبوت بھی دیا ہے۔

چودہ اگست 1945ء دوسری جنگ عظیم میں جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔

اتحادی افواج جاپان کی کامیابیوں سے بہت پریشان ہو گئی تھیں لہذا انہوں نے جاپان کے خلاف ایک ایسا بے رحمانہ قدم اٹھایا کہ انسانی تاریخ میں خون ریزی کی اس سے بڑی مثال نہیں ملتی۔ جاپان نے اس وقت ہتھیار ڈالے جب 6 اگست 1945ء کو امریکا نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گر دیا۔ جس میں اتنی جانی ہوئی کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ صرف اس پر اکتفا نہیں کیا۔ 16 اگست 1945ء کو دوسرا ایٹم بم ناگاساکی پر گر دیا۔ اس کے بعد جاپان کے پاس سرخڑ کر جانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کیونکہ کہا یہ

جا رہا تھا کہ اس طرح ہر شہر پر بم گر دیا جائے گا۔ اس خوف سے 14 فروری 1945ء کو اس نے گل طور پر سرخڑ کر دیا۔

چودہ اگست 1777ء Hans Crisians Oersted کی پیدائش۔ انمارک کا فزسٹ اور کیمسٹ۔ اس نے دیو آف نیچرل لکھا اور الیکٹرو میگنٹوم پر کئی تجربات کیے۔

1883ء ہرسٹ جسٹ کی پیدائش۔ یہ ایک مشہور بائیولوجسٹ تھا۔

1903ء میں سرس ڈائریکٹر جان رنگنگ کی پیدائش۔ یہ شخص رنگنگ برادرز میں سے ایک تھا۔ کمپنیاں کے شعبہ میں IBM نے MS.DOS اور ڈون حصارف کو دیا۔

چودہ اگست 1947ء۔ پاکستان کا یوم آزادی۔ اسی تاریخ کو 1991ء میں نواز شریف نے وائس پر باب پاکستان کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور 2000ء میں پریمر شرف نے لکل گورنمنٹ آرڈر آف ماسٹریٹ کیا۔

15 اگست 1912ء میں جولیا جائلز کی پیدائش۔ یہ خاتون اپنے زمانے میں پورے امریکا کی خواتین کی پسندیدہ تھیں۔ یہ کیل فورنیا میں پیدا ہوئی۔ یہ بہترین مصنفہ تھیں۔

جولیا نے فرانسیسی لفظ کھانوں کو امریکا میں نہ صرف متعارف کروایا بلکہ ان کو بنانے کے طریقے بھی لی دی پر پختہ رہی۔

15 اگست 1744ء میں مشہور سوس ماہر باجیات الین فریڈ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے Mycolgicum سسٹم ایجاد کیا۔

16 اگست 1892ء میں فرانسیسی فزسٹ وٹس وکٹر کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے 1929ء میں نوٹل پر انٹز حاصل کیا تھا۔

1896ء میں Leon Therwin کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے ایک ساز ایجاد کیا تھا اس ساز کا نام اس کے نام پر رکھا گیا ہے۔

16 اگست 1845ء میں گہرائی سپرین کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک فرانسیسی فزسٹ تھا۔ (فزکس کے علم کا ماہر) اس نے نوٹو گرنی کے لیے پہلی نوٹو گراک پلیٹ بنائی۔ فزکس کے شعبے میں اپنی خدمات پر 1908ء میں نوٹل

انعام بھی حاصل کیا۔
1848ء میں فرانسیسی لادوین کی پیدائش ہوئی۔

پوری دنیا کا تہذیب ترین دانشور۔ اس کی تصوری آف ریویو لیون نے ایک ہنگامہ پا کر کے رکھ دیا تھا اور آج تک اس پر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کے کام کو اس کے بیٹے چارلس لادوین نے آگے بڑھایا۔
16 اگست 1862ء کو ایک ایسے شخص کی پیدائش ہوئی جس کو کھیلوں کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اس کا نام ہنس لٹل وڈ اسٹاک تھا۔ یہ فٹ بال کے بانڈوں میں سے تھا۔

16 اگست 1904ء کو Wandeppe stanlay کی پیدائش ہوئی۔ مشہور بائو کیمسٹ۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے وائٹس کو کرسٹلائز کیا۔ 1946ء میں نوبل پرائز حاصل کیا۔ 16 اگست 1961ء کو ہائے اردو مولوی عبدالحق کا انتقال ہوا۔

اسی تاریخ کو 1991ء میں چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اسلم بیگ ریٹائر ہوئے۔ ان کے بعد یہ عہدہ جنرل آصف نواز نے سنبھالا۔

16 اگست 1997ء میں گلکار، موسیقار و استاد نصرت علی خان کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف 48 سال تھی۔

17 اگست 1870ء کو فریڈرک رسل کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس شخص نے ایمپائز کا موثر ٹیکہ بنا دیا تھا۔

17 اگست 1906ء میں ہارلی شپ کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک مشہور کیمسٹ اور کیمیکس بنانے والا تھا۔

17 اگست 1993ء میں تھامس وٹس نے اسکیت بورڈ ایجنٹ تھا۔

1939ء میں مشہور فلم Wizaed of Oz کا پریمیئر ہوا۔

17 اگست 1988ء کو ضیاء الحق کے طیارے کو بدترین حادثہ پیش آیا تھا جس میں وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

16 اگست 1934ء میں مارشل لیڈ کی پیدائش ہوئی اس نے مارشل لیڈ ہیڈ مارٹنس اسٹوڈیو قائم کیا تھا۔

1904ء میکس لیکٹر جو نیئر کی پیدائش۔ جو میکس لیکٹر کا سیکس کا Ceo اور میکس لیکٹر سینٹر کا بچا تھا۔ پوری دنیا کی خواتین اس ادارے کو بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔

18 اگست 1947ء میں پاکستان UN کا ممبر بنا۔

18 اگست 1871ء میں ارول رایت کی پیدائش ہوئی تھی (رائٹ برادران میں سے ایک) اسی تاریخ کو

1948ء میں امریکا کے صدر ہل کلنٹن کی پیدائش ہوئی تھی اور 1785ء میں ہیٹ تھامس کی پیدائش۔ جس نے آگے

چل کر گھڑی ساز ادارہ قائم کیا اور بڑی تعداد میں گھڑیاں بنانی شروع کیں۔ اسی تاریخ کو 1919ء میں ہاکم فوربس کی پیدائش۔ یہ ایک مشہور پبلشر تھا جس نے مشہور فوربس

میگزین شروع کیا۔ 1888ء میں ہیلیئم میں ایک ایسا رسم کی ابتدا ہوئی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ

میں لے لیا اور ہر سال اس رسم کا انعقاد درودشور سے کیا جاتا ہے اور وہ ہے مقابلہ حسن۔ اس کی ابتدا بہت تھوڑے عرصے

پر ہوئی تھی۔ اس لیے مقابلے میں ویٹ ایڈجک کی 18 سالہ حسینہ نے کامیابی حاصل کی تھی اور اب تو یہ مقابلہ ایک بہت

بڑا کرشل ایونٹ بن چکا ہے۔

20 اگست 1741ء کو Tus Baring.... نے آلاسکا اور یانٹ کیا تھا۔ اسی تاریخ کو 1930ء میں فائو فرس درتھ نے ایک لیڈی پینٹ کر دیا تھا۔

21 اگست 1888ء کو ولیم ہارڈے نے دنیا کا پہلا کیمیکو لیٹر بنا دیا تھا۔ اسی تاریخ کو 1952ء میں پاکستان اور

ہندوستان ہیٹ بنگال اور ویٹ بنگال کی سرحدوں پر متعلق ہوئے تھے۔

بائیس اگست 1762ء میں این فرینکن کی پیدائش ہوئی۔ یہ دنیا میں کسی بھی اخبار کی پہلی خاتون ایڈیٹر تھی۔ اسی

تاریخ کو 1860ء میں ہال پپ کی پیدائش ہوئی جو بی بی کا موہد کہلاتا ہے۔ اسی تاریخ کو 1920ء میں لائنڈ کو لے

ہارٹ سرجن کی پیدائش۔ اس نے پہلی بار مصنوعی دل کی لڑائی پیش کی۔

22 اگست 1932ء میں BBC نے تجرباتی نشریات کا آغاز کیا۔ 22 اگست 1952ء میں پاکستان اور

ہندوستان کے درمیان فون کار رابطہ شروع ہوا تھا۔ اسی تاریخ کو 1966ء میں لوئس نے چاند سے زمین کی پہلی

تصویر اتاری۔ (اور اس دن پتا چلا کہ ہماری زمین چاند سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے)

23 اگست 1926ء میں مشہور ایفرا پلو جٹ کلورڈ گیز کی پیدائش ہوئی۔ 1933ء میں مین فریڈ

ڈوناٹک کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے دواؤں کی جانچ کا مسلم بھاد کیا تھا۔

23 اگست 1904ء میں آلو موہاں ہارجن پینٹ ہوا تھا۔

24 اگست کو روم کا مشہور شہر پاپائی آتش فشاں کے غضب کا شکار ہو کر تباہ ہو گیا تھا۔ یہ حادثہ 79 اے ڈی میں پیش آیا تھا۔ آگ کے بڑے بڑے گولے پھاڑ کے دہانوں سے نکل کر ہیں ہیں تھیں تھیں کلو میٹر تک برس گئے تھے کہا جاتا ہے کہ ہیرہ شہر پر گرائے جانے والے اہلیم بم سے سونکا زیادہ طاقت ور اور تباہ کن مواد اس پھاڑ سے نکل کر شہر والوں پر نازل ہوا تھا۔ اس کی آبادی تھیں پانچ ہزار کی رہی ہوگی۔ جس میں سے سولہ سترہ ہزار افراد اسی وقت مر گئے تھے جبکہ پورا شہر کھردہ بن کر رہ گیا تھا۔ آج بھی اس پھاڑ کے گرد تھیں لاکھ کی آبادی کا ایک بڑا شہر آباد ہے۔ یہ آتش فشاں فی الحال تو سویا ہوا ہے لیکن بھی بھی جاگ اٹھے گا مگر کب یہ کوئی نہیں جانتا۔

جوہیں اگست 1880ء میں جو شوا کی پیدائش ہوئی۔ اس نے نقش لامت بنانے میں تعاون کے علاوہ اپنے طور پر پہلی کھلونا الیکٹرک لڑین بنائی تھی۔

چوہیں اگست 1898ء میں بلجیم کے سائنس دان البرٹ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے خلیات کی ساخت اور کارکردگی کا جائزہ لیا۔ اور 1974ء میں نوبل انعام حاصل کیا۔ 1918ء میں کیمیکل انجینئر رے کی پیدائش ہوئی۔

اس نے Styro foam ایجاد کیا۔ 24 اگست 1993ء کو منہ سے بلبلا لٹانے والی گڑباز رجسٹر ہوئی۔

24 اگست 1967ء میں پاکستان کے پہلے اسٹیل کا چٹا ٹک میں انتخاب ہوا تھا (اب یہ شہر بلکہ دیش میں شامل ہے۔)

24 اگست 2002ء میں جنرل پرویز مشرف نے ایک فریم ورک آرڈر جاری کیا۔

25 اگست 1841ء میں تھیر اور کوشر کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک سولس سرجن تھا۔ اس نے 1908ء میں نوبل حاصل کیا تھا۔

1916ء میں امریکی ماہر حشرات فریڈک راہن کی پیدائش۔ اس نے 1954ء میں نوبل انعام حاصل کیا۔

26 اگست 1740ء میں جوزف موشوئیر کی پیدائش

ہوئی تھی۔ اس شخص نے گرم فہرے کو فضا میں ٹھہرانے کا تجربہ کیا تھا۔

1743ء میں مشہور فرانسیسی سائنس دان ایتوئی لودج کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے پہلی بار آکسیجن کے لیے آکسیجن کی اصطلاح استعمال کی۔ ویسے سائنس دانوں کو معلوم کر چکے تھے کہ فضا میں آکسیجن موجود ہے جو زمین کے لیے بہت ضروری ہے لیکن اسے کوئی نام نہیں دیا گیا تھا۔

26 اگست 1850ء میں چارلس رچٹ کی پیدائش ہوئی۔ یہ فرانسیسی فزیا لوجسٹ تھا۔ اس نے 1913ء میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

1906ء میں البرٹ ساین کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک امریکی ماہر ویا لوجسٹ تھا اس شخص نے پہری دنیا کے بچوں کے لیے ایک بہت بڑا کام انجام دیا۔ وہ ہے پولیو کے قطرے۔ اس نے پولیو کے قطرے بنائے تھے۔

1951ء میں ایڈورڈ واکمن کی پیدائش۔ یہ ایک امریکی ریاضی دان تھا۔

28 اگست کو آر تھر سیکرائی نے نوٹو گرائی کے لیے ایک ایسا تاب بنا یا جس میں دن کی روشنی میں ہی ظلم کے رول دخل کھتے تھے۔

(اب تو خیر کیمروں سے رول و پیرہ فتح ہو چکے ہیں کیونکہ دوسرا سسٹم آگیا ہے۔ لیکن پہلے کیمروں میں تصویریں کھینچنے کے لیے رول ڈالے جاتے تھے اور ایک اندھیرے کمرے میں اس رول کو خاص کیمیکل سے دھویا جاتا تھا جس سے تصویریں واضح ہو جاتی تھیں پھر ان تصویروں کو اسی اندھیرے کمرے میں نکھایا جاتا تھا)

26 اگست 2006ء میں اکبر بٹنی کی ہلاکت ہوئی۔

27 اگست 1910ء میں مدثر سیال کی پیدائش ہوئی۔ خود کو خدمت خلق کے لیے وقف کر دینے والی عیسائی راہبہ نے اپنی زندگی غریبوں اور بے کسوں کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ ہندوستان کے شہر کلکتہ میں ساٹھ برسوں تک غریبوں و نادار بچروں کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ مدثر سیال مقدونیہ بلقان کے شہر اسکوپجی میں پیدا ہوئی تھیں۔ تاہم ان پر الہالوی اور مقدونیائی باشندوں کا یکساں دھوکا ہے۔ کیونکہ اس وقت مقدونیہ کے نام سے کسی جگہ کا وجود نہیں تھا۔ بلکہ یہ شہر سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ انہوں نے اپنے ادارے کی بنیاد انیس سو پچاس میں شخص بارہ راہباؤں کے ہمراہ رکھی تھی۔ جن کی تعداد بعد میں بڑھ

ساتھ کی۔ اس گروپ کا نام جیکسن قائم ہوا۔ مانگیل ابتدا میں کانگریس پارٹی تھا پھر جب اس کی صفحہ میں سامنے آنے لگیں تو گروپ کا سربراہ ہو گیا۔ اس کے ایلم Life thriller- On The wall دھیرہ پوری دنیا میں سے جاتے ہیں۔ 750 طین کا بچوں کی فروخت کا ریکارڈ قائم کیا۔ اس کی موت پر پوری دنیا کے محفلوں کے بارے میں بتاتے رہے تھے۔

1971ء میں راشد منہاس شہید کو نشانِ حیدر دیا گیا۔

30 اگست 1852ء میں ڈیوڈ فریڈل کیسٹ جیکب ہیریکس کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1901ء میں نوٹل انعام حاصل کیا تھا۔

اسی تاریخ کو 1884ء میں سوڈن کے کیسٹ تھیوڈور کی پیدائش۔ جسے 1936ء میں نوٹل انعام سے نوازا گیا۔

30 اگست 1927ء میں مشہور فیشن ڈیزائنر جینرے ہین کی پیدائش ہوئی۔ اس نے B ہارکون ایوارڈ حاصل کیا۔ فیشن کی دنیا کا ایک مستند ایوارڈ ہے۔

30 اگست 1994ء میں IBM نے اعلان کیا کہ اسے اس پر اعتراض نہیں ہے کہ مائیکروسوفٹ وینڈوز کی اصطلاح استعمال کر رہا ہے۔ یہ دو بڑی کمپنیوں کے درمیان مطابقت کا معاہدہ تھا۔

1870ء میں ہارپا موتی سوڈی کی پیدائش ہوئی۔ ہارپا کی پیدائش انگی میں ہوئی۔ اور انتقال ہالینڈ میں ہوا تھا۔ ہارپا نے یونیورسٹی آف روم میں تعلیم حاصل کی۔ آپ فزیشن بھی تھے۔ ایک عرصے تک وینی طور پر کمزور بچوں کے لیے کام کرتی رہیں۔ آپ نے ایک چھوٹا سا اسکول "کاسٹلی ہام ہین" کے نام سے شروع کیا تھا۔

پہلا کاسا 6 جنوری 1907ء میں نکھو گیا۔ جس میں بچا اس ساتھ بچے تھے۔ ان کی تعلیم دینے کا طریقہ دارا مختلف تھا۔ یہ بچے کے احصاء اور حواس کو فعال کرتے۔ پھر اس میں ذہانت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ آپ کے غلوں اور گن کی وجہ سے یہ طریقہ تعلیم مقبول ہوتا چلا گیا اور اس وقت دنیا کے ہر حصے میں کاسٹلی ہام ہین اور موتی سوڈی اسکول موجود ہیں۔

کرساڑھے چار سو تک اور دائرہ کار ایک سو تیس ممالک تک جا پہنچا۔ مدر لیسہ کو ان کی خدمات کے صلے میں 1979ء میں نوٹل انعام دیا گیا۔ ہندوستان نے انہیں بھارت رتن دیا۔ پاپائے روم نے ہیرکت شخصیت قرار دیا ہے۔ یہ سعادت ہیٹ قرار دیے جانے یا حیسانیت کے تحت ولایت کا مرتبہ حاصل کر لینے کے برابر ہے۔ مدر لیسہ کا انتقال 1997ء میں نکلے میں ہی ہوا تھا۔

27 اگست 1874ء کو جیمز کیسٹ گارلی جوش کی پیدائش۔ اس نے وائس کی مشہور کمپنی BASF بنائی۔ 1931ء میں نوٹل پرائز حاصل کیا۔

1877ء کو چارلس اسٹیوارٹ ولس کی پیدائش۔ برطانوی کارساز، اس نے مشہور گاڑی رولز راس بنائی۔ جو دنیا کی پہلی ترین گاڑیوں میں سے ہے۔

1890ء امریکی آرٹس اور نوٹو کرافر مین رے کی پیدائش۔ اس نے ڈیج سوڈن ایجاد کیا۔

28 اگست 865ء میں عالم اسلام کے ایک بہت بڑے انسان رازی کی پیدائش ہوئی تھی۔ آپ کا پرانام ابو بکر محمد ابن زکریا الرازی تھا۔ آپ ایک نامور مسلمان عالم، طبیب، فلسفی، ماہر علم نجوم اور کیمیا دان تھے۔ آپ جالینوس العرب کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کی ولادت ایران کے شہرے میں ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جمرہ نے طب ایجاد کی، جالینوس نے طب کا سالیہ کیا، رازی نے مختلف سلسلہ ہائے طب کو جمع کیا اور لندن سینا نے تکمیل تک پہنچایا۔

29 اگست 1561ء میں جرمن ریاضی دان PilsCus کی پیدائش ہوئی۔ اس نے علم الحساب میں ریگیمیٹر کا اضافہ کیا۔

1904ء میں جرمنی ہرولڈ جسٹ ورنر کی پیدائش ہوئی۔ 1956ء میں نوٹل پرائز حاصل کیا۔

29 اگست 1958ء میں امریکا کے مائیکل مانگیل جیکسن کی پیدائش ہوئی۔ اس کا پرانام مائیکل جازل جیکسن تھا۔ اظہار میں 29 اگست 1953ء میں پیدا ہوا اور 25 جون 2009ء میں لاس اینجلس میں انتقال ہوا۔ یہ مشہور سنگر، راک، ڈسکو ہرٹم کے گانے گایا تھا۔ یہ بہترین میوزیسن سٹار، گیت نگار اور ڈانسر ہونے کے علاوہ بہترین ایجنٹ آرگنائزر بھی تھا۔ اس نے اپنے کیریئر کی ابتدا اپنے بھائیوں کے گروپ کے



سراپ

راوی: شہباز ملک

تحریر: کاشف زمیر

68/1

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پاری تھیں۔ اسے ان میں اپن کشش اور اپن للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو مسخر کرو اور ہمارے مسخرے میں مسخور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراپ۔ اپنا سراپ جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو ہٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھپیں لیتا ہے۔ سراپ ہی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دالروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ ولت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی حیر اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال دلوں سے گندمی ایک تہلک خیز کہانی

اگست 2014ء

162

ملہنامہ سرگزشت

www.paksociety.com

www.paksociety.com



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ہاں کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں نے دلی میں چاہا تھا۔ میری بہت سہرا میرے بھائی کا اصرار تھا کہ میں بھیجے۔
 کے لیے حریف سے لڑا۔ اسی دوران ڈانٹل سے گراؤ ہو گیا پھر یہ گراؤ والی تانیسی بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ایوان شاہیہ دھن تھے تو
 دوسری طرف سفیر، عظیم اور ہم جیسے ہاں مار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک پہنچ گئیں۔ میں مددگار
 دھن لوں تو فتح خان سے گراؤ ہو گیا۔ اس کے آدھوں کو کھست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ آئے وقت میرے ساتھ حکومت دھن کا ایک راجہ کس
 آگیا جو شہلا کے ساتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے دیکھ کے ہنگاموں کے ساتھ ساتھ کس کو حاصل کر لیں۔ ہم دیکھ میں سیف سے
 بریف کس لٹل چپے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدھوں کو بلا لیا تھا۔ وہ مجھے بریف لیا کہ فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ
 سوہا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ایوان شاہیہ کے ہرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، بہت شاکر لے آیا پھر ہنگاموں کو چکا
 تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے اسی شکل بھیج کر انھیں کو بھی بلا لیا۔ بہت شاکر میرے بہتول سے فتح خان کو شاکر لے کر لیا تھا کہ اس کے آدھوں نے بہت
 شاکر کو گولی مار دی۔ مرتے وقت بہت شاکر بولا "اتھ"۔ "کسٹ" "دو توڑتے بہت شاکر آواز صرف میں لے کر تھی انھوں نے دیر میں اعتراف ہو گیا کہ فتح
 خان نے اعتراف کیا ہے کہ اس پوری کھردہ والی میں میرا اٹھ ہے۔ بھیجے مانیک سے اطلاع دیا کہ جو بھی ہے، وہ اٹھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب
 کے آدھوں تھے۔ وہاں سے میں نکل گیا۔ وہاں میں بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم چڑی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھر کر کے کس کو دیا
 اور انھیں کو خوراک دیکھتے ہی تانیسی سے مارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم جھلکے کی کوشش میں غصے سے تھے اطلاع لی کہ شہلا کا فون آ گیا تھا۔ میں
 شہلا کے گھر کی تلاش لینے پہنچے تو باہر سے کس۔ ہم بھینک کر گئے۔ پہلے تو کس کو دیا گیا۔ شہلا نے کس کو دیا تو کس نے خود کو اڑیے آدھوں کی تحویل میں دیا کہ میں
 ان کو ان کی لڑکتا کر لٹل بھاگا۔ سیف تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھر لیا۔ انھیں زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کس کو دیا تو کس نے ہم دونوں کو بکھڑا لیا۔ وہ مجھے
 پھر سے اڑیے آدھوں کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کس کو دیا تو کس کے برساتے حق میں کہی۔ میں وہ سٹوں کے درمیان آ کر لی وی وی دیکھ رہا تھا کہ
 ایک خبر پھر آئی کہ ایک کوشی میں ہم دھماکا کوشی کی تانیسی سے کس نے دھماکا کیا۔ مرشد نے بھائی کو روکتے سے بٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی
 تلاش تھی۔ اس لیے امدد کی کوشش کی جانب توجہ دی تھی خبر لی کہ شہلا کس سارے ہائی ٹیکس سے ملنے چلائی ہے۔ میں وہ سٹوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل
 پڑا۔ کچھ کے ذمے کام ہنگاموں کو دھماکا کوشی میں۔ سارے کوشش میں ہم دھماکا کوشی میں۔ ہم اس گھر سے نکل کر باہر کی طرف بڑھ گئے۔ وہاں ہم سے
 ایک دوست کے گھر میں غصے سے۔ اس دوست کے بٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو کھانا دیا تو کس نے وہ لڑکی مر رہی تھی۔ وہ ہمیں بریف کس تک لے کر لگا دیا
 بریف کس نے خود کس کو دیکھ کر بریف کس لے لیا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو کس کا کچھ لوگ ایک گاڑی پر ٹاؤنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے
 غلط آدھوں کو بھنگا دیا۔ اس گاڑی سے کس کو دیکھ لیا۔ وہ دھمکی دے رہا تھا۔ ہم نے بریف کس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کس کو ایک
 گڑھے میں چھپا دیا۔ وہاں آیا تو فتح خان نے ہم پر کڑوا لیا۔ بہتول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا کہ میں نے جب گڑھے میں اچھا ڈالا تو
 وہاں بریف کس نہیں تھا۔ اسے میں میری لہر آؤں گے جس دالے نکلے گئے۔ انھوں نے فتح خان پر ٹاؤنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف
 کس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کس لے کر چلے گئے۔ ہم وہاں ہی عہدہ لڑکی کو کس پر آ گئے۔ سفیر کو دھن بھیجا تھا اسے ان پورٹ سے کس آف کر کے آ رہے تھے کہ
 راستے میں ایک بھڑا سا کسپٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی میں تھوڑے سیاست دان کی جی ٹی ٹی میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ بڑھتی ہوئی تھی۔ میں اپنی کوشش
 میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم تھکے ہوئے ہیں۔ جتنا صبر ہمیں کس سے طوا چاہتا تھا۔ ٹیلی کا پڑے جو شخص آیا اسے کچھ کریں چمک لیا۔ وہ
 میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ مائی کھڑا تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آ یا اس سے میں بہت کچھ کھ گیا۔ اس نے مجھ پر کیا کس
 ہر روز نصف لیٹر فون اسے دیوں۔ بحالت مجھ پر میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی ہال کی کو بکھڑا کس کو دھمکی دھن لٹل رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر
 حملہ کیا تو زس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر دھماکا ہو گیا۔ وہاں آیا تو میں اڑیے میں تھا۔ ہانگی انھوں کو کھانچے ہوئے تھی۔ وہ لوگ ہمیں
 گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے راستے میں بی ٹیکس ایوان والوں نے دھمکی کا اشارہ کیا۔ حیات قمر کر گیا اور کس کو یہاں کس کو دھمکی دے چلے گئے۔ مجھے
 راج کھوئی حریف میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں اندرونی سازش شروع ہو گئی۔ پھر نے کھوئے نے سازش کر کے ہانگو اپنے بیٹے دھم میں ہے ہوئی کی حالت میں ہوا
 لیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشاک کے ساتھ رشتہ گزراؤ تو اوردہ ہوا جائے گی۔ میں نے دھن پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھ پر ہانگو ہانگو دلی آ گیا اور اس نے
 دھن کو بہتول کے تختے پر لے کر اپنے ساتھ چلے کو کہا۔ ہانگو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کس روز کے بعد مجھے کھانے میں ہے ہوئی کی امداد کی گئی جس کا اثر
 نہیں ہوا۔ ٹیکس اور دھن اندر آئے۔ میں نے ان پر کھانا لیا پھر راج کھوئے کا پیر دیا لیکن جب دھماکا کھولا تو باہر بڑا کھوئے کھڑا تھا۔ "شہلا! جھمار
 بیٹک کر باہر آ جاؤں میں نے یہ وقت راج کھوئے کے اٹھ بڑے تیار ہوا۔ ہانگو بہتول لٹل کر دھماکا کر لیا۔ وہاں سے نکل کر راستے میں شام ... کی گاڑی پر
 قبضہ کیا اور راج کھوئے کو گاڑی میں اٹل کر بھاگ لیا۔ شہلا بھیج کر دھماکا صاحب سے بات کی۔ انھوں نے ہوئی میں کھرا دھماکا۔ میں دھن کھوئے کو بریف لیا کہ
 پاکستان پہنچنے کی تیار کر رہا تھا۔ اسپتال جہاں کھوئے کو دھماکا کیا تھا وہاں سے نکل کر اٹھ کر بہتول کی دلی میری گردن پر آ گئی اور دھن کی آواز ابھری۔ "لہا
 مت شہلا۔" میں نے اسے کھوئے سے ادر کرے ہوئی کیا اور دھن کی سے نکل کر آوا ہوئی بھیج کر اسے کس کے ذریعہ تمام دوستوں اور اپنے گھروالوں سے بات
 کی۔ میں نے پان ملایا تھا کہ کھوئے کو انھوں کے ٹیلی کا پڑے کے ذریعہ ہارڈ کر اس کر لیں گا۔ اسے آخر کرنے اسپتال پہنچا اور جیسے ہی اندر داخل ہوا ڈاکٹر

امرت سنگھ سامنے آگیا۔ اس کے اچھ میں سر جیک بٹنک تھی۔ اس نے چمک کر بچھا آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ اسے میں نے گھبرا کر لیا۔ اس نے بتایا کہ راجستھان کوڈ کو کھال لے گیا ہے۔ میں نے فوراً جان بچا کر نکل کر کالہ سے راج کوڈ کا چچا کوڈ لے گا اور اسے اٹھا کر کے پاکستان لے جاؤں گا۔ کامیابی مل گئی اور میں راج کوڈ کوڈ لے کر سرحد پار کر گیا۔ مگر جب اپنی سرحد میں پہنچا تو خبر لی کہ سرحد پہ کوڈ لے کر لیا گیا ہے اور اسے واپس لٹھلے لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے واپس کے لیے نکل کر کالہ لے کر لیا۔ سٹاری جب نکل کر کالہ لے کر لیا تو اس کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ کون سا ہے اور اسے واپس لٹھلے لے جایا جا رہا ہے۔ ان کو کھالنے لگا کہ ہم آگے بڑھے اور ایک خطہ کر لیں۔ پڑے کر سسے سطر پر مل پڑے۔ شمل پچھے پھر وہاں سے راج کوڈ کے گل کی ناک بندی کرنے پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سرحد پہ کوڈ لے جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ یکدم ہر دوہائی دے پر ایک گاڑی کی ویل لائٹس جگمگا جانے لگی۔ سڑک پر نوکلی ٹھیکیں بچھا دی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچے تو دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو جوتے کے نشانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کر دیا۔ گاڑی کی گاڑی لی گئی اور اس سے سڑی کی بجائے کوڈ تھا۔ ہم گل کی طرف بڑھے کہ ایک قبیلے کا پٹرا اتر رہا تھا۔ اس سے سڑی اتری اور اتر رہی گئی۔ میں جوتے کو لے کر اٹھ گیا۔ اس نے لٹھی اور اتر رہے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بھی بیٹا کے گھر بھیج دیا۔ سیا کا شوہر اور دن اسے حرم میں کر رہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو روک دیا۔ وہاں تک تھا کہ اس نے لٹھلے لٹھلے کے اشارے پر مجھے گھبرا دیا۔ میں اس کے ساتھ لٹھلے لٹھلے کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے اسے اسرارہ ادنیٰ میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں دلا دینے کا وعدہ کیا۔ سرحد پہ کوڈ بٹنک سے اتر کر لٹھلے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرے رو رو دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے بچہ ہائی تو کرانی کو ضرور کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے ماتھے دونوں سے لٹھی دلی کی آدھ سالی دی۔ شامی شہباز ملک کسی عورت کو پھرانے آیا ہے۔ "اٹھو شاہ کا جناب میں نہیں چلا کر تھک چکے ہوں۔" اس دن کے بعد سے بچہ کی لڑائی نہیں ہو رہی تھی۔ ہمیں ایک دوسری تو کرانی دی گئی۔ ہم چلنے کی دیر میں بھی کر رہے تھے کہ خبر آئی "فوراً کہیں اور منتقل ہو جاؤ۔ ہم راج خاں کے ساتھ ایک دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ وہاں سے چلنے کے لیے لٹھلے اور ایک جھڑی کی آڑ میں چھپ کر موہن پر ہاتھیں کرنے لگا تھی کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیں۔ ہوش آئے تو میں کسی سے بندھا ہوا تھا۔ سامنے تھا۔ وہ تھیش کر رہا تھا۔ کہ کوڈ بٹنک پر حمل ہو اور دھماکے سے میرے ہوش حواس گم ہو گئے۔ جب ہوش آئے تو میں نے خود کو کسی سے بندھا ہوا پایا پھر موقع پا کر آزاد ہو گیا اور ناہنگ کی ٹیکٹرک شاگ لگا کر کھالنے لگا اور کمرے سے سرگرمی میں آگیا۔ جوتے بھی مل گیا تھے۔ سامنے اور قریبی دل لے میں گھبرا گیا۔ پتا چلا کہ ساری اور بڑا کوڈ اب تک محفوظ ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ پوری سرگرمی میں انکا فون لگا ہے اور یہاں کی باتیں بڑا کوڈ میں راجوگا۔ بھی فائرنگ کی آدھ سالی دی اور میں نے جوتے کر کہا "کوڈ بڑا سادہ سادگی کوڈ کر رہا ہے۔" مگر میرا جملہ اور اتر رہا گیا۔ نہ بدست فائرنگ شروع ہو گئی پھر ساری کی جوتے سالی دی۔

(اب آگے پڑھیں)

بیٹہ کو ڈھم کا بچا نہیں تھا لیکن اس نے میرے تاثرات سے جان لیا اور سرگرمی میں بولا۔ "شوہلی ہم بچے کا نہیں۔" "نہیں۔۔۔ نہیں۔" میں نے پھر کہا۔ "بیٹہ کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ ابھی تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں تم بالکل تھیک ہو جاؤ گے۔"

اس نے لٹھی میں سر ہلایا۔ "شوہلی ڈاکٹر بہت دور ہے۔ ہم نہیں جا سکتا۔ پر آپ ادھر سے دیدی اتر رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ کافی ہے۔"

سادگی خود پر قابو رکھ رہی تھی۔ مگر اس کے آنسو اس کے قابو میں نہیں تھے۔ شاید میرے بھی نہیں تھے۔ کیونکہ بیٹہ مجھے وحشت لانا نظر آ رہا تھا۔ سادی نے گویا لہجے میں کہا۔ "بیٹہ اسکا بات نہ کر۔"

میں نے بیٹہ کو اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے روک دیا۔ "نہیں شوہلی۔۔۔۔۔ وقت کم ہے۔۔۔۔۔ آپ ہم سے بات کر۔۔۔۔۔"

اب تک میں خود کو جھٹلا رہا تھا کہ بیٹہ فکا جائے گا۔

اس سے پہلے ہمارا میں نے موت کو پاس سے دیکھا۔ بے شمار لوگ میرے ہاتھوں پر میرے سامنے میرے۔ گزشتہ بارہ کھٹے میں اتنی گل و غارت دیکھ لی تھی۔ میں اس معاملے میں اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ ڈھم کی کنڈیشن اور زندگی کی صورت دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ وہ بچے کا یا نہیں اور بیٹہ کا ڈھم دیکھ کر میرے اُمید سے کسی نے کہا وہ نہیں بچے گا۔ مگر میں اپنے اُمید کے آدھی کو جھٹلا رہا تھا۔ میں بیٹہ کو سنبھال رہا تھا۔ سادی نے اپنی شال اتار کر اس کی گدی بنا کر بیٹہ کے ڈھم پر رکھا۔ جب کھڑکی لوٹنے کا چھٹا کاسٹائی دیا تب بھی میں نے بیٹہ سے نظر نہیں اٹھائی تھی۔ مجھے معلوم تھا فتح خان فرار ہو گیا ہے۔ اگر وہ فرار ہونے کی بجائے مجھے شوٹ کر دیتا تب بھی مجھے پروا نہیں ہوتی۔ اس وقت مجھے بیٹہ کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ گولی ہلت ہر طرف سے صرف نصف اٹھی اور مٹی تھی اگر یہ ذرا نیچے گئی تو کچھ نہ ہوتا۔ آدھے اٹھی کا فرق زندگی اور موت کا فرق بن جاتا ہے۔ میں نے نم لہجے میں کہا۔ "بیٹہ یہ کیا کیا؟"

اسے کچھ نہیں ہوگا۔ پہلے بھی وہ کی ہار ڈٹی ہوا تھا۔ ہم میں سب سے زیادہ زخم خوردہ وہی تھا۔ اس کا پورا خاندان اس کی آنکھوں کے سامنے مارا گیا تھا۔ اس کے قہقہے کے بیشتر افراد مارے گئے تھے اور باقی بچائیں کہاں تھے۔ دنیا میں اس کا اب کوئی نہیں تھا سوائے ہمارے۔ میں نے سوچا تھا کہ ہمیشہ اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ وہ میرے خاندان کا ایک حصہ ہوگا۔ ہم اس کی شادی کریں گے پھر اس کا بھی ایک خاندان ہوگا۔ مگر جو سوچا تھا وہ سوچ میں رہ گیا اور حقیقت بیڑے کی رگوں سے قطرہ قطرہ کر کے دس رہی تھی۔ جب بیڑے نے مجھ سے بات کرنے کو کہا تو مجھے لگا کہ ہاں اب وقت نہیں ہے۔ بیڑے جانے والا ہے۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس کا سر گود میں رکھ لیا اور اس کا زخم دہایا۔ خون چشتی و رنگ لکنا بیڑے کی ہری ریزہ اور ہوتا۔

"بیڑے میں بات کر رہا ہوں میرے بیٹے۔"

اس کا چہرہ ایک لمحے کو چمکا تھا۔ "ہم آپ کا بیٹا ہے؟"

"تم میرے بیٹے ہو، بھائی ہو، دوست ہو۔"

"ہم جانتا ہے شولی۔۔۔" اس نے کسی قدر وقت سے کہا۔ "آپ سمجھتا ہوں گا میں سے محبت کیا۔۔۔ نہیں شولی ہم بس آپ لوگ سے محبت کیا۔۔۔ کامی اچھا لگا تھا اور نہیں۔۔۔"

"میں جانتا ہوں اگر تمہیں کامی سے محبت ہوتی تو تم اس کے ساتھ جاتے۔۔۔ آدمی اس کے ساتھ جاتا ہے جس سے محبت کرتا ہے۔ اگر تم اس سے محبت کرتے تو میں اسے کہیں سے بھی تمہارے لیے لے آتا۔"

"ہم کو مظلوم ہے، پر ہم نے کبھی نہیں چاہا۔"

سادہ بڑے کھد کے بیڑے کے ساتھ موجود دواؤں کی میز سے بیڑے کا سامان لے آئی تھی۔ اس نے ایک بڑی پٹی نکالی۔ میں نے شال ہٹا کر پہ پٹی اور اس کے ساتھ روٹی کا بٹل رکھا۔ خون اسی دہلی سے بہ رہا تھا اور اسے یوں پتے دیکھ کر میری دہی کی امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ بیڑے کا چہرہ ہرگز روتے لمحے زرد ہو رہا تھا اور اس پر تکلیف نمایاں ہو رہی تھی۔ اس نے رک رک کر کہا۔ "شولی۔۔۔ ہم کو سفیر۔۔۔ بھائی یاد آ رہا ہے۔۔۔ ہم اس سے بہت لڑا۔۔۔ بدتمیزی بھی کیا۔۔۔"

"بیڑے میری جان یہ محبت تھی۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔"

"ہم جانتا ہے۔۔۔ وہ ہم سے بولا کہ جب سب ٹھیک ہو جائے گا تو وہ ہم کو اپنے پاس رکھے گا کیونکہ وہ جیسے مونا

دیدی کے بغیر نہیں رہ سکتا اسی طرح ہمارے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔" بیڑے کا لہجہ پھر صاف ہو گیا۔ اس کی کلفت ختم ہو گئی تھی۔ جیسے اس کے اندر قوت آئی ہو۔ جیسے چرخ بچنے سے پہلے بڑھ رہا ہے۔ اس نے سادی کی طرف دیکھا۔ "دیدی ہم کو معاف کر دیتا۔ ہم آپ کو دیدی بولا اور آپ کے لیے کچھ نہیں کیا۔"

"تم نے میرے لیے سب کیا تھا ایک بھائی اپنی بہن کے لیے کر سکتا ہے اس سے زیادہ کیا۔۔۔ یہ میرے بھائی ہیں۔" سادی نے راج اور بڑے کھد کی لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اللہ کی قسم مجھے ان کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑا ہے لیکن بیڑے تمہارا زخم بھڑانے دل پر لگ رہا ہے۔"

"دیدی آپ ہم سے محبت کرتا ہے۔"

"ہاں میرے بھائی۔۔۔" سادی رونے لگی تھی۔

"شولی آپ بھی کرتا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے اس کا ہاتھ چوم لیا جس پر پینا آگیا تھا اور یہ موت کا پینا تھا۔ اس کا جسم ہاتھ رہا تھا۔ لیکن چہرہ پرسکون تھا۔ "شولی میرا آخری خواہش پوری کرے گا۔"

اس وقت مجھے خود پر قابو پانے میں بہت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ "بیڑے میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔"

"شولی تمہارا ارٹھی کو آپ آگ دکھانا۔۔۔ پر ایسا ضروری نہیں ہے مگر خطرہ ہو تو آپ ہم کو ادھر ہی چھوڑ جانا۔"

"میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔" میں نے کہا تو مجھے اپنی آواز اجنبی لگی تھی۔ سادی وہ پٹے سے حشد بارہی تھی کہ اس کی آواز نہ نکلے۔

"نہیں آپ یہاں سے جاؤ۔۔۔ یہاں خطرہ ہے۔"

بیڑے نے کہا۔ "ہم پاگل ہے جو آپ کو ایسا بولا۔۔۔ آپ دیدی کو دیکھو۔۔۔ یہاں سے۔۔۔"

"تم جیسا کہو گے میں دینا کروں گا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ اس وقت وہ میری جان بھی مانگتا تو میں مانگتا کرتا۔ اس کی آنکھیں بچھ رہی تھیں۔ اس نے رک رک کر کہا۔

"شولی۔۔۔ تمہارا ماں ایک ہار۔۔۔ ہم سے بولا۔۔۔ آدمی مرنا ہے تو۔۔۔ اس وقت۔۔۔ وہ بھگوان سے۔۔۔ جو مانگتا۔۔۔ بھگوان اسے۔۔۔ ضرور دیتا ہے۔۔۔ شولی ہم مانگتا۔۔۔ بھگوان آپ کو کامیاب کرے۔۔۔ آپ کا دشمن ناکام

ہو۔

”جی میری خواہش ہے تم میرے ساتھ رہو۔“

”شوہی اب ایسا نہیں ہو سکتا۔“ جی نے کہا اور بولنے

ہوئے اچانک اسے جھٹکا لگا اور اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھوں کی پلک جھپکنے لگی تھی۔ میں جی کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے آواز دے رہا تھا مگر وہ میری آواز کی حد سے دور جا چکا تھا۔ آوازیں دیتے ہوئے میں نے اسے جھنجھوڑا تو جی کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ سادی دھماکی مار کر رونے لگی وہ سمجھ گئی تھی۔ مگر میں نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”بے وقوف رو کیوں رہی ہو، جی بے ہوش ہوا ہے ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔“

سادی نے میرے شانے پر سر مارا۔ ”شوہی جی مر گیا ہے۔“

جب میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی نبض چیک کی۔ وہ ساکت تھی۔ جی کی سانس اور دل دونوں ٹھہر گئے تھے۔ وہ مر گیا تھا۔ شاید میں بھی رونے لگا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرا دایاں بازو میرے جسم سے کٹ کر الگ ہو گیا ہے۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ میں نے بے ساختہ اپنا بازو ٹوٹا مگر وہ اپنی جگہ تھا۔ ہاں ٹھل ہو گیا تھا۔ میں بنی کیفیت میں تھا۔ جی کی موت نے میرے حواس چھین لیے تھے۔ مگر اس موقع پر سادی نے حواس بحال رکھے۔ حالانکہ اس کے وہ بھائی اس کے سامنے مارے گئے اور جی تو بھائیوں سے بڑھ کر تھا۔ اس نے میرا بازو ہلایا۔ ”شوہی...! میں یہاں سے جانا ہے۔“

میں چوٹا۔ ”جی کو چھوڑ کر؟“

”اگر نہ لے جاؤں گے تو چھوڑ کر جانا ہوگا۔“ سادی کھڑی ہو گئی۔ ”شوہی وقت کم ہے کوئی بھی آسکتا ہے۔ ابھی یہاں کچھ لوگ اور ہوں گے۔“

”کون لوگ؟“ میں نے راسن، نشی ہراج اور بیڑے کنوڑ کی لاشوں کی طرف دیکھا۔ ”لب بچا ہی کون ہے۔“

”ان کے آدمی ہوں گے۔ ممکن ہے نشی کے کچھ آدمی باہر بھی ہوں۔ یا جھنگو کے آدمی بھی ہوں۔“

سادی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ لیکن میں جی کو یوں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ میں ہر صورت اس کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جی کا سر احتیاط سے لیے رکھا جیسے وہ سو رہا ہے اور اس کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔ میں نے راسن کا

پستول اٹھا لیا کیونکہ اپنا پستول تو میں نے راج کنوڑ پر خالی کر دیا تھا۔ جی اس کی گولی کا نشانہ بنا تھا لیکن اس کا اصل قصور سادی پر تھا یا راجا تھا۔ میں نے اس کا پستول بھی اٹھا لیا جو اس کے پاس پڑا تھا۔ پھر میں باہر آیا جہاں فتح خان کے آدمیوں کی لاشیں، جھنگو اور اس کے آدمیوں کی لاشوں کے ساتھ پڑی تھیں۔ کنوڑ پولیس میں اندر باہر لاشیں ہی لاشیں بکھری تھیں۔ ان میں وہ بھی تھے جو دوسروں کو مارنے آئے تھے اور وہ بھی تھے جن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی انہیں مارنے آ رہا ہے۔ وہ بھی مارے گئے تھے جن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ کنوڑ پولیس میں کام کرتے تھے اور ان میں سے بہت سے تو یہاں غلام کی حیثیت سے تھے۔ انہیں صرف زندہ رہنے کا سامان مہیا کیا جاتا تھا۔ وہ انتظار رہے کے تا بعد رہتے مگر ان کی تابعداری بھی ان کو موت سے نہیں بچا سکتی تھی۔

ان میں میرے بہت سے دشمن تھے اور بہت سے ایسے تھے جن سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی اور جی جو میرا ساتھی تھا میرے وجود کا ایک حصہ اب وہ یہاں لاشوں کا ایک حصہ تھا۔ راسن اور راج کنوڑ نے ہل میں موجود فتح خان کے آدمیوں کو نشانہ بنایا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آئے اور راج کنوڑ یہاں تک کیسے پہنچا۔ جیسا کہ فتح خان کا دعویٰ تھا کہ یہاں جتنے راستے سامنے تھے اس سے کہیں زیادہ غیبی راستے تھے۔ وہ دونوں بھی کسی ایسے ہی راستے سے آئے ہوں گے۔ راج کنوڑ کے ہارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اب ڈیوڑ شا کے قبضے میں نہیں ہے لیکن یہ میں نے نہیں سوچا تھا کہ وہ اچانک یہاں پہنچ جائے گا۔ یہ تو واضح تھا کہ راسن اب تک اس کے ساتھ تھا اور وہ اسی کے ہمراہ آیا تھا۔ نشی سمجھ رہا تھا کہ اس نے راسن کو بے وقوف بنایا ہے لیکن حالات بتا رہے تھے کہ راسن نے راج کنوڑ کے ہمراہی کراسے بے وقوف بنایا تھا۔ ان سب نے میرے اور ڈیوڑ شا کے کنوڑوں پر رکھ کر ہندوئی چلائی مگر آخر میں خود نشانہ بن گئے۔

میں گیلری کی طرف آیا تھا کہ مجھے کسی کی جھلک دکھائی دی اور میں تیزی سے واپس آ گیا۔ آنے والے نے میری جھلک بھی دیکھ لی تھی اور مجھے پہچان لیا تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”شہباز یہ میں ہوں۔“

میں چوٹا تھا۔ وہ کرل جھوٹا جس کے ہارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا تھا۔

میں نے سر ٹال کر جھانکا۔ وہ سر سے پاؤں تک گرد اور مٹی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مگر وہ کرل جمو ہی تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ کرل کے ہاتھ میں راتھل مٹی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہارہ اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ "کرل تم زندہ ہو۔" میں نے سر دھجے میں کہا۔ "میرا خیال تھا تم بھی مر چکے ہو؟"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" اس نے سر ہلایا۔ "اتفاق سے میرا اگلے اے پی سی کے سامنے لگا تھا اور میں بھی صے میں تھا۔ میرے سارے ساتھی مارے گئے اور میں اڑ کر باہر جا کر تھا گم سے گم دس گز دور اس کے ہاؤس جو دھک گیا شاید اس لیے کہ نرم گھاس پر گرا تھا۔"

"تمہارا احتیاط منصوبہ پوری طرح ناکام رہا۔"

"نہیں پوری طرح ناکام نہیں ہوا میں زندہ ہوں تم زندہ ہو۔"

میں نے اسے دھکیل کر دیوار سے لگایا اور اس کی گردن پر کبھی رکھ کر چٹایا۔ "ہاں لیکن میرا ساتھی زندہ نہیں ہے۔ وہ مارا گیا ہے تمہارے اس منصوبے کی بجائے چڑھ گیا ہے۔"

"کون؟" وہ چونکا۔ "وہ لڑکا۔۔۔؟"

"ہاں وہی۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ کرل نے حراست نہیں کی تھی اس لیے میری گرفت خود نرم ہو گئی۔ "تم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ میرے لیے کیا تھا؟"

"میں سمجھ رہا ہوں۔" کرل نے نرمی سے کہا۔ "لیکن اس کی موت اسی طرح اور اسی جگہ لکھی تھی۔ یہ میرا اور تمہارا ایمان ہے۔"

اس کے الفاظ نے مجھ پر اثر کیا تھا میرا ہاتھ اس کی گردن سے ہٹ گیا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ لیکن میں کیا کروں۔"

"وہ لڑکی کہاں ہے؟ جسے ہم لینے آئے ہیں۔"

"موجود ہے لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم اب تک کہاں تھے۔ اے پی سیز کو اڑے ہارہ کھٹے سے زیادہ دقت ہو گیا ہے۔" میں نے اچھی نظر گڑی پر ڈالی جس میں تمنا بک رہے تھے۔

"میں سمجھ گیا تھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے کاش کہ میں پہلے ہی تمہاری بات مان جاتا۔ یہ سارا کیا دھڑلہ تھا۔ مجھے تمہارے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں ہو۔ میرے سارے ساتھی مارے گئے تھے صرف بلی کا پٹر سے اترنے والی میم محفوظ تھی۔ لیکن باہر اسٹائیز کی موجودگی میں وہ بھی محفوظ نہیں تھے اس لیے میں نے ان کے خاتمے کا فیصلہ

کیا۔ میں رات کی تاریکی میں باہر نہیں نکل سکتا تھا اس لیے دن طلوع ہونے تک ایک جگہ چھپا رہا کتنے ہی دن میں گارڈز میرے سامنے مارے گئے۔ جیسے ہی دن طلوع ہوا میں بلیس سے نکل گیا۔ مجھے جتنی صے سے اترنا پڑا تھا اس کے بعد میں ایک ایک جگہ جا کر فٹنی کے آدمیوں کا خاتمہ کرتا رہا۔ یہ کام فٹنا کر میں امداد آیا۔ یہاں کوئی فرد زندہ نہیں ہے۔ میں اس امید میں یہاں آیا تھا کہ شاید یہ لڑکی زندہ ہو اور میں اسے ساتھ لے کر نکل سکوں۔ مجھے بالکل اُمید نہیں تھی یہاں تم سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"اُمید تو مجھے بھی نہیں تھی۔" میں نے امداد جاتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟"

"ہاں بلی کا پٹر ہے۔" کرل نے کہا۔ "میری پائلٹ سے مدد لیو پر بات اولی ہے وہ دس منٹ میں یہاں آسکتا ہے۔"

ہم کمرے میں آئے تو سادی جو بیچو کے پاس بیٹھی تھی کرل کو دیکھ کر چونکی اور ہم گئی۔ "شوہلی یہ کون ہے؟"

"کرل جمو۔" میں نے کہا۔ "یہ ہم اسی نے ترتیب دی تھی۔"

"ہم یا تو کل عام۔" سادی نے تکی سے کہا۔ "اسے مظلوم ہے یہاں کتنے لوگ مارے گئے ہیں۔"

"بے بی ایسے کاموں میں یہ سب ہوتا ہے۔" کرل نے نرمی سے کہا۔ "نی لالہ! ہمیں کسی بحث میں پڑے بغیر یہاں سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ "میں بلی کا پٹر کے لیے کال کر رہا ہوں۔"

اب تک میں سوچ رہا تھا کہ بیچو کو کیسے لے کر جاؤں۔ مجھے گاڑی کا خیال آیا تھا مگر بلی کا پٹر کہیں بہتر تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے کال کرو۔"

اس کے پاس کسی قدر بڑے سائز کا ریڈیو تھا۔ یہ اس کی پشت پر بندھے بجک میں موجود تھا۔ اس نے ریڈیو لگا لگا اور بلی کا پٹر پائلٹ کو کال کرنے لگا۔ "ریڈیو بڑا۔۔۔ ریڈیو بڑا ڈوبو ریڈی؟"

اس نے کئی بار پکارا لیکن ریڈیو سے کوئی جواب برآمد نہیں ہوا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ "شاید مجھے چھت پر جانا پڑے۔۔۔ یہاں ریڈیو کام نہیں کر رہا ہے۔"

چھت پر جانے کا سیدھا راستہ تباہ ہو گیا ہے۔ لیکن ایک راستہ اور ہے۔"

"کہاں ہے اس پر بتاؤ۔" کرل نے ڈیجیٹل کہاں

حصہ ہے جس کا حشر ہو چکا ہے۔ اس نے الماری کھولی اور اس سے اپنے کچھ کپڑے نکال کر ایک چھوٹے چنڈ کیری میں ڈالے۔ پھر اس نے اٹھد سے رقم کی گڈیاں نکالیں۔ یہ بھارتی روپے تھے۔ بڑا اور چانچ سو کے نوٹوں کی چار گڈیاں تھیں۔ یہ تین لاکھ کی رقم تھی جو عام حالات میں ہمارے لیے کافی ہوتی۔ سادی نے شلو اور قمیص پہنی ہوئی تھی میں نے پوچھا۔ "ٹراؤڈر شرٹ ہے تو وہ لیکن لو اور پیروں میں جو گرہ ہوں۔ ہو سکتا ہے بھاگ دوڑ کرنی پڑے۔ اپنی دوائیاں بھی ساتھ رکھنا۔"

"میں نے سب رکھ لی ہیں۔" اس نے کہا اور بیگ کی زپ بند کی۔ میں نے وہ اٹھا لیا۔ سادی نے الماری سے ایک چٹون اور شرٹ نکالی تو میں باہر نکل آیا۔ میں نے یہاں آتے ہوئے ایک مافصل اٹھالی تھی۔ مگر کسی نے راستہ نہیں روکا۔ سادی چند منٹ میں باہر آئی اور اس نے مجھ سے پوچھا۔ "شوہلی آپ نے کیا سوچا؟"

"دیکھتی رہو۔" میں نے کہا اور ہم واپس بڑے کنور والے حصے میں پہنچے۔ کرل وہاں آچکا تھا اس نے بے چینی سے کہا۔

"کہاں چلے گئے تھے ہمیں یہاں سے لگتا ہے۔"

"کچھ سامان لینا تھا۔"

اس نے پوچھا۔ "کیسا سامان؟"

"اس کی دوائیاں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم نے ہیلی کاہنر کے لیے کال کر لی؟"

"ہاں اور پرہا آسانی بات ہو گئی۔" اس نے جواب دیا اور گھڑی دیکھی۔ "ہیلی کاہنر پانچ منٹ میں آنے والا ہو گا۔"

"تب چلو اوپر۔" میں نے کہا اور بیگ سادی کو تھا کر بیچ کو اٹھا کر شانے پر ڈال لیا۔ میرا دل ایک بار پھر لرزا۔ آدھے گھنٹے پہلے جتہ بیٹا جاگتا انسان تھا اور اب میں اس کی لاش لے جا رہا تھا۔ کرل چوٹا۔

"اسے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"یہ میرا سامان ہے میں اس کی لاش یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ کرل کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔

"اوکے ہری اپ وقت کم ہے۔ لیکن ہے مقامی پولیس یہاں آنے والی ہو۔"

ہم میٹر میوں سے اوپر آئے۔ سب سے آگے کرل

نالا۔ میں نے اسے ابھر چکی میٹر میوں والا غلیہ راستہ سمجھایا۔ وہ تھکنے میں نہیں تھا مگر کرل کچھ گیا۔

"لیکن یہ اوپر سے بند ہو گا اور اسے کھولنا پڑے گا۔"

"فکرمات کر دو میں اسے کھول لوں گا۔" کرل نے کہا اور کرنے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی سادی بولی۔

"شوہلی کیا ہم اس کے ساتھ جائیں گے۔"

"مجھوڑی ہے یہاں میں خود سے کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ڈیڑا شاکی مدد سے ہم ہا آسانی واپس جاسکتے ہیں۔"

"آپ اس شخص پر بھروسہ کر رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ سب ہوا۔ بیچ مارا گیا۔" سادی جذباتی لہجے میں بولی۔ "کیا ضمانت ہے کہ یہ آپ کے کام آئے گا۔ میں جانتی ہوں وہ آپ کے پیچھے کیوں پڑا ہے۔ اگر میں اور آپ اس کے پاس چلے گئے تو کیا وہ میری مدد سے آپ کو مجھوڑ نہیں کرے گا۔"

بیچ کی اچانک موت نے مجھ سے جیسے سوچنے کھینے کی صلاحیت چھین لی تھی اور میں الفاظ میں نہیں بتا سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت ہو رہی تھی۔ میں جو سب بیان کر رہا ہوں اگر وہ کیفیت ہوتی تو میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ پاتا۔ سادی نے توجہ دلائی تو مجھے خیال آیا۔ یہ سامنے کی بات تھی۔ اگر میں سادی سمیت ڈیڑا شاکی کے پاس پہنچ جاتا تو اس جیسے پیار کے لیے ذرا بھی دشوار نہیں تھا کہ وہ سادی کی مدد سے مجھے بلیک میل کرے۔ یہ کنویں سے نکل کر کھائی میں گرنے والی بات ہوتی۔ مجھے لگا جیسے بیچ کی موت کے بعد مجھے ہیلی بار ہوش آیا ہے۔ میں نے بیچ کی طرف دیکھا اور پھر اس کے پاس بیٹھ کر اس کے سر دانتے پر پیار کیا۔ میرے آنسو اس کے چہرے پر گرے تھے۔ بیچ چلا گیا تھا لیکن سادی تھی اور وہ میری ذمے داری تھی۔ مجھے اپنی پوری توجہ اس ذمے داری پر دینی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "سادی تیار ہو جاؤ۔ یہاں سے اپنا سامان اور اگر دم ہے تو وہ بھی لے لو۔ اگر ہم نے اپنا راستہ الگ کیا تو اس کی ضرورت پڑے گی۔"

سادی نے سر ہلایا اور بولی۔ "میرے ساتھ پلیس مجھے اکٹھے جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔"

میرا بیچ کو چھوڑ کر جانے کو دل نہیں مان رہا تھا اس لیے خود پر جبر کر کے گیا۔ سادی کا کمر صاف ستر اور چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اس بلیس کا ایک

"اس صورت میں ہم کسی ممکنہ وارننگ سے بے خبر رہیں گے یہ علاقہ حساس ہے چانکا کی سرحد یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"ریڈیو بند کرو۔" میں نے پھر حکم دیا تو اس نے قبیل کی قسم۔ اس نے قہر میں کھینچا تو انجمن کی آواز بدلی اور ہیلی کاپٹر ایک ہلکے سے دھچکے سے بلند ہوا تھا۔ ساڑھے تین بج رہے تھے اور سورج مغرب کی طرف جھک چکا تھا۔ مگر ابھی غروب ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ ہیلی کاپٹر دس منٹ سے بھی پہلے اس نیلے رنگ پہنچ گیا تھا۔ وہاں ہیلی پیڈ کے لیے بنائے گئے نشانات اور دوسرا سامان جس سے یہ جگہ صاف کی گئی تھی۔ اپنی جگہ موجود تھے۔ پائلٹ نے ہیلی کاپٹر فتح اتارا اور پھر انجمن بند کر دیا۔ میں دانتے میں کرل کو چپک کر چکا تھا اس کی بغض مست لیکن ہاتھ نہ تھا۔ وہ بے ہوش تھا لیکن اس کی جان کو کوئی غلغلہ نہیں تھا۔ انجمن بند ہونے پر سکون ہو گیا۔ اس کے گردش کرتے ہتھکوں کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ میں نے دونوں پائلٹس سے کہا۔ "نیچے اترو؟"

"کیوں؟" چیف پائلٹ نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔

"یہ ہم کو مارنا چاہتا ہے۔" سیاہ رو کو پائلٹ نے..... مطلع کیا۔

"اتھقانہ باتیں مت کرو..... میں بلاوجہ کسی کو نہیں مارتا ہاں اگر تم مرنا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ اب نیچے اترو..... مجھے ایک بات دوبار کہنے کی عادت نہیں ہے۔ یہ بات ذہن میں بٹھا لو۔"

وہ دونوں نیچے اترے تو میں نے کرل کو کھینچ کر نیچے اتارا اور اس کا بیگ الگ کر دیا پھر اس کی مکمل تلاشی لی تو اس کے پاس سے کئی ہتھیار نکلے تھے۔ وہ کچھ زیادہ ہی سچا تھا۔ اسے مکمل طور پر نہتا کر کے میں نے سادی سے کہا۔ "اس کی نگرانی کرنا..... شہزادہ ان سے کام لے رہا ہوں۔"

"شوبی ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"بیٹہ..... کی آخری خواہش پوری کرنے۔" میں نے کہا اور ایک طرف رکھے سامان کی طرف بڑھ گیا۔ ان میں کپڑاؤں اور آرمیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں جن سے شاہیں کالی جاسکتی تھیں۔ کام کی چیز کپڑاؤں میں۔ میں نے دو کپڑاؤں اٹھائیں اور پائنتوں کے پاس آیا۔ کپڑاؤں ان کے سامنے پائی تھیں اور ایک طرف گرے بہت

تھا۔ اس کے پیچھے سادی اور سب سے پیچھے میں بیٹہ کو لیے ہوئے تھا۔ لیکن بے زندگی میں بیٹہ وزنی ہو لیکن اس وقت مجھے کسی بچے کی طرح ہلکا سا لگ رہا تھا۔ ہم چھت پر آئے۔ میں نے بیٹہ کو ایک طرف ٹکادیا۔ کرل جمو آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمیں اوپر آنے میں چند منٹ لگے تھے اور اتنی دیر میں ہیلی کاپٹر وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ کسی نقطے کی طرح نمودار ہوا جو ہندرتج بڑا ہوتا گیا۔ کرل نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور ہیلی کاپٹر چھت پر بنے ہیلی پیڈ پر اتر گیا۔ اس کے پیچھے گردش کر رہے تھے۔ انجمن کی آواز دھیمی ہوئی تھی لیکن وہ بند نہیں ہوا تھا۔ کرل نے ہمیں اشارہ کیا اور چلا کر بولا۔ "جلدی کرو۔"

میں نے سادی کو سہارا دیا اور ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھا۔ میں نے اسے اندر بٹھایا۔ پھر میں نے مڑ کر کرل کو اشارہ کیا کہ وہ بیٹہ کو اٹھا کر لائے۔ اسے خیال نہیں تھا کہ میں یہ کام اسے کہوں گا۔ اس لیے وہ جھپکا اور پھر بادل نا خواست بیٹہ کی طرف بڑھا اس نے بیٹہ کو اٹھا کر شانے پر ڈالا اور ہیلی کاپٹر کی طرف آیا۔ جیسے ہی اس نے بیٹہ کو اندر لٹایا میں نے عقب سے اس کی گدی پر ہستول کا دست مارا۔ وہ ٹوٹ کر اڑا اور دوسری ضرب پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اس دوران میں سادی اپنا ہستول دونوں پائلٹ پر تان چکی تھی۔ جو میری کارروائی سے چمکے تھے۔ میں نے کرل کے بیگ سے مٹی نکال کر اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھے۔ ہاتھ کس کر باندھے تھے اور پاؤں اس طرح باندھے کہ وہ چھوٹے قدموں سے چل سکتا تھا۔ یہ کام نکٹا کر میں نے اسے ہیلی کاپٹر میں ڈالا۔ پھر خود بھی سوار ہو گیا۔ وہ اندر بند کیا تو شور کسی قدر کم ہوا تھا۔ میں نے پائلٹ سے کہا۔ "اسی نیلے پر چلو جہاں سے آئے ہو۔"

"ہمیں واپس شملہ جانا ہے۔" پائلٹ بولا۔ وہ مقامی لیکن خوش شکل جوان آدمی تھا اس کا کو پائلٹ سیاہ رو اور بد صورت تھا۔

"گنا ہے تمہیں جہنم جانا ہے۔" میں نے اس کے سر سے ہستول لگا یا تو وہ جلدی سے بولا۔

"اوکے اوکے..... جہاں تم کہو۔"

"ریڈیو بند ہوں اور ہیلی کاپٹر کا کوئی ریڈیائی سسٹم کام نہ کرے۔"

"ریڈیو کام کر رہا ہے ہائی سسٹم بند ہیں۔"

"ریڈیو بھی بند کرو۔"

ماہنامہ سرگزشت

پرانے شک و شبہ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس سے کڑی کاٹو۔"

"ہم کڑی کاٹیں؟" سیاہ رو نے بے یقینی سے کہا۔
"بالکل کاٹو گے اگر مرنا نہیں چاہتے ہو۔" میں نے راکھل کا رخ ان کی طرف کیا اور کڑی کی طرف دیکھا۔ "تمہارے پاس صرف ایک گھنٹہ ہے اگر اس دوران میں تم اتنی کڑی نہیں کاٹ سکتے جتنی ایک چٹا کے لیے درکار ہوتی ہے تو میں تم دونوں کو پھینک کر دوں گا۔"

"ہمیں مار دیا تو اسے تم اڑاؤ گے؟" پائلٹ نے ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھا۔

"ہاں میں اسے اڑا لوں گا۔ تم دونوں ابھی تک شروع نہیں ہوئے۔ وقت آدھا صحت کم ہو گیا ہے۔" وہ حرکت میں آئے۔ یہ بڑا اتنا تھا مگر اس کا اندرونی حصہ کھوکھلا ہو گیا تھا اور یہ بالکل خشک ہو چکا تھا اس لیے آسانی سے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ آدھے گھنٹے میں انہوں نے خاصی کڑی نکال لی تھی۔ اس دوران میں میں نے سامان سے پانی نکال کر پیا تھا۔ پاس سے حلق خشک ہو گیا تھا۔ میں نے کڑی کا جائزہ لیا اور انہیں روک کر کڑی چٹا کے انداز میں رکھنے کو کہا۔ انہوں نے اس حکم کی تعمیل بھی کی۔ ایک گھنٹے میں وہ ساری کڑی کاٹ چکے تھے اور ان کا حشر ہو گیا تھا۔ وہ اس مشقت کے عادی نہیں تھے اور پھر یہاں دھوپ بھی تیز تھی۔ وہ ہانپ رہے تھے اور پسینے میں شرابور تھے۔ یہ کڑی کافی تھی۔ اس لیے میں نے ان سے کہاڑیاں لے لیں۔ میں ہوشیار رہا تھا کیونکہ یہ خطرناک ہتھیار بھی ثابت ہو سکتی تھیں۔ ایک کین میں نیلی کا پٹر کے ٹینک سے اس کا ایندھن نکلا۔ یہ بہت تیز حرارت پیدا کرتا ہے جو ایک لڑ پو جیٹ انجن چلانے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ تقریباً ایک گیلن تیل کڑیوں پر ابھی طرح والا۔

وہ مرط آگیا جس کے پارے میں میں سوچنے سے گریز کر رہا تھا۔ مگر مجھے اس سے گزرنا ہی تھا۔ میں نیلی کا پٹر کی طرف آیا تو سادی نے ردنا شروع کر دیا۔ یہاں سنانے میں اس کی آواز عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ سب چھوڑ کر بیٹھ کر یہاں سے لے جاؤں اسے آگ کی تذرہ نہ کروں۔ پھر دل پر جبر کر کے میں نیلی کا پٹر میں آیا۔ بیٹھ کے جسم سے ہلٹ پروف اور دوسری چیزیں الگ کیں۔ اس کے جوتے اتارے۔ اب اس کے جسم پر صرف شرٹ اور پتلون تھی۔ اسے اٹھا کر اس کی چٹا تک لایا۔ اس پر لٹا کر

میں نے اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے۔ اس کی شرٹ سامنے سے خون سے بھیگ گئی تھی۔ یہ وہ خون تھا جو جسم میں تھا تو زندگی تھا اور جسم سے نکل گیا تو موت بن گیا۔ اس کے ماتھے پر آخری بوسہ دے کر میں پیچھے ہٹا تو سادی آگے آئی۔ وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔ وہ مجھے مار رہی تھی اور میں نے بڑی مشکل سے اسے جتے سے الگ کیا۔

"شوبلی... بیٹہ... بیٹہ۔" وہ کہتے ہوئے اچانک ڈھیل ہو کر پیچھے گرنے لگی۔ میں نے اسے سنبھال لیا اور اٹھا کر ہیلی کاپٹر میں لا کر لٹا دیا۔ پھر اپنی آنکھیں صاف کیں اور پائلٹ سے کہا۔

"تمہارے پاس ماچس بالائٹر ہے۔"

اس نے خاموشی سے لائٹر نکال کر میرے حوالے کیا اور میں چٹا تک آیا۔ لائٹر جلا کر میرا ہاتھ لڑ گیا تھا۔ اس روز مجھے پتا چلا کہ اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھ سے آگ دکھانا کتنا مشکل کام ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور اپنے مردے زمین کے سپرد کرتے ہیں جو سب سے احسن طریقہ ہے۔ مگر ہاتھ میرا ہاتھ بڑھتے بڑھتے رکا۔ پھر میں نے ہت کر کے کڑیوں کو آگ دکھا دی۔ پالی ٹیمپ آئل کی جگہ سے کڑیوں نے بہت تیزی سے آگ پکڑ لی تھی۔ جب تک میں بڑا پیچھے ہوا آگ نے کڑیوں اور بیٹھ کے بے جان وجود کو پوری طرح گھیر لیا تھا۔ میں نے چٹا کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا لیکن جب آگ نے بیٹھ کے جسم کو چٹا شروع کیا تو اس کی بو خود مجھ تک آگئی تھی۔ مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا اس لیے میں کرل کے پاس آیا وہ کلہلا رہا تھا۔ میں نے کچھ پانی اس کے منہ پر اور کچھ منہ میں ڈالا تو اسے ہوش آگیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے سر جھٹک کر بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

"شہیاد یہ کیا... تم نے...."

"میں واپس ڈیوڑھا کے پاس نہیں جاؤں گا اور یہ حفظ ماتقدم کے طور پر کیا ہے۔ میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا تھا اس لیے مجھ پر یہ حربہ استعمال کیا۔ ورنہ تم آسانی سے قابو میں نہ آتے۔"

وہ کسی قدر کوشش سے اٹھ بیٹھا اس نے چٹا کی طرف دیکھا۔ "اوہ ہم وہیں ہیں.... پر یہ...."

"میرے سامنے کی چٹا ہے اس کی خواہش تھی کہ اس کی چٹا کو میں آگ لگاؤں۔"

کرل کچھ دیر سوچتا رہا۔ "تو تم واپس نہیں جانا

جوت ہوئے تھے اور اسے آسانی سے خراب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے بھڑکا استعمال کیا مگر کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ پائلٹ نے کہا۔ ”یہ خراب نہیں ہوگا۔“

”تمہارے پاس کہاں تک پرواز کا اجازت نامہ ہے؟“

”پورے اٹریا میں پرواز کر سکتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”اگر مجھے ہوشیار پر ہانا ہو تو؟“

”تقریباً سو کلومیٹرز کا فاصلہ ہے اس میں ہون گھنٹا لگے گا لیکن ہیلی کاپٹر میں اتنی لمبی پرواز کا لمبہ نہیں ہے۔“

میں نے لمبوں کی جیک کیا۔ ٹینک تقریباً ساٹھ فیصد بھرا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کتنی پرواز کے لیے کافی ہو گا؟“

”تقریباً ساٹھ سے ستر کلومیٹرز۔“

مجھے خیال آیا۔ ہمیں اوپر کی بجائے نیچے کی طرف جانا چاہیے۔ بتانا نیچے جائیں گے پاکستان کی سرحد اتنا ہی پاس پڑے گی اور اسے عبور کرنا اتنا ہی کم مشکل ہوگا۔ لاہور اور اس سے اوپر سرحد حساس تھی اور اسے عبور کرنا جان جو حکم کا کام تھا۔ ”اگر ہم لدھیانہ کی طرف جائیں تو....؟“

”جب بھی اتنا ہی فاصلہ پڑے گا۔“

کرل فور سے سن رہا تھا مگر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر میں اسے بے خبر بھی رکھتا تو جب ہیلی کاپٹر چھوڑتا تو پائلٹ خود کرل یا اپنے مالک سے رابطہ کر کے اسے بتا دیتا کہ ہم کہاں اترے تھے؟ میں نے فوری فیصلہ کیا۔ ”ٹھیک ہے ہم لدھیانہ کی طرف جائیں گے۔“

میرا طبع نہایت خراب تھا۔ خون مٹی، چہرے پر کئی دھم تھے جو دیکھنے والے کو فوراً حیرت کرتے۔ میری جیکٹ بھی کئی جگہ سے خون آلود تھی لیکن اس کے اندر موجود شرٹ محفوظ تھی میں نے جیکٹ اتار دی۔ پھر وہاں موجود پانی لے کر چہرہ اور جسم کے دوسرے حصے صاف کیے۔ اس سے میں کئی حد تک صاف ستھرا نظر آنے لگا۔ ہیلی کاپٹر میں میڈیکل ایڈجسٹ موجود تھا اس کی مدد سے بھی میرا تاثر بہتر ہوا۔ میں نے گیس ماسک پہلے ہی اتار دیا تھا اور اب میرے پاس اپنا اور بچہ کا نائٹ ویژن تھا وہ میں نے سادی کے بیگ میں رکھ دیا۔ میری ہاتھوں کا ٹھونڈا پڑاؤن کی تھی لیکن آج کل ہر دوسرا شخص اسی قسم کی پینٹ پہن کر گھوم رہا ہے۔ میں نے خود کو صاف کرنے اور طبع بہتر بنانے میں خود کو لگن کر لیا کیونکہ میں

چاہتے۔ جیسا تم نے سوچ لیا ہو گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اب تم میرے ساتھ کیا کرو گے؟“

”کچھ نہیں اگر کچھ کرنا ہوتا تو تم اب تک زندہ نہ ہوتے۔ ہیلی کاپٹر مجھے اور سادی کو کہیں اتار کر تمہیں واپس لے جائے گا۔“

”تمہاری مرضی۔“ اس نے سکون کا سانس لیا۔ ”دیے میں تمہیں بتا دوں تم یہاں محفوظ نہیں ہو....! ہو! شا تمہارے لیے بہت آسانیاں مہیا کر سکتا ہے۔ دیے تم نے اس سے وعدہ کیا تھا۔“

”میں اس وعدے پر اب بھی قائم ہوں۔ جیسے ہی سادی واپس پاکستان پہنچے گی۔ میں ڈیڑھ شا کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ میں اس کی کم میں شامل ہوں گا لیکن اپنے طریقے سے۔ میں مکمل طور پر اس پر انحصار نہیں کر سکتا۔“

”تم جانتے ہو.... جو کام وہ بہت آسانی سے کر سکتا ہے۔ تمہارے لیے وہ بہت مشکل ہوگا۔“

میں نے انکار کیا۔ ”اس کے باوجود میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر اس نے سادی کو اپنے قبضے میں کر لیا تو میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

”وہ تم پر بالکل جبر نہیں کرے گا۔“ کرل نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی۔ مگر میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ سورج مغرب کی طرف چمکتے ہوئے بچہ کی چتا کے دوسری طرف چلا گیا تھا اور اس کی سرخی شعلوں کی سرخی میں گم ہو کر عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ یہ دل و دماغ کو بوجھل کر دینے والا منظر تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ ہیلی کاپٹر اسی راتھستانی راجا کا تھا جس کے والا میں ڈیڑھ شا مقیم تھا اور جہاں پولیس اور انجینیئر نے مل کر چھاپا مارا تھا۔ میں سورج رہا تھا کہ اس ہیلی کاپٹر کو استعمال کیا جائے تو ہم مشرقی پنجاب تک کا طویل سفر بہت کم وقت میں طے کر سکتے تھے۔ وہاں میں عبداللہ اور وسیم سے رابطہ کر سکتا تھا۔ کرل مجھے فور سے دیکھ رہا تھا اس نے بھانپ لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں اس نے کہا۔

”یہ بہت خطرناک ہوگا.... یہ ہیلی کاپٹر ہر جگہ پہچانا جائے گا۔“

”کیا خطرناک ہوگا۔“

”یہی کہ تم اسے کبھی دور لے جانے کے لیے استعمال کرو۔“

میں نے ہیلی کاپٹر پر بنے نشانات کا معائنہ کیا یہ

سیٹوں پر چلے گئے۔ "میں تمہیں یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں مجھے اُمید ہے تم خود کو آزاد کر لو گے اور چند گھنٹوں بعد لاہور شاہ کے پاس واپس پہنچ جاؤ گے۔ مجھے کوئی خبر نہ ہو جس پر میں تم سے لاہور شاہ سے رابطہ کر سکوں۔"

اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ "ایک نمبر ہے لیکن اسے دیکھیں کہ وہ کبھی لکھنا سکتا۔"

"تاؤ میں بھی لکھنے کا قلم نہیں ہوں۔"

اس نے نمبر بتایا جو میں نے تین چار بار دہرایا اور مجھے یاد ہو گیا۔ کرل نے سمجھ لیا تھا کہ میں اپنی ہی کروں گا اس لیے اس نے دوبارہ نہیں کہا۔ البتہ جب نیلی کا پٹر کا انجن اشارت ہوا تو اتنا کہہ "اگر تمہیں مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کال کر لیتا۔"

"یقیناً میں ایسا ہی کروں گا۔" میں نے سر ہلایا اور دھپکے سے اسے آگیا۔ میں نے ایک چاقو کرل کی طرف پھینکا اور سلائیڈنگ اور سچا کر بند کر دیا اور سادوی کے گز سیٹ پلٹ پلٹ دی۔ نیلی کا پٹر کا انجن پوری رفتار سے چلنے لگا اور پھر وہ دھچکے سے ٹوچا تھا۔ میں نے آخری بار جیت کی چتا دیکھی جس میں شعلے اب بڑھ گئے تھے۔ انہوں نے اپنا کام کر لیا تھا۔ جیت کی راکہ نہیں رہ گئی تھی۔ وقت کی ہوا اسے منتشر کر دیتی اور اس کا نام و نشان مٹ جاتا۔ لیکن جب تک میں زندہ رہتا رہتا ہوں میرے دل میں زندہ رہتا۔ نیلی کا پٹر نے جنوب مشرق کا رخ کیا تو میں چو لگا تھا۔ اس کے ریڈیو آف تھے اور وہ پھاڑوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ میں نے اشارے سے ہیڈ فون مالتا تو کو پائلٹ نے مجھے ایک ہیڈ فون تھما دیا۔ میں نے اسے پہن کر پائلٹ سے کہا۔ "خیال رکھنا ہم زیادہ بلندی پر نہ جائیں۔"

"ام اس وقت پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ ٹارل بلندی ہے میری مانی مانتے ہیں ہم تین ہزار فٹ کی بلندی پر آ جائیں گے۔"

"جب ابعد من ختم ہونے لگے تو کسی ہائی وے کے پاس رہنا ہم اتریں تو آگے بھی سفر کے لیے کچھ مل جائے اور تم دونوں کو بھی مشکل نہ ہو۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں ایسا ہی کروں گا۔" میں سادوی کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی چھڑکا اور کچھ اس کے منہ میں پٹکا یا۔ وہ ہوش میں آنے لگی۔ میں نے مزید کوشش نہیں کی وہ خود سے جاگتی تو زیادہ اچھا تھا۔ پانچ منٹ بعد اس نے آنکھیں کھول دیں

اپنے شعلوں کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا جو جیت کے جواں جسم کو چاٹ چکے تھے۔ اس نے کوسوں نہیں کرنا چاہتا تھا جو دھوپ کے ساتھ لہذا میں پھیل رہی تھی۔ لیکن جب میں ساکت ہوا تو مجھے لگا میں خود کو مصروفیت کا دھوکا دے رہا تھا۔ میرا دل دواں اپنی شعلوں کی طرف متوجہ تھا۔

اس سے پہلے میں جان نہیں پایا تھا کہ جیت میرے لیے کیا ہے۔ مجھے اس شخص لڑکے سے کئی محبت ہے جس کی محبت اور بہادری کا میں خود گواہ تھا۔ جو موت سے یوں کھیلتا تھا جیسے وہ اس کا پسندیدہ کھلونا ہو۔ جو مرنے سے بھی نہیں ڈرا۔ شاید اسی لیے وہ آسانی سے موت کے ساتھ چلا گیا۔ اس کا پسندیدہ کھلونا اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ میرا ہم وطن اور ہم مذہب بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا اس کے باوجود وہ مجھ سے منسلک ہو گیا۔ مجھ پر جان نثار کرنے لگا اور آخر میں اپنی زندگی مجھ پر دے گیا۔ جو کوئی راجہ کنور نے میری جان لینے کے لیے چلائی تھی وہ اس نے اپنے وجود پر روک لی۔ اب اس کا وجود راکہ میں بدل رہا تھا۔ چتا سے پڑیاں جھنکے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میرا ضبط ایک بار پھر جواب دے گیا۔ میں نے بیروں کے مل بیٹھ کر زمین پر ہاتھ رکھ لیا اور خاموش آواز میں رونے لگا۔ اس وقت میں آس پاس سے بھی مائل ہو گیا تھا۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ کرل قید ہے مگر دونوں پائلٹس تو آزاد ہیں۔ وہ مجھ پر حملہ کر سکتے تھے۔

مگر انہوں نے کوئی حرکت نہیں کی۔ شاید ان میں اتنی انسانیت تھی کہ مجھے اس سوگ میں نہ چھوڑیں۔ جب میرا دل ڈرنا لگا ہوا تو میں اٹھ کر نیلی کا پٹر کی طرف آیا۔ سادوی بے ہوش تھی لیکن اس کی نبض چل رہی تھی۔ یہ بے ہوشی نہیں جسم کا سہاف ڈنکنا تھا جو قدرت نے خاص طور سے خواتین کو عطا کیا ہے۔ ان کا دکھ ہسٹریا کی صورت میں آنکھوں سے بہہ جاتا ہے یا وہ بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ کرل مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ "شہید تم قتل کی کر رہے ہو، ایک بار پھر سوچ لو... تم اکیلے مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

"میں سوچنے کی سہلت ہی تو چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم کہاں جاؤ گے اٹریا کی سرزمین پر تم کہیں محفوظ نہیں ہو۔"

"میں بہت مرے یہاں رہا ہوں اور اب تک محفوظ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور پائلٹس کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی

خوش تھا کہ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد یہ فضائی سفر اس کے لیے
تھکان دہ نہ ہو۔ میں گزشتہ میں گھنٹے سے مصروف عمل
تھا۔ شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے اور سورج مغرب کی طرف
پر جا پہنچا تھا مگر مجھے امید تھی جب تک ہم زمین پر اتریں گے
روشنی پر قرار رہے گی۔ سادی بھی سولہ سترہ گھنٹے سے بے
آرام تھی اور اس دردناک میں اسے بہت زیادہ حرکت بھی کرنا
پڑی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ سرحد پار کرنے کا مرحلہ بھی
آسان نہیں ہوگا۔ لیکن اس سے پہلے تو ہم سے کم ایک دات
تکمل آرام کی ضرورت تھی۔

پائلٹ نے پلٹ کر اشارہ کیا تو میں نے ہیل فون لگا دیا۔
اس نے کہا۔ ”ہم لہریات سے تیس کلومیٹر دور ہیں اور
اب مشکل سے دس منٹ کی پرواز کا اہدہ من رہ گیا ہے۔“
”اوہ کے تم پانچ منٹ میں کوئی ہائی وے تلاش کرو اور
اس کے ساتھ ساتھ تین منٹ پرواز کے بعد ہیلی کاپٹر نیچے
اتار لو۔“

”یہ شرط لگاؤ اگر اترنے کے لیے مناسب جگہ نہ
ملے۔“
”ہائی وے سے مناسب جگہ کون سی ہوگی۔“ میں نے
اسے یاد دلایا۔ ”ناؤ گو۔“

پائلٹ نے سر ہلاتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی بلندی کم کرنا
شروع کر دی۔ پانچ منٹ بعد ہم ایک بڑی ہائی وے پر تھے اور
اس چوہین کی ہائی وے پر بے پناہ ٹریفک تھا۔ ان میں
بڑے ٹرکس اور بسیں بہت زیادہ تھیں۔ اس ٹریفک میں ہائی
وے پر ہیلی کاپٹر اتارنا خود کشی کے مترادف ہوتا اور اس سے
بہت زیادہ افراتفری مچ سکتی۔ میں نے پائلٹ سے
کہا۔ ”آس پاس کوئی جگہ دیکھو اور فوری ہیلی کاپٹر اتار لو۔“
اسی لمحے ایک سرخ روشنی چلے بھنے لگی جو اس بات کا
اشارہ تھی کہ اہدہ من بہت کم رہ گیا ہے۔ میں اور پائلٹ
دونوں بے تاب سے اترنے کے قابل کوئی جگہ دیکھ رہے تھے
اور جگہ بیک وقت ہم دونوں کو نظر آئی۔ یہ ایک کھڈی کا
میدان تھا جس میں دو تیس تیرہ آزما تھیں۔ پائلٹ ہیلی کاپٹر
میدان کے اوپر لانے لگا۔ کھیلنے والے لاپٹا کھیل بھول کر ہیلی
کاپٹر کی طرف متوجہ ہوئے اور جب وہ نیچے آنے لگا تو سب
بھاگے تھے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میدان صاف ہو گیا تھا
اور ہیلی کاپٹر آرام سے اس نرم مٹی والے میدان میں اتر
گیا۔ مجھے بے پناہ مٹی اڑا رہے تھے اس لیے میں نے اس
وقت تک دروازہ کھولنے سے گریز کیا جب تک مجھے تقریباً

اور دس منٹ بعد وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ اب ہوش میں تھی لیکن
خاموش تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لڑ رہے تھے جو دلتے
دلتے سے رخساروں پر ڈھلک آتے تھے۔ میں نے اس کی
طرف پانی کی بوتل بڑھائی۔ اس نے چند گھونٹ پانی لیا اور
بولی۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ کی طرف۔“ میں نے
کہا۔ ”وہاں سے ہم پاکستانی سرحد کی طرف جانے کی کوشش
کریں گے۔“

”یہ آپ نے اچھا کیا۔“ سادی نے سر ہلایا۔ ”بڑا
شان کا عملی اعتبار نقص ہے۔ اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا
ہے۔“

”وسیم کی اس طرف سرحد پار آنے جانے والوں سے
واقفیت ہے۔ وہ ان لوگوں کی مدد سے ہمیں سرحد پار کر سکتا
ہے۔“ پائلٹس کے خیال سے میں نے ہیل فون اتار دیا تھا
اور لیکن حد تک وہی آواز میں بات کر رہے تھے۔

”جیت۔۔۔؟“ سادی نے کچھ دیر بعد کہا تو میں نے سرد
آہ بھری۔
”راکھ ہو گیا۔“

سادی بھر روئے گی تھی مگر اب اس کے رونے میں
شدت نہیں تھی۔ مجھے خیال آیا۔ ”سادی مجھے راج اور بڑے
کتور کا بھی۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے ان کا افسوس کرنے
کی۔“ اس نے ٹپ کر میری بات کاٹی۔ ”میرا ان خود غرض
اور سفاک لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کاش میں جی جی
جو کی بہن ہوتی۔ پلیز آجندہ ان کی بات مت کرے گا۔
میرا ماضی جیت ہے اور میرا حال اور مستقبل آپ لوگ ہیں اس
کے علاوہ میرا کوئی ماضی نہیں ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے مجھے بھی اچھا نہیں لگتا
کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ بس اب تم ہماری ہو۔“

”شوہن ان لوگوں کو کیسے قاتل کرے گا؟“ سادی کا
اشارہ پاکستان والوں کی طرف تھا۔
”پتا نہیں... لیکن بتانا تو ہوگا۔“

میں نے سارا اسلحہ چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ نمایاں ہوتا
تھا۔ میں نے صرف ایک چھوٹی شاٹ گن اور اس کے کچھ
کارٹریج سادی کے بیگ میں ڈال لیے تھے اور ایک پستول
اور اس کے کچھ اضافی میگزین میری پتلون کی جیب میں لگے
ہوئے تھے۔ سادی کی طبیعت ٹھیک لگ رہی تھی ورنہ مجھے

رک نہیں گئے اور مٹی اڑنا تمام نہیں گئی۔ میں نے سادی سے کہا۔ ”تم اس اسٹیٹ کی راجکماری ہو جس کا یہ بیل کاہن ہے میں تمہارا محافظ اور سکرٹری ہوں۔“

وہ پچھلے اعزاز میں مسکرائی۔ ”جو چاہے بنا دیں۔“ یہ کوئی گاؤں تھا جس کے ساتھ ہی میدان میں کھڑی ہو رہی تھی اور تقریباً ساڑھے ستر گز لمبی تھی۔ اسے لوگوں سے الگ تھوڑا سا جدا اسلے کی تلاش ہوا اور زبردستی مناسب نہیں تھی اس کے مقابلے میں حکمت کی سے کام لیا جاتا تو یہی لوگ ہماری مدد پر آمادہ ہو جاتے۔ میں نے سادی کو اندر رکھنے کو کہا اور خود پیچھے اتر آیا۔ میں نے دروازہ دھرا سا کھلا رکھتے دیکھا تاکہ لوگ خود راجکماری کو دیکھ سکیں۔ ویسے سادی کچھ راجکماری ہی تھی۔ کنور خانہ ان راجا خانہ ان تھا اور وہ اب اس کی انکوتی وارث تھی یا شاید اس کی ایک بہن اور بھی تھی۔ جاگیر و دولت اب اسے ملتی یا پھر راج کنور کے بیٹے وارث ہوتے۔ مگر اس وقت سادی ریاست چتر پور کی راجکماری تھی۔ بیل کاہن پر ریاست کا نام بھی تھا۔ اترنے سے پہلے میں نے پائٹلس کو خبردار کر دیا کہ وہ کوئی لفظ حرکت یا بات کرنے سے گریز کریں جس کا انجام ان کی وفات کی صورت میں ملے۔ میرے اترتے ہی دو کنور منہ مکھ سامنے آئے۔ وہ کھڑی کے کھڑی تھے۔

”توں کون اے۔“ ایک نے بیل کاہن میں مہاکٹے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ ریاست چتر پور کے مہاراجا جیجیت سنگھ کا بیل کاہن ہے۔ فی خرابی کی وجہ سے بیل کاہن یہاں اتارنا پڑا۔ تم لوگوں کا کھیل خراب ہوا لیکن معاملہ جان کا تھا۔ بیل کاہن میں ریاست کی راجکماری ستر کر رہی ہیں۔“

”توں کون اے؟“ دوسرے سکھ نے بھی وہی سوال کیا۔

”میں پرسز کا سیکرٹری اور ہاڈی گارڈ ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا ہمیں یہاں سے آگے جانے کے لیے کوئی گاڑی مل سکتی ہے؟“

”آگے کہاں؟“

”ہمیں ہوشیار پور جانا ہے۔ وہاں راجا تیر سنگھ کے ہوتے کی سگائی ہے پرسز اسی میں شرکت کے لیے جاری تھیں۔“

راجاؤں کے ذکر سے زیادہ انہیں بیل کاہن اور اس میں موجود سادی کی جھلک نے متاثر کیا تھا۔ ایک سکھ

ماہنامہ سرگزشت

ہوا۔ ”کیوں نہیں سرکار گڈیاں بہت... کسی حکم کرو۔“ ”میری خیر ہے پر پرسز ہر گاڑی میں سفر نہیں کر سکتی ہیں۔“ میں نے صبح کی اس پر وہاں موجود گاؤں کے سرکردہ لوگوں میں مختصر ٹینک ہوئی اور طے ہوا کہ قلعے کی گڈی پرسز کے لیے سونڈوں رہے گی۔ وہ مضبوط بھی تھی اور طویل سفر کر سکتی تھی۔ فیچا سنگھ عرف فیلا وہیں موجود تھا۔ وہ درمیانے قدر اور درمیانے جسم کا صورت سے شریف نظر آنے والا شخص تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ثالث جا کر گاڑی لے آئے کیونکہ راجکماری کو بہر صورت آج کے دن وہاں پہنچنا ہے اور کل سے شادی کی تقریبات کا آغاز ہو جائے گا۔ جب تک گاڑی آتی میں نے گاؤں کے معززین کو پابند کر دیا کہ وہ پائٹلس اور بیل کاہن کی دیکھ بھال کریں گے جب تک مدد نہ آجائے۔ ان سے منٹ کر میں وہاں بیل کاہن میں آیا۔ میں نے پائٹلس سے کہا۔ ”ہم یہاں سے طے جائیں گے اور ان کو بتایا ہے کہ بیل کاہن میں فی خرابی ہوئی ہے۔ ہمارے جانے کے بعد تم دیکھو پر کسی سے مدد طلب کر سکتے ہو لیکن بہتر ہو گا ہمارے ہمارے میں کسی کو مت متاثر نہ ٹھکن ہے تم پر اپنے آکا کی طرف سے خطاب نازل ہو میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

”مجھ رہا ہوں۔“ اس نے سپاٹ لیے میں کہا۔ ”تمہاری مہربانی کہ ہمیں مار کر نہیں جا رہے۔“

”میں بلا وجہ کسی کو نہیں مارتا اور ہاں کر تلوں کے ہمارے میں بھی قادیانہ اب تک وہیں پھنسا ہوا گا۔“

اس نے صرف سر ہلایا۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ اپنے کام سے کام رہیں گے۔ فیلا دس منٹ میں اپنی گڈی لے آیا۔ میری توجہ کے عین مطابق یہ خستہ حال بھارتی ساختہ جیسی تھی لیکن گاؤں والوں کے لیے یہ کسی گھوڑی کار سے کم نہیں تھی۔ مگر میں نے اس پر تبصرہ نہیں کیا کیونکہ اصل مرحلہ یہاں سے جلد از جلد نکل جانے کا تھا۔ میں نے سادی کا بیگ اٹھا کر جیسی میں رکھا اور وہ بہت نزاکت اور نعرے کے ساتھ آکر جیسی میں پہنچی تھی۔ اس وقت وہ راجکماری کی کھل اور کاری کر رہی تھی۔ ویسے گاؤں والے حیران تھے کہ راجکماری اتنے سادہ طبعے میں اور اتنے معمولی سے سامان کے ساتھ تھی۔ میں نے ان کے شکوک رفع کرنے کے لیے جان جاری کیا کہ راجکماری فضائی سفر میں ایسا ہی لباس پہنتی ہیں اور ان کا سامان سڑک کے درستے پہلے ہی ہوشیار پور پہنچ چکا ہے۔ بیل کاہن میں اتنا سامان لے جانے کی گنجائش نہیں

اگست 2014ء

175

تھی۔ میں نے کہا۔ "اس میں تو راجکاری کے زیورات کے بکس بھی نہیں آتے۔"

بیلی کا پڑا ترنہ کے دس منٹ بعد سورج غروب ہو گیا تھا اور اب مکمل اندھیرا تھا۔ مگر وہاں موجود افراد جانے کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لیے جب کسی حرکت میں آئی تو میں نے اور سادی نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے سب سے نیا بخندشہ یہ تھا کہ کہیں سوبل جواب نہ شروع ہو جائیں یا کوئی چڑچڑ کا واقف کار نہ نکل آئے یا کوئی ہوشیار پور کے مفروضہ راہا کی ہسٹری سے واقف ہو جس کی الف بے سے بھی ہم ناواقف تھے تو معاملہ خراب ہو جاتا اور پھر بات دہیں طاقت کے استعمال تک آجاتی جس سے آگے مزید خرابیاں پیدا ہوتیں۔ میں قہقہے کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا جس کی زبان ٹیکسی کے انجن کے ساتھ ہی حرکت میں آگئی تھی۔ وہ پہلے تو ہمیں اپنی خاندانی تاریخ سناتا رہا، اگر ہم بیچ کے صدمے میں نہ ہوتے تو بہت جتنے مگر ہمارے لیوں پر سکرابٹ تک نہیں آئی۔ ہائی وے تک آنے پر میں نے اسے خبردار کیا کہ پرسنز خاموشی پسند ہیں اور اپنے آس پاس بے ضرورت شور پسند نہیں کرتی ہیں۔ اس پر وہ خاموشی ہوا تھا۔

ہم ہائی وے پر اپنی سمت گئے تھے۔ بہ ظاہر ہمارا رخ واپس شملہ کی طرف تھا لیکن کچھ دیر بعد ٹیکسی ایک ذیلی ہائی وے پر مڑی جو ہوشیار پور کی طرف جارہی تھی۔ میں نے قہقہے سے معلومات حاصل کیں اور ان کے مطابق گھٹی ہائی وے لدھیانہ کی طرف جارہی تھی۔ دیگر معلومات میں نے یہ حاصل کیں کہ راستے میں کوئی پولیس چوکی اور چیک پوسٹ آتی ہے یا نہیں۔ اس نے انکشاف کے انداز میں گالی دے کر کہہ "کوئی جگان.... سے خالی ہے۔ ہر جگہ کھانچے کے لیے بیٹھے ہوتے ہیں۔"

میں نے اچانک کہا۔ "واپس چلو...."

وہ بھونچکا رہ گیا۔ "واپس.... کیا گاؤں چلوں؟"

"نہیں.... اب ہم لدھیانہ جائیں گے وہاں راجا صاحب کی ایک کوٹھی ہے۔"

"تو پہلے بتانا تھا جی دیں چلتے۔" اس نے کہا۔

"پرسنز نے ابھی ارادہ کیا ہے پہلے تم کو کہاں سے لے گا۔"

"انہوں نے کب کہا ہے جی؟" وہ پھر حیران ہوا۔

"ابھی.... ہم تابعدار خادم ہیں آگے کا اشارہ دیکھتے"

ہیں۔" میں نے کہا۔ کچھ دیر بعد آنے والے اولین کٹ سے اس نے ٹیکسی واپس موڑ لی۔ میں منٹ بعد ہم اس کے گاؤں کے پاس سے گزرے تھے یہی کا پڑا اپنی جگہ موجود تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ ایک دو گھنٹے میں ان کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور وہ یہاں سے پرواز کر جائیں گے۔ کچھ دیر بعد ہم ایک چیک پوسٹ کے پاس سے گزرے تھے لیکن وہاں موجود پولیس نے ہمیں روکا تھا۔ وہ صرف بسوں اور ٹرکوں کو روک رہے تھے کیونکہ اسی سے ان کی آمدنی ہوتی تھی۔ گاڑیوں کو روکنے سے بعض اوقات لینے کے دینے پڑ جاتے تھے۔ انڈیا میں دولت مند اور اونچے طبقے کے لوگ بھی ٹیکسیوں یا عام سی گاڑیوں میں سفر کرنے میں مار محسوس نہیں کرتے ہیں۔ قہقہے نے پوچھنے پر بتایا کہ یہ ہائی وے پچانوے تھی۔ ہم چند ہی گڑھ کی طرف جاتے ہوئے ہوشیار پور کی طرف مڑے تھے۔ وہ ہائی وے انہیں تھی۔

میں اس کی گفتگو دہن نشین کر رہا تھا۔ اس نے مزید بتایا کہ ہائی وے پچانوے ہی سوگا سے آگے فیروز پور کی طرف جاتی تھی اور یہی ہائی وے آگے جا کر پاکستان میں داخل ہونے کے بعد فیروز پور روڈ بن جاتی تھی جو قصور سے ہوتی لاہور تک چلی جاتی تھی۔ فیروز پور مشرقی پنجاب میں اہم ترین شہر تھا کیونکہ اس کے پاس ہی سٹیج کا ہیڈورک تھا اور ریڈ کلف نامی بددانت شخص نے اسے فراغ دلی سے اٹھایا کو بخش دیا تھا حالانکہ یہ آبادی اور اہمیت کے لحاظ سے پاکستان کا فطری حصہ تھا۔ اسے اٹھایا کو دینے کا مقصد پاکستان کو سٹیج کے پانی سے محروم کرنا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ اس کا کنٹرول سنبھالتے ہی اٹھایا نے پانی بند کر دیا۔ ایک نام نہاد مساجد سے کے ذریعے اٹھایا کو تین مشرقی دریا بخش دئے گئے حالانکہ وہ سارے کے سارے کشمیر سے آتے ہیں اور کشمیر ہمارا حصہ ہے۔ ہمارے حکمرانوں کی اس فراغ دلی کا اٹھایا کے ہوشیار حکمرانوں نے یہ جواب دیا کہ اب وہ باقی تین دریاؤں پر بھی دھڑا دھڑا کم بنارہے ہیں اور مستقبل میں وہ ہمارا پانی مکمل طور پر بند کرنے کی پوری تیاری کر رہے ہیں۔

فیروز پور کا نام سن کر یہ ساری باتیں میرے ذہن میں آئی تھیں۔ ٹیکسی والے نے پتا پوچھا تو میں چونکا اور اس سے کہا۔ "نی اکیل میں کسی اچھے شاہک سینٹر پر اتار دو.... پرسنز لے کچھ لینا ہے ہم وہاں سے واپس جائیں گے۔"

قہقہے کے چہرے پر شک آیا تھا مگر وہ جرأت نہیں کر سکا

جسٹ اور لارنس شرٹ کے جڑے لیے۔ غیاں اور سوزے لیے۔ جوتے مجھے اسی اسٹور میں مل گئے تھے۔ سادی کو کپڑوں کی ضرورت نہیں تھی اس لیے اس نے اسکی چیزوں کی خریداری کی جن سے ہمارا طبقہ تلف نظر آتا۔ میرے لیے اس نے سن گلاس اور سادہ شیشوں والے فریم لیے۔ ایک پیکیٹ تھی۔ اپنے لیے اس نے نیشنل سٹیل کم کے دو سیٹ لیے تھے۔ لڑائی روم میں اس نے لباس تبدیل کیا۔ اتارا جانے والا لباس میں نے ہائپر ٹیکسٹائٹ ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔ میرا اضافی جوتا اور دوسرا سامان سادی کے بیگ میں آگیا تھا اس کے لیے ہمیں الگ سے کوئی بیگ لینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہیں سے میں نے معلوم کیا تو اسی بازار میں ایک شاپ کا پتا چلا جہاں مجھے کپڑا اور اسی قسم کا دوسرا سامان مل سکتا تھا۔

اٹلیا کے ایک چھوٹے سے شہر میں بھی کپڑا اور دوسرے سامان کی ایسی حدید شاپ موجود تھی جہاں سب کچھ دستیاب تھا۔ میں اندر داخل ہوا تھا کہ میری نظر ایک ڈسپلے میں پڑی اسکرین والے ٹیپ کپڑا پر گئی۔ یہ اس وقت سے آئے تھے اور تیزی سے مقبول ہو رہے تھے، میں نے سوچا کہ کپڑا کتنا بھائے ٹیپ کیوں نہ لے لوں۔ میں نے شاپ کپڑا کو بتایا کہ مجھے ایسا ٹیپ چاہیے جس میں انٹریٹ کے لیے الگ سے کچھ لگانا نہ پڑے۔ اس نے فوراً ایک ٹیپ نکال کر میرے سامنے رکھا۔ ”سریہ انٹریٹ ریٹی ہے اس میں جلتی ہے۔ صرف نکشن آن کرانا پڑے گا۔“

”نکشن کیسے آن ہوگا؟“

”سر آپ انٹریٹ پروڈا نڈر سے....“

”سوری میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کیا یہ کام آپ نہیں کر سکتے۔ میں ادا نیکی کروں گا۔“

”کیوں نہیں سر۔“ اس لوجران سکھ نے خوشدلی سے

کہا۔ ”انٹریٹ سمیت یہ آپ کو پینتیس ہزار میں پڑے گا۔“

اس میں غبن مینے کا انٹریٹ بھی شامل ہوگا۔“

”ٹھیک ہے تم اسے اکیٹو کرو اور پھر اس دوران میں

اراس کا استعمال سمجھا دو۔“

”مجھے آتا ہے۔“ سادی نے مداحیت کی۔ ”مائی کے

پاس ہے اس نے سکھایا تھا۔“

”بس تو تم انٹریٹ آن کرو۔“

”آپ شیج میں یہ کام کراتا ہوں۔“ اس نے

سامنے لگی کر سبوں کی طرف اشارہ کیا۔ چند منٹ میں اس

اگست 2014

کہنیل کا پڑ سے اترنے والوں پر کسی قسم کا شک کر سکے۔ اگر ہم وہ نہیں تھے جو ظاہر کر رہے تھے تب بھی اس کی اوقات سے بہت دور کی چیز تھے اس لیے اس نے خاموش رہنے میں مالیت بھی۔ اس نے ہمیں اندھیا نہ شہر کی سول لائن کے پاس بازار میں اتارا اس میں کئی حدید شاپنگ سینٹر تھے۔ یہ بڑا شہر نہیں ہے شکل سے چند گلو میٹرز پر پھیلا ہوا ہے۔ مگر اس شہر نے تقسیم سے پہلے بے شمار شاعر اور عالم پیدا کیے۔ نیچے اترنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میری جیب تو خالی تھی۔ میں نے بیگ کھولا اور اس میں سے ایک پانچ سو روپے کی گڈی سے ایک نوٹ نکال کر فیس کے حوالے کیا۔ اس کے چہرے پر جو خوشی دکھائی دی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”اب جاؤ۔“

وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں سادی کے ہمراہ پہلے ایک ریستوران کی طرف بڑھتا ہوں گا لیکن اور بھوک پیاس سے برا حال تھا۔ ریستوران میں کھانے کا آرڈر کر کے ہم نے ہماری ہماری خود کو اس کے واش روم میں فریش کیا۔ میدانی علاقے میں گری بے پناہ تھی اور اسے سی میں آکر سکون ملا تھا۔ سادی کی آنکھیں مسلسل رونے سے سوچ رہی تھیں۔ منہ دھو کر اس کا چہرہ بہتر ہوا تھا۔ کھانے کا موڈ نہیں تھا اس لیے میں نے اس کے لیے چائے اور اپنے لیے کافی کے ساتھ اسٹیکس کا آرڈر دیا۔ دیگر نے لائبر کے وقت ان چیزوں کے آرڈر پر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں اور خاموشی سے چلے گیا۔ اس کے جانے کے بعد سادی نے پوچھا۔ ”اب ہم کیا کریں گے؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ رات یہاں رک کر ہم صبح کھن اور چائیں گے اور پھر دسم اور دوسروں سے رابطہ کریں گے۔“

دسم کے نام پر اس کا چہرے پر رنگ آیا تھا اس نے

لجابت سے کہا۔ ”شوٹی کیا آج رابطہ نہیں کر سکتے؟“

”آج۔“ میں نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”کوشش کر

سکتے ہیں۔“

لیپ ٹاپ اور اس کے ساتھ دوسرا سامان نہ جانے

کہاں گیا تھا مگر مجھے موبائل کے مقابلے میں انٹریٹ سے

رابطہ محفوظ لگا تھا۔ چائے اور کافی کے ساتھ اگلی پانچ چیزوں

نے ہمیں کسی قدر تازہ دم کر دیا تھا۔ ریستوران سے نکل کر

ایک شاپنگ سینٹر میں داخل ہوئے۔ میں نے اپنے لیے

ماہنامہ سرگزشت

نے اتر بیٹھ آن کرا کے ہمیں چیک کرایا اور بولا۔ "اے کراس دی اظہا نہیں بھی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے شکل ہر جگہ لکھیں گے۔ اس میں ڈبل کیرا ہے فرٹ کیرے سے اسکا ٹپ پروڈیو کال کی جاسکتی ہے۔"

"بیٹری ہائیک نئی ہے؟"

"نارل ہڈی چار سے چھ گھنٹے اور آلو ویڈیو پر تین سے چار گھنٹے۔ یہ ہر طرح کی ویڈیو پلے بیک کر سکتا ہے۔"

اس نے کر کے دکھایا۔ اس کے ساتھ چار جڑ، چنڈ فرنی اور کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔ سادی کی قدر پڑ جوش ہو گئی تھی۔

باہر آ کر اس نے کہا۔ "اب ہم وہاں بات کر سکتے ہیں۔"

"ہاں لیکن اس کے لیے ہمیں کسی جگہ کی ضرورت ہو گی جہاں ہم کسی کی نظر اور کان میں آئے بغیر پاکستان رابطہ کر سکیں۔" اس نے کہا اور ایک جیسی دالے کو روکا۔ اندر بیٹھ کر میں نے اس سے کسی ایسے ہوٹل کی طرف چلنے کو کہا جہاں کھانے کے ساتھ ساتھ دیکھنے کا انتظام بھی ہو۔ جیسی دالے نے جس سٹی فخر۔ نظروں سے سادی کو دیکھا تھا اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ جیسی دالے نے کیا سوچا ہے مگر ہماری بات سے وہ جو چاہے سوچتا رہے۔ اس نے ایک ذرا اچھے درجے کے ہوٹل کے سامنے جیسی روکی اور جب میں اسے کرایہ دے رہا تھا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ "سر جی اگر کوئی کمرہ چاہے تو وہاں ساگر سے بات کرنا۔۔۔ وہ دیکھ رہا ہے۔"

سادی ذرا دور تھی وہ نہیں سن سکی وہ نہ مرید، امانتی۔

ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس کوئی شناختی چیز نہیں تھی۔ ہوٹل والے اس کے بغیر کمرہ نہیں دیتے۔ ایسے میں جیسی دالے کی غریب ذہنیت کام آئی اس نے ہمیں حیاش جوڑا سمجھا اور اپنے چائے والا کا نام دے دیا۔ ساگر ہماری مدد کر سکتا تھا۔ ڈانٹک ہال بڑا اور اس وقت بھرا ہوا تھا۔ رات کے دس بجے وہاں شکل سے کوئی میز خالی نظر آرہی تھی مگر ایک ہیڈ ویئر نے ہمارے لیے جگہ نکال لی۔ میں نے سی نوڈ کا آرڈر دیا تھا تا کہ حلال حرام کا مسئلہ نہ ہو۔ بھوک ہم دونوں کو نہیں تھی۔ ہم تو یہاں کسی اور مقصد کے تحت آئے تھے۔ جو ویڈیو آرڈر لینے آیا میں نے اسے آرڈر کے ساتھ ہی ایک پانچ سو کا نوٹ تمنا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر آیا تھا کہ اگر میں اسے حکم دیتا کہ اپنے باپ کو مل کر دو تو شاید وہ یہ بھی کر گزرتا۔ آرڈر دی جلیس کرتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ "سر کوئی خدمت؟"

"ساگر نامی ایک ویئر ہے یہاں؟"

وہ چمٹا۔ "ہے لیکن سر جو کام ساگر کر سکتا ہے وہ میں بھی کر سکتا ہوں۔"

میں نے سوچا اور آہستہ سے کہا۔ "ہمیں ایک رات کے لیے کمرہ چاہیے۔ بغیر کسی گھنٹہ پر بھی کے۔۔۔ تم سمجھ رہے ہو؟"

جیسی ڈرامیور کی نسبت یہ ویئر نہایت گھانگ اور تجربے کا تھا اس نے نظر اٹھا کر بھی سادی کو نہیں دیکھا اور نہایت نارل لہجے میں بولا۔ "کیوں نہیں سر۔۔۔ بالکل مل سکتا ہے۔"

"کوئی مسئلہ نہ ہو۔۔۔ نہ ابھی۔۔۔ نہ رات میں اور نہ صبح۔" میں نے کسی قدر بدلے لہجے میں کہا۔ "میں مسئلے پسند نہیں کرتا ہوں ان کا فوری حل نکال لیتا ہوں۔ اس میں مجھے صرف مالی نقصان ہوتا ہے لیکن دوسروں کا نقصان اس سے آگے کا ہوتا ہے۔"

اس کے چہرے کا رنگ بدلتا تھا اس نے جلدی سے کہا۔ "سر کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔۔۔ میں گارنٹی دیتا ہوں۔"

"اس صورت میں تمہاری توقع سے زیادہ ملے گا۔"

"آپ آرام سے ڈنر کریں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "کوشش کریں کم سے کم دو گھنٹے یہاں رکھیں تا کہ آپ کو ہر گھنٹہ انتظار نہ کرنا پڑے۔"

اس کے جانے کے بعد ہم نے ڈنر شروع کیا۔ سادی کم کھا رہی تھی مگر میں نے اصرار کیا۔ "سادی کھاؤ۔۔۔ ہمیں آنے والے وقت کے لیے تو تالی کی ضرورت ہے۔ یہ سوچ کر کھاؤ۔۔۔ ویسے بھی ہمیں یہاں دو گھنٹے گزارنے ہیں۔"

ہم نے بہت سکون سے ڈنر کیا۔ سب کھایا اس کے بعد میں نے اپنے لیے کافی اور سادی کے لیے اورنج جوس منگوایا۔ اسے دو تالیاں لیتی تھیں۔ ابھی ساڑھے گیارہ بجے تھے اور آرام وہ نشست پر بھی سادی چکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں نے ویئر کے لیے اشارہ کیا تو وہ ویئر نمودار ہوا۔ اس نے لجاہٹ سے کہا۔ "سر پلیز۔۔۔ صرف پندرہ منٹ اور۔۔۔ ٹائٹ شفٹ پہنچ ہو رہی ہے۔ اس میں اپنا آدوی آئے گا اور وہ کوئی مسئلہ نہیں ہونے دے گا۔"

مجھ پر ابھی مزید بٹھنا پڑا اور اس کے لیے مجھے ایک کافی اور چٹا پڑی تھی۔ خدا خدا کر کے ویئر گیارہ بجاس پر واپس آیا۔ اس نے مل ہمارے سامنے رکھا اور میں نے اسے دیکھ کر دم مل کے ساتھ رکھ دی۔ اس نے کہا۔ "بھیرے"

حرامی پن مت کر... میری جتن سے بات کر۔۔۔ وہ مجھ سے جان پھڑانا چاہتا ہے۔"

"سفیر وہ چلا گیا ہے سب کو چھوڑ کر۔"

اسی لمحے سفیر سے سواگل دسک نے جھین لیا۔ "شہباز صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں... جت۔۔۔ اس کی آواز مطلق میں پھنس گئی تھی۔"

"ہاں یار۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

مجھے بچاتے ہوئے اس نے اپنی جان دلا دی۔ ہم اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکے تھے۔ اس نے میرے ہاتھوں میں جان دے دی۔"

دسک بھی رو رہا تھا۔ عہد اللہ آگیا اس نے سواگل لیا تو اسے بھی بتانا پڑا تھا۔ پہلے وہ شاک میں رہ گیا تھا۔ پھر اس نے سادی کے بارے میں پوچھا۔ "وہ میرے ساتھ ہے۔۔۔" واٹس روم مگنی ہے۔ ایک منٹ میں اسے بلاتا ہوں۔"

میں نے دروازے پر دستک دی۔ سادی باہر آئی تو اس کا چہرہ پانی سے نہیں آنسوؤں سے بیگا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "تم بات کر دو میں آتا ہوں۔"

جب تک میں اپنے دل کا بوجھ کم کر کے آیا سادی دو دھوکہ خاں موش ہو گئی تھی اور اس کی دسک سے بات بھی ہو گئی تھی۔ دوسری طرف سفیر اور عہد اللہ نے بھی دسک کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ سادی نے ویلے ویلے کال لگائی تھی اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ جتن کا دکھ اپنی جگہ لیکن سادی کو دیکھ کر دسک کے چہرے پر جواطمینان آیا تھا وہ محسوس کیا جاسکتا تھا۔ جب تک سادی واٹس نہیں آئی دسک کے دل پر جھڑپت رہی تھی وہ وہی جانتا تھا یا پھر سادی جانتی تھی۔ یہ اطمینان ہی ان کی دلی کیفیت کو ظاہر کر رہا تھا سادی نے مجھ سے کہا۔ "دسک آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

دسک نے کہا۔ "سادی نے مجھے مختصر حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"یعنی اب تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟"

"آپ فکرنہ کریں میں خود ردائہ ہورہا ہوں اور اپنے آدمی بھی ساتھ لاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "تھپ کل صبح مجھ سے رابطہ کر لے گا۔ اس وقت تک جویشن وارن ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے ایسی بات کرنا مناسب نہیں ہے اور ہم بہت جگے ہوئے ہیں۔ سادی کو آرام کی ضرورت ہے۔ کل

صبح بات کریں گے۔" میں نے کہا اور لیپ آف کر دیا۔ سادی بستر پر غم ورلا ہو گئی تھی۔ اسے سی چلنے کے بعد کمرانگک ہو گیا تھا۔ یہاں دو کچے کبیل موجود تھے۔ میں نے ایک کبیل اور کچھ اٹھایا۔ "تم سو جاؤ۔۔۔ میں نیچے لیٹ رہا ہوں۔"

دوبے جھین ہو گئی۔ "شوہا نیچے صرف قالین ہے آپ بے آرام ہوں گے۔"

"میں تو کمروری زمین پر سوتا آیا ہوں۔ تم فکرت کرو قالین دھیر ہے۔ میں کبیل بھی بچاؤں گا۔ تم سو جاؤ۔" میں نے کہا اور قالین پر ٹکیہ رکھ کر لیٹ گیا۔ ابھی سردی محسوس نہیں ہوئی تھی کہ کبیل لیتا۔ سادی کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

"شوہا کیا ہم جتن کے لیے دعا نہیں کر سکتے؟"

"ہاں نہیں۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "ہم ان نیچے کے اتنی ہیں جنہوں نے منافقوں کی بخشش کے لیے بھی دعا کی تھی۔ جتن منافق تو نہیں تھا۔ ہم اللہ سے مانگ سکتے ہیں آگے وہ مرضی کھا لک ہے کہ بخشے یا نہ بخشے۔"

سادی خاموش ہو گئی پھر اس نے نہیں کہا تھا۔ میں نے دل میں جتن کے لیے دعا کی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جسم خستہ حال ہو رہا تھا اور دل کی کیفیت اس سے بھی زیادہ خستہ تھی۔ اس کے باوجود بہت مشکل سے نیند آئی۔ میں شاید دو بجے سو رہا تھا اور صبح سات بجے آکھ کل گئی۔ جسم لوٹ رہا تھا اور سر میں درد تھا۔ سادی بے خبر سو رہی تھی میں نے اسے سونے دیا اور خود اٹھ کر واٹس روم میں آیا۔ یہ لگژری قسم کا ہاتھ روم تھا جس میں ہاتھ دب بھی تھا۔ میں نے اسے گرم پانی سے بھرا۔ اس میں کھون اور جراثیم کش ملا دیا اور کپڑے اتار کر اس میں بیٹھ گیا۔ جہاں جہاں دھم تھے اور کسی قدر ہرے تھے وہاں مر جھکی گئی تھیں۔ کچھ دیر میں تکلیف کم ہو گئی اور گرم پانی جسم سے درد مٹنے لگا تھا۔ میں گردن تک اس میں لاؤب کر لیٹ گیا۔ میں آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا تو بجے ہمیں یہاں سے لگتا تھا اس کے بعد ہم کہیں ناشتا کرتے اور پھر گھومتے پھرتے رہے۔ اگر دسک صبح تک یہاں پہنچی کر ان لوگوں سے رابطہ کر لیتا جو سرحد پار کراتے تھے تو ممکن ہے آئے والی رات ہم پاکستان میں ہوتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمیں پھر رات گزارنے کے لیے یہ لگانا تو ملا ہوا تھا۔ نو کھینے کا آرام کافی ہوتا۔

میں شاید غنودگی میں چلا گیا تھا اچانک برابر والے

تا میرا اب تک برقرار تھی کہ میرے زخم بہت تیزی سے भर جاتے ہیں۔ اب بھی معمولی زخم بھر چکے تھے اور بس کھرٹ باقی رہ گیا تھا اور جو گہرے تھے وہ بھی بھرنے کی پوزیشن میں آچکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ٹیب اور انٹریسٹ کی سہولت اپنی جگہ لیکن مجھے ایک سہولت کی ضرورت تھی۔ اس کی مدد سے بہت جلد رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ اور بیک نچل کے ساتھ ایک ریک تھا جس پر مختلف شوٹیں رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کرشل کا بنا ہوا ٹیڈی بیئر تھا۔ یہ ذرا مختلف چیز تھی میں نے پہلی بار کرشل کا بنا ہوا ٹیڈی بیئر دیکھا تھا۔ اس کا شیشہ کسی قدر گہرے سبز رنگ کا تھا۔ میں نے ایسے ہی اسے اٹھایا تو اس کے نیچے چھپا ہوا تار نظر آیا۔ تار ٹیڈی بیئر کے اندر جا رہا تھا اور پیچھے یہ دیوار میں غائب ہو رہا تھا۔

یہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کوئی نائٹ شو نہیں تھا اس کے اندر روشنی ہوتی تھی اور یہ رات کی تار کی میں نظر آتا۔ تار بجلی کا ہو سکتا تھا۔ مگر میں جن حالات سے گزر رہا تھا اور جس طرح میں یہ کرا لیا تھا۔ میں مفلوک ہو گیا۔ میں نے اسے ہلا کر دیکھا۔ یہ وہی تھا شاید ایک سوا گلو وزن ہو گا۔ پھر میں نے تار کھینچ کر توڑ دیا اور ٹیڈی بیئر نیچے گرا دیا۔ وہ نوٹ گیا اور اس کے اندر بھی چیز سامنے آگئی۔ یہ

کمرے سے ایسی دھمک ہوئی جیسے کوئی دیوار سے ٹکرایا ہو۔ ساتھ ہی ہلکی سی نسوانی چیخ سنائی دی تھی۔ میں چونک گیا۔ شاید برابر والے کمرے میں کوئی جوڑا تھا اور مرد نے معاملات سلجھانے کے لیے بازو کا سہارا لیا تھا۔ دھمک خاصی بلند تھی اور اتنی قوت سے کوئی دیوار سے ٹکرائے تو اس کی وفات کا امکان بھی ہو سکتا تھا۔ مگر جب آواز دوبارہ نہیں سنائی دی تو میں واپس لیٹ گیا۔ پھر مجھے وقت کا خیال آیا۔ برابر سے اپنی درست واقعہ اٹھا کر دیکھی۔ سوا آٹھ بج رہے تھے۔ میں سوا گھنٹے سے یہاں تھا۔ گرم پانی نے میل نکیل

کے ساتھ درد بھی کھینچ لیا تھا اور میرا جسم ہلکا ہو رہا تھا۔ ہا ہر نکل کر میں نے کوئی ٹیک شاور لیا اور تویہ سے جسم صاف کر کے کپڑے پہن کر باہر آیا۔ سادی جاگ گئی تھی۔ مجھے آنا دیکھ کر اُٹھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "جلدی سے واش روم سے ہواؤ۔۔۔ ہمیں تو بچے یہاں سے چاہتا ہے۔"

"میں ہاتھ بھی لوں گی۔"

"اسی لیے جلدی کا کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور اریک نچل کے آئینے میں دیکھ کر ہال بنائے۔ مجھے حکیم قادی کی دوائیاں کھاتے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا لیکن ان کی یہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

عید کی خوشیوں کے سنگ
جاسوسی کے شہدے کے دلفریب رنگ

اولین صفحات ● جرم کی سنگین دلدل میں بہتے مسکراتے لوگوں کے دھنسنے کا دل خراش فساد۔۔۔ روبینہ رشید کے قلم سے

آوارہ گرد ● دکھ سکھ کے شر کے تھیں کی ایک بڑی اور انوکھی دنیا کی جنگ۔۔۔ ہر ایک کو اپنی تلاش کا سہارا پیش تھا۔ ڈاکٹر عبداللہ بھٹو کی شہریت

جواہری ● احمد اقبال کے شہر قلم سے ایک جوانی کے کھیل کے نئے نئے انداز

مغرب کے نالیے انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب و ادب کی مکاشفہ اور محبت کی پوری دنیا کا قابل فراموش کہانیاں

سبز و زرق کی کہانیاں

پہلی کہانی ● مصوٰی بچوں کے انہر رنگ دلوں کے بہاؤ دیووں کی مظہر دل سوز کہانی

دوسری کہانی ● فطرت کی سسین واپس انوکھی حیات کے تحفظ کو پیش خطا پرستی کی غیر موزون اور نئی دلچسپ باتیں۔۔۔ کھاتیں



میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم لوگ یہاں رات کو رہنے والوں کی ویلے بولتے ہو۔۔۔ یہ کام کہاں ہوتا ہے؟"

اس کی ناک سے خون پھوٹ کر نکلا تھا اور اس کی سفید شرٹ پر گر رہا تھا۔ اس نے ٹہنی میں سر ہلایا۔ اس ہار میں نے سر کی بجائے گھونٹے سے کام لیا اور اس کی ناک کا رہا سہا بھی لمبہ ہو گیا۔ وہ ہلایا تھا مگر اس نے اونچی آواز نکالنے سے گریز کیا۔ یہ اس کا مسئلہ بھی تھا۔ "اپنی خوب صورت ناک کو تم نے خود گھنی بھالیا ہے مگر تم ٹہنی ناک کے ساتھ بہ خوبی زعمہ رہ سکتے اہلہا مگر میں نے تمہاری گردن توڑ دی تو تم سو فیصد مر جاؤ گے۔ اس لیے میرے سوال کا درست جواب دو۔"

وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا اس لیے کسی قدر ہلکا ہٹ کے بعد اپنے دو دانت لٹکوا کر مان گیا۔ میں نے اسے موقع دیا کہ وہ واش روم میں جا کر اپنی ناک دھو لے جو سوچ کر اپنے اصل سائز سے دوگنی ہو گئی تھی۔ اس نے منہ کر کہا۔ "اب اس طبقے کے ساتھ باہر جاؤں گا؟"

"بعد میں وضاحت کر سکتے ہو کہ سیز میوں سے گریے تھے یا بے خیالی میں دیوار سے ٹکرائے تھے۔ اب وقت ضائع مت کرو ورنہ خود ضائع ہو جاؤ گے۔"

بادل نا خواستہ وہ مجھے اور سادی کو لے کر باہر آیا۔ میں نے ہسٹول ہاتھ میں لے کر دوبارہ چلون کی جیب میں کر لیا تھا اور اسے خبردار کیا کہ میں یہاں سے بھی درست ترین نشانہ لے سکتا ہوں اس لیے وہ خود سے مرنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ ہمیں اسی طور کے ایک کمرے میں لایا۔ دستک کے جواب میں ایک شخص نے پوچھ کر دروازہ کھولا اور مجھے دیگر کے صوب میں دیکھ کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے دیگر کو اس پر دھکیل کر یہ کوشش ناکام بنا دی۔ دونوں پیچھے گرے اور ان کے اٹھنے سے پہلے ہم اندر آ گئے تھے۔ وہاں ایک شخص میز پر گئے بڑے ایل سی ڈی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا جس پر مختلف کیمروں کے مناظر آرہے تھے۔ ایک سکھ ایک طرف کھڑا تھا۔ ایل سی ڈی کے سامنے بیٹھے شخص نے اٹھنے کی کوشش کی اور ہسٹول دیکھ کر واپس بیٹھ گیا۔ "سب اس طرف دیوار کے ساتھ منہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔"

انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے ان کی تلاش لی صرف مانیٹر کے سامنے بیٹھے شخص کے پاس سے ایک گمراہی والا چاقو نکلا تھا۔ ہائی سب نیچے تھے۔ سکھ کے پاس کچھ نہیں

چھوٹا سا لیکن جدید ترین کیمرہ تھا اور اس کا لینس تیار ہاتھ کا یہ بہت واضح تصویر یا ویڈیو لے سکتا ہے۔ بات واضح تھی۔ دیگر اور اس کے ساتھ دوسرے افراد کا پورا گینگ تھا۔ وہ عیاش طبع لوگوں کو یہاں کراہیا کرتے تھے اور ان کی شرمناک سرگرمیوں کی تصاویر اور ویڈیو بنا کر پھر انہیں بلیک میل کرتے تھے۔ ظاہر ہے جو ایک رات کے لیے دس ہزار دے سکتے ہوں گے وہ دولت مند ہی ہوں گے۔ اگرچہ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ ہم یہاں رات گزارنے آئے تھے اور کچھ دیر میں یہاں سے چلے جاتے۔ اس کے باوجود مجھے طعنا لگانا تھا۔

سادی مشہور لہو لہی تھی اس لیے اسے ہاتھیں چلا کر یہاں کیا ہوا تھا وہ باہر آئی تو ٹیڈی بیٹر دیکھ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے ہاتھوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے کیمرہ دکھایا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تو میں نے اٹھدے سے منع کیا اور بولا۔ "تیار ہونا وہ آنے والا ہو گا وہی نہیں یہاں سے باہر نکالے گا۔"

"میں تیار ہوں۔" سادی نے جواب دیا اور جو سامان بیگ سے باہر تھا اسے اندر رکھ لیا۔ میں نے کیمرہ چلون کی جیب میں رکھ لیا اور ٹیڈی بیٹر کے کھڑے پونجی پڑے رہنے دیے۔ ٹھیک لو بجے دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھولا۔ دیگر اندر آیا تھا اور اس نے آتے ہی ٹیڈی بیٹر کے کھڑے دیکھ لیے۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"یہ کیا؟"

"مضطرب سے ٹوٹ گیا۔۔۔ میں اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں۔" میں نے سکون سے کہا۔

"مگر اس میں۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"شاید تم اس کی بات کر رہے ہو۔" اب میں نے اسے کیمرہ نکال کر دکھایا تو اس کا رہا سہا رنگ بھی اڑ گیا۔ مگر اچھائی ہائی تھی۔

"مجھے کیا معلوم سر۔"

"تمہیں شاید اپنے باپ کا علم نہ ہو لیکن اسے تم اچھی طرح جانتے ہو۔" میں نے اسے گریبان سے بکڑ کر کھینچا اور سر کی پھر پھر اس کی ناک پر دھبہ کی۔ ڈی ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ اس کے منہ سے ایک دردناک کراہ لگی اور اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ میں نے ہسٹول نکال کر نال اس کے منہ میں رکھ دی۔ اس کی آواز مطلق میں گھٹ گئی۔

تھا اور مجھے لگا کہ وہ ان کا ساتھی بھی نہیں تھا۔ جلد اس کی تصدیق ہو گئی جب اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ”اُوئے میوں جان دیو... بے ب دی سوں ہے کدی اچھے آواں۔“

”سردار جی آرام سے۔“ میں نے تلاش سے فارغ ہو کر کہا اور پھر مائٹرز پر بیٹھے شخص سے پوچھا۔ ”ان کمروں کی ریکارڈنگ کہاں ہے؟“

اس نے لرزاتے ہاتھوں سے ایک طرف رکے کپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ”سب اس میں ریکارڈ ہوتا ہے۔“

”اور کل رات کی ریکارڈنگ کہاں ہے؟“

اس نے مجھے ہلکے کھانسی جہاں سب ریکارڈ ہوتا تھا۔ یہ جدید ترین کپیوٹر تھا جس میں بڑی گھنائون سی ہارڈ ڈسک لگی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی وی ڈی مائٹرز بھی تھا گویا ان لوگوں نے مکمل بندوبست کیا ہوا تھا۔ یہ صرف ان تین افراد کا سیٹ اپ نہیں تھا اس میں یقیناً اس ہوٹل کے اور لوگ بھی ملوث تھے۔ میں نے صرف اپنے کمرے کی ریکارڈنگ چیک کی۔ سادی کی موجودگی میں ہائی کمروں کی ریکارڈنگ چیک نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ہارڈ ڈسک سے مکمل فولڈر اڑا دیا اور وہ بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔ اسے دو بار دیو اور کی طرف رخ کر کے کھڑا ہونے کا حکم دے کر میں نے کمرے کی تلاش لی تو ایک دروازے سے کئی ڈبے سی ڈیج کے نکلے۔ ان میں ریکارڈ شدہ سی ڈیج اور ڈی وی ڈیج بھری ہوئی تھیں۔ یہ سب ہیز پر رکھ کر میں نے سکے سے پوچھا۔

”تم کون ہو اور یہاں کس خوشی میں ہو؟“

”میں ہوشیار سنگھ ہوں گی... ادھر فیروز پور سے آگے میری زمین ہے۔“

”تم زمیندار ہو... یہاں کس لیے آئے تھے؟“

”جس کے لیے تم آئے تھے۔“ دروازہ کھولنے والے نے زہریلے لہجے میں کہا۔ وہ جوان عمر شخص تھا یہ تینوں ہی جوان عمر تھے۔ جواب میں میں نے عقب سے اس کی گدی پر گھونسا مارا اور آگے سے اس کا منہ پور سے لگا۔ اس دوہری ضرب نے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ وہ نیچے گرا تو مائٹروالے نے جلدی سے کہا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”ابھی تم دیکھ لو گے۔“ میں نے کہا اور سکے سے پوچھا۔

”یہاں تمہاری موجودگی کا مقصد پوچھا ہے؟“

”وہ ایک لڑکی مجھے یہاں لانی تھی۔“ اس نے

ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ یہ جملہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ میں نے اس کی بات پر غور کیا۔

”تھیک ہے وہ لڑکی تمہیں یہاں لانی تھی۔“

”وہ ان کی ساتھی تھی۔“ ہوشیار سنگھ نے اس بار رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا۔“

”یہ کیوں نہیں بتاتا تو نے اسے مار دیا ہے۔“

مائٹروالہ بولا۔ ”تو تھک رہا ہے۔“

مجھے صبح واش روم میں دیوار کے ساتھ دھم کی آواز اور نسوانی چیخ کا خیال آیا۔ ”یہ میرے برابر والے کمرے میں تھا؟“

دبیر نے سر ہلایا۔ ”اس نے بڑا فرق کر دیا ہے۔“

لب لاش کا کیا کریں؟“

لاش کا سنتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہاں سے جلد از جلد روانگی اختیار کی جائے۔ اس سے پہلے کہ پولیس منظر

ٹا سے میں داخل ہو۔ ان میں سے ایک بے ہوش تھا۔ دبیر کے سر پر میں نے پستول کا دستہ مارا اور وہ گرا تو مائٹروالہ

چولا کر اس سے پہلے کہ وہ صورت حال سمجھتا میں نے اسے بھی بے ہوش کر دیا تھا۔ ہوشیار سنگھ کی حالت خراب ہو گئی تھی۔

اس نے گھٹیا کر درخواست کی کہ اسے بے ہوش نہ کیا جائے۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم ہمارے ساتھ چل رہے

ہو۔“ میں نے کہا اور ان تینوں کی تلاش لی۔ ان کے پاس موہاٹل اور دوسری چیزیں تھیں لیکن میں نے صرف موہاٹل

لیے تھے۔ یہاں موجود بلیک میٹنگ اسٹل اور سردار جی کے ہاتھوں ماری جانے والی لڑکی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں

تھی۔ اس سردار جی سے دلچسپی ضرور ہو گئی تھی اسی لیے میں نے اس کی تلاش بھی لی اور اس کا پرس اور موہاٹل فون

ٹال لیا۔ پھر مجھے خیال آیا۔ میں نے ڈی وی ڈیج کے ساتھ کپیوٹر کھول کر اس کی ہارڈ ڈسک بھی ٹال لی۔ وقت نہیں تھا

ورنہ میں انھیں ضائع کر دیتا۔ اب یہ کام یہاں سے نکل کر ہی کیا جاسکتا تھا۔ ”اگر تم نے فرار کی کوشش کی تو میں یہ دونوں

چیزیں پولیس کے حوالے کر دوں گا اور وہ خود تمہیں تلاش کر لے گی۔“

”نن... نہیں۔“ وہ ہکلا یا۔ ”میں نہیں بھاگوں گا۔“

”اسی میں تمہاری بھتری ہے۔“ میں نے کہا اور

دروازہ کھول کر باہر چھاٹا۔ راہداری سنسان تھی۔ درحقیقت

یہ پورا طور ہی سنسان تھا اور شاید اسی قسم کی سرگرمیوں کے

لے مخصوص تھا۔ ہم تینوں ان ہی میز میوں سے بیٹھے آئے اور لابی سے جوتے ہوئے ڈانگ ہل میں داخل ہوئے۔ اس وقت لابی میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اندر جاتے ہی ہم نے واپس کی راہ لی اور لابی میں آئے۔ کسی نے نہیں روکا اور ہم آرام سے باہر نکل آئے تھے۔ میں نے ہوشیار سنگھ سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس کوئی گاڑی ہے؟“

”بالکل ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”لوہر پاس ہی کھڑی ہے۔“

مہندراجپ چند سال پرانی تھی اور اس کا ظاہری طبع خراب تھا لیکن جب ہوشیار سنگھ نے اس کا اچھا اشارت کیا تو وہ ایک سیکنڈ میں اشارت ہو گیا۔ یہ اندر سے بھی آرام وہ تھی۔ بھارت میں تیار ہونے والی یہ جیب چلنے میں دیر پا ہوتی ہے اس لیے میں مطمئن تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”پہلے کسی اچھے ریستوران چلو جہاں ہم ناشاکر سکیں۔“

”میں.... میں بھی چلوں گا؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل.... اب ہم ساتھ ساتھ رہیں گے۔“

”مگر کیوں؟“

”کیونکہ مجھے تم اچھے لگے ہو اور جو مجھے اچھا لگتا ہے میں اس کا ساتھ بھی نہیں چھوڑتا۔“ میں نے اس کا شانہ چھتہ پایا۔ ”دیکھو تمہاری خاطر میں یہ سارا کچرا اٹھا لیا ہوں ورنہ کیا ہوتا پولیس اس میں تمہاری ویلہ پودھنتی اور سیدھی تمہارے گھر آتی۔“

”تم نے آئے ہو لیکن اب اپنے پاس رکھو گے مجھے بلیک میل کرو گے۔“ ہوشیار سنگھ نے مردہ لہجے میں کہا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اردو میں بات کر رہا ہوں تو وہ بھی اردو بولنے لگا تھا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس نے کم سے کم کالج کی سطح تک تعلیم حاصل کی تھی۔

”بالکل بھی نہیں ابھی ناشتے کے بعد ہم کسی مناسب جگہ پہنچ کر انہیں مشائع کریں گے میں یہ کام تمہارے سامنے کروں گا۔“

”واقعی؟“ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”بالکل جلد تم دیکھ لو گے، اب چلو۔“

ہوشیار سنگھ نے جیب ایک اعلیٰ درجے کے ریستوران کے سامنے روکی اور ہم اتر کر اندر آئے۔ سادی نے سادہ شلو اور سوٹ پہن لیا تھا جو پنجاب میں عام پہنا دیا ہے۔ چنٹ شرٹ اور جوکر میں وہ لمبایاں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا ایک

سیٹل بھی ساتھ رکھا تھا اور اس سوٹ کے ساتھ وہی پہنے ہوئے تھی۔ سامان ہم نے جیب میں چھوڑ دیا تھا۔ ہوشیار سنگھ کا خیال تھا کہ ناشاکر ہم اس کے خرچ پر کریں گے لیکن علی میں نے دیا۔ ناشاکر کے ہم باہر آئے اور جیب میں بیٹھے تو ہوشیار سنگھ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”لب ہم تمہارے گھر چلیں گے۔“

وہ ہکا۔ ”وہ کیوں لی؟“

”میں نے بتایا کہ تم مجھے اچھے لگے ہو۔“ میں نے کہا اور پستول والی جیب پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اب چلو۔“

اس نے جلدی سے جیب اشارت کر دی۔ پارکنگ سے نکلنے کے بعد اس نے کہا۔ ”تم نے بولا تھا کہ ان چیزوں کو ہاتھ کر دو گے۔“

”کیوں نہیں.... جیب کسی ایسی جگہ روکنا جہاں لوگ نہ ہوں۔“

کچھ دیر بعد اس نے جیب ایک میدان کے ساتھ روکی جس میں چھڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ہوشیار سنگھ نے میری ہدایت کے مطابق سوچی گھاس اور شاخیں جمع کیں اور ان پر ہی ڈیڑ کے ڈبے اور ہارڈسک رکھ کر اوپر سے کچھ پیٹرول چھڑکا۔ کیونکہ ماچس یا لائٹر نہیں تھا اس لیے لائٹس پورڈ کا لائٹر نکال کر لگایا تو پیٹرول نے فوراً آگ پکڑ لی تھی۔ سادی جیب میں بیٹھی تھی اور ہم اس وقت تک وہاں کھڑے رہے جب تک آگ نے ان چیزوں کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں نہیں لے لیا۔ اب ہوشیار سنگھ کچھ مطمئن تھا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی مطمئن لگ رہا تھا۔ اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

”پابلی کسی اپنا راستہ لو۔“

”راستے کے بچے۔“ میں نے اسے گردن سے پکڑ کر آگ کی طرف دھکا دیا اور پستول نکال لیا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو میں اس پکڑے کا محتاج ہوں۔ میں تمہیں یہیں کوئی مار کر پھینک جاؤں گا اور تمہارے گھر بھی پھینک جاؤں گا۔“

وہ آگ کے پاس گرا اور جلدی سے اس سے دور ہو گیا۔ اس کی حالت غیر ہو گئی۔ ”اے ایسا نہ کرنا میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”بچے ہیں تو ان کی ماں بھی ہوگی۔“

”ہے جی کیوں نہیں ہے ورنہ بچے کہاں سے آتے؟“

”اگر اپنے بچوں کو قیم اور بیوی کو درد دھوا نہیں کرنا

چاہے تو شرافت سے چلو۔"

اس بار وہ شرافت سے ڈرائیجنگ سیٹ پر آگیا۔ لدھیانہ پاکستان کی سرحد سے کوئی اتنی کلومیٹر دور ہے۔ اس لحاظ سے ہوشیارنگہ کا گھر بھی اتنا ہی دور ہوتا ہے۔ چاہے تھا کیونکہ فیروز پور سرحد کے بالکل پاس ہے۔ یہ میں نے ٹیب میں گوگل میپ پر دیکھا۔ یہ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا لیکن بہترین سڑک اور جیب کی وجہ سے ایک گھنٹے میں طے ہو گیا۔ یہ کوئی گاؤں نہیں تھا بلکہ فارم ہاؤس تھے۔ ہر فارم ہاؤس میں زمین کے مالک کا گھر بنا ہوا تھا۔ اس لیے سارے گھراگ الگ تھے۔ یہ چھوٹا سا پتھر کا مکان تھا جس کی چھت آری سی لیکن کچھریل اشاکل کی تھی۔ یہ ایک منزل تھا اور کوئی سات مرلے پر پھیلا ہوا تھا۔ سامنے پتھروں سے بنا ہوا خوب صورت پورچ تھا۔ دارن کی آواز پر اندر سے ایک نو عمر لڑکی نکلی اور اس نے گیٹ کھولا۔ مکان کے چاروں طرف احاطہ تھا اور اس میں گھاس کے لان کے ساتھ پھولدار پودوں کے جھنڈے بھی تھے۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ سادی جتنی لاشٹ پر آرام کرتی رہی تھی اور میں سوچتا رہا۔

ہم کوئی بارہ بجے وہاں پہنچے تھے۔ ہوشیارنگہ نے جیب پورچ میں روکی اور اترنے لگا تو میں نے کہا۔ "خیال رکھنا کوئی چالاک دیکھا کر اپنے لیے مشکل مت کھڑی کرنا.... ابھی تمہاری بیوی نہیں جانتی ہے کہ تم کہاں گئے تھے اور وہاں ایک عورت کی لاش چھوڑ آئے ہو۔ کوئی ہنگامہ ہو تو وہ جان جائے گی۔"

"میں کچھ نہیں کروں گا میرے باپ۔" وہ زور دینے والے لہجے میں بولا۔ "تم کیوں میرے ساتھ چلے آئے ہو؟"

"بس ایسے ہی، ویسے تم گھر مت کرو میں بیک میلر نہیں ہوں ورنہ سٹیف ضائع نہ کرتا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کی زندگیوں ان سی ڈیج میں تھیں۔" میں نے کہا۔ "ایک دو دن تمہارے ساتھ رہیں گے اور پھر چلے جائیں گے۔ بلکہ تم چاہو تو ہم یہاں رکھنے کا معاوضہ بھی دے سکتے ہیں۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے بس تم میری جان چھوڑ دو۔"

"اس کی صرف ایک صورت ہے کہ میرے کپے پر حرف بہ حرف عمل کرو۔"

اس نے سر ہلایا اور نیچے اتر گیا۔ میں اور سادی بھی نیچے آئے تھے۔ اس وقت دھوپ کی شدت ناقابل برداشت

تھی۔ جیب اسے سی تھی اس لیے اصل موسم کا باہر آنے پر اندازہ ہوا تھا۔ یہ جولائی کا آغاز تھا اور اب تک آستان سال تھا یعنی ہارٹس نہیں ہوئی تھی۔ ہوشیارنگہ میں اندھا لایا۔ آغاز میں ہی پڑھش انداز میں سہا ہوا ڈرائنگ روم تھا اور بجلی تانے کے لیے کافی تھا کہ ہوشیارنگہ خاصا دولت مند شخص تھا۔ یہ دولت کا بخاری تو تھا جسے نکالنے وہ اس ہوٹل تک گیا تھا۔ وہ سونا سکھ تھا یعنی معمولی سی شیڈ جی صرف سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ جسے اس نے ایک خاص ٹوٹی میں لپیٹا ہوا تھا یہ پگڑی نہیں تھی۔ اس نے نو عمر خادمہ سے کہا۔ "شیشا چاکر خٹھا لے آ۔"

شیشا کے جانے کے بعد اس نے کہا۔ "واہ گورو کے واسطے میری بیوی کے سامنے کچھ مت کہنا، وہ مجھے شریف آدمی سمجھتی ہے اسے پتا چل گیا تو مجھے صاف نہیں کرے گی۔"

"ویسے تم اسی قابل ہو لیکن بے فکر ہو جاؤ تمہاری زبان سے کچھ نہیں نکلے گا۔"

"اچھا اب میرا پس اور موہاٹل دے دو۔"

میں نے دونوں چیزیں اس کے حوالے کر دیں اور جیسے ہی ہوشیارنگہ سے نکلا میں نے ایک موہاٹل نکالا۔ اس پر سفیر کا نمبر ملا تھا۔ اس نے پہلی بیل پر کال ریسیو کر لی۔ میں نے بلا تمہید کہا۔ "ہم سرحد کے پاس ہیں.... وسیم کہاں ہے؟"

"وہ اور عبداللہ دو گاڑیوں میں نکلے تھے۔ وہ اس وقت قصور سے آگے گئے اسٹگہ والا روڈ پر ٹھوڑی دکانی علاقے میں زمیندار کمال کھوکھر کے پاس ہیں۔"

"ٹھیک اسے یہ موہاٹل نمبر دے دو۔ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ پھر میں نے ٹیب نکال کر اس پر مذکورہ پاکستانی علاقہ دیکھا۔ یہ سرحد سے مشکل سے ایک کلومیٹر دور تھا۔ کچھ دیر میں لڑکی ہمارے لیے ٹھیکین لسی لے آئی جو اس موسم میں بہترین ہوتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ علاقہ کیا کہلاتا ہے؟"

"دھوب محلہ۔" اس نے جواب دیا اور باہر چلی گئی۔ میں نے ٹیب پر دیکھا تو حیرت انگیز پردوں جگہوں کو بالکل پاس آیا۔ جیسے ٹھوڑی دکان سرحد سے ایک کلومیٹر دور تھا اسی طرح دھوب محلہ سرحد سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور اس سے ذرا آگے فیروز پور کی آبادی تھی۔ یہ سارا علاقہ آباد اور سرسبز و شاداب ہے۔ سادی کو بتایا تو وہ یہ سن کر ہی پرجوش

ہوئی تھی کہ وہیم اور عبداللہ ہم سے صرف دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھے۔ لیکن یہ دنیا کے مشکل ترین دو کلومیٹر تھے۔ کیونکہ درمیان میں وہ لکیر تھی جو آگ و خون سے بھٹی گئی تھی۔ سرحد کے دونوں طرف فوج اور دوسرے بھڑاٹھری دستوں کی موجودگی لازمی تھی۔ وہیم جس کمال کھوکھر کے پاس تھا کیا وہ وہی شخص تھا جس کا وہیم نے ذکر کیا تھا یا پھر وہیم اس کے پاس رکھا ہوا تھا۔ میں نے کسی کا گلاس قسم کیا تھا کہ سوہائل نے تھل دی۔ نمبر پاکستان کا تھا اور اچھی تھا یعنی کوئی جانا بچھا نمبر نہیں تھا۔ میں نے کال ریسیڈی۔ "ہیلو۔"

"میں بات کر رہا ہوں۔" وہیم کی آواز آئی۔ "آپ کہاں ہیں۔"

"کنڈاسنگ والا روڈ اٹھ پانچ سینٹی والا روڈ میں جاتی ہے۔ تقریباً ایک کلومیٹر دور درجوب محلہ میں ہیں۔"

"تو ابھی خبر ہے کہ آپ بالکل پاس ہیں۔" وہیم نے کہا۔ "لیکن کراسنگ آسان نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"میں جس کے پاس ٹھہرا ہوں اس کا کہنا ہے آج کل بہت سختی ہو رہی ہے اور چوبیس گھنٹے نگرانی کی جا رہی ہے۔"

"سادو" کے ہوتے ہوئے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ "اس کی بجائے میں کوئی اور راستہ تلاش کرنے کو ترجیح دوں گا۔"

"آپ محفوظ ہیں؟"

"فی الحال۔" میں نے کہا۔ "ایک زمیندار کے گھر ہیں اور مزید دقتی کے مہمان ہیں۔"

"وہ خطرناک ہو سکتا ہے؟"

"نہیں وہ قابو میں ہے۔"

"جب ٹھیک ہے آپ یہیں رکھیں جب تک میں کوئی محفوظ راستہ تلاش نہ کروں۔" وہیم نے کہا اور کال کاٹ دی۔ ہم جتنی کم بات کرتے اتنا ہی اچھا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ہوشیار پاس کے گھر کے کسی فرد کے سامنے بات نہیں ہوئی۔ ہوشیار تقریباً چالیس برس کا شخص تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کے بچے چھوٹے ہوں گے۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں تھا اور گھر میں بھی کسی اور مرد کے آجادی فی الحال نظر نہیں آئے تھے۔ اگر ہوشیار اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا تو اسے قابو کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اگر اس سے زیادہ افراد تھے تو پھر سوچا جاسکتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہوشیار ایک جوان عورت کے ساتھ

آمد آیا اور میں اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ وہ بہت حسین عورت تھی۔ اس نے شلوار کپڑوں کے ساتھ دوپٹا لیا ہوا تھا اور خود کو مناسب انداز میں ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوشیار سنگھ نے تعارف کرایا۔ اس کی بیوی کا نام سویت تھا۔ اس نے ہمارا نام اجیت اور کوشل بتائے تھے۔ وہ گرم جوشی سے سادی سے ملی۔ اسے گلے لگایا اور سادی سے بولی۔ "ہوشیار کہہ رہا ہے آپ بہت اچھے ہیں کچھ دن اور مہمان رہیں گے۔"

"ہاں سرورارگی سے اتفاقاً ملاقات ہوگی۔"

"اتفاقاً؟" وہ چوگی۔ "یہ تو کہہ رہے ہیں کہ آپ کو کالج کے زمانے سے جانتے ہیں۔"

"وہی کہہ رہا ہوں یہاں اتفاقاً ملاقات ہوگی۔ شاید دس سال بعد، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" میں نے ہوشیار کی طرف دیکھا۔

"ہاں یاد۔۔۔" اس نے ٹارٹل انداز میں کہا۔ "اتنا عرصہ ہو گیا ہے۔"

سویت نے سادی کی طرف دیکھا اور بولی۔ "آپ کی بیوی بہت پیاری ہے اجیت بھیا۔"

سادی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ہوشیار سنگھ نے جلدی سے کہا۔ "تو ہیا کر بھر جانی کو اندر لے جا۔ آرام سے بٹھا۔"

سویت سادی کو وہاں سے لے گئی۔ ان کے جاتے ہی ہوشیار نے کہا۔ "معاف کرنا مجھے تمہارے ناموں کا خیال ہی نہیں رہا تھا اس لیے جوت میں آیا ہوں دیا۔"

"کوئی بات نہیں بلکہ اچھا ہے تم ہمارے بارے میں نہ جالو۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ یہاں کتنے لوگ رہتے ہیں؟"

"میں، سویت اور ہمارے تین بچے ہیں، بڑا بیٹا ہے دس سال کا اور اس سے چھوٹی سات اور پانچ سال کی دو بیٹیاں ہیں۔ یہ فیلا ادھر کام کرتی ہے ادھر ہی رہتی ہے۔"

"کوئی مرد ملازم؟"

"کوئی نہیں ہے۔۔۔ پیچھے زمین پر کام کرنے والے چار آدمیوں کے گھر بنے ہیں۔"

"یہ اچھی بات ہے ہمارے بارے میں کم سے کم لوگوں کو بتا چلے۔ اسی میں تمہارا بھی بھلا ہوگا۔"

وہ ہنسیا۔ "مجھے تم لوگ کچھ پراسرار سے لگ رہے ہو۔"

"ہم واقعی پراسرار ہیں اور ہمارے بارے میں نہ جانتا ہی بھر ہوگا۔" میں نے اس کا خدشہ جھٹلانے کی کوشش

اس کی بات درست تھی۔ میں نے اس پر دھاؤں لگا۔ "اس کے ہاؤس پر کل ہی کہلائے گا۔"

"میں نے اسے ایک دھکے کے ساتھ اٹھ بھی نہیں لگایا تھا۔" ہوشیار کے چہرے پر پریشانی نمودار ہوئی تھی۔ "اگر معاملہ پولیس تک پہنچا تو وہ یہاں بھی آسکتی ہے۔"

"کیسے؟... کیا تم نے ان کو اپنا پتا بتایا تھا؟"

"نہیں لیکن قسمیں جب اپنا نام اور فیروز پور کا تار پڑا تھا تو وہ بھی سن رہے تھے۔ یہ جگہ کوئی بہت بڑی نہیں ہے اور یہاں دور درجن ہوشیار بھی نہیں ہوں گے۔"

میں مسکرایا تھا۔ "اگر وہ سب تمہارے جیسے ہیں تو دور حقیقت یہاں کوئی ہوشیار نہیں ہے۔"

"میں اسی سب سے ہوشیار ہوں۔" اس نے تصدیق کی۔ "اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو باقی سب کے بارے میں۔"

اس کی یہ بات کافی غور تھی اگر لاش دہلی بات پولیس تک پہنچی اور وہ تینوں پکڑے گئے تو پولیس کو یہاں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں نے پوچھا۔ "یہاں لی وی کیبل ہے۔"

"بالکل ہے میرے پاس ڈاٹا اسکاٹی ہے۔" اس نے کہا اور ایک کونے میں دکھا پڑے سائز کا ایل سی ڈی ٹی وی ریسیوٹر سے آن کیا۔ پھر اس نے بجالی کا ایک مقامی نیوز چینل لگایا۔ "اگر معاملہ پولیس تک گیا ہے تو لازمی اس پر خبر آئے گی۔"

لیکن آدھے گھنٹے بعد بھی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا معاملہ دبا دیا گیا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بات پولیس تک نہیں پہنچی تھی۔ یہ ایک بڑے ہوٹل کی سڑک کا معاملہ تھا۔ اس لیے خاموشی کا ردیائی کا بھی امکان تھا۔ اس صورت میں پولیس بہر حال تفتیش کرتی اور یہاں آنے کا بھی بہت زیادہ امکان تھا۔ ایک بج رہا تھا کچھ دیر بعد شیلانے کھانا گھننے کی اطلاع دی۔ وہ تقریباً چودہ چھوڑ پرس کی صحت مند اور مناسب شکل و صورت والی لڑکی تھی۔ میں ہوشیار کے ساتھ ڈرائنگ روم کے ساتھ موجود لائونج میں آیا۔ ڈرائنگ ایریا بھی سکی تھا اور اس کے ساتھ بڑا سا کچن تھا۔ سویت نے کھانا خود بنایا تھا اور کیونکہ وہ بھی مہتری خور تھے اس لیے یہ خدمت نہیں تھا کہ کسی ڈش میں کوئی غلط چیز شامل ہوگی۔ کھانے میں مٹر پلاؤ اور روٹی کے ساتھ بھانگی تھی۔ کئی طرح کے چائے اور پشیاں بھی تھیں۔ شیلانے

نہیں کی۔ وہ ہمارے بارے میں جتنا زیادہ مشکوک رہتا کسی بے وقوفی سے اتنا ہی گریز کرتا۔ "ویسے تم کچھ گئے ہو گے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں لیکن ایک بار پھر سمجھا دوں۔ اگر تمہارے دماغ میں کوئی الٹا سیدھا خیال ہے یا تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے اور تم نے اسے استعمال کرنے کی کوشش کی تو یقیناً ممکن ہے یہاں گرنے والی لاشیں دو سے کھن زیادہ ہوں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہمیں مہمان بنا کر رکھو اور ہمارے جانے کے بعد ہمیں بھول جاؤ۔ اگر تم چاہو تو میں اس میزبانی کا معاوضہ بھی دے سکتا ہوں۔ میں پہلے ہی پیشکش کر چکا ہوں۔"

"لیکن بات نہیں ہے۔" اس نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ "بس تم جلد از جلد یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میری بھی بھی خواہش ہے۔" میں نے کہا۔ "تم زمیندار ہو تم سے ملنے لوگ آتے ہوں گے؟"

"بہت کم۔" اس نے کہا۔ "ابھی چاول کی فصل درمیان میں ہے۔ یہ پاری بھی نہیں آ رہے۔"

"وہ امر تسر میں ہوتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "جب تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"اسل میں یہ میری بیوی کی زمین ہے۔" اس نے ہنسی کر کہا۔ "وہ میرے سر کی ایک ہی اولاد ہے۔ ساری زمین اسے ملی۔"

"یعنی تمہیں ملی۔ تمہاری بیوی خوب صورت عورت ہے اس کے ہاؤس پر تم ادھر ادھر منہ مارتے پھر رہے ہو۔"

وہ کھپکھپایا تھا۔ "میری تو بہ جو لب میں کہیں جاؤں۔"

"وہاں کیا ہوا تھا؟"

جواب میں وہ چپ رہا تو میں نے کہا۔ "تم نہ بھی بتاؤ جب بھی کل سب اخبار پائی وی میں آجائے گا۔"

اس نے چہرہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "وہ مجھے ہلکے سے مل کر رہی تھی۔ میرا بھڑا ہوا تو میں نے اسے دھکا دیا تھا اس کا سر دیوار سے لگا اور وہ مر گئی۔ میں واہ گرد کی سو میں نے صرف اسے دھکا دیا تھا کیونکہ وہ میرا منہ نوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر اس کے ناخنوں کے نشانات آتے تو میں سویت کو کیا منہ دھکتا۔ چلری میں دھکا دے گا اور وہ دیوار سے ٹکرا کر وہیں گر گئی تھی۔"

لگا رہی تھی۔ مجھے بچے خطر نہیں آئے میں نے ان کے ہارے میں پوچھا تو سوویت بولی۔

”بھائی وہ اپنے دادے کے ہاں گئے ہیں۔ اسکول کی پٹریاں ہیں۔“

یہ بھی اچھا تھا کہ یہاں بچے نہیں تھے ورنہ بچے اندر کی خبریں سب سے زیادہ باہر پہنچاتے ہیں۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ پھر سوویت نے کہا۔ ”بھائی اور بھرجائی آپ آرام کریں تاچ گری بہت ہے شام کوڑھ میں پرچلیں گے۔“ کھانے کے بعد کسی کے گھاس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا۔ سادی کی آنکھیں پوچھل ہو رہی تھیں میں نے اس سے کہا۔ ”تم آرام کرو میں ذرا ہوشیار سے کپ شپ کروں گا۔“

ہوشیار کا خیال تھا کہ میں اس کی جان چھوڑ دوں گا اس لیے میری بات پر اسے مایوسی ہوئی تھی۔ سادی کھڑی ہو گئی۔ سوویت نے ہمارے لیے ایک کرا بھی سیٹ کر دیا تھا۔ میں اور ہوشیار واپس ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ہوشیار نے ٹی وی آن کر دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تم مجھے اپنے سامنے دکھنا چاہتے ہو؟“

”اس کی بجائے تم کہہ سکتے ہو کہ میں پوری طرح ہوشیار رہتا چاہتا ہوں۔ یہاں پولیس آسکتی ہے اور اس صورت میں مجھے اپنا بچاؤ کرنا ہوگا۔“

اس نے فور سے مجھے دیکھا۔ ”تمہیں پولیس سے خطرہ ہے؟“

”میں مطلوب تو نہیں ہوں لیکن بعض وجوہات کی بنا پر پولیس کے ہاتھ آنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ اگر وہ یہاں آئی تو لازمی بات ہے تمہارے ساتھ مجھے بھی لے جائے گی۔“

”اس صورت میں یہاں رکنا تمہارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔“ اس نے گویا مجھے ڈرانے کی کوشش کی۔

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن میں خطرہ مول لینے والا آدمی ہوں۔“

ہوشیار نگہ ہوشیار آدمی تھا۔ وہ عام شخص تھا اس لیے ہنگامی صورت میں بدحواس ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں ایک عورت ماری گئی تھی اور پھر وہ بلیک پیٹک کے چکر میں بھی آ رہا تھا۔ میں اسے دونوں چکروں سے لٹال لایا تھا مگر یہ کام میں نے ٹی سیکل اللہ نہیں کیا تھا۔ اس میں میرا مفاد تھا۔ مجھے اس سرزمین پر ایک لٹکانے کی ضرورت تھی اور وہ مجھے مل گیا

تھا۔ اخلاق کی بات ہے یہ سرحد کے ہانگل پاس تھا اور اب دیکھ بھی دوسری طرف آ گیا تھا اس لیے ہمارا یہاں رکنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ ہوشیار یہ بات نہیں جانتا تھا مگر وہ اتنا ضرور سمجھ رہا تھا کہ ہم کسی مقصد سے اس کے پاس ٹھہرے ہیں۔ ٹی الحال اسے بے خبر رکھنا ضروری تھا۔ اگر وہ جان جاتا کہ میں پاکستانی ہوں تو ممکن ہے اس کی حب الوطنی کی رنگ بھڑک جاتی اور وہ تمام خطرات کو پس پشت ڈال کر میری بیخ کنی پر عمل جاتا۔ اس لیے میں اسے دھکانے کے ساتھ ساتھ نرمی سے بات کر رہا تھا اور اسے یقین دلانا تھا کہ میں اس کے لیے خطرہ نہیں ہوں۔ وہ مطمئن نہیں تھا اور میں چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ میری طرف سے ٹینشن میں رہے مگر یہ ٹینشن اتنی نہ بڑھے کہ وہ کوئی قدم اٹھانے پر عمل جائے۔

میں نے موہان کو داہریت پر کر لیا تھا۔ باقی دو موہان آف کر دیئے تھے۔ اگر وہیم مجھے کال کرتا تو میں نہیں چاہتا تھا کہ ہوشیار کو اس کا علم ہو۔ میں نے کہا۔ ”تم اس چکر میں مت پڑو۔۔۔ اگر پولیس نے تمہیں گرفتار بھی کیا تو تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ تم سر سے اس ہوٹل میں رہ کے ہی نہیں۔“

”وہاں کئی افراد نے مجھے دیکھا ہے۔“

”تم کھانے پینے کے لیے بھی وہاں جا سکتے ہو۔“

”میں دباؤ برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس نے پریشانی سے کہا۔ ”تم جانتے ہو پولیس کس طرح سے پوچھتی ہے۔“

”انسان پر مشکلیں آتی ہیں اسے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ ہاتھ پاؤں چھوڑ دینا کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں پر میں بزدل آدمی ہوں۔“

”اگر تم بزدل ہوتے تو یہ سب نہیں کرتے آدمی سب سے زیادہ اپنی بیوی سے ڈرتا ہے۔“

”سوویت سے میری جان جاتی ہے اگر اسے پتا چل گیا تو وہ لات مار کر مجھے یہاں سے لٹال دے گی۔“

”یہ سب اس کا ہے؟“

”ہاں اس کا اور اس کے بعد بچوں کا۔“ ہوشیار نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں مرتے دم تک ان لوگوں کے لیے بس کام کرتا رہوں گا۔“

”ہر آدمی اپنی اپنی بچوں کے لیے کام کرتا ہے۔ تمہیں فکر ہونا کرنا چاہیے کہ اپنا کام کر رہے ہو، کسی کی

لو کری نہیں کر رہے۔ مجھے تو لگتا ہے سویت نے سب تمہارے ہاتھ میں دیا ہوا ہے۔

”یہ تو ہے۔“ اس نے کسی قدر شرمندگی کے ساتھ کہا۔ ”سویت نے آج تک پلٹ کر حساب نہیں مانا کہ کتنا کمایا ہے اور کہاں خرچ کیا ہے۔“

”اس لیے میرا مشورہ ہے کہ اب ان پکروں سے گریز کرو یہ یقیناً تمہاری بھئی بچوں کی دعا نہیں تھیں جو میں وہاں پہنچ گیا اور نہ اس وقت تم حالات میں ہوتے یا پھر ان سفاک بلیک سمرلوں کے چنگل میں جو بالآخر تمہارے خون کا آخری قطرہ تک چوس جاتے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں دھڑک رہا ہوں۔۔۔۔۔“
”وہ دمت کرو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“
میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”اگر کوئی دھڑک رہا ہے تو خود سے کرو۔“

وہ سر ہلاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ”میں ذرا آرام کر لوں رات سے جاگا ہوا ہوں اور اب سر بھاری ہو رہا ہے۔“
”پاکل آرام کرو مگر کوئی احتیاط حرکت مت کرنا جو تمہارا آرام ہمیشہ کے لیے غارت کر دے۔“

ہوشیار وہاں سے چلا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو شیلا کو آواز دے لوں۔ میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ رات چند گھنٹے کی بے خواب نیند نے مجھے کس حد تک تازہ دم کر دیا تھا۔ زخم بھرنے سے جسمانی حالت بھی بہتر ہو رہی تھی۔ مجھے ابتدائی مرہم پٹی کے بعد کسی دوا کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ میں نے پشت سے سر ہٹا کر آنکھیں بند کر لیں۔ آتے والے صبح مرے سے پہلے ہمارے لیے آرام کا یہ وقفہ قیمتی تھا۔ ہم دونوں ہی جسمانی اور ذہنی صحت کا شکار تھے۔ آدھے گھنٹے بعد موہاگل وا بھر پٹ ہوا۔ میں نے سوچا کہ دسم کی کال ہوگی مگر کال منقادی نمبر سے تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے سننائی آواز آئی۔ ”تم کہیں ہو یہ موہاگل تمہارے پاس کہاں سے آیا۔“

یہ وہی تھا جس کی ناک کو میں نے انسوسٹاک بنا دیا تھا۔ ”میں وہی ہوں اور یہ موہاگل اب میرے پاس رہے گا۔“

اس نے ہمزک کر گالی دی۔ ”جھے دیکھ لیں گے۔۔۔ پاتال سے بھی تلاش کر لیں گے۔“

”خبردار۔“ میں وحشی آواز میں ہنسا۔ ”مگر تمہیں اس کی رحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ جلد میں تم لوگوں سے خود رابطہ

کروں گا۔ اب میں تمہارا باپ ہوں۔ وہ تمام اسٹف میرے پاس ہے۔“

وہ ایک لمبے کے لمبے چپ ہوا پھر اس نے دعویٰ کیا۔ ”تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ ہمارے پاس اس کی کاپیاں ہیں۔“

”ہاں لیکن ایک چیز کی کاپی نہیں ہوگی۔ تمہیں معلوم ہے جب تم تینوں بے ہوش ہوئے تو میں نے کیا کیا تھا؟“
میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

”کیا۔۔۔ کیا تو نے؟“

”وہاں ایک عدد لاش تھی اور میں نے ہاری ہاری تم تینوں کے ساتھ اس کی تصویریں لی ہیں۔ تم لوگوں نے وہ لاش یقیناً ٹھکانے لگا دی ہوگی۔ لیکن یہ تصویریں بھی کاپی ہیں۔ پوئیس خود معلوم کر لے گی کہ لاش کہاں گئی؟“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ اس کی آواز لرزنے لگی تھی۔

”چائی کے ساتھ میں جلد رپھڑ کروں گا۔ اس موہاگل کو بھول جاؤ اور نمبر بند کرانے کی کوشش مت کرنا ورنہ وہ تصاویر پوئیس تک پہنچ جائیں گی۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ یہ خیال گھٹکھٹکھٹکھٹکھٹک میں میرے ذہن میں آتا تھا مجھے یقین ہے اس کی حالت خیر ہوگی ہوگی، اس جھوٹ پر کہ میں نے لاش کے ساتھ ان کی تصاویر بنالی تھیں۔ وہ اس بات پر یقین نہ بھی کرتے جب بھی ان میں اتنی جرأت نہیں رہی ہوگی کہ اپنے موہاگل نمبر بند کراتے۔ یہ موہاگل میرے لیے اشد ضروری ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے اسی نمبر پر کال کی دہرنے ہی کال ریسیو کی تھی۔

”اب کیا ہے؟“
”تیز سے بات کرو۔“ میں نے غرا کر کہا۔ ”لاش کا کیا کیا؟“

”ٹھکانے لگا دی ہے۔“ اس نے کسی قدر حوصلہ کر کے کہا۔ ”اب اسے کوئی تلاش نہیں کر سکتا ہے۔“

”گڈ میں بھی کیا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ لاش غائب تھی اور پوئیس کو اس کے قاتل کی تلاش نہیں تھی یعنی پوئیس کا ہوشیار سنگھ کے گھر آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے شیلا کو آواز دی۔ وہ فوراً آ گئی۔ ”جی سرکار۔“

”مجھے کرا دکھاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ مجھے سادی والے کمرے تک لے آئی۔ دستک کے جواب میں اندر سے

باہر آئے تو دور تک زمین پر چاول کی فصل لگی ہوئی تھی اور ابھی کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔ پودے دونٹ اور بچے ہو چکے تھے۔ ہماری زمینوں پر بھی چاول کھیتے تھے۔ میں نے ٹوٹ کیا کہ یہاں پودے بہت پاس پاس لگے تھے۔ یعنی فی مربع فٹ زیادہ پودے لگے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اٹھایا میں چاول کی فی ایکڑ پیداوار ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ حکومت کسانوں کو کھاد اور مکلی میں سب سڈی دیتی ہے۔ پانی مہیا کرنا حکومت کا کام ہے اور وہ پاکستان کے حصے کا پانی چاکر تھوڑی سے یہ فریضہ سرانجام دے رہی ہے۔ میں نے پوچھا۔ ”ابھی بارشیں شروع نہیں ہوئی ہیں پھر پانی کہاں سے لے رہے ہو؟“

”وہ دیکھ رہے ہو؟“ ہوشیار سنگھ نے مغرب میں دور ہوا میں بلند ہونے سیاہ دھوئیں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس وقت ٹوٹ نہیں کیا تھا۔

”ہاں یہ کیا ہے کوئی بھی کام کر رہی ہے؟“
”نہیں یہ ڈیزل سے چلنے والے میگا ٹیوب ویل ہیں۔“ ہوشیار سنگھ نے انکشاف کیا۔ ”یہاں ڈھلان ہماری طرف ہے۔ اس لیے جب ہم زمین سے پانی نکالتے ہیں تو پاکستان کا پانی ہماری طرف آتا ہے۔ یہ ٹیوب ویل ایک منٹ میں ایک ہزار لیٹر پانی زمین سے کھینچتے ہیں اور یہ پانی بہت بڑے پائپوں کی مدد سے یہاں زمینوں پر دیا جاتا ہے۔ پائپوں کی مدد سے یہ پانی سوکل دور تک پہنچایا جاتا ہے۔“

میں دنگ رہ گیا۔ یہ انکشاف تھا۔ کم سے کم میرے لیے تو انکشاف ہی تھا۔ لیکن ہے میرے ملک کے ارباب اختیار واقف ہوں مگر جب انہیں دریاؤں کے پانی کی چوری کی پروا نہیں ہے تو ٹیوب ویلوں سے پانی چرانے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میرے حکمران ملک و قوم کے مفاد سے کس حد تک لاعلم ہو سکتے ہیں۔ یہ شاخ کاٹنے والا کیس نہیں تھا یہ تو جڑ کاٹنے والی ہاتھی تھی۔ اللہ یا صرف دریاؤں کا پانی نہیں روک رہا تھا بلکہ وہ زیر زمین پانی بھی چرا رہا تھا اور یہ صرف چوری نہیں تھی بلکہ اس کے پس پشت پاکستان سے دشمنی کا جذبہ پوری شدت سے کارفرما تھا۔ جس خشک سالی اور قحط سے ہمارے چند ماہرین زراعت و معاشیات خبردار کر رہے تھے اٹھایا اسے جلد از جلد لانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ بین الاقوامی تجارت کے معاہدوں کی مدد سے وہ بہت جلد ہمیں اپنے

سادی نے کہا۔

”آجائو۔“

میں اندر آیا سادی آرام کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”اللہ کا شکر ہے کہ یہ جگہ مل گئی درہم نہیں بھٹکتا پڑا۔“
”ہاں واقعی اس کا احسان ہے وہ بھی آزمائش کو ہماری اوقات سے زیادہ نہیں بڑھاتا ہے۔“

”وسیم کی کال آئی؟“

”نہیں۔“ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ سادی جلدی سے بیڈ سے اٹھ گئی۔

”آپ آرام کر لیں... آپ رات میں بھی کم سوئے تھے۔“

”نہیں کسی کا جاگنا لازمی ہے۔“

”میں جاگوں گی۔“ اس نے کہا۔ ”دو گھنٹے سولی ہوں اتنا کافی ہے۔“

اس وقت ساڑھے چار بج رہے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کچھ دیر آرام کر لوں۔ ”مجھے دو گھنٹے بعد اٹھا دینا۔“ میں نے ہسٹل سادی کے حوالے کیا۔ ”کوئی مسئلہ ہو تو اسے استہلال کرنا۔“

”میں کر لوں گی۔“ وہ احتیاط سے بوٹی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں بیڈ پر دوڑا ہو گیا۔ چند منٹ بعد میں سو گیا تھا۔ اس بار بھی نیند بہت گہری اور بے خواب تھی۔ میں اس وقت چوٹا جب سادی نے مجھے اٹھایا۔ اس کا پُرسکون چہرہ دیکھ کر مجھے مطمئن ہوا تھا۔

”اٹھ جائیں دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔ سوویت نے باہر لان میں جانے کا انتظام کیا ہے۔“

میں منہ پر پانی مار کر باہر آیا۔ پونے سات بجے دھوپ تقریباً ختم ہو چکی تھی اور لان کو پانی دینے سے ایک نم اور خوشگوار سے خشک کا احساس ہو رہا تھا۔ یہاں جدید ترین لان جسٹرز ایک مارٹل ٹاپ میز کے گرد لگی تھیں۔ ٹیلا جانے کے ساتھ پیش کیے جانے والے لوازمات جاری تھے۔ اس میں سو سے اور کھس تھے۔ دونوں چیزیں آلوکی تھیں اس لیے ہم نے بے فکر ہو کر کھا نہیں۔ چائے بہت اچھی لگی تھی۔ سادی اور سوویت اس دوران میں خاصی بے تکلف ہو گئی تھیں اور انہوں نے ایک طرف اپنی محفل جمائی ہوئی تھی۔ ہوشیار نے چائے کے بعد مجھ سے کہا۔ ”آؤ میں تمہیں اپنا فارم دکھاتا ہوں۔“

فارم بننے کے ساتھ ہی تھا۔ ہم مٹی دروازے سے

کو دس بھی کر رکھے تھے اسی لیے وہ کاشت کے جدید طریقے اپنائے ہوئے تھا۔ اس کے پاس بہترین گھر تھا اور دو گاڑیاں تھیں۔ جب وہ اپنے لیے استعمال کرتا تھا جب کہ خاندان کے ساتھ آنے جانے کے لیے اس کے پاس سے باڈل کی چھوٹی کار تھی۔ یہ اس نے چند مہینے پہلے ہی تھی۔ ہم چلتے ہوئے اس کی زمین کی آخری حد تک چلے گئے۔ یہاں سے وہ میگا نیوب ویل دکھائی دے رہے تھے جو زمین سے پانی کھینچ کر آگے بھیج رہے تھے۔ ان کی تعداد کم سے کم بھی درجن تھی اور یہ سرحده سے کچھ فاصلے پر ہر سو گز کے بعد لگے ہوئے تھے۔ ہوشیار سنگھ نے کہا۔ ”یہ ہمارے کھیتے چلتے ہیں۔“

”ان کی تعداد بہت زیادہ ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم لیکن میں نے جہاں تک دیکھا ہے یہ ہر سو گز بعد اسی طرح لگے ہوئے ہیں۔ انہیں لوگوں سے لیزل دیا جاتا ہے۔“

”تم لوگ پانی کا مواخذہ دیتے ہو؟“

”بالکل۔۔۔ ورنہ یہ نیوب ویل کیسے چل سکتے ہیں۔ مگر یہ مواخذہ بہت زیادہ تھک ہے یوں کچھ لیں مجھے مہینے میں تین چار ہزار روپے سے زیادہ ٹیکس دینا پڑتا ہے۔“

”اچانک چٹکوں کی جیب میں موجود سو پاگل نے واہریشن دی تو میں نے ہوشیار سنگھ کی طرف دیکھ کر چھوٹی انگلی فضا میں بلند کی اور نزدیک موجود چند درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ گیا۔ درختوں میں پھنکی کر پتا چلا کہ وہ ان ہی کاموں کے لیے مخصوص تھے جس کا بیان کر کے میں یہاں آیا تھا۔ اس لیے فضا تھک رہی تھی۔ میں نے سو پاگل نکالا اس ہاروسم کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

”کام چل رہا ہے۔“ وسیم کی آواز آئی۔ ”ممكن ہے آج ہو جائے۔“

”کام کا ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”غطرہ کم سے کم ہو۔“

”میں بھی کوشش کر رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ دونوں ٹھیک ہیں؟“

”ہاں یہاں حالات بہتر ہیں۔“

”گتہ میں پھر رابطہ کروں گا۔“ اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں سو پاگل مدد کر رہا تھا تو ہوشیار ای جگہ کھڑا تھا۔ لیکن وہ اپنی فصل کا ساتھ نہ کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا نہیں تھا کہ اس کے ہاتھوں ماری جانے والی عورت کی لاش

ساتھ قحاروت پر مجبور کر کے ہماری رہی سہی راحت و صنعت تباہ کر دی۔ اس کے بعد اسے کسی جنگ کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں نے ہوشیار سے کہا۔ ”کیا یہ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی نہیں ہے؟“

اس نے کسی قدر تعجب سے مجھے دیکھا۔ ”کیا مطلب؟“

مجھے احساس ہوا کہ میں نے پاکستانی بین کریہ سوال کر دیا تھا اور ہوشیار سنگھ کا تعجب درست تھا کہ میں خود کون سا قانون پسند تھا جو بین الاقوامی قانون کی بات کر رہا تھا۔ ”مطلب یہ کہ اس طرح کسی دوسرے ملک کا پانی حاصل کرنا کیا ٹھیک ہے؟“

اس نے شلنے اچکائے۔ ”صحیح لفظ تو حکومت جانے۔۔۔ جب سے یہاں دیا کا بھاؤ کم ہوا ہے حکومت نے پانی دینے کے لیے یہ نیوب ویل لگائے ہیں جب سے پانی کی کمی نہیں ہے۔“

میں جتنی بار اظہارِ آقا میں نے محسوس کیا کہ یہاں حکومت زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ ایک تو اتنی بڑی آبادی کو خود اک بھی بہت زیادہ درکار ہوتی ہے دوسرے اظہار کی ستر فیصد سے زیادہ آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ اگر انہیں زراعت میں روزگار نہیں ملے گا تو وہ لازمی شہروں کا رخ کریں گے اور اس سے وہ مسائل جنم لیں گے جس سے آج ہمارا ملک دوچار ہے۔ اس لیے کم سے کم مشرقی پنجاب کی حد تک حکومت نے یہ پالیسی اپنائی ہے کہ کسان کو ٹکی اور سڑک مہیا کی ہے۔ وہ اپنی زمین آباد کر سکتا ہے اور اپنی پیداوار کو خود منڈی تک پہنچا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ مشرقی پنجاب خوشحالی میں جنوب کی ان ریاستوں سے آگے ہے جہاں آبی ٹی کی اظہاری بین الاقوامی سطح پر کام کر رہی ہے۔ اس کی ایک مثال ہوشیار سنگھ تھا۔ اس کے پاس کل چندہ ایکڑ زمین تھی اور وہ اس کا ایک ایک انچ استعمال کر رہا تھا۔ جدید زرعی آلات اور ٹکی کی وجہ سے اسے صرف چار ملازموں کی مدد درکار تھی۔ اس نے غر سے بتایا۔

”دس سال سے صرف تین بار میں نے ایک فصل کے لیے زمین چھوڑی ہے اس میں بھی گوار پھلی لگتا ہوں اس سے زمین پھر زرخیز ہو جاتی ہے اور مجھے اس کا بھی اچھا فاصلہ جاتا ہے۔“

ہوشیار سنگھ پڑھا لکھا تھا اور اس نے غمزدہ راحت سے

ماہنامہ سرگوشٹ

ان تینوں نے کھانے لگا دی تھی اور یہ کام انہوں نے اپنی گردن بچانے کے لیے کیا تھا۔ میں اسے بتانا بھی نہیں چاہتا تھا اس طرح اس پر سے دھاؤ کم ہو جاتا جب تک وہ اس خوف میں رہتا کوئی اسکی حرکت کرنے سے گریز کرتا جس سے معاملہ پولیس کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔ اب تک اس کا رویہ عمل مطمئن کرنے والا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ لایوڈ شا کو اطلاع مل گئی ہوگی کہ میں سادی کو لے کر اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ انتقاماً مقامی حکام کو میرے بارے میں بتا سکتا تھا لیکن یہ طے تھا کہ اسے میرے بارے میں علم نہیں تھا کہ میں کہاں تھا؟

لایوڈ شا زیادہ سے زیادہ اس ہائر تک پہنچ سکتا تھا جہاں قبیلے نے مجھے اور سادی کو اتارا تھا۔ ہائر بہت بڑا تھا اور وہاں بے شمار شاہک سینٹرز اور دکانیں تھیں جس میں ہم رکے تھے وہ اس جگہ سے کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہاں بھی ہماری موجودگی کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ جب تک وہ تینوں پولیس یا لایوڈ شا کے ہاتھ نہیں آتے ہماری نشان دہی مشکل تھی۔ اس کے باوجود میں سو فیصد مطمئن نہیں تھا۔ دشمن کو کبھی بے وقوف یا کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس لیے میں ذہنی طور پر مستعد تھا۔ ہم واپس آئے تو سورج ڈوبنے کے بعد رسی سکی روشنی بھی تاریکی میں بدل چکی تھی۔ سو میت نے ہم سے معذرت کی تھی کہ وہ سبزی خوردے اور کسی قسم کا گوشت نہیں کھاتے تھے اس میں پھل بھی شامل تھی ہاں اظہ سے استعمال کرتے تھے اور ڈنر میں اظہوں سے بنی ایک ڈش موجود تھی۔ یہ اصل میں اظہ ابر یا پانی تھی جو میں نے پہلی بار کھائی تھی۔ وہ لوگ جلدی کھانے کے عادی تھے اس لیے ساڑھے آٹھ بجے میز پر کھانا لگا دیا گیا تھا۔

جلد کھانے کے ساتھ وہ جلد سونے کے عادی بھی تھے جیسا کہ گاؤں دیہات کا رواج ہے۔ ان کا گھر شہری سہولتوں سے آراستہ تھا مگر معمولات دیہاتی ہی تھے۔ کھانے کے بعد ہم نے کچھ دیر چال قدمی کی۔ میری کوشش تھی کہ ہوشیار زیادہ سے زیادہ میرے ساتھ رہے۔ دس بجے ہم اپنے کمروں میں آگئے۔ وہ جلدی سو جانے کے عادی تھے میں نے سادی سے کہا۔ "ہم کمرے میں ہوں گے لیکن کوئی ایک جاگن رہے گا۔ ابھی تم سو جاؤ میں تمہیں صبح چار بجے جگا دوں گا۔"

سادی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ میں نے مختصر شاور لیا اور ایک طرف صوفے پر اپنی جگہ بنالی تھی۔ یہاں اسے ی

نہیں تھا اس لیے کبیل کی ضرورت نہیں تھی۔ پکھا چل رہا تھا اور اس کی ہوا گرمی اور جس دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لانر کے بعد موسم لچا تک جس آلود ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بارش آنے والی تھی۔ مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی آجائے گی۔ بارہ بجے گرج چمک شروع ہوئی اور دس منٹ بعد تیز ہواؤں کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ میں نے کھڑکی کے پت کھول دیئے تھے اندر کی گرمی نکلے اور باہر سے خشک دھم ہوا اندر آئی۔ شدید بارش کا سلسلہ کوئی آدھے گھنٹے جاری رہا اس کے بعد اس کی شدت میں کمی آگئی۔ مگر گرج چمک کا سلسلہ جاری تھا۔ میں صوفے پر نیم دھارا تھا۔ کمرے کی بڑی روشنیاں بند کر کے صرف ایک ٹیبلو روشنی والا ٹائٹ لیمپ آن کیا ہوا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ باہر کوئی گاڑی رکی ہے۔ ویسے تو اندر نہیں آئی تھی لیکن انجین بند کرنے سے پہلے اسے ریس دی جاتی ہے تو اس کی آواز آتی تھی۔ میں چمکنا ہوتا تھا اور دروازے تک آیا۔ میں نے باہر جھانکا لیکن لائوڈ خالی تھا۔ ہوشیار سنگھ کے کمرے میں چار بیڈروم تھے اور ان چاروں کے دروازے لائوڈ میں کھلتے تھے۔ لائوڈ گھر کے وسط میں تھا۔ مگر لائوڈ میں کوئی نہیں تھا۔ ہمارا کمرہ پورچ اور گیٹ کی طرف تھا اس لیے میں نے آواز سن لی۔ خاصی دیر تک کوئی اور آہٹ نہیں ہوئی تو میں دروازہ بند کرنے والا ہی تھا کہ اسی لمحے کال بتلی گئی۔ بچانے والے نے نہایت بدتمیزی سے بتلے بغیر پرانگی رکھ دی تھی اور تقریباً آدھے منٹ تک مسلسل بجاتا رہا۔ اندر سے ہوشیار پا جاے اور بنیان میں افراتفری کے ساتھ برآمد ہوا۔ یقیناً میری طرح اس کے ذہن میں بھی خیال آیا ہوگا کہ پولیس آگئی۔ پولیس۔ کسی کے گھر آدمی رات کو اسی طرح نازل ہو سکتی تھی۔

میں چلا کہ بیگ سے شاٹ گن نکال سکوں تو سادی کو بیدار پایا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ میں بیگ کی طرف بڑھا تھا کہ باہر سے ہوشیار سنگھ کی حیرت زدہ آواز آئی۔ "سکیجے تو...؟"

"ہاں بھائی جی... ایک سال بعد ہی تو دیکھا ہے... کیا شکل بدل گئی ہے جو بچپان میں رہے تھے۔"

"تو یہاں کیوں آیا ہے؟"

"ہوشیار یار تو میرا بھائی ہے۔" سکیجے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ میں نے جھانک کر دیکھا وہ ہوشیار سنگھ سے

رہ گیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں کہیں جاؤں اور وہاں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ یہاں بھی مسئلہ آگیا تھا۔ سکیجے کے دونوں آدمی اعدا آگئے اور ہوشیار کی آواز بند ہو گئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ دونوں آدمی سنا تھے اور انہوں نے دودھ دیکھ اٹھا رکھے تھے۔

”بھائی تمی یہ بد معاش نہیں ہیں لیکن ضرورت پڑے تو بین جاتے ہیں۔“ سکیجے نے دانت نکال کر کہا۔ ”بس ایک رات کی بات ہے صبح ہم چلے جائیں گے۔“

”تم لوگ کوئی واردات کر کے آئے ہو۔“ ہوشیار نے اذیت لے کر کہا۔ ”پولیس سے بچنے کے لیے یہاں آئے ہو۔“

”ہی، ادھر پولیس سرگرم ہے۔“ ایک آدمی نے نہان کھولی۔ وہ طویل قامت اور دلی جسامت کا مالک تھا۔ اس وقت ہاتھ لگائے ہیں صبح تک کھول دیں گے تو ہم چلے جائیں گے۔“

”کسی کو پتا نہیں چلے گا۔“ سکیجے بولا۔ ”مجھے معلوم ہے بچے ماما پتا کے پاس ہیں۔ ادھر بس بھر جائی ہوگی۔“

”کچھ مہمان بھی ہیں۔“ ہوشیار نے آہستہ سے کہا۔ ”میرے کالج کے وقت کا دوست ہے، بیوی کے ساتھ ادھر آیا ہوا ہے۔“

”اس کی خیر ہے تم بتا دینا کہ بھائی اور اس کے دوست ہیں۔ کوئی سامنے نہیں آئے گا ہم کرے تک رہیں گے۔“

ان لوگوں کے تہہ تار ہے تھے کہ اگر ہوشیار نے انکار کیا تو وہ زبردستی پر اتر آئیں گے۔ طویل قامت کے شانے سے شاٹ گن لٹک رہی تھی اور دوسرے نے اپنی توپ کے ساتھ چٹون کی دھنسی پلٹ میں پستول بھی اٹکایا ہوا تھا۔ سکیجے خالی ہاتھ تھا لیکن لگ رہا تھا کہ اس کے پاس بھی کوئی نہ کوئی ہتھیار ہوگا۔ ہوشیار نے محسوس کیا کہ وہ اب انکار کر کے نقصان میں رہے گا۔ مجھدا اس نے سر ہلایا۔ ”اپنی بات پر قائم رہنا کل صبح یہاں سے چلے جانا۔“

”بھائی جی اعدا تو آنے دو۔ ابھی آئے نہیں اور نکالنے کی بات شروع کر دی۔“ سکیجے آگے بڑھا تو ہوشیار نے راک۔

”ادھر نہیں یہاں دور کے ہیں۔ تم لوگ اس کرے میں جاؤ۔“

میں نے آہستہ سے دودھ اڑھ بند کر دیا تھا۔ کیونکہ اب

ہاتھ بٹک اور صورت سے ہی جرائم پیشہ نظر آنے والا شخص تھا۔ لہجے سے وہ بھی ہوشیار کی طرح بڑھا کھٹا لگ رہا تھا۔ ”اسے بھائی سے ملنے آیا ہوں۔“

”سکیجے تھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا تو جانتا ہے سب نے تجھ سے کھٹن ختم کر لیا ہے۔ سویت بھی پسند نہیں کرے گی۔“

”بھر جائی کو چھوڑ اپنی بات کر۔“ سکیجے نے کہا۔ ”وہ بے چاری تو اور بھی بہت کچھ پسند نہیں کرے گی جو تو کرتا پھرتا ہے۔“

”آہستہ بول۔“ ہوشیار نے برہمی سے کہا۔ ”کیا تو میرا گھر بھڑکے آتا ہے۔“

”میں تیرا بھائی ہوں دشمن نہیں۔۔۔ یہاں سے گزرو ہا تھا سوچا ایک رات تیرے پاس رک جاؤں صبح چلا جاؤں گا۔“

”تو جیل سے کب آیا؟“

”دو مہینے پہلے رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اس علاقے میں تو کہاں جا رہا تھا جو یہاں سے گزرا۔“ ہوشیار کے لہجے میں شک تھا۔

”بس جا رہا تھا۔“ سکیجے نے احمائی سے کہا۔

”یہ کیوں نہیں کہتا کہ یہاں آیا ہے۔ کوئی گڑبڑ تو کر کے نہیں آیا ہے کہ پیچھے سے پولیس بھی آ رہی ہو۔“

”ایسا کچھ نہیں بھائی جی۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں نے کہا تھا بس ایک رات رکوں گا اور پھر ہم اپنی راہ لیں گے۔“

”ہم؟“ ہوشیار کی چوٹی آواز آئی۔ ”اور کون ہے؟“

”میرے دو دوست بھی ہیں۔“ اس نے کہا تو میرے اعدا خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ سکیجے کا کئی لفظ کام کر کے یہاں آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بھائی اسے برداشت نہیں کرے گا اور وہ اپنے ساتھیوں کو بھی لے آیا تھا۔ یہ بات ہوشیار نے بھی محسوس کر لی۔

”سکیجے میں تھے نہیں ٹھہرا سکتا اپنے دوستوں کو لے کر اسی وقت نکل جا۔“ ہوشیار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”چل نکل یہاں سے۔“

”اب میں نہیں جاؤں گا۔“ سکیجے نے کہا اور آواز دی۔ ”آ جاؤ امداد اپنا ہی گھر ہے۔“

”سکیجے یہ کیا کر رہا ہے ان بد معاشوں کو اعدا بلا رہا ہے۔“ ہوشیار نے برہمی سے کہا اور میں گہری سانس لے کر

وہ آگے آتے تو کھلا دروازہ دیکھ سکتے تھے۔ میری توجہ کا مرکز سٹیج کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں موجود بیگ تھے۔ انہوں نے جس طرح افکار کئے تھے اس سے ظاہر تھا کہ ان میں خاصا وزن قلعہ وہ بیگوں میں کپڑے اور ضرورت کا سامان لے کر گھومنے والے لوگ نہیں تھے۔ ان بیگوں میں یقیناً لوٹ کا مال یا ایسی کوئی چیز تھی جس کے لیے پولیس ان کے پیچھے تھی اور ملاقات کو ہاتھ نہ آکر ان سے بند کیا گیا تھا۔ وہ سچے اس کمرے میں چلے گئے جو ہوشیار نے ان کے لیے کھولا تھا۔ میں پلٹا تو سادی کو پیچھے کھڑے پایا اس نے سرگوشی میں کہا۔ "شوہنی لگ رہا ہے مصیبت آگئی ہے۔"

"لازمی بات ہے ہم کہیں قدم درنچو فرمائیں اور وہاں کوئی مصیبت یا آفت نہ آئے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔"

"تب کیا کریں پولیس آگئی تو ان کے ساتھ ہمیں بھی سمیٹ کر لے جائے گی۔"

میں نے سر ہلایا۔ "اس کا بہت زیادہ امکان ہے۔ کیونکہ اگر پولیس نے ناکا بندی کی ہے تو ان کے ہاتھ نہ آنے کی صورت میں وہ گھروں تک بھی آسکتی ہے۔ یقیناً یہ کوئی ایسا کام کر کے آئے ہیں جس کی وجہ سے پولیس بڑے پیمانے پر حرکت میں آئی ہے۔"

"شوہنی دسم نے رابطہ کیا پھر؟"

"نہیں بس شام کو اس کی کال آئی تھی، جنہیں بتایا تھا۔"

"میں وہاں صوفے پر دروازہ ہو گیا۔" وہ ہماری کوشش کردہ ہوا گالین میں نے اسے بتا دیا ہے کہ جب تک خطرہ صرف دس لیمد تک نہ ہو میں جنہیں لے کر بارڈر گراس نہیں کر سکتا۔"

"وہ تو جب وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا۔"

"سادی بستر پر بیٹھ گئی۔" لیکن شوہنی مجھے لگ رہا ہے یہ لوگ کچھ گڑبگڑ کریں گے۔"

"وہ کیسے؟"

"جیسے ہم ان سے چوکتا ہیں اسی طرح وہ بھی ہم سے چوکتا ہوں گے۔ بھائی کی بات الگ ہے لیکن ہوشیار کا بھائی ہم پر اصرار نہیں کرے گا۔"

سادی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ویسے بھی ان لوگوں کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ صرف ایک رات کے لیے یہاں نہیں آئے تھے۔ جب تک پولیس ان کی تلاش میں ہوئی وہ اسی جگہ رہے اور یہاں انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہوشیار بہر حال اپنے بھائی کو پولیس کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ یہیں رہے تو اس کا پورا امکان تھا کہ جلد یا بدیر ہماری

ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات خوشگوار نہیں ہوئی۔ وہ تین تھے اور سب بھگتے تھے۔ پھر مادی جرائم پیشہ تھے ان کے لیے کسی پر ہاتھ اٹھانا یا کسی کو مار دینا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں انتظار کرنے کی بجائے پہلے میں ہی کیوں نہ کچھ کر گزروں۔ یہ گھوڑے کے پہلے پھونک مارنے والا کیس بھی ہو سکتا تھا۔ جلد یا بدیر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا جائے اور تب وہ اسلئے کے زور پر ہمیں پر غمال بنا لیتے۔ اگر میں پہلے کارروائی کرتا تب بھی خطرہ تھا کہ وہ مزاحمت کریں گے اور یہاں کچھ گولیاں چلیں گی۔ اس صورت میں پولیس کے آنے کا امکان بڑھ جاتا۔ بے شک آس پاس کوئی گھر نہیں تھا لیکن یہ جگہ وہ ان بھی نہیں تھی۔ بڑی سڑک پاس تھی جس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اب کوئی نہ بدعتی اندر نہیں آ سکتا تھا۔

مجھے خود پر اعتماد تھا کہ وہ تینوں میرے لیے مسئلہ نہیں ہوں گے۔ مگر انہیں کامیاب کر کے رکھنا آسان نہیں تھا اور کل تو اس مسئلے کا بالکل بھی حل نہیں تھا۔ اس سے دیگر کئی مسائل کھڑے ہو جاتے۔ یہاں ہوشیار کے کارڈ میں بھی الی خانہ کے ساتھ رہتے تھے۔ اسے لوگوں کو خاموش کرانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے جو کرنا تھا خاموشی سے کرنا تھا۔ میں سوچ رہا تھا سادی وہ بارہ لیٹ گئی۔ اسے وہی تشویش ہوئی تھی ورنہ اسے بھی یقین تھا کہ میں اس جگہ سے نکل سکتا ہوں۔ وہ غنودگی میں گئی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دھک ہوئی اور وہ جاگ گئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ کون ہے؟"

"میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور اٹھ کر دروازے تک آیا۔ دھک اتنی ہلکی تھی کہ اگر ہم داخلی طور پر چوکتا نہ ہوتے تو شاید سنائی بھی نہ دیتی۔ پھر باہر ہارٹس اور بجلی کی گرج چمک کا شور تھا۔ امکان یہی تھا کہ باہر ہوشیار ہوگا اس لیے میں نے ممکن حد تک دھیمی آواز میں پوچھا۔ "کون؟"

"میں ہوں ہوشیار۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ میں نے گہری سانس لی لیکن مطمئن نہیں ہوا تھا کیونکہ ہوشیار کو گولی لہاؤنٹ پر بھی یہاں لایا جاسکتا تھا۔ میں نے ہسٹول نکال کر ہاتھ پشت پر کیا اور دروازہ کھول دیا۔ ہوشیار تیزی سے اندر آیا۔ سادی نے جلدی سے دوپٹا ٹھیک کیا اور میں نے پوچھا۔

"یہ کیا حرکت ہے تم اس طرح منہ اٹھائے کس خوشی میں اندر آ رہے ہو؟"

"آئی ایم سوری۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا اور

بھری ہوئی۔ "ہم بڑی مشکل میں پھنس گئے۔"

"ہم سے کیا مراد ہے؟"

"میرا مطلب ہے ہم دونوں۔" اس نے گھبرا کر کہا
کیونکہ میں نے ذرا اونچی آواز میں پوچھا تھا۔ "واہ گورو کے
لیے آواز جیسی دکھو نہ سن لیں۔"

"وہ کون؟"

"میرا بھائی اور اس کے ساتھی۔"

"میرا تمہارے بھائی یا اس کے ساتھیوں سے کیا
تعلق ہو سکتا ہے۔"

ہوشیار نے سوچا اور پھر مجھے پوری بات بتانے کا
فیصلہ کیا حالانکہ میں پہلے ہی سب جانتا تھا۔ اس نے کہا
شروع کیا۔ "میرا چھوٹا بھائی ہے سنگیت سنگ۔ جوانی میں لالہ
چکروں میں پڑ گیا۔"

"جیسے تم شادی کے بعد لالہ چکروں میں پڑ گئے۔"
میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے ہم ڈرائنگ روم میں جل کر
بات کرتے ہیں۔"

ہوشیار نے سر ہلایا تو میں نے سادی کو اشارہ کیا کہ وہ
اعداد سے دور لڑو بند کر لے۔ وہ سر ہلاتی ہوئی کھڑی ہوئی تو
میں اور ہوشیار ہا ہر گل آئے اور وہ بے قدموں ڈرائنگ روم
میں آ گئے۔ ہوشیار نے اعداد آتے ہی دروازہ بند کر کے لاگ
کر دیا اور مجھے ٹکڑے تک دور والے حصے میں لا کر
بولایا۔ "اس نے جرم شروع کر دیے۔ ایک سال پہلے وہ پکڑا
گیا۔ خوش قسمتی سے ایک گواہ کر ہو گیا اور اسے صرف چھ
مہینے کی سزا ہوئی۔ وہ چھوٹ آیا اور اب یہاں ہے۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں نے
انہماں بن کر کہا۔

"مجھے شبہ ہے مئی کہ وہ اور اس کے دو ساتھی کہیں کوئی
اورالت کر کے آئے ہیں۔ پولیس ان کی تلاش میں ہے اور
علاقے کی ناکابندی کر رہی ہے۔"

"ہاں اب میرا مسئلہ بھی بن رہا ہے۔" میں نے سر
ہلایا۔ "تمہارا مسئلہ تو ہے ہی۔"

"وہ کہہ رہا ہے کہ سچ چلا جائے گا لیکن مجھے یقین ہے
وہ یہاں جیم کر بیٹھ جائے گا۔"

"سامنے کی بات ہے پولیس اپنی جلدی اپنی تلاش قسم
نہیں کرے گی اور یہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

"ابھی تو میں نے انہیں تالیفِ کرم میرے دوست
ہو۔"

"سوال یہ ہے کہ اگر وہ یہاں رہے اور پولیس انہیں
حفاظت کرتی آگئی تو وہ اتنی شرافت سے خود کو پولیس کے
حوالے نہیں کریں گے۔" میں نے ہوشیار کو قائل کرنا شروع
کر دیا۔ "یہ گولیاں چلائیں گے اور مارا ماری ہوگی۔ ممکن
ہے پولیس سے بچنے کے لیے یہ تمہیں اور ہمیں بے مثال
بنائیں۔"

درحقیقت وہ پہلے ہی قائل تھا اور جو باتیں میرے
ذہن میں تھیں وہ پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ اسی لیے تو وہ میرے
پاس آیا تھا۔ وہ حنک رہا تھا۔ "یہ تو ہے۔"

"یہ مقابلہ کریں گے اور گولیاں چلائیں گے تو جواب
میں پولیس پھول تو نہیں مارے گی اور گولیاں سامنے آنے
والے کو نہیں دیکھتی ہیں۔ ہم بھی مارے جاسکتے ہیں۔"

"یہ بھی ہے۔" اس نے پھر اتفاق کیا۔
"اس صورت میں ہمیں وہ کام کرنا چاہیے جس سے
مسئلہ خاموشی سے حل ہو جائے۔"

"خاموشی سے کیسے؟"
"یہ بتاؤ تمہارے پاس خفیہ کی دوا ہے؟"
"ہاں کل ہے کچھ مہینے پہلے مجھے خفیہ نہیں آتی تھی تو میں
لایا تھا۔ اس کے بعد خود خفیہ آنے لگی تو اس کا لڑا دیا ہی پڑا
ہے۔"

"ٹھیک ہے انہیں چائے میں دوا ملا کر دے دو۔"
میں نے مشورہ دیا۔

"چائے اس وقت؟"
"ہاں... تم کہہ سکتے ہو کہ لکر سے تمہاری خفیہ ڈوگی
ہے اور تم اپنے لیے چائے بنا رہے تھے تو سوچا کہ ان تینوں
کے لیے بھی بنا دو۔ تم ان کے ساتھ ہی چائے پینا تاکہ انہیں
شک نہ ہو۔"

"دوا دالی۔" اس نے اعتراض کیا۔ "اس سے تو میں
بھی سو جاؤں گا۔"

"آپ نے لیے تم بغیر دوا دالی لینا۔"
"جب تک ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

"جب تو قائل کرو... اگر وہ کچھ سوچے تو تم اٹھا کر تو
چائے نہیں دو گے۔"

"میں ابھی جاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "میرے پاس
گولیاں ہیں پہلے انہیں میں لیتا ہوں۔"

وہ کچھ ہوشیار تھا۔ شکر ہے اسے یہ حرکت ہمارے
ساتھ کرنے کا خیال نہیں آیا۔ شاید اس لیے بھی کہ ہم نے

شرافت سے کام لیا تھا اور اس کی مدد ہی کی تھی۔ اسے کل اور بلیک میٹنگ کے پکڑے بچا لیا تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا اور اس نے دروازہ کھولا تھا کہ سامنے سنگیت اور اس کے دونوں ساتھی دکھائی دیے۔ ان کے چہروں پر شک ہی شک تھا۔ سنگیت نے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔ ”بھائی جی دروازہ کھول کر کے کیا کر رہے تھے؟“

میں خاموش کھڑا رہا ہوشیار نے مڑ کر دیکھا تو اس کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ میں نے آنکھوں میں ہلکے اشارے کیا کہ حوصلہ کرے۔ اس نے اشارہ سمجھ لیا اور کسی قدر گرم لہجے میں بولا۔ ”تو کون ہوتا ہے مجھ سے میرے گھر میں یہ سوال کرنے والا۔“

”ناراض کیوں ہوتے ہو پارا ایسے ہی پوچھ لیا۔“ میں آگے آیا۔ ”تم تینوں ساتھ ساتھ رہتے ہو کیا... ہر وقت؟“

طویل قامت نے غرا کر میری طرف دیکھا اور ہوشیار سے کہا۔ ”آئیے پار کو سمجھالے ہمارے منہ نہ لگے۔“

”منہ لگنے والی بات بھی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بات کرنے سے پہلے آئیے میں منہ کچھ لیا کرو۔“

”لگتا ہے تو اس طرح نہیں مانے گا۔“ طویل قامت آگے آیا تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”یہاں نہیں.... یہ میرے دوست کا گھر ہے اس کا نقصان میرا نقصان ہے باہر چلتے ہیں۔“

توند والا خوش تھا اور سنگیت بھی دل چھین لے رہا تھا ہینا لگ رہا تھا ان کا دل پسند تھا شاید ہونے والا ہے۔ طویل قامت بولا۔ ”تم خود مقابلے کا کہہ رہے ہو بعد میں رونا مت۔ میں ہاتھ چلاتے ہوئے یہ نہیں سوچتا کہ آگے والے کے منہ ناک کا کیا ہوگا؟“

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ ہوشیار گھبرا گیا۔

میں نے اس کا شانہ چھپکا۔ ”تم گھومت کرو ہم ذرا جادو خیال کریں گے۔“ میں نے کہتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ وہ چاروں بھی پیچھے تھے۔ ہوشیار اپنے بھائی سے کچھ کہہ رہا تھا مگر وہ اس کی سننے کے سواڑ میں نہیں تھا۔ اس کی بجائے وہ اپنے ساتھی کے ہاتھوں میری حرمت دیکھنا چاہتا تھا۔ اب وہ ہوشیار ہو گئے تھے اور شاید دروازہ والا حیرت بکام نہ کرنا

اس لیے میں نے دوسرا طریقہ سوچا تھا۔ ہم باہر آئے جہاں ہوشیار کی جیب کے ساتھ ایک کٹھنر سی پرانی کار کھڑی تھی۔ وہ لوگ اسی میں آئے تھے اور انہوں نے چالاک سے کام

لیتے ہوئے گاڑی بھی اندر کھڑی کر لی تھی۔ اس لیے اب پورچ میں جگہ نہیں تھی۔ ہم لان میں آگئے۔ ہوشیار اب خاموش تھا اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی کوئی نہیں سنے گا۔ سنگیت اور توند والا ذرا دور کھڑے ہو گئے اور طویل قامت آگے آیا۔ میں نے انارڈیوں کی طرح دونوں ہاتھ آگے کیے۔ طویل قامت مسکرایا اور اس کا چہرہ لان یسپ کی بجلی روشنی میں حریف مکروہ نظر آنے لگا۔ مجھے کزور محسوس کر کے وہ آگے آیا اور میں نے آدھے صحت میں کھیل ختم کر دیا۔ اس کے دو وارنا کام بنا کر میں نے پہلے اس کے پیچ میں مکا مارا اور جب وہ جھکا تو اس کے سر پر پستول کا دست رسید کیا وہ وہیں گر گیا۔ توندوالے کا ہاتھ اپنی ویلٹ کی طرف گھمایا تھا کہ میں نے پستول اس کی طرف کر دیا۔ ”ہاتھ اوپر اور حرکت مت کرنا ورنہ....“ میں نے پستول کو جنٹیل دی تو اس کا ہاتھ رک گیا پھر اس نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ سنگیت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اب ہوائیاں ان کے چہروں پر اڑ رہی تھیں۔ وہ میرے پرزے اڑتے دیکھتے آئے تھے اور یہاں قماش ہی اٹھا ہو گیا تھا۔

”ہاتھ گردن پر۔“ میں نے حکم دیا تو انہوں نے اس بار بھی کھیل کی اور ہوشیار نے میرے کہنے پر ان کی عطا فی لے کر ہتھیار برآمد کر لیے۔ دونوں کے پاس پستول تھے۔ نیچے ہونے پر ان کا رہا سا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ سنگیت نے کہا۔ ”بھائی جی ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔“

”اتنی آسانی سے نہیں۔“ میں نے کہا اور ہوشیار سے پوچھا۔ ”کوئی جگہ ہے جہاں ان کو بند کیا جاسکے تو صرف ان کی آتما نہیں وہاں سے کل سکیں؟“

”بالکل ہے۔“ اس نے کہا اور قماش لان کے ساتھ بنی کوٹھری تک آیا۔ یہ اوڑا اور قاتل سامان دیکھنے کے لیے تھی۔

بند اینٹوں سے بنی اس کوٹھری کی چھت بھی پکی تھی اور دروازہ موٹی لوہے کی چادر کا بنا ہوا تھا۔ یہ انتظام شاید سامان کو چوروں سے بچانے کے لیے کیا گیا تھا اور یہاں سے کچھ ان کی رو میں ہی کل سکتی تھیں۔ ایسی ساری چیزیں نکال لیں جن کی مدد سے یہ خود کو آزاد کرا سکتے تھے اور پھر انہیں کوٹھری میں دھکیل دیا۔ میں نے کہا۔

”آرام سے بیٹھنا.... ہنگامہ کیا تو اپنا نقصان خود کرو گے۔“

”بھائی تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔“ مسکیتے نے بھائی کو دھمکایا۔

"تو نے بہت اچھا کیا جو ان بد معاشوں کو لے کر میرے گھر آ گیا۔" ہوشیار نے سچ لہجے میں جواب دیا۔
 "ہم صرف دیکھتے تھے کہ کوئی اور نقصان نہیں کرتے۔"
 "کونسا مت کر... یہ میرا دوست ہے اس کے ساتھ کیا کر رہے تھے میرے ساتھ اور تو... تو کہتا ہے میرا نقصان نہیں کر رہے تھے۔ ابھی پہلے معلوم کر لوں کہ تم لوگوں نے کیا کیا ہے پھر تمہارا فیصلہ کرتا ہوں۔"

ہوشیار احمد سے ایک بڑا اور مضبوط تالا لے آیا اسے باہر ال دیا۔ ہم اندر آئے پہلے میں نے سادی کو تسلی دی کہ حالات میرے قابو میں ہیں اور وہ سو جائے پھر میں ہوشیار کے ساتھ اس کمرے میں آیا جس میں یہ تینوں رہتے تھے۔ وہاں ان کے اضافی اسلے کے ساتھ دو دلوں بڑے بیگ بھی تھے۔ ہوشیار نے ایک بیگ کھولا اور میری توقع کے عین مطابق اس میں کرسیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ یہ سارے خزانہ اور پانچ سو ڈالے نئے کرسی ٹوٹ تھے جن پر بیگ کی پٹی لگی تھی۔ ہوشیار نے گھبرا کر کہا۔ "واہ گرد کی سو... کسی بیگ میں ڈاکا لگا ہے۔"

"تک تو یہی ہی رہا ہے۔" میں نے دوسرا بیگ بھی کھولا اور وہ بھی اسی طرح کرسی سے بھرا ہوا تھا۔ دونوں بیگوں کا مشترکہ وزن کوئی پچاس کلو گرام تھا۔ ہوشیار نے گتہ پس گھنٹیں اور مجھے آگاہ کیا۔
 "دو سو گتہ یاں لاکھ والی اور تین سو پچاس ہزار والی ہیں۔"

"سازمے تین کروڑ روپے۔" میں حیران ہوا تھا۔ "یہ تو بہت بڑی رقم ہے اور پولیس ملازمی چو کتنا ہوگی۔"
 "اتنی بڑی واردات لی ڈی پر لازمی آ رہی ہو گی۔" ہوشیار نے کہا تو ہم نے نشست گاہ کا رخ کیا۔ اس نے لی ڈی آن کر کے مقامی ٹیڈو چیمبل لگایا تو اس پر اس وقت بھی خبر چل رہی تھی۔ نامعلوم افراد نے امرتسر سے لدھیانہ آنے والے کیش آرمرڈ ٹرک کو لوٹ لیا تھا۔ ڈاکوؤں نے ٹرک کے چاروں کانٹوں کا قتل کر دیا تھا اور اس میں موجود ساڑھے تین کروڑ کی رقم لوٹ کر لے گئے تھے۔ یہ خبر دیکھتے ہوئے رات دو بجے ہوشیار سنگھ کے ہارہ جگ گئے تھے۔ "یہ تو قاتل بھی ہیں۔"

"پوکیس بہت سرگرمی سے ان کی تلاش میں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "یہ ابھی خبر ہے کہ وہ ان کے ہارے میں کچھ نہیں جانتی ہے۔ مگر بہت سی باتوں سے دورانِ تحقیق پتہ چل

جائے گا کہ ڈاکوؤں نے کہاں کا رخ کیا ہے۔"
 "وہ سیدھی یہاں آئے گی۔" ہوشیار نے رد دینے والے لہجے میں کہا۔ "اور تم کہہ رہے ہو کہ انہی بات ہے۔"
 "میرا مطلب ہے وہ ناموں سے واقف نہیں ہے ورنہ یہ پتا چلا تا کون سا مشکل ہوتا کہ سنگھ کا بھائی ہوشیار سنگھ اسی علاقے میں رہتا ہے۔ لدھیانہ یہاں سے بہت دور ہے۔"

"آٹھ دور بھی نہیں ہے۔" اس نے سر پر ہاتھ مارا۔
 "اب ان کو چھپا کر رکھنا اور ضروری ہو گیا ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ان کے لیے چائے بنا دو لی دوا والی۔"

"شراب میں نہ دیدوں۔" ہوشیار سنگھ نے بہتر تجویز دی۔ "زیادہ اثر کرے گی۔"

"یہ بہتر رہے گا۔" میں نے کہا تو اسی لمحے نشست گاہ کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"یہ سویت ہوگی وہ جاگ گئی ہوگی۔" ہوشیار نے کہا اور باہر چلا گیا۔ دس منٹ بعد آیا تو اس کے ہاتھ میں دو لی شراب کی بوتل تھی۔ اس نے مجھے دکھائی۔ "دوا نہیں کر اس میں شامل کر دی ہے۔"

ہم باہر آئے۔ کوٹھری کا تالا کھولا اور ہم اندر آئے۔ طویل قامت کو ہوش آگیا تھا اور وہ سر تھاٹے مجھے خوشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تو نے اچھا نہیں کیا ابھی مجھے جانتا نہیں ہے۔"

میں نے نرمی سے کہا۔ "بس ایک دن کی بات ہے پھر تم کو آکر لو کر دوں گا۔"

"تم لوگوں نے آمرڈ ٹرک لوٹا اور اس کے گاڑڈ کو مار دیا۔" ہوشیار نے لہجے میں کہا۔ اس نے شراب کی بوتل سنگیت کی طرف اچھال دی۔ میں نے اندر آنے سے پہلے پستول نکال لیا تھا اس لیے وہ شرافت کے دائرے میں تھے۔ سنگیت نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"تو شراب کیوں لایا ہے۔"
 "تایا تو ہے کہ تم لوگ ایک دن آرام سے رہو گے۔ شاہاش اب چوٹا شرور کر دو۔"

"اس میں تیر ہے۔" سنگیت کا شک دہان پر آگیا۔
 "میں تم تینوں کو خالی ہاتھ سے بھی مار سکتا ہوں تو تیرہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تین تک گنوں گا اور اس کے بعد... میں نے پستول کو جنبش دی تو طویل قامت نے

ٹرینٹر اور دوسری مشینری کے شہد میں کھڑی کر دی تھی۔ میں نے سویت سے کہا۔ "بھر جائی اگر مشکل نہ ہو تو میرے لیے ایک کپ چائے بنا دیں۔"

اس نے ہنسی لہجے میں کہا۔ "کسی بات کرتے ہیں اوجیت بھیا آپ نے تو ہمیں ان ڈاکوؤں سے بچایا ہے آپ کی سہوا تو دھرم ہے۔"

سویت چائے بہت اچھی بناتی تھی اور اس کے پاس پتی بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ میں دیریں لاؤنج میں بیٹھ گیا تھا۔ ہوشیار کمرے میں تھا سویت مجھے چائے دے کر بولی۔ "بھائی جی کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے لیما اب یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔"

"شکریہ بہت۔" میں نے کہا وہ اندر چلی گئی تھی۔ باہر کمرچ چمک رک گئی تھی مگر موسم بارش والا تھا اور ہاتھ لگی کبھی تیز ہوا کے خشک جھونکے آتے تھے۔ میں پانچ بجے تک وہاں رہا پھر کمرے میں آیا اور سادی کو چنگا کر سو گیا۔ وہ کمرے سے ہی آس پاس نظر رکھ سکتی تھی۔ اس نے مجھے نو بجے جگا دیا۔ وہ خود نہ ہاتھ دھو کر ناشتا کر چکی تھی۔

"شولی انڈھا چائیں ناشتا کر لیں۔"

"کوئی تبدیلی تو نہیں آئی؟"

"نہیں ہوشیار بھی سو رہا ہے، میں اور سویت باتیں کر رہے تھے۔"

میں نے سو پائل چمک کیے ان پر کال نہیں آئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اب دسم اسی وقت کال کرتا جب وہ ہمارے لیے بندوبست کر لیتا یا پھر نہیں کرتا اور ہمیں کوئی قبیلہ رات انتظار کرنا پڑتا۔ ویسے میری خواہش تھی کہ وہ انتظام کر لے اور ہم یہیں سے سرحد پار کر جائیں۔ میں اور سادی بخشی جلدی یہاں سے چلے جاتے ہمارے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا۔ میں نے منہ ہاتھ دھونے کی بجائے غسل کیا اور اپنے زخموں کا جائزہ لیا جو تقریباً بھر چکے تھے۔ ماتھے کے زخم پر کھڑا آگیا تھا جو شاید ایک دن میں اتر جاتا۔ ہاتھ زخم صاف ہو چکے تھے اور معمولی نکانہ رہ گئے تھے۔ رات میں نے جاگتے رہنے کے خیال سے کم کھایا تھا اس لیے اب بھوک لگ رہی تھی۔ ناشتے میں دیکھی اٹھ رہے اور پراٹھے تھے۔ ان کے ساتھ سوچی کا طوطا اور لکی تھی۔ میں نے ناشتے سے پورا انصاف کیا، سویت تازہ پراٹھے بنا رہی تھی۔ اسی دوران میں ہوشیار بھی آکر میرے ساتھ ناشتے میں شامل ہو گیا۔ اس نے کہا۔

شکیت سے بولنے لگا۔ اے ضرورت بھی تھی اس نے ایک ہی بار میں چوتھائی بوتل صاف کر دی۔ پھر گینڈے نے بوتل کے ساتھ ہی سلوک کیا۔ شکیت کو جب میں نے بھایا تو اس نے بوتل منہ سے لگائی تھی۔ اس دوران میں طویل قامت جھوننے لگا تھا مگر پہلے گینڈا لڑکا بھر طویل قامت گرا اور آخر میں شکیت نے مزید ایک گھونٹ لیا تھا اٹھا فٹیل ہونے سے پہلے۔ بوتل تقریباً خالی ہو گئی تھی۔

"یہ مجھے کم سے کم دس بارہ گھنٹے کے لیے۔" ہوشیار نے بوتل اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کوئی دوا انسان کو آٹھ گھنٹے سے زیادہ دیر تک نہیں سلا سکتی ہے اس سے زیادہ دیر سونے کی صورت میں انسان کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔ "ہاں یہ دس بارہ گھنٹے تک کسی قافلے نہیں رہیں گے۔"

ہم باہر آئے اور ہوشیار نے تالا لگا دیا۔ ہم اندر آئے تو میں نے ہوشیار کا شانہ تھپکا۔ "لب تم سو جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میں جاگتا رہوں گا۔ پولیس کی طرف سے ہوشیار رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا خیال ہے یہ گاڑی کہیں اور نہ چھوڑ دیں۔"

"بچھے کھڑی کر دیتے ہیں۔" ہوشیار نے تھوڑے وقت کی۔ "باہر جانا خطرے والی بات ہوگی۔ میں روڈ پاس ہے اور اس پر پولیس موجود ہو سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے تب بچھے کھڑی کر دوں گا۔ ابھی یہ کام کر رہا ہوں۔" ہوشیار نے مشورہ دیا اور ہوشیار میل کے لیے چلا گیا۔ اب اس کا رویہ میرے ساتھ تقریباً بدل ہو گیا تھا اور وہ بھڑک نہیں رہا تھا اور نہ ہی اس کی نظروں اور انداز میں قاصت تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ میں اپنے ساتھ اس کی مدد بھی کر رہا تھا۔ رقم والے بیک ابھی تک ان کے کمرے میں پڑے ہوئے تھے۔ ہوشیار آیا تو میں نے اس سے کہا۔ "انہیں چھپانا ہے۔ صبح ٹیلا یا کوئی اور بندہ نہ جانے کے یہ لوگ یہاں آئے تھے۔"

گھر میں ایک اسٹور روم تھا مگر وہ نکلا تھا اس لیے ہوشیار کے کمرے کے ہاتھ روم کے اوپر والی دو چھتی سے کام لیا گیا۔ ہم نے اسٹور بھی بیگوں میں ڈال دیا اور انہیں دو چھتی پر سامان کے پیچھے رکھ دیا۔ سویت جان گئی تھی اور ہراساں تھی۔ مگر وہ ہوشیار کا مسئلہ ہی وہ اسے سنبھال لیتا۔ اس نے گاڑی پیچھے ملازموں کے مکانات کے ساتھ

میں ہاتھ دھو کر آیا تو سادی سر اپا انتظار بنی ہوئی تھی۔ وہ کچھ گلی تھی کہ مجھے کال آئی تھی۔ میں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ ڈرامہ کرے اور ہوشیار سے کہا۔ "میں کچھ کپڑے چاہیں یہاں سے مل سکتے ہیں۔"

"یہاں تو مشکل ہے۔" اس نے کہا۔ "ادھر فیروز پور جانا پڑے گا۔ وہاں کچھ دکانیں ہیں جہاں کپڑے مل جاتے ہیں۔"

"بس تو ابھی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ابھی۔" وہ شکر ہو گیا۔ "ابن کو چھوڑ کر؟"

"وہ آرام سے پڑے ہیں اور کوٹھری سے باہر نہیں آسکتے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ہم ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں واپس آ جائیں گے۔"

میں نے اسے سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ میں سادی کے ساتھ کمرے میں آیا اور اسے مختصر دسک سے ہونے والی گنگو سٹائی۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا کہ ہم آج رات ہی واپس جا رہے تھے۔ "میں سامان لینے جا رہا ہوں تم ہوشیار رہنا اور کسی مشکل صورت میں پستول کے استعمال سے مت بچکنا۔"

"آپ نگر نہ کریں میں سب دیکھ لوں گی۔" اس نے اس سے کہا۔

ہم فیروز پور کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ حقیقت وحب محلہ فیروز پور شہر میں ہی ہے لیکن آبادی کم ہونے کی وجہ سے الگ تھلک لگتا ہے۔ ہائی وے یا حسین والا باردار روڈ کی طرف جانے کی بجائے ہوشیار نے اندرونی سڑکوں کا انتخاب کیا اور ہم بغیر پولیس سے مدد بغیر کیے فیروز پور کنٹریکٹ ایریا پہنچ گئے وہاں ایک چھوٹا سا صاف ستھرا بازار تھا۔ میں نے ریڈی میڈ ہوزری گارمنٹ کی ایک دکان کا انتخاب کیا۔ اس کے پاس ہر سائز کے فٹ نائٹ مردانہ لڑاؤ تیر اور پودے آستین کی ٹی شرٹ موجود تھیں میں نے سیاہ رنگ میں دکھانے کو کہا۔ دکاندار ذرا حیران ہوا تھا کہ میں نے اس موسم میں پوری آستین کی ٹی شرٹ مانگی تھیں۔ مگر اسے دکاندار سے مطلب تھا اس نے مجھے مطلوبہ سائز کے لڑاؤ زراور ٹی شرٹس دے دیں۔ ایک میں نے اپنا سائز کالیا تھا اور ایک سادی کالیا تھا۔ اس کے پاس کل کر لیں ہو جانے والی ٹوپیاں بھی تھیں۔ یہ سردی کا مال تھا جو فروخت سے فائدہ لے رہا تھا۔ میں نے وہ بھی لے لیں اور سیاہ ہی رنگ کے ہارک دستانے لیے۔ اس کے بعد ہم ایک شو اسٹور آئے

"میں کچھ دیر پہلے گیا تھا وہ بے سود پڑے ہیں۔"

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ اگر ان میں سے کسی کو ہوش آ گیا ہوتا تو تم مشکل میں پڑ جاتے۔"

"میں صرف نام کا ہوشیار نہیں ہوں۔" اس نے فخر سے کہا۔ "پستول لے کر گیا تھا۔"

"یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کو پولیس کے حوالے کرنے کا حوصلہ کتنے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "خاص طور سے جب ان میں تمہارا بھائی بھی شامل ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "مشکل ہے اگر سنگیت نہ ہوتا تو میں ایسا کر گزرتا۔"

"دوسری صورت میں کیا یہ تمہیں بخش دیں گے؟ کل رات ان کے ساتھ جو ہوا ہے۔"

اس بار ہوشیار سنگھ کا رنگ اڑ گیا تھا اور لوہا اس کے منہ میں پھنس گیا جسے اس نے جلدی سے لسی سے نیچے اتارا۔ وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "جو سوچتا ہے جلدی سوچ لو، میرے پاس وقت نہیں ہے شاید ہمیں بھی جلد جانا پڑے۔"

"میں سوچتا ہوں۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔ "تاہم یہ اس کے بس سے باہر تھا۔ میں ناشائستہ کر رہا تھا کہ سوبال دابھر مٹ ہوا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔"

"میں دالہ روم سے آتا ہوں۔"

دالہ روم میں آکر میں نے کال ریسیو کی دوسری طرف دیکھا۔ اس نے بلا تھمہ کہا۔ "سیاہ لباس کا بندوبست کر لیں، جوڑے ایسے ہوں کہ مٹی لورنا ہوا دشت پر جڑی سے حرکت کر سکیں اور سر سے پاؤں تک سیاہ رنگ کے سوا کچھ نہ ہو۔"

"میں بندوبست کرنا ہوں۔"

"یہ کام آج رات تک کر لیں اور ہاں ٹائٹ وچن بھی ہوں۔"

"وہ ہیں اور بہت اچھی کوالٹی کے ہیں۔"

"بس تو کام بن گیا۔" دیکم بولا۔ "تیسرے آپ کو یہ سوبال بھی ساتھ رکھنا ہوگا، بیٹھ فری کے ساتھ رہنمائی کے لیے۔ اسے پوری طرح چارج ہونا چاہیے۔"

"ہو جائے گا ورنہ میں کوئی بھی چارجنگ والا سین لے لوں گا۔"

"آج رات تیار رہے گا میں شام کے وقت رابطہ کروں گا۔"

"تو خود کو میرا بھائی کہتا ہے اور یہاں چلا آیا۔" ہوشیار نے نظرت سے نگہیت کو دیکھا۔ "تیرے پیچھے پولیس آتی تو میں بھی بدرا جاتا۔"

نگہیت کا سر جھک گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "دیے تم تینوں اس قابل ہو کر بھائی چڑھاؤ لیکن ابھی ہم نے فیصلہ نہیں کیا ہے ممکن ہے کہ ہمیں چھوڑ دیں۔ اس لیے آرام سے بیٹھو اور کوئی ہنگامہ مت کرنا۔"

"ہم کوئی ہنگامہ نہیں کریں گے۔" سونے نے یقین دلایا۔

لے نے چھوٹی انگلی سے اشارہ کیا۔ "بیٹاب آرام ہے۔"

"نہیں کرلو۔" ہوشیار نے کہا۔ "کچھ دیر میں تمہیں کھانے کو مل جائے گا۔"

"شراب نہیں مل سکتی۔" سونے نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"ابھی نہیں شام کو دوں گا۔" ہوشیار نے انکار کیا۔ ہم انہیں بند کر کے اندر آئے۔ اس بار میں ہوشیار کو نشست گاہ میں لے آیا۔

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"میری ایک تجویز ہے۔" میں نے کہا۔ "انہیں ایک بار پھر شراب میں دوا دے دو اور ان کی گاڑی میں داخل کر انہیں یہاں سے دور کہیں چھوڑ آؤ۔"

"دور جانا ممکن نہیں ہے۔ پولیس نے تارکے لگائے ہوں گے۔"

"تم پہلے خود جا کر دیکھ لو کہ پولیس کتنی سرگرم ہے اور انہیں چھوڑنے کا کام تارکی کے بعد کرنا۔"

اس نے غور کیا۔ "تم میری مدد کرو گے۔"

میں نے سوچا اور سر ہلایا۔ "ہاں میں تمہاری مدد کروں گا۔"

"ان کا اسلحہ اور وہ رقم؟" ہوشیار کا لہجہ رقم کا ذکر کرتے ہوئے ارا تہد مل ہوا تھا۔

"وہ بھی ساتھ ہوگی۔ اس رقم کے پتھر میں مت پڑو۔ تم نے خود نہیں کیا وہ ساری نی اور کل گڈیاں ہیں ان کے خبردار پولیس کے پاس ہوں گے اور تمہارے پاس سے ایک نوٹ بھی نکل آتا تو تم بھی ان کے ساتھ مارے جاؤ گے۔"

ہوشیار فوراً سیدھا ہو گیا۔ اس نے صفائی پیش

یہاں سے کیوں کے کرپ ریسول والے جوتے لیے۔ ان کا رنگ گہرا تھا مگر انہیں سیاہ کیا جاسکتا تھا۔ یہ ساری خریداری شکل سے آرمے کھٹے میں منت گئی۔ پھر میں نے وہیں ایک سوہاگل شاپ سے ایک ساواہ اسکرین مگر لکھی بیٹری والا سوہاگل لیا۔ یہ تھا اس لیے قابل بھروسہ تھا۔ ہم کچھ ایک کھٹے میں واپس آ گئے تھے۔

لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری اس خریداری نے ہوشیار کو ہوشیار کر دیا تھا۔ اس نے راستے میں وہ تین بار مجھ سے پوچھا کہ میں نے یہ کپڑے اور جوتے کیوں لیے ہیں لیکن میں نے اسے ٹال دیا تھا۔ واپس آتے ہی میں نے کمرے میں آکر سب سے پہلے ٹاپ چیک کیے۔ خاص طور سے جوتوں کے۔ اپنا ساڑو تو دکان پر دیکھ لیا تھا مگر سادی کا اندازے سے لایا تھا اس نے پہلے جوتے چیک کیے۔ یہ اسے معمولی سے پڑے تھے۔ اس نے کہا۔ "کوئی بات نہیں میں موڑے ہیں لوں گی۔"

پھر اس نے واش روم میں جا کر چست ٹراؤزر اور لی شرٹ پہنی اور چھینٹی ہوئی باہر آئی۔ میں جتنا تو وہ شرما گئی۔ "دلہیات نگہ دہی ہوں اس میں۔"

"مجبوری ہے تمہارے میاں جی کا حکم ہے۔" میں نے سوہاگل کو چارج پر لگاتے ہوئے کہا۔ "وہ پھر میں ام لے کر کریں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ فل ڈریس ریسول ہوگی رات کے اصل آرامے کے لیے۔" میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔ ہوشیار نگہ لاؤنج میں تھا اور سوہیت سے کچھ کہہ رہا تھا مجھے دیکھ کر پیک دم چپ ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

"ان کو چیک کیا؟"

"نہیں۔"

"آؤ دیکھ لیں۔" میں نے کہا اور ہم کوٹھری تک آئے۔ ہوشیار نے تالا کھولا۔ وہ تینوں ہوش میں تھے مگر ان کی صورتیں گھڑی ہوئی تھیں۔ نگہیت نے بھائی کو دیکھتے ہی وہی راگ الاپنا شروع کر دیا جس میں دھمکیاں بھی تھیں اور انتہائیں بھی۔ درحقیقت وہ تینوں ہی خوفزدہ تھے۔ وہ جو کر کے آئے تھے انہیں اندازہ تھا کہ اب تک ہم واقف ہو چکے ہوں گے۔ میں نے کہا۔ "پولیس تمہیں پاگوں کی طرح تلاش کر رہی ہے۔ چار کل اور ساڑھے تین کروڑ کی ڈکیتی معمولی بات نہیں ہوتی ہے۔"

کی۔ "میری نسبت خراب نہیں ہے میں صرف بوجھ ہوں۔"

"تم ابھی کھانے کے بعد نکلتا اور دیکھ کر آ جانا۔ اس کے بعد ہم لیٹ کر رہیں گے۔"

سویت نے وال چادل بنائے تھے جس کے ساتھ چٹنیاں اور اچار تھا۔ ایک ڈبے میں سب لابل کران تھیں کو پیچھا دیا گیا اور پھر ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہوشیار اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں سادی کو لے کر کمرے میں آ گیا۔ اگرچہ سویت اس سے گپ شپ کرنا چاہتی تھی۔ ہم دونوں نے کپڑے بدلے اور سیاہ ٹراؤزر اور فل آستین کی ٹی شرٹ میں آ گئے۔ جوتے ڈھک براؤن کمر کے تھے اور تاریکی میں یہ سیاہ ہی نظر آتے۔ میں جوتے پہاں لایا تھا انکس سر پر چڑھا کر دیکھا۔ یہ گردن تک آ رہی تھیں۔ پھر ان میں آنکھوں والی جگہ ہلڈ سے کاٹ کر سوراخ کیے اور آخر میں کمرے میں تاریکی کر کے نائٹ وچن لگا کر ایک دوسرے کا معائنہ کیا۔ چست سیاہ لباس اور سرتاپا سیاہ ہونے کی وجہ سے رات کی تاریکی میں نظر آنے کا امکان کم تھا اور آج رات بھی بادل ہوتے تو کام اور آسان ہو جاتا۔ سادی نے جوتوں میں مونے پہن کر دیکھے اور وہ مطمئن تھی اب جوتے اسے لٹ تھے۔

ریپرسل سے فارغ ہو کر وہ باہر چلی گئی اور میں لیٹ کر آرام کرنے لگا مجھے ہوشیار کی واپسی کا انتظار تھا۔ وہ چار بجے واپس آیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں باہر نکلا تو وہ نہاد ہو کر تازہ دم ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس علاقے میں پولیس معمول کے مطابق ہے۔ "ہم آرام سے انکس دھڑک چھوڑ کر آ سکتے ہیں۔"

"گنڈ ب ہم تاریکی چھاتے ہی روانہ ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"میں انکس شراب دے آتا ہوں۔"

"صرف دے کر نہیں آئی ہے انکس پہلے کی طرح پلائی ہے۔ ورنہ وہ اپنے کا دھوکا بھی دے سکتے ہیں۔"

"سب تم بھی چلو۔"

ہم کوٹھری تک آئے۔ اس بار بھی ہوشیار دھکی شراب کی بوتل لایا تھا اور انکس اس بار بھی چٹا چڑی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹھن ہو گئے تھے۔ ہوشیار ان کی گاڑی ملانے چلا گیا۔ میں اندر آیا۔ مجھے لب و لہجہ کی کال کا انتظار تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ چوبیس بجے اس کی کال نہیں آئی تو میں اسے

کال کروں گا۔ مگر پونے چھ بجے ہی اس کی کال آ گئی۔ اس نے کہا۔ "گوگل میپ پر یہ علاقہ نکالیں۔"

میں نے لیپ آن کر کے اس پر گوگل میپ پر سرحدی علاقہ نکالا اور دیکھ کر کہہ دیا۔ "لال لیا۔"

"اس میں فیروز پور دھوکا پر دیکھیں۔ وہاں کر اس کرنے کے لیے ایک پل ہے۔"

"بالکل ہے۔"

"یہاں دریا اڑیا کی حد میں ہے لیکن اس سے نیچے چند سو گز کے بعد یہ گھوم کر پاکستان کی حد میں چلا جاتا ہے۔"

"ٹھیک۔"

"آپ نے اسی جگہ آنا ہے۔ یہاں سے کراسنگ کرتے ہی آپ ٹھیک میں آ جائیں گے اور اڑیا کی طرف سے محفوظ ہو جائیں گے۔"

"رضمنائی کیسے ہوگی؟"

"آپ نائٹ وچن استعمال کریں گے اور ہماری طرف سے ایک انفرادی تاریخ آپ کو گائیڈ کرے گی۔ لیکن خیال رہے یہاں اڑیا نے کسی زمانے میں بارودی سرنگیں بچھا دی تھیں اور آپ نائٹ وچن سے زمین دیکھ کر آئیں گے۔ جہاں بارودی سرنگ ہوگی وہاں سپاٹ سا نظر آئے گا۔"

میں مگر متد ہو گیا۔ "یہ خطرناک چیز ہے۔"

"اس لیے میں نے نائٹ وچن کا کہا ہے۔ سمجھ لیں صرف ایک لیٹر دھڑک رہا جائے گا۔ آپ موہاں سے راپلے میں ہوں گے اور آپ کو گائیڈ کیا جائے گا۔"

"تم لوگ علاقے کی گرائی کر رہے ہو گے؟"

"بالکل۔ کسی کی آمد سے ہم پہلے ہی خبردار ہو جائیں گے۔"

"وقت کیا ہوگا؟"

"رات بارہ کے بعد۔ آپ اشارہ ملنے پر روانہ ہوں گے لیکن بارہ بج بالکل تیار رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور دیکھنے کی کال کاٹ دی۔

موہاں چارج ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا پیٹ فری آزما کر دیکھا وہ بہترین کام کر رہا تھا۔ میں نے سم اس میں غلطی کر دی۔ سویت نے آج بھی چائے پر اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر ہم نے خواتین کو اندر بھیج دیا اور جیسے ہی تاریکی ہوئی ہادی ہادی ان تینوں کو لا کر کار

"مکمل سے بھاگنا ہے۔"
"تو بھاگ بھی لوں گی۔"

ہم ساڑھے بارہ بجے سرحد کے پاس تھے۔ یہاں
ایچ این سائیڈ پر انہوں نے ایک چمکنے والی ٹیلی فون بٹارنگی
تھی تاکہ مقامی لوگ سرحد سے ہوشیار رہیں اور فلسطی سے
بھی پار نہ جائیں۔ ہم حسین والا ہاؤس پر دوڑ کر اس کر کے
یہاں تک آئے تھے۔ علاقہ صاف اور خالی تھا۔ یہاں نہ
تو آبادی تھی اور نہ کھیت تھے۔ اس پاس کوئی نہیں تھا۔
میں نے وسم کو کس کال دی اور اس نے مجھے کال کر
لی۔ "ہم پہنچ گئے ہیں۔"

"رائٹ آپ دونوں نظر میں ہیں۔ کس کال کے اس
طرف آئیں اور دریا کے کنارے تک بہت احتیاط سے
زمین چیک کر کے چلیں۔ سادی آپ کے پیچھے مدد یا پار
دیکھیں مددنی نظر آ رہی ہے۔"

دریا پار سرخ روشنی ہمارے جل بھڑھ رہی تھی۔ "ہاں نظر
آ رہی ہے۔" میں نے کہا اور سادی کو ہدایت کی۔ "تم ٹھیک
میرے نقش قدم پر چلو۔ اس قدم سے دس قدم پیچھے چلو گی۔"
"وہ کیوں؟" اس نے تشریح سے پوچھا۔

"یہاں ہارمونی سرگرم ہیں۔ زمین کو غور سے دیکھتی
رہنا کوئی سپاٹ الگ سے دکھائی دے تو سمجھ لیں یہ ہارمونی
سریک ہے۔"

سادی نے سر ہلایا۔ میں جھکے جھکے آگے بڑھا۔ وسم
نے کہا۔ "سوگڑ کا گھڑا خطرناک ہے وہاں میں اتر کر بائیں
طرف مڑ جائے گا پانی ہے لیکن زیادہ گہرا ہے۔"

اس طرح جھکے جھکے چلتا آسان نہیں تھا میں نظر بھا کر
زمین بھی دیکھ رہا تھا۔ اپنے اس پاس کی گہرائی میں نے وسم
کے سپرد کر دی تھی جو یقیناً سرحد پار سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے
جیسے دریا کی ڈھلان پاس آ رہی تھی میرے دل کی رفتار بڑھ
رہی تھی۔ سادی ٹھیک میرے پیچھے تھی اور اس کے لیے اس
طرح جھک کر چلنا زیادہ مشکل کام تھا۔ بالآخر ہم دریا کی
اٹلان تک پہنچ گئے۔ وسم نے تصدیق کی۔ "آپ ڈھلان
پر ہیں۔"

میں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ ہم نے کسی دشواری
کے بغیر ایک طرف سے سرحد پار کر لی تھی۔ اسی لمحے میرا پاؤں
کسی چیز پر گیا اور کلک کی آواز آئی تھی۔ میرا تیز رفتار سے
دھڑکنے لگا دل غم گیا۔

(جاری ہے)

کی پگھلی لشت پر ڈھیر کر کے ان پر چادر ڈال دی تھی۔
اسٹو اور دم والے بیگ ڈکی میں رکھے۔ میرے مشورے
پر ہوشیار نے گاڑی کی این تمام جگہوں کو صاف کر دیا تھا
جہاں اس کی انگلیوں کے نشانات ہو سکتے تھے۔ اس نے
اس گاڑی کی ڈرائیونگ سنبھالی اور میں ہوشیار کی جیب
میں اس کے پیچھے تھا۔ یہ سب کرتے ہوئے میرے دل
میں فحش تھا کہ کہیں کسی چکر میں نہ پھنس جاؤں اور ہمدانی
ردائی کشتی میں پڑ جائے۔ اُن ہوشیار میرے اس پاس
تھی اور ہمتی تھیں۔

مگر سب آسانی سے ہو گیا۔ ان تینوں کو گاڑی
سمیت لہریانہ سے کوئی چالیس کلومیٹر پہلے سڑک کے
ساتھ چھوڑا۔ ان پر سے چادر ہٹا دی تھی اور سنگیت کو اٹھا
کر ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔ دہلی شراب کی خالی
بومل گاڑی میں ڈال دی اور اس کے دونوں پہلے
دروازے کھلے چھوڑ دیے تھے۔ اُمید تھی کہ پولیس جلد یا
بدیر ان تک پہنچ جائے گی۔ ہم نو بجے تک واپس پہنچ گئے
تھے۔ ہوشیار کسی قدر فکر مند مگر مطمئن بھی تھا میں نے اسے
تسلوی دی کہ پولیس ڈاکوؤں کی بجائے اس پر توجہ نہیں دے گی
جب کہ اسے لوٹ کا مال بھی مل جائے گا۔ ان تینوں کی
بچت کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پچاسی سے فٹ گئے جب بھی
سادی مر جیل میں گزرے گی۔ لہذا اسے کوئی خطرہ نہیں
تھا۔ رات کا کھانا دم سے اور ہٹا کھایا تھا۔ پھر حکن اور
خینکا کا بھانہ کر کے کمرے میں آ گئے۔ خود ہوشیار بھی تھکا ہوا
تھا۔ وہ سوویت سمیت اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔

رات دس بجے تک ایک بار پھر پادل آگئے مگر آج
مگر ج چمک نہیں ہو رہی تھی۔ یہ ابھی بات تھی ورنہ اس میں
ٹائٹ وچن کا استعمال بہت مشکل ہو جاتا۔ گیارہ بجے ہم
تیار ہونے لگے اور بارہ بجے تک ہم بالکل تیار تھے۔ بارہ بج
کر پانچ منٹ پر وسم کی کال آئی۔

"نکل جائیں اور پوائنٹ پر پہنچ کر مجھے اشارہ دیجئے
گاہیں کال کروں گا۔"

"چلو۔" میں نے سادی سے کہا اور ہم خاموشی سے
مکان سے نکل آئے۔ جتنی جگہ سے نکلنے کی بجائے ہم گھوم
کر کھیتوں والی طرف آئے۔ ٹائٹ وچن کی وجہ سے سب
صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہمیں چار کلومیٹر تک پیدل چلنا
تھا۔ مجھے سادی کی فکر تھی مگر اس نے کہا۔ "میں چل لوں گی۔
وہ بچے بھی چلتا ہے نہ بھاگتا تو نہیں ہے۔"



(آفاق حیدر آباد کا جواب)

سرسن امتیاز..... حیدر آباد

حید کے دن اداس ہے گھر میں
ایک یہ غریب دولت ہے
اس کا بچہ یہ بچہ بیٹھا تھا
حید بگلوں ہی میں کیوں ہوتی ہے
(ذیشان احمدی لواب شاہ کا جواب)

ماورغ..... نقیر کا حیدر آباد

نشان منزل جانان لے لے نہ لے
حرے کی جڑ ہے یہ دولت جتو اپنا
(عارف ممتاز سہانوالی کا جواب)

حکیم سید محمد رضا شاہ..... دوکڑی سولہ

موت کی آخری ہنگی کو ذرا فور سے سن
زندگی بھر کا خلاصہ اسی آواز میں ہے
(امجد حبیب رولپٹھی کا جواب)

نذیر حسن عابدی..... لاہور

یہ داس کیوں یہ تھنائے خود کشی کیسی
تو یہ رنج ہے قلب حمام کی ہرزگی
تو یہ رنج دین..... جہنم

یہ حادثہ سر ساحل دلا گیا سب کو
ہنود میں ڈوبنے والوں کے ہاتھ بھی ہیں
اتحاد حسین..... ایبٹ آباد

یہ سوچ کر بگلوں میں چھپا لیتا ہوں آئندہ
مگر کہ یہ میری آنکھوں سے بے گھر نہ ہو جائیں
نثار سہابی..... کراچی

یہ زندگی تو کسی اور کی بٹھی ہوئی امت ہے
ہم تو صرف سانسوں کی رسم ادا کرتے ہیں
(احمد لاہور کا جواب)

مظفر علی خان..... لاہور

الجھا ہے پاؤں یار کا دلف دلاہ میں
لو آپ اپنے دام میں سیار آگیا

ماہنامہ سرگزشت

(باسم عشاق لاہور کا جواب)

ایم الغزل کمرل..... ننگرانہ صاحب

تیری تلاش میں میرا وجود بھی نہ رہا
مٹا مٹی میری ہستی کو تمہاری آرزو
(عزیز الدین لاڑکانہ کا جواب)

منیر الحسن..... چنیوٹ

ان کا جنگ تھا ان کا قانون تھا
جس طرح می میں آگیا بدلے رہے
حسین احسان..... فیصل آباد

آکسی خوف میں اتریں کسی فلم کو اور جیس
کسی اجڑے اوئے لے میں سہائیں خود کو
امتیاز احمد..... کوٹ سہیل

اس عمر میں خوش فہمیاں ابھی نہیں ہوتیں
اس عمر کو بعدوں کے حوالے نہیں کرنا
کاشی شرف..... مصروف حیدری

اپنے حالات سے میں سلج تو کر لوں لیکن
مجھ میں روپوش جو اک شخص ہے مر جائے گا
(نورین اصغر دہاڑی کا جواب)

ہدین اختر..... حاصل پور

یہ اور بات کہ دل کی اجازت ہستی میں
تیرا خیال گل تر دکھائی دیتا ہے
نصیب خان..... کوٹہ

یہ تیر ہی تو ہے اپنی زمین کا ہم کہیں
قبر میں ہوتا کہیں ہے اگر شر کوئی
انیس الرحمن..... کوٹہ ادو

یہ شہر جہاں ہم ہیں یہاں کون ہے اپنا
یہ بات ہی کیا کم ہے یہاں بیت گیا دن
حسین الدین..... خان پور

یوں تو چہرے ہزار تھے لیکن
ایک چہرے کو آگیا رکنا
(احمد ریاض لاہور کا جواب)

اگست 2014ء

203

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

گزر..... چار
زمک جب اسی مشکل سے گزر گئی غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
(محمد زین الدین کا جواب)

انجم سہیل..... لاڈکانہ
ان کے سروں پہ کاش سلامت رہیں سدا
ملت کی ٹپوں کی رداؤں کی خیر ہو
نماز کھوکھر..... شہنورد

اس کے قریب جاؤں
اس تک نہ پہنچ جاؤں
نظام الدین..... لاہور

آہیں جو آنکھ میں صورت دل وہاں بن گئی
جو کہ اچھا ہمیں وہ عمر بھر اچھا لگا
دریاب خان..... کراچی

ایسے جیون میں نہیں اپنے تصور میں سی
آئے جانے کی اجازت ہی مجھے دے جانا
(میر تقی میر کا جواب)

ادب خان..... جنگ صدر
قتل حسین روز کا معمول بن گیا
دنیا میں آج بھی ہے حکومت بڑے کی
(حسین علی ملتان کا جواب)

مرزا ہادی بیگ..... حیدرآباد
وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دعا کرے وہ کسی سے تو شرم آنے مجھے
(اکرم علی بنو میر پور خاص کا جواب)

کلیل الرحمن..... کھانہ
حیرے لہجے کی محکم میں حیرا دل شامل ہے
ایسا لگتا ہے جہاں کی گزری آگئی دوست
(راء حبیب الرحمن لاہور کا جواب)

اسامیل رند..... مظفر گڑھ
یہ بھی کیا امن کا معیار بنا رکھا ہے
شاخ رخن کو گلوہ بنا رکھا ہے
مدلی بیگ..... ملتان

یادوں کے کاغذ پر گھسوں انکسوں سے میں دل پر
شعر و ادب کی دنیا دہن کوئی سی دیکھی جہاں ہے

ماہنامہ سرگشت

احمد یار خان..... کراچی
یہ لوگ کراچی کے کیا ہیں دیوانے ہیں لہر زانے ہیں
کیا ہوش سے بیگانے ہیں سید سے ہیں ماہانے ہیں
(مرزا ہادی بیگ حیدرآباد کا جواب)

در باز خان..... کوئٹہ
وہی شب ہے جو کہ ظہر گئی
مرے بے ہر تجھے کیا خیر
قصیم بہنو..... لاڈکانہ

وہ جن کے ہوتے ہیں غور شدہ آسمانوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤں بڑا اندھیرا ہے
(نوشین مارل لعل آباد کا جواب)

فتی محمد عزیز..... لندن
ادا سمجھوں جا سمجھوں یا اظہار وفا سمجھوں
خیری ہر مسکراہٹ مجھ سے پہچانی نہیں چلتی
(فتی عزیز لندن کا جواب)

حسین حسین..... داد پٹری
ہنا طاب تھا بھی رونا طاب تھا
کی پوچھتے تو دوستو ہونا طاب تھا
نازیہ نوشین..... کوٹاہ

ہو کے دھرتی پہ عرش پر ہونا
ایک جنت ہے بے خیر ہونا
(نہت گل کا جواب)

طالب حسین ظہر..... ملتان
اک قیامت ہے کہ ہر شام گزر جاتی ہے
تو نے دیکھا نہیں نقش میری تمہائی کا
(نشی عزیز لندن کا جواب)

محمد عقیل چٹھہ..... حافظ آباد
وہ بحر جس سے لڑتا ہے شہتان وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اڑوں سے پیدا

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر طبع
ہوتا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال
کریں۔ اکثر کارنیں اس اصول کو نظر انداز کر رہے
ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس
اصول کو نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

اگست 2014ء

204

علمی آزمائش-105

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا مندرجہ انعامی مسئلہ

علمی آزمائش کے اس مفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، مسپینس ڈائجسٹ، جاموسمی ڈائجسٹ اور ماہنامہ ہاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک در سال ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک علمی سرگزشت" کے عنوان تلے مفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچئے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح پر دواک کیجئے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اگست 2014ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کا سوال

قرآن پاک میں نمر سوز کے قریب کے ایک مسند کا ذکر سورہ اعراف آیت 16-5-4-2 اقصیٰ 1-4 میں آیا ہے۔ اس وقت کے لوگوں کے لیے یہ نام حیرت انگیز تھا مگر آج سائنس کہتی ہے کہ نیا بھر کے مسند میں سب سے شہرا ہوا پانی ہیں اور اس وجہ سے اس کا نام بھی ہونا چاہیے تھا۔ قرآن پاک میں اس مسند کے جسے کو کس نام سے یاد کیا گیا ہے؟ اور دوسری نام ہے؟

علمی آزمائش 103 کا جواب

دریائے فرات کے مغربی کنارے واقع ایک مشہور شہر کونہ ہے جسے فارس کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ کے دور میں سپاہیوں نے آباد کیا تھا تا کہ فارس کے باقی اگر کبھی حملہ کریں تو انہیں روکا جائے۔ اس شہر کے قریب کبھی شہر بائیل ہوا کرتا تھا جو کھنڈر میں تبدیل ہو کر زمین بوس ہو چکا تھا۔ ابو العباس نے 750 ہجری میں اسے اپنا دار الخلافہ بنایا۔ اس دوران میں یہ شہر بہت اردو نقش تھا اور تجارتی و مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔ اس شہر کو علمی مرکز ہونے کا بھی فخر حاصل ہے کہ یہاں کی رسم الخط نے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ اس شہر کونہ کو کئی اور وجہ سے بھی شہرت حاصل ہے۔

انعام یافتگان

1۔ نسیم جوکیو، والدینہ 2۔ مذاہد شیرازی، مٹان 3۔ اقر علی، صوفائی، کراچی

4۔ کنول، حیدرآباد 5۔ بی بی شیریں خان، کوئٹہ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے عمران جوائی، محمد احمد (سلمان فارسی طبر)، سید عزیز الدین، علیہ نورین، فرید الدین بلوچ، نہال قیوم، شکیل انجم، اشرف سائیں، حمید اختر، قمر عباس، کوکب قادری، ڈاکٹر یحییٰ ظفر اسماعیل، رضوان احمد ہاشمی نصرت حسین۔ اسلام آباد سے فتح دین، ناصر اختر ناصر، ممتاز الدین فتح، عہاد انصاری، نسیم بٹ، نعمان شاہ، انور یوسف ذکی۔ مظفر گڑھ سے خاقان خان، جان محمد عباسی، زاہد سولگی، احمد توحید، ساجد انور، وجاہت مرزا، اسد علی، عبدال رؤف کھتری، دانش قریشی، عثمان عثمانی، منشا خان، میر جاوید میر، ظفر انجم، بلقیس عثمانی، سعید حیدر، انجم پرویز، اعتبار علی، رابعہ اختر، پرویز بھٹو، نعمان اشرف، ملک محمد اعجاز۔ لاہور سے امروہہ اسم ملک، مظفر علی خان، امروہہ اختر، ثاقب نسیم، محمد نجو، محمد احسن، نواز کبیر، عبدالخالق چوہان، چوہدری رب نواز، زینت جہاں، کائنات مرزا، توسیف ہارہوی، منبرین اختر، بشری خالق، نیاز چوہان، یاسمین لرحت۔ تونسہ شریف سے میاں جمال محمود، نعمان شہزاد۔ ملتان سے محمد یحییٰ چشتی، گل باز خان، خالد فریدی، ذکیہ حسین نصیر، جمال، رخسانہ یاسمین، فوزیہ اختر، الطاف گہر، حسن محمود۔ بہاولپور سے سید محمد شفیق (شاہد)، نواز علی، مہوش خان، جعفر افتخار۔ بہاولنگر سے صفراں نسیم، اطہر احمد لاشاری، افضل ایڈو، فرید عباسی، محمد ارشد ظفر حسین۔ حیدرآباد سے مرزا ہادی بیگ، انعام اللہ، مارو فتح، نسیم احتیاز انصاری، زہر یاب فرحان، اقرام ظہیر، موسیٰ خان، مشتاق احمد، نسیم قریشی، فصاحت اللہ، نورین اپاز۔ کوئٹہ سے عہد القادری، فتح الدین، نواز بلوچ، قمر الدین لاشاری، سید محمد رضا کاگی۔ میرپور خاص سے خودیز اختر (سیلاٹ ٹاؤن)۔ قنبر احمد، ندیم منصور، فتح الباری، عنایت اللہ، آغا مظہر، ڈیٹان قزلباش، مرزا اسحاق بیگ، مرزا ہادی بیگ۔ خطہ آدم سے انعام احسن، ناصر زید پوری، انصار حسین، احمد علی افتخار، فیصل آباد سے احتیاز حسن، قمری اسولکھ۔ میرپور آزاد کشمیر سے نیاز بھٹ، افتخار احمد، محمود نیاز، فتح الباری، محمد توقیر، ارشد حسین، نسیم اللہ بھٹی، ناصر حسین، خان محمد خان۔ قاسم خان، کبیر حسن، غلام حسین، ناز خان۔ ڈوب ویشین سے نئی چنگیزی، نصرت اللہ، محمد سائیں، وردانہ قمر، احباب خان۔ میرپور آزاد کشمیر سے محمد ہارون۔ خیرپور میرس سے سیدتی زیدی، گل لیاقت۔ سکھر سے ارشدولی محمد، بشری اصغر، مسکان علی، سلمان منگریو۔ شیخوپورہ سے چوہدری اللہ دتہ، کائنات علی، سفیر احمد، سید ساحل۔ گجرات سے نعمان سعید۔ جہلم سے محمد عوید، کمال اللہ خان، کاشف خان، وردہ جلول، سعید احمد۔ اسلام آباد سے انور یوسف ذکی، محمد ہارون، اسامہ حیدر، فیروز رحمانی۔ سوئی ڈیرہ کٹی سے خاقان احمد، عنایت کھر۔ کوٹ ادو سے طیب احمد، صالح احمد۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، ظفر اسماعیل، محمد یحییٰ نسیم احمد، محمد سعید اقبال، مصباح الرحمان۔ کوہاٹ کینٹ سے ڈاکٹر شہزادہ احمد علی، نیاز خان۔ ہاڑی سے منشی محمد مزید، منشی خورشید احمد کنول (لڈن) محمد اقبال راے (پور پوالہ)۔ ہاشمپور سے منصور احمد، مجاہد علی، زینت جھکیو۔ مظفر گڑھ رانا محمد سجاد (توہاں شہر) اور باب رضا، عبدالیہ احمد، طاہرہ یاسمین۔ جامشورو سے ملک جاوید محمد خان سرکانی (برہ ذکی)۔ ڈی جی خان سے سجاد احمد بے ایس، جمیل چیمبر، سعید یگل، شمس اصغر۔ ڈی آئی خان سے محمد اکبر، محمد بنار، ساجد علی، عابد علی، بدخشاں اکمل۔ دہانا ظفر اقبال، بلوچین قاطب، کلیم خان، عباس اختر، بھکر حسین، نصیر عباس، عسکرت اللہ۔ لیہ سے نصیر عباس، نصرت افروز، احمد خان، نسیم خان، نسیم اللہ، ار باز خان۔ نگار افروزہ اقبال حسن، نسیم آزاد، ڈیٹان حیدر، بہادر علی۔ بہاولنگر سے سبط حسن، قازی اختر، نسیم زہرہ، نیاز احمد، قطب الدین احمد۔ سرگودھا سے ظفر اقبال جاوید (سلوٹوالی) امرا سلطان، شائستہ سلطان۔ ساہیوال سے محمد افضل، مظہر حسین قادری، طاہر علی، انعام اللہ، سلیمین آقا۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، اشرف خان، وردہ خان۔ جنگ سے عطا المصطفیٰ، فہد علی، سعدان ربیع، کاظم علی سید۔ میانوالی سے ندا خالق (میںی شیل) حکیم سید محمد رضا شاہ (نورنگہ روکھڑی)۔ ٹنڈو جان محمد سے قمری اسولکھ۔ ملہ منگ سے خودیز حسین، فصاحت عثمان۔ ممالک غیر سے اشرف سلطان (بیڈ فورڈ الکیڈ) سلمان فردوس۔ غلیل صدیقی۔ زونی کشمیری (الحمین) ساجد علی پاکستانی (وام) امیر صادق، سلمان اشرف، کنیز زینب، اشرف زیدی (شارجہ) صہبہ وقار (لوکیو جاپان) سعادت علی خان (مہرگ) سلمان منگریو (ہولما) وکیل قریشی (اوہان)۔

آخری راستہ

محترمہ عذرا رسول!

السلام علیکم!

اسہد تو یہی ہے بغیریت ہوں گی۔ ہمارے ہاں برادری سسٹم رائج ہے اور اس سسٹم سے زیادہ مردوں کا غصہ، انا کا سوال۔ اس کا خمیازہ عورتوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ اگر ہوسکے تو میری اس روداد کو شائع کر دیں تاکہ لوگوں کو ہوش آئے کہ غصے کی وجہ سے کس طرح عورتوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

رباب

(حیدرآباد)

جاتے کیونکہ برسوں پہلے بابا کا خالو سے کسی بات پر جھگڑا ہوا اور آج تک ان کے درمیان بات چیت بند تھی۔ خالو بھی ہمارے ہاں نہیں آتے تھے اسی طرح ماسٹم بھی نہیں آئے تھے البتہ علیجا خالہ کے ساتھ دو بار آئی تھی اور میں تو امی کے ساتھ بہت بار خالہ کے ہاں جا چکی تھی۔ خالو کے ڈی اے میں آفیسر تھے۔ ان کی رہائش گلشن اقبال کے ایک خوبصورت علاقے میں تھی۔ یہاں درمیانے سائز کے بنگلے ہیں اور صاف ستھرا پوش علاقہ ہے۔ خالہ کا اپنا بنگلا ہے جو پارک کے سامنے ہے۔ یہاں بچے کھتے اور مہذب لوگ رہتے ہیں۔ جب بھی ہم یہاں آتے تو عام طور سے رات کو ٹھیکے اور ہوا کھانے کے لیے پارک چلے جاتے تھے۔

میں نے ایک بار امی سے پوچھا کہ بابا اور خالو میں کیا اختلاف ہے؟ امی نے بتایا کہ ظلمی بابا کی تھی۔ اصل میں بابا بہت فیصلے اور سخت طبیعت کے مالک ہیں۔ امی سے محبت کی شادی کی، اس کے باوجود بعض اوقات ان پر بھی خسر ہو جاتے ہیں اور ایسے میں جوش میں آئے بولتے جاتے ہیں۔ امی ان کی فطرت سمجھتی ہیں اس لیے خاموش رہتی ہیں۔ جب بابا کا خسر اتر جاتا ہے تو وہ امی کو مٹالیتے ہیں لیکن وہ سانی نہیں مانگتے۔ معافی مانگنا یا شرمندہ ہونا ان کی

جیسے ہی کوچ کراچی سے نکل، مجھ پر قوطیت چھانے لگی تھی۔ میرا دل سر جھما گیا تھا اور دل چاہ رہا تھا کہ ہمیں کوچ سے اتر جاؤں۔ شاید برابر میں امی نہ ہوتیں تو میں بھی کرلی مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہم کوچ سے حیدرآباد جا رہے تھے۔ جہاں ایک متوسط علاقے میں ہماری رہائش ہے۔ گھر میں میرے علاوہ امی بابا اور میرے دو بڑے بھائی ہوتے ہیں۔ میں اور امی کراچی میں خالہ کے گھر آئے ہوئے تھے۔ حیدرآباد سے بابا نے ہمیں کوچ میں بٹھا دیا اور یہاں کراچی میں میرے خالو بس اڑے پر موجود تھے۔ ہمیں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ میں اس سے پہلے بھی کئی بار کراچی آ چکی تھی لیکن اس بار کا مزہ ہی الگ تھا۔ خالہ کے دو بچے ہیں۔ بڑے ماسٹم ہیں جو چار سال سے آسٹریلیا میں ہوتے ہیں، وہ وہاں پڑھ رہے ہیں اور ان کو وہاں کی شہریت بھی مل گئی ہے۔ ان سے چھوٹی علیجا میرے برابر ہی ہے۔ ہم دونوں نے اتفاق سے اسی سال گریجویٹن کے پیر زوئے تھے۔

میں قاریغ تھی اس لیے امی کے ساتھ کراچی آ گئی۔ امی کو اپنی بہن سے بہت محبت ہے اور وہ سال میں تین چار بار لازمی ان سے ملنے آتی ہیں۔ خالہ بہت سالوں بعد ہمارے ہاں آئی ہیں۔ بابا اور بھائی خالہ کے گھر بالکل نہیں

اور تک نظری تھی۔ آپس میں لڑائی جھگڑے تھے اور عورت کی بکائی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی، اسے تعلیم اور پسند کی شادی کا حق نہیں تھا۔ خاص طور سے پسند کی شادی کا حق تو بالکل نہیں تھا۔ اگر کوئی لڑکی یہ حق استعمال کرنا چاہتی تو اسے دلہن کے سرخ جوڑے کی بجائے سفید کفن نصیب ہوتا تھا۔ ہمارے ساتھ رہنے والے ایسا سوچ رکھتے تھے تو ان لوگوں کے بارے میں سوچیں جو اندرون صوبہ آباد تھے۔ یہاں بھی لڑکیوں کو پڑھانے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ دس میں سے ایک ہی لڑکی اسکول جاتی تھی اور کالج جانا تو بہت ہی بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ لیکن ابھی کہ جب میں اسکول کے بعد کالج جانے لگی تو اس پر بہت باتیں ہوئی تھیں۔ بابا تو ایک بار فیصلہ کر کے خاموش ہو گئے تھے مگر بھائی مٹھے والوں کی باتوں پر مسلسل ہو جاتے اور بابا اسی سے کہتے کہ مجھے کالج سے نکال کر گھر

سرشت میں نہیں ہے۔ اصل میں بابا کا تعلق اندرون صوبہ کے ایک قبائلی علاقے سے ہے۔ وہاں کے رسم و رواج اور خاص طور سے عورتوں کے حالات اتنے سخت ہیں کہ میں نے سن کر ہلکا سا شکر ادا کیا کہ ہم حیدر آباد میں رہتے ہیں۔ اگرچہ یہاں بھی میرا دم گھٹتا تھا مگر ہم یہاں باہر تو نکل سکتے تھے۔ میں نے بابا کے نہ چاہنے کے باوجود کالج سے گریجویشن کیا تھا۔ اس کی اجازت مجھے امی نے دلجوئی اور نہ بابا اور ان سے بھی زیادہ بھائی تو اس کے بالکل حق میں نہیں تھے۔ ایک بار وہ خالو کے سامنے امی کو سنا رہے تھے اور خالو نے درمیان میں مداخلت کر دی اور بابا اس پر ان سے لڑ پڑے۔

میرے دونوں بڑے بھائی انور اور منور پڑھے لکھے ہیں۔ انہوں نے بھی گریجویشن کیا ہے مگر ان کی ذہنیت بابا سے بھی زیادہ قبائلی ہے۔ بابا تو سترہ سال کے تھے جب کراچی آئے اور انہوں نے وہاں کالج میں تعلیم حاصل کی۔ پھر جاب کرنے لگے تھے۔ وہیں امی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں میں پسندیدگی ہوئی اور بابا نے امی کے والدین سے رشتے کی بات کی۔ انہوں نے صاف قیاد کیا تھا کہ ان میں ذات برادری سے باہر رشتہ نہیں ہوتا ہے اس لیے ان کی طرف سے کوئی نہیں آئے گا۔ اگر وہ اکیلے نہیں رشتہ دینا چاہیں تو یہ شادی ممکن ہے۔ امی کے والدین نے امی کی پسند و بھیجی اور انہوں نے بابا کو ہاں کر دی۔ بابا سادگی سے برأت لے کر آئے اور امی کو بیاد کر لے گئے۔ دو سال بعد وہ حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں انہوں نے آگل شاپ کا کاروبار کر لیا تھا۔ چند سال میں کاروبار جم گیا۔ بابا چاہتے تو حیدر آباد کے کسی اچھے علاقے میں مکان لے سکتے تھے مگر اس جگہ ہماری برادری کے لوگ آباد تھے اس لیے بابا نے سبک دہنے کا فیصلہ کیا۔ حیدر آباد کے اس محلے میں آنے کے بعد امی کو صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ بابا کی برادری کس قسم کی ہے۔ وہ آج کے جدید دور میں بھی وہی قبائلی سوچ رکھتے تھے۔ جہالت



سے ڈرتے تھے اور جب بابا کو طعنا آتا تو وہ گھر سے نکھک جاتے۔

گھر میں اور ائی کہاں جاتیں؟ ہم گھر میں ہوتے تھے اور بابا کا سارا طعنا ہم پر اترتا تھا۔ ہم خاموشی سے سننے پر مجبور تھے۔ امی کا قسط کیونکہ برادری سے نہیں تھا اس لیے بابا کا خاندان تو ایک طرف رہا برادری کی عورتیں بھی امی سے بہت کم ملتی تھیں۔ بچوں سالوں میں چند ایک گھروں میں ہی امی کا آنا جانا ہوا تھا اور وہاں بھی وہ کئی دنوں میں ایک آدھ بار جاتی تھیں۔ اسی طرح یہ عورتیں بھی بہت کم ہمارے ہاں آتی تھیں۔ جب میں چھوٹی تھی تب میری چند ایک سہیلیاں تھیں۔ لیکن جب دس سال کی ہوئی تو میرے بلاوجہ گھر سے جانے پر پابندی لگا دی گئی۔

دس سال کی عمر کے بعد میں با تو اسکول جاتی تھی یا پھر امی اور بابا کے ساتھ کھینٹا تھی۔ خاص طور سے محلے میں امی کے ساتھ ہی آتی جاتی تھی اور تب ہی مجھے اپنی عمر کی لڑکیوں سے نئے کا موقع ملتا تھا۔ مگر جیسے جیسے میں آگے بڑھتی گئی تو میں لڑکیوں سے میرا ذہن بٹنے لگا۔ ان میں سے کوئی بھی تعلیم یافتہ نہیں تھی صرف ایک لڑکی نے چار جماعت تک پڑھا تھا اور اس کے بعد اسے گھر بٹھا لیا گیا تھا۔ وہ بھی خوش تھی کیونکہ پڑھنا اسے پسند ہی نہیں تھا۔ مجھے پڑھنا پسند تھا۔ صرف نسائی تعلیم ہی نہیں بلکہ میں اس کے علاوہ بھی پڑھنا چاہتی تھی مگر ہمارے گھر میں ایسی کسی چیز کی سختی سے ممانعت تھی۔ حد یہ کہ بابا بچوں کے رسائل کے قائل بھی نہیں تھے۔ اس لیے میں اپنا شوق اسکول میں پورا کر لیتی تھی۔ وہاں لڑکیوں کے پاس رسائل اور کتب ہوتی تھیں۔ آدمی چھٹی میں جب دوسری لڑکیاں کھانے پینے اور کھیلنے یا گیموں میں مصروف ہوتی تھیں تو میں کلاس میں بیٹھی کوئی نہ کوئی رسالہ یا کتاب پڑھ رہی ہوتی تھی۔

پڑھنے میں تیز تھی، میں نے صرف ساڑھے چودہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان دیا اور جب میرا رزلٹ آیا تو میں اس وقت چودہ کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے امتحان میں اتنی بڑی کامیابی حاصل کی جس کی مجھے بھی اُمید نہیں تھی۔ میں نے حیدرآباد بورڈ میں ساتویں اور لڑکیوں میں چوتھی پوزیشن لی تھی۔ اس پر میرے اسکول والوں نے ایک خصوصی تقریب منعقد کی تھی اور اس میں ایک صوبائی وزیر کو بھی بلا یا تھا۔ بابا صرف وزیر کا سن کر چلے گئے ورنہ ان کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وزیر نے مجھے انعام اور شیلڈ کے

بخا نہیں۔

جب میں چھوٹی تھی تب بھی ہمارے گھر کا ماحول گھٹا ہوا اور خانوش سا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے ایسا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بابا مجھ سے محبت کرتے تھے مگر جیسے باپ بیٹیوں کے لاڈ اٹھاتے ہیں ایسا انہوں نے بھی نہیں کیا تھا۔ ہماری برادری میں بیٹیوں سے تقریباً سب ہی ایسا برتاؤ کرتے تھے بلکہ بہت برا سلوک کیا جاتا تھا۔ اس لیے مجھے پتا بھی نہیں تھا لیکن جب میں چھ سال کی تھی تب پہلی بار امی کے ساتھ خالہ کے گھر گئی تھی۔ اس سے پہلے بابا مجھے بھی جانے نہیں دیتے تھے۔ امی کو بھی بڑی مشکل سے اجازت ملتی تھی۔ خالو سے جھگڑا میری پیدائش کے بعد ہی ہو گیا تھا اس لیے میں نے زندگی میں پہلی بار خالہ، خالو اور ان کے بچوں کو دیکھا تھا۔ چھوٹی ہونے کے باوجود میں نے کچھ دیر میں جان لیا تھا کہ ان کے گھر کا ماحول ہمارے گھر سے بالکل مختلف ہے۔ یہ ماحول کھلا، روشن اور محبت سے بھرپور تھا۔ ہمارے ہاں جب بابا گھر آتے تو ہم بہن بھائی کسی قدر سہم جاتے اور باادب ہو جاتے۔ بابا کے ہوتے ہوئے کوئی ادنیٰ آواز میں نہ تو بات کرتا تھا اور نہ ہی ہنستا بولتا تھا۔ بھائی بھی بچپن سے بابا کے رنگ میں دگتے ہوئے تھے۔

اس کے برعکس جب خالو گھر آتے تو ان کے بچے کھل جاتے تھے۔ صائم اور علیا دو ڈکر خالو سے لپٹ جاتیں اور وہ ان کو پیار کرتے اور لانا کے بارے میں پوچھتے تھے۔ خالہ اور خالو کی شادی اور بچ تھی اس کے باوجود ان میں جو محبت اور آپس کا قسط تھا وہ میں نے امی ابو میں بھی محسوس نہیں کیا حالانکہ ان کی تو محبت کی شادی تھی۔ صائم اور علیا خالو کی طیر موجودگی میں جتنے شوق ہوتے تھے ان کے آنے کے بعد تو اس نیکی زیادہ شوقی اور شور شرابے پر اتر آتے تھے۔ خالو پر امانت نے یا انہیں ڈانٹنے کی بجائے ان کا ساتھ دیتے تھے۔ خالہ ان سے کہتیں کہ آپ بچوں کے ساتھ پیچھے بن جاتے ہیں اور میں حیرت سے سوچتی کہ کیا باپ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ اس وقت مجھے شدت سے اپنے گھر کے کھٹے اور پوچھل ماحول کا احساس ہوتا اور میں دل سے دعا کرتی کہ اللہ ہمارا گھر بھی ایسا ہی کر دے۔ مگر میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھر کا ماحول خراب سے خراب ہوتا چلا گیا۔ بابا پہلے سے زیادہ طعنا کرنے لگے تھے اور ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتے۔ بھائی جو مزاج میں ان کے قریب تھے ان کے لیے

ساتھ بہت شامی بھی دی اور ہا ہا سے کہا کہ وہ مجھے آگے بھی تعلیم دلائیں۔ اگرچہ بابا کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر اس وقت ان کے منہ سے نکل گیا۔ "کیوں نہیں سائیں اگر میری بیٹی آگے پڑھنا چاہے گی تو میں اسے ضرور پڑھاؤں گا۔"

میں نے نورانی نے بابا کے یہی الفاظ پکڑ لیے اور ان سے مطالبہ کیا کہ مجھے کالج میں داخل کرانیں۔ بابا انہیں مان رہے تھے اور بھائی تو بالکل بھی تیار نہیں تھے مگر امی نے نہ جانے کیسے بابا کو متا لیا۔ مگر جب میں کالج جانے لگی تو بابا اور بھائیوں نے مجھ سے کل کر کہا کہ اگر میں نے کہیں ان کی عزت کو ٹانگا لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ اچھا نہیں کیا ہوگا۔ ہماری برادری میں ایسی باتوں پر کل سے کم بات نہیں ہوتی تھی۔ اول تو اپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اگر لڑکی کسی کے ساتھ فرار ہو جائے تو اسے اور لڑکے کو تلاش کر کے ہاتھ جوڑے کی مدد سے سزا دی جاتی تھی۔ اگر لڑکا اور لڑکی ہاتھ نہیں آتے تھے تو ان کے گھر والوں کو سزا ہوتی تھی اور یہ سزا عام طور سے لڑکی کے بدلے لڑکی یا بھر بھاری مالیت کا جرمانہ ہوتا تھا۔ میں سن کر رہ گئی کیونکہ میری طرف سے کسی قسم کی یقین دہانی کی بابا اور بھائیوں کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔

جب میں نے انٹر کیا تب بھائیوں نے ایک بار پھر زور دیا کہ مجھے گھر بٹھا لیا جائے بلکہ میری شادی کر دی جائے۔ یہ مطالبہ سن کر میری جان ٹل گئی۔ کیونکہ مجھے برادری میں ہی رشتہ ملتا اور یہاں سب مرد ایک جیسے ہی تھے۔ میں بابا کے گھر سے نکل کر کسی ایسے ہی بابا اس سے بھی بدتر ماحول والے گھر میں جا سکتی تھی لیکن بھری کی امید نہیں تھی۔ میں نے رد و محو کر اور امی کے پیچھے پڑ کر بابا سے کسی نہ کسی طرح بی اے کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ بابا انہیں امی نے کیسے ان سے یہ بات منوائی مگر اس کے بعد بابا کا موڈ بہت دن تک خراب رہا تھا وہ مجھ سے بات کرتے ہی نہیں تھے اور امی سے کرتے تب بھی ان کا لہجہ سخت ہوتا تھا۔ بھائی مجھ سے بات کرنا تو ایک طرف، دو یکنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ یہاں لگ رہا تھا انہوں نے میری تعلیم کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ اگر وہ بابا پر ذرا بھی حاوی ہوتے تو لازمی مجھے گھر بٹھا دیتے۔

بہت دنوں بعد بابا کا موڈ ٹھیک ہوا تھا تب انہوں نے امی کو کراچی جانے کی اجازت دی مگر میرے لیے منع کر دیا۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ انہوں نے میرے لیے کیوں

منع کیا ہے۔ میں امی کے ساتھ جانا چاہتی تھی مگر اجازت نہ ملنے پر تڑپ کر رہ گئی۔ واپس آنے کے بعد امی نے ایک دن میرے پوچھنے پر چپکے سے بتایا کہ خالہ کی خواہش تھی کہ وہ مجھے صائم کے لیے لے جائیں۔ مگر جب امی نے ابو سے یہ بات کی تو وہ اسے لمبے لمبے محسوس کر ائی کوڑا لگا کہ کہیں طلاق نہ دے دیں۔ برادری سے ہا ہر شادی اگر مرد کے لیے گناہ صیغہ تھی تو عورت کے لیے گناہ کبیرہ تھی۔ گناہ تو اللہ معاف کر دیتا ہے لیکن اس کی تو معافی بھی نہیں تھی۔ پھر انہوں نے امی سے کہا کہ اب انہوں نے یہ بات دو بارہ کی تو ان کے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوگا اور اس کے بعد ہی ابو نے مجھے امی کے ساتھ خالہ کے گھر جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ان دنوں میں بی اے پاورٹ دن میں تھی۔ پھر جن دنوں میرے امتحان ہو رہے تھے خالہ کے گھر سے اطلاع آئی کہ صائم نے اپنے ساتھ آسٹریلیا میں پڑھنے والی ایک پاکستانی لڑکی کو پسند کر لیا ہے اور جلد خالہ اس کے گھر رشتہ لے کر چاہی ہیں۔

صائم ابھی خوش حال اور گورے رنگ کے تھے۔ قد طویل تھا شاید چوٹ سے ذرا زیادہ تھا۔ لیکن میرے خیال میں سب کا قد طویل ہی ہوتا ہے۔ خود میں بھی طویل تھی اور میرا قد پانچ فٹ سات انچ تھا۔ میں کی ہمارا ان سے ملی تھی مگر ہمیشہ داخل کزن ہی سمجھا تھا۔ وہ دو سال پہلے گریجویشن کے بعد آسٹریلیا چلے گئے تھے۔ جب امی نے بتایا کہ خالہ مجھے لینا چاہ رہی تھیں تب بھی میں نے کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ ہاں اس کا محسوس تھا کہ میں خالہ کے ہاں نہیں جا سکتی۔ مجھے ان کے گھر کا ماحول بہت پسند تھا۔ بہر حال جب صائم کی منگنی ہو گئی تب بابا کو اعتراض نہیں رہا اس لیے جب میں نے گریجویشن کے بعد روے لیے تب مجھے بھی امی کے ساتھ جانے کی اجازت مل گئی۔ علیحدگی قاری تھی اور ہم نے مل کر خوب انجوائے کیا۔ صائم باہر تھے لیکن اکڑوہ اسکاٹ پ پر گھر والوں سے رابطے میں رہتے تھے۔ بلکہ ان کا اسکاٹ پ ہر وقت آن رہتا تھا۔

صائم نے ایم فل مکمل کر لیا تھا اور اب بی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ ساتھ ہی جڑ وطنی جاب بھی کرتے تھے جس سے ان کو اتنی رقم مل جاتی کہ اپنا گزارہ ہو جاتا تھا۔ آسٹریلیا کی شہریت اتنی آسانی سے نہیں ملتی ہے لیکن صائم کو مل گئی تھی۔ ان سے بھی گپ شپ ہوتی تھی۔ موسم سرد تھا مگر خالہ اور خالو نے ہمیں ہر جگہ گھمایا پھر لایا۔ ہم ساحل سمندر پر بھی

دیا جائے گا۔ بابا نے تو اسی سے محبت کی شادی کی تھی اس کے باوجود وہ کس طرح رو رہی تھیں۔ میرے ساتھ نہ جانے کیا ہوگا۔ ان ہی سوچوں میں سڑکٹ گیا اور بس آگے پر منور ہو جاتا تھا۔ وہ گاڑی ساتھ لایا تھا۔ ہمارے ہاں دو گاڑیاں تھیں۔ ایک کمرشل بھی جو آئل سپلائی کرنے کے کام آتی تھی بابا اور بھائی عام طور سے اسے استعمال کرتے تھے۔ ایک کار بھی جو گھر کے کاموں اور آنے جانے کے لیے مخصوص تھی لیکن کبھی کبھی ضرورت ہوتی تو بابا اور بھائی دونوں گاڑیاں لے جاتے تھے۔

بابا اور انور کے مقابلے میں منور کا رویہ مجھ سے کہیں زیادہ سخت تھا۔ وہ نارمل بات بھی کرتا تو ایسا لگتا جیسے ڈانٹ رہا ہو۔ اس کی نظر میں ہر وقت ہوں مجھے شک سے کھوجتیں جیسے نہ جانے میں نے کیا جرم کر دیا ہے۔ خاص طور سے جب میں کالج سے آتی اور وہ گھر میں ہوتا تو پانچ دس منٹ دیر سے آنے پر بھی لاتعداد سوالات کرتا تھا۔ بعض اوقات تو اس کے سوالوں سے ذہن آکر میں رونے لگتی تھی مگر ہمارے گھر میں مردوں سے زبان چلانے یا جواب دینے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ منور فیسے کا بہت تیز تھا اور ای بھی اس سے ڈرتی تھیں وہ خود صرف بابا سے ڈرتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت بھی اس کا سوڈ خراب تھا۔ اس نے یہ شکل لی تو سلام کیا اور میرے سلام کا جواب دینے بغیر سامان کار کی ڈکی میں رکھنے لگا۔ راستے میں اسی نے پوچھا۔ "منور گھر میں سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" اس نے اگڑے لہجے میں کہا۔ مگر ای اور میں ٹھیک کئے تھے۔ کوئی مسئلہ تھا۔ ہم گھر پہنچے تو خلاف معمول بابا گھر پر تھے اور وہ فوراً ہی اسی کو اندر لے گئے۔ اس سے میرا تھا اور شکا کیونکہ ہمارے ہاں کسی بھی معاملے میں عورتوں کو شامل کرنے کا رواج نہیں تھا۔ انہیں صرف فیملے سنائے جاتے تھے۔ ایسی کیا بات تھی جو بابا اسی کو الگ لے گئے تھے۔ ایک گھنٹے بعد اسی کمرے سے نکلیں تو ان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ منور ہمیں گھر لاتے ہی باہر چلا گیا تھا۔ اسی سے بات کرنے کے کچھ دیر بعد بابا بھی چلے گئے۔ ان کے چلنے ہی میں اسی کے پاس آئی۔

"ای کیا ہوا ہے، بابا آپ سے کیا کہہ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں ہوا۔" اسی نے مجھے ہلکا سا ہاتھ میں لے کر سر ہونگی۔ اس گھر میں وہی ایک فرد تھیں جن پر میرا بس چلتا تھا اور میں ان سے خند بھی کر سکتی تھی۔ آخر میں نے ان

مجھے تھے۔ ایک صبحا کیسے گزرا اس کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ جب ہم وہاں جا رہے تھے تو میرا دل ہانک نہیں چاہ رہا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ کاش بابا مان جاتے اور میں آج خانہ کے گھر ہوتی۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ بابا کی برادری میں لڑکی باہر سے لائی جائے تو اسے پھر بھی مان لیا جاتا ہے، بے شک قبول نہ کیا جائے مگر لڑکی برادری سے باہر دینا کسی صورت قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے والوں کو برادری اور علاقے سے نکال دیا جاتا ہے۔ ان کو پھر کوئی لڑکی نہیں دینا اور نہ کوئی لین دین کیا جاتا ہے۔

انور بھائی مجھ سے بڑے تھے۔ وہ پورے پانچ برس بڑے تھے۔ اس لیے ایک سال پہلے بابا نے ان کی برادری میں شادی کر دی۔ میری ہونے والی بھائی اریشا کا ایک بھائی تھا۔ ارشد معمولی بچہ تھا لیکن انور مولر سیکولوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ اس کی حیدر آباد میں ہی دکان تھی۔ جن دنوں میں بے اسے فائل کے پیچہ زدے رہتی تھی میرے کانوں میں کچھ لٹکی باتیں پڑیں کہ شاید ارشد کے گھر والے مجھے مانگ رہے تھے۔ یعنی وٹے سے کا معاملہ تھا۔ مگر بابا اس کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک گھر میں آدمی ایک ہی رشتہ کرے تاکہ اگر ایک کا معاملہ خراب ہو تو دوسرے پر اس کا اثر نہ پڑے۔ اس سے مجھے اُسید ہوئی کہ یہ رشتہ نہیں ہوگا۔ ویسے بھی ارشد مجھے زہر لگتا تھا۔ فعل صورت کا مناسب تھا مگر اس کی آنکھوں میں جیجی کی گند تھی۔ وہ دو تین بار ہمارے ہاں آیا اور ہر بار سامنا ہونے پر اس نے جس طرح مجھ سے دیکھا تو مجھے ہانک اچھا نہیں لگا تھا۔

میں بس کی کڑکی کے ٹھٹھے سے سر ٹکائے بیٹھی تھی کہ اسی نے پوچھا۔ "رہا باب کیا سوچ رہی ہے؟"

"کچھ نہیں اسی۔" میں نے بے دلی سے کہا پھر پوچھا۔ "ای آپ اور بابا کراچی میں نہیں رہ سکتے تھے حیدر آباد میں میرا دم ٹھٹھا ہے۔"

ای کچھ دیر خاموش رہیں پھر سرد آہ بھر کر بولیں۔ "میری بیٹی بات شہر کی نہیں ہے، ہمارے گھر کی ہے، یہ گھر نہیں بھی ہوتا اس کا بھی ماحول ہوتا اور یونہی دم ٹھٹھا۔"

ای ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ بابا اور بھائیوں کے ساتھ ہم اگر امریکا یا یورپ کے کسی ملک میں رہتے تب بھی ہمارے گھر کا بھی ماحول ہوتا۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں نے خند کر کے گریجویشن کر لیا تھا مگر مجھے اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ امکان یہی تھا کہ مجھے کسی جاہل یا معمولی بڑے سے کھسے سے بیاہ

سے اگلا ہی لیا۔ امی نے انکشاف کیا۔
 ”منور... غیر برادری کی ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

یہ ہماری ثقافت برادری تھی اور ان سے تو صرف خون و کشت کا رشتہ تھا شادی بیاہ کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دوسری حیرت مجھے اس بات پر ہوئی تھی کہ منور جو اس بارے میں اتنا بولتا تھا اور برادری سے باہر شادی کو گناہ قرار دیتا تھا وہ خود نہ صرف برادری سے باہر شادی کرنا چاہ رہا تھا بلکہ لڑکی بھی اس نے مخالف برادری کی چنی تھی۔ اگر یہ بات کھل جاتی تو اس پر بہت بڑا فساد ہو جاتا۔ ہمارے وہاں برادریوں کی لڑائی میں ٹکڑا ہونا اور کر دینا معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔ میں بابا اور بھائیوں کے لیے پریشان ہوئی۔ اگر منور کوئی الٹا سیدھا کام کر جاتا تو رد میں بابا اور بھائی بھی آ جاتے۔ میں نے امی سے بھی یہی کہا تو وہ بولیں۔ ”مجھے بھی سبھی ڈر ہے۔ تو جانتی ہے منور کتنا اکڑ ہے۔“

”ہاں ویسے تو برادری کا راک الا پتا تھا اور اب خود برادری سے باہر شادی کا کہہ رہا ہے، کیا اسے نہیں معلوم کہ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ وہ لوگ بھی نہیں مانیں گے۔“
 ”ہات ان کے ماننے کی نہیں ہے۔“ امی نے رد ہانے لہجے میں کہا۔ ”منور پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے حیرے بابا سے کہا ہے کہ وہ لڑکی کو لے کر بھاگ جائے گا اور اس سے کدھت بھرج کر لے گا۔“

اس بار میں کچھ دہلی گئی۔ ”امی وہ اتنا خود غرض ہو گیا ہے اسے اپنے باپ بھائی کی بھی پروا نہیں ہے تو ہماری کیا ہوگی۔“

”میں نے کہا نا وہ پاگل ہو گیا ہے۔“

”بابا یا انور بھائی کچھ نہیں کر سکتے؟“

”انہوں نے سب کر کے دیکھ لیا ہے۔ اسے ہمارا کچھ ہے مگر وہ اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔ کہتا ہے مری جاؤں گا مگر شادی اسی سے کروں گا۔“

منور کا تو نہیں پتا تھا لیکن اگر وہ اس لڑکی کو لے کر بھاگ جاتا تو ہم گھر والوں کی مالیت خطرے میں پڑ جاتی۔ یہ ایسا خطرہ تھا جس کے بارے میں سب جانتے ہیں کیونکہ میں بچپن سے یہی دیکھتی اور سنتی آئی تھی۔ ایسی باتوں پر ٹکڑاؤ خون ہی ہوتے تھے۔ خود ہمارے محلے میں کئی ایسے واقعات پیش آچکے تھے۔ دو گھر چھوڑ کر ایک لڑکی حیدر آباد کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تو برادری والے اسے

اور لڑکے کو کراچی سے پکڑ کر لائے اور اپنے علاقے میں لے جا کر جڑے میں انہیں سزا سنا کر اسی وقت اس پر عمل درآمد بھی کرادیا۔ ان کو قتل کر کے ان کی لاشیں کسی غلیہ جگہ دفن کر دی گئی تھیں۔ میں نے سنا تھا کہ برادری کا ایک غلیہ قبرستان ہے جہاں ایسی ہی لاشوں کو دفن کیا جاتا ہے اور ان میں اکثریت عورتوں اور لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ مرد عام طور سے بھاگ جاتے ہیں یا بھاری جرمانے دے کر قتل جاتے ہیں مگر عورت کے حصے میں صرف موت آتی ہے۔ اگر سزائے موت سے بچنے کے لیے جرمانہ کیا جاتا ہے تو عورت کی طرف سے کوئی ادا کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور بالآخر اسے موت ہی نصیب ہوتی ہے۔

رات بابا اور انور آئے تو سب نے میٹنگ کی اور اس میں زندگی میں پہلی بار امی کو بھی شامل کیا گیا۔ منور نہیں آیا تھا۔ بھرپور بات کئے تک نہیں آیا تو بابا اور انور پریشان ہو کر اس کی تلاش میں نکل گئے۔ میں اور امی پریشانی کے ساتھ جاکتے رہے۔ بابا فجر کے قریب آئے تو ان کی پریشانی ان کے چہرے سے چمکی پڑ رہی تھی۔ میں امی کے ساتھ تھی مگر انہوں نے میرے سامنے ہی امی سے کہا۔ ”جیب بہت بڑا ہوا ہے، منور اس لڑکی کو لے کر کہیں بھاگ گیا ہے۔“

امی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”ہائے یہ اس نے کیا کیا؟“

بابا زندگی میں پہلی بار فکرت لگ رہے تھے۔ وہ چہرے جس میں اب دواڑ آگئی تھی۔ انہوں نے تھکے لہجے میں کہا۔ ”ہات اب تک کھلی نہیں ہے۔ انور اسے تلاش کر رہا ہے۔ اگر وہ مل گیا تو ہات اب بھی بند نہیں ہے لیکن وہ نہ ملتا۔“

اس کے آگے جو تھا اس سے ہم بھی اچھی طرح واقف تھے۔ لڑکی کے گھر والے شاید بے خبر تھے کہ ان کی لڑکی کس کے ساتھ بھاگی ہے ورنہ وہ اب تک ہمارے گھر پر دھوا بول چکے ہوتے۔ ایسے معاملات میں تاخیر نہیں کی جاتی تھی لیکن چند دن بعد خود واضح ہو جاتا جب منور بھی غائب ہوتا اور اس کے بعد جو ہوتا اس کا سوچ کر میری دماغ کا پیچہ لگی تھی۔ امی مدد ہی نہیں اور بابا کم مسم سے ٹھہر رہے تھے۔ انور کی گھنٹے بعد آیا اور اس نے آتے ہی بابا کو گئی میں سر ہلا کر قادیانہ کہہ دیا کام رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ منور لڑکی کو لے کر حیدر آباد سے ہی چلا گیا تھا کیونکہ اس کے ساتھ کار بھی قایم تھی۔ حیدر آباد جیسے چھوٹے شہر میں ان کا چھپنا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح انور دن صوبہ بھی وہ کہیں چھپتے تو یہ

رات کو پیاس گئے پر میں کمرے سے نکل اور نشست گاہ میں بیٹھے بابا اور انور کی گفتگو سن لی۔ انور کہہ رہا تھا۔ "بس ایک بار وہ ہاتھ آ جائیں۔"

"اس مسئلے کا بھی حل ہے۔" بابا نے کہا۔ "منور کو چپ کرادیں گے اور ٹوکی ایٹھ کے لیے قایم ہو جائے گی۔ اس کے گھر اور برادری والوں کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ وہ کہاں گئی۔"

"ایسی جگہ گاڑیں گے کہ پھر قیامت کے دن علی اٹھے گی۔" انور نے غصے سے کہا۔

میں دنگ رہ گئی تھی۔ وہ اس لڑکی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے جس کا جرم یہ تھا کہ وہ منور کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس طرح دیکھا جاتے تو منور بڑا مجرم تھا۔ پہل تو مرد کرتا ہے اور وہ آگے بڑھتا ہے۔ انور کو اپنے بھائی کی لگن اور اس کے لیے وہ ایک لڑکی کو قتل کرنے کو بھی تیار تھا۔ میں دیے قدموں واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب تک میری خواہش تھی کہ کاش منور اور وہ لڑکی مل جائیں۔ اگر چنانچہ کے ملنے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ مگر یہ جان کر کہ بابا اور انور نے مسئلہ حل کرنے کے لیے کیا سوچا ہے۔ اب میری خواہش تھی کہ وہ نہ ملیں۔ اس صورت میں بھی یہ راز کھل کر رہتا اور دونوں برادر ہوں میں کشیدگی آ جاتی۔ بابا اور انور خطرے میں پڑ جاتے کیونکہ وہ مرد تھے اور باہر جانا ان کی مجبوری تھی۔ وہ گھر نہیں بیٹھ سکتے تھے اور ان کو نشانہ بنانا آسان تھا۔

دو دن بعد بابا اور انور نے دکان پر علی لا دیا اور ایک جملی فون کال ریسیو کی جس میں بتایا گیا کہ منور کا کراچی میں ایک اسپتال ہو گیا ہے اور وہ زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ بابا اور انور مارکیٹ اور برادری میں یہ خبر پھیل کر خود کراچی روانہ ہو گئے۔ اللہ جانے وہ کہاں گئے تھے۔ بابا اور انور بعد آ گئے لیکن انور ایک ہفتے بعد آیا تھا۔ چپ کر بابا اور اس کی گفتگو سن تو پتا چلا کہ وہ کراچی میں ہی گئے تھے۔ انور ایک ہفتے تک وہاں ہوٹلوں میں منور اور لڑکی کو تلاش کرتا رہا تھا مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ منور کے چند ایک دوست اور واقف کار کراچی میں تھے۔ انہوں نے ان سے بھی رابطہ کیا مگر منور کہیں نہیں ملے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی بہت محفوظ جگہ تھا جہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ دوسری برادری والوں کو شک ہو گیا تھا اور بڑی خاموشی اور ہوشیاری سے منور اور لڑکی کے ساتھ ثبوت کی تلاش میں بھی تھے۔

انور کی کراچی واپسی سے چار دن بعد کی بات

بات زیادہ دیر چھپی نہیں رہتی۔ اگر وہ کراچی چلے جاتے تو ان کے بچنے کا امکان تھا۔ کچھ دیر بعد انور اور بابا بھی یہی بات کہہ رہے تھے کہ وہ کراچی چلے گئے ہیں۔ منور کا موہاں مسلسل بند چار ہاتھ بابا شام تک بار بار ٹرائی کرتے رہے مگر موہاں آن نہیں تھا۔

ہماری برادری میں گھر میں کھانے کو ہونا نہ ہو لیکن اسلئے ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی خاصا اسلئے تھا۔ بابا کے پاس ایک رائل اور ایک پستول کا لائسنس تھا۔ انور کے نام پر شاٹ گن اور منور کے نام پستول کا لائسنس تھا۔ اس کا پستول بھی اس کے ساتھ ہی قایم تھا۔ مگر ہمارے ہاں لائسنس سے ہٹ کر بھی کچھ اسلئے تھا۔ اس میں ایک کلاشکوف بھی شامل تھی۔ شام تک بابا اور انور نے وہ سارا اسلئے نکال لیا۔ عام حالات میں وہ دکان پر جاتے ہوئے پستول وغیرہ ساتھ رکھتے تھے کیونکہ چوری ڈکیتی کا خطرہ رہتا ہے مگر اگلے دن وہ جب گئے تو انہوں نے گاڑی میں کلاشکوف اور رائل بھی رکھ لی تھی۔ اس شام بابا نے گھر آنے پر بتایا کہ انہوں نے سب جانے والوں کو یہی بتایا ہے کہ منور تیل کی خریداری کے لیے کراچی گیا ہوا ہے۔

یہ بہانہ بھی چند دن چل سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگوں کو کیا بتاتے کہ منور کہاں ہے۔ ہمارے ہاں ذات برادری میں کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ اگر لڑکی ہماری برادری کی ہوتی تو اب تک پتا بھی چلا ہوتا مگر وہ دوسری برادری کی تھی اس لیے لڑکی کے گھر والے لب لباب تک جان نہیں سکے تھے۔ مگر وہ کوشش میں ہوں گے۔ اس معاملے میں ان جاہلی لوگوں کی عقل بعض اوقات پڑھے لکھوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ وہ اتنی محنت اور جانفشانی سے اپنے مجرموں کو تلاش کرتے ہیں کہ کیا پولیس کرتی ہوگی۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ان کا مجرم چل جائے کیونکہ ان کی تلاش دونوں ہاتھوں نہیں بلکہ سالوں اور عشروں جاری رہتی ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے چندہ میں سال بعد اپنے مجرموں کو تلاش کر لیا جو کہیں چھپ کر زندگی گزار رہے تھے اور انہیں معاف کے بچوں کے قتل کر دیا گیا۔

بابا اور انور کسی قدر پُر امید تھے کہ اگر منور مل جائے تو وہ اسے سمجھا سکتے تھے اور اسے واپس لے آتے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیسے واپس لے سکتے تھے؟ اور اگر اسے واپس لے بھی آتے تب بھی وہ اس لڑکی کا کیا کرتے جو منور کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس کا پتا مجھے اس وقت چلا جب

ہوا تھا۔ انور کو کرکٹ کا شوق تھا۔ اس لیے بابا نے فوری خبر دیکھ لی اور اس کے فوراً بعد وہ مکان بند کر کے انور کے ساتھ گھر آئے اور انہوں نے برادری کے بڑوں کو بلا لیا۔ ہمارے گھر ایک طویل میٹنگ ہوئی۔ محلے کی عورتیں بھی آگئی تھیں۔ ایک طرف میٹنگ ہو رہی تھی اور دوسری طرف عورتیں امی اور میرے ساتھ مل کر مدد دھور رہی تھیں۔ میٹنگ کے بعد بابا، انور اور برادری کے کوئی درجن بھر افراد پوری طرح سچ ہو کر کراہی روانہ ہو گئے اور یہاں محلے میں بھی سب ہوشیار ہو گئے تھے۔

اتفاق سے مخالف برادری کا محلہ بھی ہمارے محلے کے پاس ہی تھا۔ اس لیے آنے والے سارے مورچے بن گئے۔ ایک قاتر جنگ بھیڑ سکتا تھا جس میں نہ جانے اور کتنی جانیں ضائع ہوتیں مگر اس موقع پر دونوں طرف کے بزرگ آڑے آئے اور انہوں نے امن برقرار رکھا۔ مگر جیسے ہی بابا اور انور، منور کی لاش لے کر واپس آئے ماحول بدل گیا۔ وہ انتقام کے لیے پاگل ہو رہے تھے۔ امی نے بابا کو سمجھانا چاہا تو انہوں نے زندگی میں پہلی بار امی پر ہاتھ اٹھایا اور پھینک مار کر بولے۔ ”میرا بھائی بیٹا مر رہا ہے اور میں چوڑیاں پہن کر بیٹھا رہوں گا۔“

”منور کی لاش پہلی ضرور ہے لیکن آخری نہیں ہے۔“ انور نے بھی خطرناک لہجے میں کہا۔ ان دونوں کو سمجھانا بیکار تھا اس لیے میں امی کو ان کے سامنے سے ہٹا کر لے گئی۔ منور کی تدفین اسکے دن کی گئی اور اس کے فوراً بعد برادری کا اجلاس ہوا۔ کیونکہ مرنے والا دوسرا فرد بھی ہماری برادری کا ہی تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مخالف برادری انکار کر رہی تھی کہ یہ ان کا کام نہیں ہے۔ ہماری برادری اس پر اپنے علاقے کے بڑوں کا جرم بخانے کی بات کر رہی تھی اور وہ مان نہیں رہے تھے کہ جب ہم نے کچھ کیا ہی نہیں ہے تو جرم کس بات کا بٹھایا جائے۔ بابا اور انور کو شبہ تھا کہ یہ ٹھینے کے گھر والوں کا کام ہے۔ اس کے چار بھائی تھے اور چاروں بد معاش قسم کے تھے۔ وہ تو کچلے عام اسلحہ لے کر گھومتے تھے۔ انور سخت پیش میں تھا لیکن وہ ان کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ وہ اکیلا تھا اور مخالف چار بھائی تھے اور ان کے پاس دوسرے بھی کئی بد معاش قسم کے ملازم تھے۔

بابا نے منور کے قتل کی ایف آئی آر کراچی میں مخالف برادری کے نام کنوادی بھی مگر کسی کا نام نہیں لیا تھا۔ کوئی گرفتاری بھی عمل میں نہیں آئی تھی۔ منور کے چالیسویں تک

تھی۔ میں لی وی پر نذر جینٹل دیکھ رہی تھی کہ اچانک خبر آنے لگی، ایک پوش علاقے میں پچھلے میں قاتر جنگ جس سے تین افراد ہلاک ہو گئے۔ مارے جانے والوں میں ایک عورت اور دوسرا شامل تھے۔ ان کا تعلق اعداد و حساب سے تھا۔ یہ سن کر اور پھر عورت کا جان کر میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ میں نے جلدی سے لی وی کی آواز دہی کر دی اور انتظار کرنے لگی کہ کب اس خبر کی تفصیل آتی ہے۔ امی مکن میں کھانا بنا رہی تھیں۔ اس دوران میں جینٹل گھبراہٹ رہی اور امی آجائیں تو میں جلدی سے کوئی انٹریٹمنٹ جینٹل لگا لیتی تھی۔ بالآخر دو گھنٹے بعد اس کی تفصیل آئی۔ مارے جانے والوں کے نام نشر ہوئے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ ان میں ایک نام منور کا تھا۔ لڑکی کا نام ٹھینہ تھا اور دوسرا مرد جو بابا کا بھائی تھا اس پچھلے کا مالک تھا اور اس کا تعلق بھی ہماری برادری سے ہی تھا۔

اس کے دو ملازموں کے مطابق چار خوب پوش مسلح افراد اچانک پچھلے میں گئے اور انہوں نے اندھا دھند قاتر جنگ کر کے ان تین افراد کو قتل کیا اور اس کے بعد فرار ہو گئے۔ کسی نے انہیں روکنے کی جرأت نہیں کی اور یہی نہیں بلکہ کسی نے محلہ آدروں کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ مگر مجھے یقین تھا کہ ان کا تعلق ہماری مخالف برادری اور ٹھینہ کے گھر سے ہو گا۔ میں اپنی جینٹل بروک رہی تھی اور جب میری برداشت سے باہر ہو گیا تو میں لی وی بند کر کے ہاتھ روم میں آئی اور وہاں آنسو بہانے لگی۔ منور کیسے ہی سچ میرا بھائی تھا۔ نہ جانے کیوں جب سے یہ پکڑ شروع ہوا تھا تب سے مجھے لگ رہا تھا کہ اس کا ایسا ہی انجام ہو گا۔ اس کے باوجود مجھے بہت بڑا دھچکا لگا تھا۔ میں واش روم سے باہر آئی تو امی نے دیکھ لیا۔ ”کیا ہوا باب تو کیوں رورہی ہے؟“

”کچھ نہیں امی۔“ میں نے کہا اور پھر بہانا بنایا۔ ”منور بھائی کی طرف سے دل پریشان ہے اس لیے رونا آ گیا۔“

میں امی کو یہ خبر سنانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی اس لیے جیسے ہی امی مکن کی طرف گئیں میں نے بابا کو فون کر کے صرف اتنا کہا کہ وہ لی وی لگا کر دیکھیں۔ منور کے بارے میں خبر آرہی ہے۔ دکان پر لی وی تھا کیونکہ آئل کا کام ایسا ہوتا ہے کہ اس میں بہت دیر بعد کوئی گاڑی آتا ہے اور زیادہ تر فون پر آرڈر کرتے تھے اور کوئی جا کر سپلائی دے آتا تھا اس لیے وقت گزاری کے لیے بابا نے دکان پر لی وی رکھا

میرے ایک واقف کار نے اسے دو بار مخالف برادری کے محلے میں دیکھا ہے اور وہاں جاتا بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ ٹھنڈے ٹھنڈے ہیں۔

"میرا چچا روتو دیا ہے اب کیا چاہتے ہیں؟"

"جیب فزٹ کا معاملہ ہے ہمارے ساتھ ایسا ہوتا ہے بھی آسانی سے ٹھنڈے نہیں ہوں گے۔" بابا نے گہری سانس لی۔ "منور نے بہت برا کیا اسے احساس ہونا چاہیے تھا کہ اس کی بھی بہن ہے۔"

ای خوفزدہ ہو گئیں۔ انہوں نے کہا۔ "میں تو کہہ رہی ہوں رباب کی شادی کر دیتے ہیں۔"

"کس سے، ابھی کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔"

"اربیٹا کا بھائی ارشد ہے نا؟"

میں جو چھپ کر امی بابا کی باتیں سن رہی تھی میرے قدموں تلے سے زمین ٹل گئی۔ بابا نے کہا۔ "میں انکار کر چکا ہوں۔"

"ان کو تو نہیں کیا نا۔" امی بولیں۔ "اب ہم بات کر سکتے ہیں۔"

بابا سوچ میں پڑ گئے اور پھر انہوں نے کہا۔ "ہاں ہم نے ان کو تو انکار نہیں کیا لیکن گھر میں بات ہوئی تھی۔"

جب میں جا رہی تھی کہ بابا امی کی بات مان گئے ہیں اور میں کسی صورت ارشد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

عارف ہماری برادری سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا گھر ہماری گلی کے کونے پر تھا وہ کسی نئی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑا تھا اور جب میں کالج آتی جاتی تو اکثر وہ ان اوقات میں گلی کے کونے پر موجود رہتا تھا۔ اسی طرح جب کسی شام کو چھت پر جاتی تو کچھ دیر بعد وہ بھی آ جاتا اور اس کی نگاہ کا مرکز میں ہی ہوتی تھی۔ میں نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دی کیونکہ اس کا انداز ہنس زدہ نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ دل چسپی سے اور سراپے والے انداز میں دیکھتا تھا۔ کسی لڑکی یا عورت کو ایسی نگاہ بہت کم بری لگتی ہے۔ مجھے بھی بری نہیں لگتی تھی۔ اس لیے وہ جب مجھے دیکھتا تو میں بے نیازی بن جاتی۔ پھر صورت ٹھل کا بھی مناسب تھا لیکن میں نے بھی اس کے ہارے میں سوجھا نہیں تھا۔ کئی بار اس سے یوں آمنا سامنا ہوا کہ اس کی امی اور میری امی کی آپس میں ابھی سلام دعا تھی۔ امی ہفتہ دس دن میں ان کے گھر جاتی تھیں اور وہ بھی اسی طرح ہمارے گھر چکر لگاتیں

سکون رہا تھا۔ خالہ اور خالو واپس جا چکے تھے۔ وہ پہلے تین دن کے وقت آئے تھے اور اس کے بعد وہ بارہ کئی دن کے لیے آئے تھے۔ یہ موقع ہی ایسا تھا کہ وہ اپنا اختلاف بھول کر آگئے اور اب بابا بھی ان سے اچھی طرح سے ملے تھے۔ دوسری بار میں علیٹا بھی آئی تھی اور وہ میرے گھر کا ماحول دیکھ کر بہت حیران ہوئی تھی۔ اس نے تہاکی میں مجھ سے پوچھا۔ "رباب تو کیسے دھنکی ہے اس ماحول میں؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بس متھو رکھا لکھا کچھ کر رہی ہوں۔"

"صاف کرنا لیکن میں نے اسے روکے اور سخت باپ بھائی کہیں نہیں دیکھے۔"

"گناہات ہے میں نے بھی اپنے گھر کے علاوہ کہیں نہیں دیکھے ہیں۔" میں نے اس کی تائید کی۔

"کاش میں تم کو یہاں سے لے جا سکتی۔" علیٹا نے کہا۔ "صائم بھائی بڑے تو نہیں ہیں جو تمہارے بابا نے یوں انکار کیا۔"

"وہ بالکل بھی برے نہیں ہیں۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "برے تو میرے نصیب ہیں۔ ہماری برادری کے رسم و رواج ہیں جن میں بیٹیوں کو جہنم میں بھونکا جاتا ہے۔"

خالہ خالو اور علیٹا کے جانے کے بعد ماحول پھر دیا ہی ہو گیا۔ بلکہ میں نے محسوس کیا کہ انور اب منور بننا چاہ رہا تھا۔ وہ مجھے بالکل ان نظروں سے دیکھتا تھا جن سے منور دیکھتا تھا اور بابا چپ چاپ سوچوں میں گم رہنے لگے تھے۔ پھر ایک دن انہوں نے رات کو امی سے کہا۔ "جیب مجھے لگ رہا ہے انور کسی چکر میں ہے۔"

"کسے چکر میں؟" امی پریشان ہو گئیں وہ پہلے ہی ایک چٹا مٹوا چکی تھیں۔ "کسی لڑکی کا چکر ہے؟"

"نہیں.... مجھے لگ رہا ہے وہ بڑے کے چکر میں ہے۔" بابا بولے۔ "بدلا تو ہمیں لینا ہے لیکن ابھی وہ ہوشیار ہیں۔ چوٹ اس وقت مار لی ہے جب لوہا گرم ہو۔"

امی کو بابا کا تپشور یاد تھا اس لیے انہوں نے مخالفت تو نہیں کی لیکن پوچھا۔ "وہ کیسے... آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"آج کل وہ دکان پر کم آتا ہے۔ دو تین دوست ہیں جن کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ ہمیں پتا ہے وہ ہر وقت سچ رہتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بدلے کے چکر میں ہے۔"

تھیں۔ جب ان کے ہاں جاتے تب بھی عارف سے سامنا ہو جاتا تھا۔

پھر منور کی تدفین میں بھی عارف اور اس کے بھائی آگے آگے رہے تھے۔ اگلے دن ای چارہی تھیں تو میں نے پوچھا۔ ”ای کہاں جا رہی ہیں؟“

”زینت کے ہاں جا رہی ہوں۔“

”میں بھی چلوں؟“ میں نے پوچھا تو ای نے حیرت سے میری طرف دیکھا کیونکہ میں نے بہت عرصہ ہوا ان کے ہاں جانا چھوڑ دیا تھا۔

”ہاں چلو۔“ ای نے جت نہیں کی اور مان گئیں۔

میں ان کے ساتھ عارف کے گھر پہنچی اور اتفاق سے اسی نے درد لہ کھولا۔ مجھے ای کے بچے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایسی چمک آئی تھی کہ میری آنکھیں خود بہ خود جھک گئیں اور شاید چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔ عارف نے اپنی ای کو آواز دے کر بتایا اور بچے ہٹ کر راستہ دیا۔ میری چل اندر آتے ہوئے سلب ہوئی اور جب تک میں اسے ٹھیک کرتی ای آگے چلی گئی تھیں۔ میں اندر آئی اور عارف کے پاس سے گزرنے لگی تو اس نے سرگوشی میں کہا۔

”بہت اچھی لگ رہی ہو۔“

میرا دل دھڑک اٹھا تھا اور میں جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ جب تک میں اندر کمرے میں نہیں چلی گئی عارف کی نگاہیں میرا تعاقب کرتی رہیں تھیں۔ زینت آٹنی نے گرم جوش سے استقبال کیا اور اپنی بہو کو ٹھٹھا لانے کو کہا۔ ہم تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھے اور پھر اٹھ گئے۔ اتفاق سے اس بار بھی مچن میں عارف سے سامنا ہوا۔ اس کی نگاہوں کا پیغام بہت واضح تھا اور اس بار بھی میں نے سر جھکا لیا تھا۔ مشکل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ جب عورت نہ نہیں کرے تو اسے ہاں سمجھنا چاہیے اور عارف نے سمجھ لیا تھا۔ آج کل اگر لڑکا اور لڑکی رابطہ کرنا چاہیں تو یہ درابھی مشکل نہیں ہے۔ سوسائٹل نے اسے بہت آسان کر دیا ہے۔ میرے پاس سوسائٹل تھا اور بابا نے بڑی مشکل سے اجازت دی تھی۔ ای نے یہ کہہ کر دلوایا تھا کہ میں کلنگ جاتی ہوں کسی مشکل میں ہوں تو گھر کال کر کے بتا تو سکتی ہوں۔ بھائی اس معاملے میں بھی حائف تھے مگر مجھے سوسائٹل مل گیا اور اب تک میرے پاس تھا۔

ایک بار ہمارا سوسائٹل پر رابطہ ہوا تو معاملہ تیزی سے آگے بڑھا۔ پہلے ایس ایم ایس پر بات ہوئی اور اس کے

بعد عارف نے کال کی۔ میں نے ای سے چھپ کر اس سے بات کی۔ بابا اور انور بھائی کی موجودگی میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں کال پر اس سے بات کرتی میں تو ایسے میں سوسائٹل کو بھی کم ہی ہاتھ میں لیتی تھی مجھے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں سوسائٹل واپس نہ لے لیا جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اللہ بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اب یہ ظاہر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لیے میری کوشش ہوئی تھی کہ بابا اور انور کی نظر میرے سوسائٹل پر نہ جائے۔ اس کال پر عارف نے دراصل کراچی پہنچا کا اظہار کیا اور دوسری کال میں اس نے کہہ دیا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔ میں بھی تھی مگر میں نے بھی ڈھکے چھپے اعزاز میں کہہ دیا کہ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ عارف خوش ہو گیا تھا۔ تیسری بار اس نے کال کی تو اس نے کہا۔ ”رہا اب میں اپنی ای کو تمہارے گھر رشتے کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں۔“

میں نے خطی سلسلے لی۔ ”عارف یہ ممکن نہیں ہے۔“

وہ حیران ہوا۔ ”کیوں، میں تمہاری برادری کا تو ہوں۔“

”بات یہ نہیں ہے، اصل میں بابا نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔“

وہ دنگ رہ گیا اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ ”تم نے مجھے بتایا نہیں۔“

”میری امت نہیں ہو رہی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”تب تم نے اقرار کیوں کیا، بات کو یہیں تک لے کر کیوں آئیں؟“

”اس معاملے میں، میں اتنی ہی بے بس ہوں جتنا کہ تم ہو۔“

”تب کیا ہوگا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”جی بات ہے کہ عارف میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی مگر میں کچھ نہیں کر سکتی۔ مجھے ارشد سے نفرت ہے مگر میں بابا کے سامنے ان کی جرات نہیں کر سکتی۔“

عارف جیسے پاگل ہونے لگا تھا۔ ”رہا اب کچھ کرو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

میں نے کہا۔ ”میں ایک کنزرویٹو لڑکی ہوں تم مرد ہو کیا تم کچھ کر سکتے ہو؟“

”ہاں میں کر سکتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں تمہیں

بارے ٹال دیتی تھی۔ مگر اب میرے لیے بھی مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ یہ دس دن بعد کی بات تھی۔ اس دن باادکان پر گئے تھے اور انور گھر میں تھا۔ وہ ناشتا کر رہا تھا۔ وہ درادیم سے جاتا تھا کیونکہ سپلائی پر عام طور سے انور ہور منور ہی جاتے تھے اس لیے وہ درادیم سے جاتے تھے۔ میں چائے نکال رہی تھی کہ انور کے موبائل پر کال آئی اس نے ریسیو کی۔

"ہیلو.... ہاں... کیا؟" وہ چیخ کر کھڑا ہو گیا۔ "ہا ہا کو..."

"انور... کیا کیا ہوا؟" اسی نے بدحواس ہو کر پوچھا۔

"کسی نے ہا ہا پر فائرنگ کی ہے۔" اس نے غضب ناک لہجے میں کہا اور تیزی سے اندر کی طرف لپکا۔ پھر وہ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں کلاشکوف تھی۔ اسی نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ انہیں دھکیلتا ہوا نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ جب میں باہر گئی تو وہ گاڑی میں بیٹھ کر جا رہا تھا۔ پیچھے امی دھماڑیں مار کر رو رہی تھیں۔ میں واپس آئی اور پریشانی میں دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ امی کی حالت خراب تھی اور میں انہیں سنبھال رہی تھی۔ ان کے لیے پانی لا رہی تھی کہ باہر سے گھر کے سامنے کسی بھاری گاڑی کا انجن غرایا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں دروازے کی طرف لپکی تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں دروازہ اندر سے بند کرتی وہ ایک دھماکے سے کھلا اور دو ڈھانچے پرش افراد اندر آئے۔ میں پلٹ کر واپس بھاگی تو ان میں سے ایک دھماڑا۔

"یہی ہے پکڑا۔"

دوسرا گالیاں دیتا ہوا میری طرف لپکا۔ اس کی زبان گندمی اگل رہی تھی۔ اس سے پہلے میں اندر داخل ہو کر کمرے کا دروازہ بند کرتی اس نے عقب سے میری چوٹی پکڑ کر مجھے واپس گھن میں پھینک دیا۔ مجھے گرتے ہی میرا سر بہت زور سے فرش سے ٹکرایا اور مجھے چمڑا لے گئے۔ پھر مجھے بس اتنا یاد تھا کہ کوئی مجھے اٹھا کر شانے پر ڈال کر لے جا رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک تنگ دھار یک اور گرم کٹھری میں فرش پر پڑی تھی۔ میرے سر کی چوٹ سے خون بہہ کر میرے چہرے تک آ گیا تھا اور جب میں بہ شکل اٹھی تو یہ شرمناک انکشاف ہوا کہ میرے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں بے حد خوف کے عالم میں سکرسٹ کر دیوار کے کونے میں گھس کر بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ لباس اتارنے کے علاوہ میرے ساتھ اور کوئی رہتی نہیں ہوئی تھی لیکن ایک

لے کر کہیں دور جاسکتا ہوں۔ یوں تو تم میرے ساتھ چلو گی۔" میں ڈر گئی۔ "عارف یہ بہت بڑا فیصلہ ہوگا۔ تم جانتے ہو ہمارے ہاں ایسے موقع پر کیا ہوتا ہے، میرے بھائی منور کا واقعہ پرانا نہیں ہے۔"

اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میں مرنے کا خطرہ مول لے سکتا ہوں لیکن تم سے دور نہیں رہ سکتا۔"

"عارف مجھے کچھ سوچنے کی سہلت دو۔" میں نے التجا کی۔ "سوچ لو مگر جلدی، ایسا نہ ہو کہ تمہارے گھر والے اچانک تمہاری شادی کر دیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ ہمارے ہاں ایسا ہی رواج تھا۔ لڑکیوں کی اچانک ہی شادی کر دی جاتی تھی اور بعض اوقات تو ان کو اپنی شادی والے دن پتا چلتا تھا کہ آج ان کی شادی ہے۔ اگرچہ عام طور سے ایسا اس وقت ہوتا تھا جب گھر والوں کو سن گئی کہ لڑکی کسی اور میں دل چسپی لے رہی ہے اور انہیں خطرہ ہو کہ وہ ان کی عزت یاؤں سے روئے کر گھر سے فرار ہو جائے گی۔ عارف سے اس گفتگو کے بعد میں کشمکش میں پڑ گئی تھی۔ اگر میں بھی ایسا ہی کرتی تو ہا ہا اور امی پر کیا گزرتی۔ گئی بات ہے مجھے امی کی زیادہ فکر تھی۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ مجھے عارف سے محبت نہیں تھی، بس میں کسی صورت اشد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پہلے مجھے اس سے چڑھتی مگر جب سے میں نے امی اور ہا ہا کی کشمکش سنی تھی مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس سے شادی کی نسبت مجھے یہ زیادہ آسان لگ رہا تھا کہ میں گھر سے بھاگ جاؤں۔ بے شک اس جرم میں، میں بھی منور اور شہینہ کی طرح نکل کر دی جاؤں۔ عارف کی طرف میں اسی وجہ سے پڑھی تھی مگر جب اس نے یہ تجویز پیش کی تو میں سوچ میں پڑ گئی۔ جب ارشد کا سوچتی تو مجھے فرار آسان لگتا تھا مگر جب امی کا سوچتی تو میری ہمت جواب دے جاتی اور مجھے خیال آتا کہ اس سے بھرے میں اسی جہنم میں جلتی رہوں۔

گلی دن تک اسی کشمکش میں رہی۔ جس واحد چیز نے مجھے فیصلہ کرنے سے روکا ہوا تھا وہ امی اور ہا ہا کی خاموشی تھی۔ اگر انہوں نے میرے بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہوتا تو امی کے توسط سے لازمی میرے علم میں آ جاتا اور میں اس بارے میں باز خود کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔ امی سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر ہا ہا فیصلہ کر لیتے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس شادی سے نہیں بچا سکتی تھی۔ عارف ہر دوسرے تیسرے دن مجھے کال کر کے پوچھتا تھا اور میں ہر

کنواری لڑکی کے لیے یہ بھی بہت بڑی بات تھی کہ اسے ہوس بے لہاس کر دیا جائے۔
میں اتنی خوفزدہ تھی کہ چاہے کے ہوجھ بھی کھل کر نہیں رو سکی تھی۔ میں دلی دلی سسکیاں لے رہی تھی۔ نہ جانے میں کہاں تھی اور مجھے یہاں لانے والے کون لوگ تھے۔ ان کے قلیظ مزاج تو میری بے لہاسی سے واضح تھے۔ میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ یہ سوچ کر میرا دل چاہ رہا تھا کہ زمین بھنے اور مجھے اپنے اندر سمو لے۔ میں اس ذلت سے گزرنے کو تیار نہیں تھی۔ میں نے دل کی گہرائی سے لعنہ سے دعا کی کہ مجھے ذلت کی زندگی کی بجائے عزت کی موت دیدے۔ یہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی کیونکہ چند منٹ بعد کوٹھری کا دروازہ کھلا اور میں خود میں حریہ سمٹ گئی۔ خود کو آنے والے کی نگاہ سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی اگرچہ میں کتنا چھپا سکتی تھی؟ مگر آنے والی عورت تھی۔ اس نے اندر آ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور میرے پاس آ کر ایک جھوڑا میری طرف بڑھایا۔

"ادی یہ کتنی لو۔"

میں نے جھپٹ کر اس سے لہاس لیا اور جلدی جلدی ہٹ کر لہاس اس دوران میں عورت منہ دوسری طرف کر کے کھڑی رہی تھی۔ کپڑے ہٹا کر مجھے ایسا سکون ملا کہ اگر اس وقت وہ عورت مجھ سے جان بھی مانگتی تو میں ان کپڑوں کے بدلے خوشی سے دے دیتی۔ میں نے لڑتی آواز میں پوچھا۔ "میں کہاں ہوں۔"

"یہ سائیں کمال کا گھر ہے اور میں اس کی بیوی ہوں۔"

"وہ مجھے اغوا کر کے لایا ہے۔"

"سائیں کے ساتھ چار آدمی اور تھے۔" عورت نے کہا۔ "ادی تیرا لہاس بالکل چھٹ گیا تھا۔ میں نے ان لوگوں کے جانے کے بعد انا رہا۔ اب یہ دوسرا لہاس لائی ہوں۔"

میرا لہاس یقیناً ان درد مندوں کی دست درازی سے پھٹا تھا لیکن یہ جان کر مجھے اطمینان ہوا کہ میرا لہاس اس عورت نے اتارا تھا اور اب مجھے دوسرا جھوڑا لایا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور لہاسیت سے بولی۔ "تم نے مجھے ادی کہا ہے۔ اب ادی بن کر دکھاؤ۔۔۔۔۔ مجھے یہاں سے نکال دو۔"

اس نے ٹہنی میں سر ہلایا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔"

"تب مجھے ہر لاؤ ویل کا ٹیل دے دو۔ میں عزت دینے کی بجائے جان دینا پسند کروں گی۔"

عورت تقریباً تیس برس کی اور بہت خوب صورت

تھی۔ اس نے کچھ دیر سوچ کر سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے میں کچھ کرتی ہوں مگر تو خود بالکل مت کرنا دت۔۔۔"

"میں چپ رہوں گی۔" میں نے جلدی سے کہا پھر جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ "تم لوگ کس برادری سے ہو؟"

عورت کے جواب نے تصدیق کر دی تھی وہ اور سائیں کمال ہماری قافلہ برادری سے تھے۔ اپنی طرف سے لڑا سکون ہوا تو مجھے ہالہا اور انور کا خیال آیا۔ یہ کام کرنے والوں نے یقیناً پوری تیاری سے کیا تھا۔ ایک طرف انہوں نے ہالہا پر حملہ کیا اور جب انور گھر سے نکلا تو وہ پیچھے سے اندر گھس آئے اور مجھے اٹھا لائے۔ پتا نہیں امی پر کیا گزری ہوگی؟ ہالہا کیسے ہوں گے؟ یہ سوچ کر میرا دل بھر آیا اور میں مدد نہ لے سکی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی فکر لائق ہو گئی تھی اگرچہ اس عورت نے کہا تھا کہ وہ کچھ کرے گی لیکن وہ بہر حال بے بس عورت تھی۔ ممکن ہے وہ میری مدد نہ کر پاتی اور مجھ پر وہ سب گزر جاتی جس کا سوچ کر میرا دماغ رواں کا پ رہا تھا۔ اس ذلت سے موت بہت آسان اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔ دو گھنٹے گزر گئے اور یہ میری زندگی کے مشکل ترین دو گھنٹے تھے جو دو صدیاں بن کر گزرے۔ ابھی دل بہت تیز دھڑکتا اور ابھی ایسا لگتا جیسے رک گیا ہو۔

ایک بار پھر دروازہ کھلا تو میں آنے والے حالات کے لیے تیار ہو گئی۔ اندیشہ تھا کہ اب کوئی مرد آئے گا مگر وہی عورت تھی اس نے اشارے سے مجھے ہار آنے کو کہا اور میں تیزی سے اٹھ کر اس کے ساتھ باہر آئی۔ یہ ایک پرانا حویلی نما مکان تھا اور کوٹھری اندر کمرے میں تھی۔ عورت نے ہاتھ میں کیڑوں کے جوتے تھام رکھے تھے اور یہ میرے لیے تھے کیونکہ گھر میں میرے جوتوں میں قہقہہ لگی جو لانے کے دوران میں کھین کر گئی تھی۔ عورت مجھے گھر کے پچھلے حصے میں لائی اور جوتے پہننے کو دیے۔ یہ ذرا ٹھک تھے لیکن مجھے ننگے پاؤں نہیں چلنا پڑتا۔ میں نے جوتے پہننے ہوئے اس سے پوچھا۔ "یہ کون سی جگہ ہے۔"

اس نے حیدر آباد کی ایک جگہ کا نام بتایا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے چھ گھنٹے ہو گئے تھے۔ یہ جگہ میرے گھر سے خاص دور تھی۔ میں نے عورت سے کہا۔ "میں اتنی دور کیسے جاؤں گی؟"

"یہاں سے دس گھنٹے مل جاتے ہیں۔" وہ بولی اور پھر ایک چادر میرے حوالے کی۔ "اس سے خود کو چھپا لینا۔"

محاطات میں دیکھ رہی تھی۔ میں نے غصوں کیا کہ سب ہی مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سوائے خالہ کے کسی عورت نے مجھ سے باپا اور بھائی کی تعویث نہیں کی تھی۔ اس وقت مجھے احساس نہیں ہوا لیکن جب میں نے کچھ عورتوں کے منہ سے لفظ کاری سنا تو میں چوکی تھی اور جب مجھے پتا چلا کہ یہ مجھے عجیب نظروں سے کیوں دیکھ رہے تھے۔ میں ہراساں ہو گئی۔ میں ابھی طرح جانتی تھی کہ اگر کوئی لڑکی یا عورت اس طرح غیر مردوں کے گھنے میں رہ کر آئے تو بے آبرو سمجھا جاتا ہے اور ہمارے رواج میں اسے کاری قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

"لیکن میں تو پاک دامن ہوں۔" میں نے خود کو تسلی دی۔ رات کے وقت محلے والیاں چلی گئیں اور صرف کچھ رشتے دار خواتین تھیں۔ خالو اور دوسرے مردوں نے لاشیں گرنی کی وجہ سے سرد خانے میں رکھوا دی تھیں۔ صبح انہیں وہیں سے ہٹا کر اور دفن پہنا کر لایا جاتا اور چہرہ کرا کر قبرستان لے جاتے۔ خالو جب یہ کام نٹا کر آئے تو وہ بھی کچھ پریشان تھے۔ انہوں نے خالہ سے چپکے سے بات کی اور خالہ ای کے پاس آئیں۔ میں وہیں تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "رہا اب مجھے ہاتھی سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔" مجھے فوراً خیال آیا۔ "میرے ہارے میں؟"

خالہ ہلکی گئیں۔ "ہاں۔"

"خالہ میرے سامنے بات کریں۔"

"تیرے خالو تار ہے ہیں کہ باہر کچھ لوگ کہہ رہے کہ یہ برادری کی عزت کا معاملہ ہے۔"

"اگر عزت کا معاملہ ہے تو یہ جا کر ان لوگوں سے منیش جو مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے اور جنہوں نے باپا اور بھائی کو مارا ہے۔" میں نے رخ لہجے میں کہا۔ "میں جانتی ہوں وہ مجھے کاری کر کے مارنے کو کہہ رہے ہوں گے لیکن خالہ میں پاک دامن ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے خالہ اور ای کو ساری بات بتائی۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ ویسے بھی دونوں بگڑے کار تھیں اور انہوں نے جان لیا تھا کہ مجھے کسی نے نہیں چھوڑا ہے، بس ای نے یہ پوچھا کہ میرے کپڑے کہاں گئے تو میں نے بتایا کہ وہ پھٹ گئے تھے تو اس نیک دل عورت نے مجھے اپنا جوڑا دے دیا۔ خالہ نے خالو کو بلا کر سب بتایا، وہ بولے۔

"بات ہمارے سامنے یا نہ سامنے کی نہیں ہے اصل مسئلہ ان جالوں کا ہے۔"

یہ مکان کا پچھلا حصہ تھا جو ایک بھولی سی مٹی کی گلی میں کھل رہا تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے کھنڈیوں جیسے مکانات تھے۔ درمیان میں گنداپانی بہہ رہا تھا۔ میرے باپ آتے ہی عورت نے دروازہ بند کر لیا اور میں اندازے سے ایک طرف بڑھ گئی۔ یہ پرانے حیدر آباد کا علاقہ تھا۔ بھولی بھولی بھول بھلیوں کی سی گلیاں تھیں۔ دن کا وقت تھا اور گرمی شدت کی تھی اس لیے گلیاں دیران تھیں۔ بہت دیر بعد جا کر میں ایک سڑک پر گئی اور ایک رکشا روک کر اسے اپنے محلے کا بتایا۔ اس نے بیٹھے کا اشارہ کیا۔ "چلو بی۔"

میں بیٹھ گئی یہ سوچے بغیر کہ میرے پاس رقم کے نام پر ایک سکہ بھی نہیں تھا۔ مگر اس وقت مجھے جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانے کی فکر تھی جب گلیوں میں چل رہی تھی تب بھی یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی پیچھے سے وہی لوگ نہ آ جائیں اور مجھے پھر پکڑ کر لے جائیں۔ رکشے والے کو میں گھر پہنچ کر بھی کراپے دے سکتی اسی خیال نے تعویث دی تھی۔ یہ جگہ میں نے پہلی بار دیکھی تھی لیکن آدھے گھنٹے بعد رکشا ہمارے علاقے میں داخل ہوا تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ میں اسے گلیوں کا قتالی رتی اور چند منٹ بعد رکشا گلی میں داخل ہوا تو وہاں لوگوں کا جھوم دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔ یہ سب مرد تھے اور جب رکشا گھر کے سامنے رکا تو اندر سے رونے دھونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں اتری تو چادر کے باوجود لوگوں نے پہچان لیا۔ غلغلہ آواز میں بلند ہوئیں جو میری آمد کا اعلان کر رہی تھیں۔ میں انہیں نظر انداز کر کے اندر داخل ہوئی تو ای عورتوں کے درمیان گھری بیٹھے کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ رونے والی دوسری عورتیں تھیں۔ میں نے وحشت زدہ ہو کر پوچھا۔

"کیا... کیا ہوا ہے یہاں؟"

"مجھے لے جانے والوں نے نہیں بتایا۔" ایک عورت طنز پر لہجے میں بولی۔ "وہ تیرے باپ اور بھائی کو مار کر یہاں آئے تھے تھے لے جانے کے لیے۔"

یہ سنتے ہی میرا سر جو پہلے ہی چکر رہا تھا ایک دم تار کی میں ڈوب گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو باپا اور انور کی لاشیں آچکی تھیں۔ ای ان سے لپٹ کر رو رہی تھیں۔ مکان میں حریف لوگوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ باپا کے دور نزدیک کے کبھی رشتے دار آگئے تھے اور رات کے قریب خالہ خالو بھی آگئے۔ مدھن لگے دن صبح کے وقت طے پائی تھی۔ میں نے خود کو سنبھال لیا تھا اور اب گھر کے اندر کے

"ہم ہاٹی اور رہا اب کو ساتھ لے جاتے ہیں۔" خالد نے کہا۔

"میں نے بھی یہی سوچا ہے بعد میں اس مکان اور دکان کا معاملہ دیکھتے رہیں گے۔"

"بس تو ہم سوئم کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔" خالد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اسی اگرچہ اب ہوش میں تھیں مگر ان کی حالت ایسی تھی کہ وہ اس خطرے کو محسوس کر سکتیں۔ خالد کی بات پر انہوں نے تڑپ کر کہا۔

"صبر بہم آتی جلدی نہیں جائیں گے۔ یہاں میرے شوہر اور بچوں کی لاشیں ہیں۔" وہ روئے لگیں۔ "میں ان کی قبروں کو کیسے چھوڑ کر جاؤں میرا تو سب لٹ گیا ہے۔"

"ہاٹی آپ رہا اب کی طرف دیکھیں اب یہ خطرے میں ہے۔ برادری والے اسے گاری کر کے مارنے کی بات کر رہے ہیں۔"

اسی چمک گئیں اور جلدی سے مجھے سینے سے لگا لیا۔ "نہیں میں اپنی بچی کے قریب کسی کو آنے نہیں دوں گی۔ کسی کو ہاتھ نہیں لگائے دوں گی۔ میرے پاس اب اس کے سوا ہے ہی کیا؟"

"آپ جانتی ہیں نا یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ کسی کی نہیں سنیں گے۔ بس اپنی من مانی کریں گے۔" خالد اسی کو سمجھاتے ہوئے کمرے میں نلے گئیں۔ میں اپنے کمرے میں آگئی۔

یہ سچ ہے کہ خالو کی بات نے مجھے ہراساں کر دیا تھا۔ میں اپنی برادری والوں کو جانتی تھی۔ انہوں نے یہ بات کی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ فیصلہ کر چکے تھے۔ میرے بابا اور بھائی نہیں رہے تھے اور ان کو روکنے والا کوئی نہیں تھا لیکن اگر وہ ہوتے تب بھی وہ برادری کا ساتھ دیتے۔ مجھے نہیں بچاتے۔ ہمارے ہاں یہ بہت بڑی بات تھی کہ لڑکی کہیں اور رہ کر آئے۔ اسے لازمی ہے آکر سکھا جاتا تھا اور اس سلسلے میں میڈیکل رپورٹ کو بھی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ ایک بار امی نے مجھے بتایا تھا کہ بابا کے آپہلی علاقے میں ایک باپ نے اپنی چودہ سال بیٹی کو زرا سے قہرے پر اینٹوں سے مار مار کر قتل کر دیا تھا۔ وہ صبح کے وقت جلانے کے لیے لکڑی لینے گئی تھی اور واپس میں گئی میں آتے ہوئے گل کا ایک لڑکا اس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ باپ یہ مظلوم دیکھ رہا تھا اور اس نے نیچا پر بدکاری کا الزام لگاتے ہوئے اسے مار دیا۔ یہ واقعہ سن کر میں اتنی خوفزدہ ہوئی تھی کہ کئی دن کالج ہی نہیں گئی تھی۔

خوف کے ساتھ اطمینان کی بات یہ تھی کہ خالو اور خالد ہمیں یہاں سے لے جا رہے تھے۔ اگرچہ محفوظ تو ہم کراچی میں بھی نہیں ہوتے۔ منور اور اسی لڑکی کو کراچی کے انتہائی محفوظ علاقے میں گھر میں گھس کر قتل کیا گیا تھا۔ مگر یہاں تو خطرہ میرے چاروں طرف تھا۔ میں لپٹی ہوئی تھی اور خند آنکھوں سے دودھ تھی۔ اچانک میرے سواہل نے قتل دی۔ میں نے اٹھا کر دیکھا تو عارف کا نمبر تھا۔ میں نے اس کا نمبر محفوظ نہیں کیا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ مگر وہ مجھے نہ ہانی یاد تھا۔ عجیب بات تھی سچ کر وہ نہیں آنے کے بعد مجھے ایک بار بھی عارف کا خیال نہیں آیا تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا۔ اب اس کی کال آئی تو پہلی بار مجھے خیال آیا۔ پہلے میں نے سواہل سائلٹ پر کیا اور پھر کسی قدر چٹکا ہٹ کے ساتھ کال ریسیو کی۔ "ہلو۔"

"رہا اب۔" عارف نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "تم کل اپنی بابا اور بھائی کی تدفین مکمل ہونے سے پہلے یہاں سے چلی جاؤ۔"

"کیوں؟" میں چوکی۔ "کیونکہ برادری نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تدفین سے آتے ہی بڑے بیٹھیں گے اور تم جانتی ہو وہ کیا فیصلہ کر سکتے ہیں۔"

میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ "وہ مجھے گاری قرار دیں گے؟"

"بالکل اور اس کے بعد تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ کوئی تمہیں بچا نہیں سکے گا۔ اس سے پہلے بھاگ جاؤ تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔"

"عارف تم مجھے نہیں بچا سکتے... تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

"نہیں۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "اب میں تمہارے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

عارف نے فون بند کر دیا تھا اور میں ہراساں ہی بیٹھی رہ گئی۔ عارف برادری کا فرد تھا اور وہ سب جانتا تھا۔ جیسا کہ اس کے سامنے بات ہوئی تھی تب ہی وہ مجھے سامنے یقین سے بتا رہا تھا۔ امی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ ان سے بات کی جاتی اس لیے میں نے خالد سے بات کی۔ وہ سو گئی تھیں میں انہیں بچا کر دوسرے کمرے میں لائی اور آنے والے خطرے کے بارے میں بتایا، البتہ میں نے عارف کی بجائے محلے کی ایک لڑکی کا ذکر کیا جو اتفاق سے یہ بات جان

مگنی تھی۔ خالہ بھی ہراساں ہو گئیں۔ انہوں نے کہا۔ ”میں تیرے خالو سے بات کرتی ہوں وہی کوئی حل نکالیں گے۔“ یہ معمولی مسئلہ نہیں تھا۔ ہمارے ملک میں سب سے بڑا مسئلہ ہی قبائلی انا کا ہے۔ اس کے سامنے انسانیت اور مذہب تک کو کٹم سمجھا جاتا ہے۔ ایک گھنٹے بعد خالہ خاموشی سے میرے کمرے میں آئیں۔ ”رہا اب اپنی چیزیں اور سامان تیار کرلو۔“

”کیا ہم ابھی جا رہے ہیں؟“

”نہیں۔“ خالہ بولیں۔ ”تیرا اور ہاجی کا سامان اور ضروری چیزیں ہم تیرے خالو کی گاڑی میں رکھ رہے ہیں۔ گلی میں پہرہ ہے۔ محلے کے لڑکے پہرے پر ہیں۔ صبح جنازے کے وقت تم ہماری گاڑی کی ڈک میں چھپ جاؤ گی۔ قبرستان کے باہر جب سب چلے جائیں تو تم اتر کر دیکھو۔ بس آؤ گے۔ پہنچو گی۔ وہاں کراچی جانے والی کسی بھی بس پر بیٹھ جانا اور سہرا ب کوٹھ میں اتر کر اس پتے پر چلی جانا۔ جب ہم آئیں گے تو موقع دیکھ کر تمہیں لے آئیں گے۔“

خالہ نے مجھے ایک کاغذ دیا جس پر پتہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنا سامان تیار کیا۔ سارا سامان لینا ممکن نہیں تھا۔ بس چند جوتے اور اہم چیزیں خاص طور سے ڈاکو نہیں رکھ لیے۔ کچھ رقم اور زہر تھا وہ بھی رکھ لیا۔ خالہ نے کہا کہ باقی سامان وہ لے آئیں گے۔ ممکن ہے انہیں آنے میں دیر لگے۔ اس لیے میں گھبراؤں نہیں۔ خالو کو مکان اور دکان کا بند بست بھی کرنا تھا اس لیے دیر ہو سکتی تھی۔ خالہ نے مجھے ایک سم بھی دی کہ میں اپنی سم کی بجائے اسے اپنے موبائل میں لگا لوں۔ وہ اسی پر مجھ سے رابطہ رکھتیں۔ میں اسی سم سے بد وقت ضرورت ان سے رابطہ کر سکتی تھی۔ جنازے صبح نو بجے اٹھانے تھے۔ بابا کی ایک لمبائی ہر کھڑی ہوتی تھی۔ ہماری کار کراچی میں پولیس کی تحویل میں تھی اس لیے خالو کی کار گھن میں کھڑی کر دی گئی تھی۔ صبح روشنی ہونے سے پہلے خالہ نے مجھے لے جا کر ڈک میں چھپا دیا تھا۔ روشنی ہونے کے بعد میری کم شدگی کا ڈراما ہونا تھا اس کے بعد میری تلاش کا ڈراما ہوتا۔

امکان یہی تھا کہ گاڑی ڈک کی طرف کسی کا دھیان نہ جاتا مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کوئی توجہ دیتا اور میں پکڑی جاتی۔ مگر اچھی خاصی تھی اور کچھ ہی دیر میں میرا حشر ہو گیا جب کہ مجھے کئی گھنٹے اس میں گزارنے تھے۔ خالہ نے مجھے چھپانے سے پہلے سمجھا دیا تھا کہ موبائل واہیریت پر رکھوں اور جب خالو مجھے قتل دیں تو میں ڈک سے نکل

آؤں۔ بیک کے ساتھ ایک مہاپا بھی تھا۔ میں مہاپا بہن کر دوسروں کی نظروں سے محفوظ ہو جاتی۔ مگر تب تک مجھے ڈک میں رہنا تھا۔ یہ چند گھنٹے میں نے کیسے گزارے یہ میں ہی جانتی ہوں۔ باہر کی ہار میری تلاش کا شیرازہ تھا۔ خالہ نے انہی کو نہیں بتایا تھا اسی لیے ان کے رونے میں کچھ کیڑپ تھی اور وہ دوسروں سے کہہ رہی تھیں کہ میری رہا اب کو تلاش کر کے لاؤ۔ باہر بھی اس حوالے سے بھاگ دوڑ جاری تھی۔ ایک بار خالو چند آدمیوں کے ساتھ اندر آئے وہ شبہ ظاہر کر رہے تھے کہ مجھے شاید ان ہی لوگوں نے اغوا کیا ہے جو پہلے بھی اٹھالے گئے تھے۔

مگر مردان سے اختلاف کر رہے تھے کہ اسے پہرے میں کون یہاں تک آ سکتا ہے؟ گویا یہ بات درست تھی کہ پہلے ہی پہرہ لگا دیا گیا تھا کہ میں فرار نہ ہو سکوں۔ خالو نے کہا کہ جنازہ اٹھا لیتے ہیں اس کے بعد ایف آئی آر درج کرائیں گے۔ کچھ دیر میں ایس۔ پیس میں بابا اور بھائی کی منجیں آئیں۔ گھر میں ایک بار پھر رونے دھونے کا شور بلند ہوا۔ میں ڈک میں اپنے منہ میں دو پٹا تھوس کر رو رہی تھی کہ آواز ڈک سے باہر نہ جائے۔ نو بجے جنازے اٹھے تو خالو بھی اپنی کار لے کر نکلے تھے۔ ان کی کار میں کئی افراد اور تھے کیونکہ ان کے ہاتھیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ قبرستان ہمارے محلے سے کچھ ہی دور ہے۔ گاڑی خالو نے ایسی جگہ روکی جو قبرستان کی گزرگاہ سے دور تھی۔ یہ انہوں نے میری آسانی کے لیے کیا پھر سب مرد جنازے لے کر امداد چلے گئے۔ میں نے موبائل نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

تقریباً چندرہ منٹ بعد موبائل واہیریت ہوا۔ میں نے دیکھا خالو کا نمبر آ رہا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ میں نکل جاؤں۔ ڈک اندر سے آرام سے نکل جاتی تھی میں نے کھولا اور اپنا بیک اور مہاپا لے کر باہر آئی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں تیزی سے ایک طرف چل پڑی۔ پھر ایک جگہ موقع دیکھ کر میں نے مہاپا بہن لیا۔ رکشا مجھے چند منٹ بعد مل گیا اور اس نے مجھے چندرہ منٹ میں بس آؤے پر پہنچا دیا۔ خوش قسمتی سے وہاں کراچی جانے والی ایک بس ہانکل تیار تھی اور اس میں جگہ تھی۔ میں سوار ہو گئی گٹ بنوالیا۔ سوا دس بجے بس حرکت میں آئی اور گیارہ بجے تک میں حیدر آباد کی حدود سے نکل چکی تھی۔ اگرچہ محفوظ اب بھی نہیں تھی لیکن پھر بھی مجھے اطمینان محسوس ہوا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے بس سہرا ب کوٹھ پہنچی تو میں وہیں اتر گئی۔ کراچی میں موسم اچھا تھا یا مجھے اچھا

لگا۔ مری اتنی شدت کی نہیں تھی۔ میں نے چند رکشے والوں سے بات کی اور جس نے پتے پر پہنچانے کا دعویٰ کیا اس کے رکشے میں بیٹھ گئی۔

پتہ ایف بی ایریا کا تھا جو یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور مجھے ایک قلیٹ تک جانا تھا۔ گیٹ پر موجود گارڈ نے میری رضامندی کی اور میں دوسری منزل پر واقع اس قلیٹ تک پہنچی اور کال بیل بجائی تو ایک خاتون نے دروازہ کھولا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے تذبذب کے ساتھ اپنا تعارف کرایا اور خالہ کا حوالہ دیا تو خاتون پر جوش ہو گئیں۔ انہوں نے کہا۔ ”مجھے صیہ کی کال آگئی تھی تم باہر کیوں کھڑی ہو آؤ اندر آؤ۔“

قلیٹ اندر سے صاف ستھرا اور سہا سہورا ہوا تھا۔ ”میرا نام ریحانہ ہے اور میں صیہ کی بچپن کی دوست ہوں۔ ہم اسکول سے کالج تک کلاس فیلو رہے ہیں۔ یہ عجیب اتار دو..... یہاں کوئی نہیں ہے۔ میری بیٹیاں کالج سے آنے والی ہیں اور یہاں شام کو آتے ہیں۔“

میں نے سکون محسوس کیا تھا۔ کی میں بند بند میرا حشر ہو گیا تھا۔ ریحانہ آئی نے غسل کا مشورہ دیا اور مجھے غسل خانہ دکھایا۔ جب تک میں نہائی دھوئی ریحانہ آئی کی دونوں بیٹیاں کالج سے آگئی تھیں۔ ایک میری ہم عمر تھی اور دوسری دو سال چھوٹی تھی۔ ریحانہ آئی کی طرح ان کی بیٹیاں بھی دوستانہ فطرت کی تھیں اس لیے میں تین دن ان لوگوں کے ساتھ بہت سکون سے رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بابا اور انور کا دکھ ہلکا ہو رہا تھا مگر اب مجھے اسی کی فکر ہو رہی تھی۔ خالہ دن میں ایک دوپہر ایس ایم ایس کرتی تھیں کہ سب ٹھیک ہے اور وہ جلد کراچی آجائیں گی۔ لیکن انہیں آنے میں تین دن لگ گئے تھے۔ خالو نے برادری والوں سے مل کر مخالف برادری پر میرے اغوا کی ایف آئی آر درج کرا دی تھی۔ اگرچہ وہ ایک بار مجھے اغوا کر چکے تھے اور اس قابل تھے کہ ان پر ایف آئی آر کڑوائی جاتی لیکن اس بار یہ ایف آئی آر دراصل مجھے میری اپنی برادری سے بچانے کے لیے کڑوائی گئی تھی۔

مکان بند کر دیا تھا اور دکان فروخت پر لگا دی۔ امی کا ارادہ تھا کہ دونوں چیزیں فروخت کر کے ہمیشہ کے لیے کراچی آجائیں گی۔ خالو نے ایک وکیل کی خدمات حاصل کر لی تھیں جو وراثت کی منتقلی کا کام کر داتا اور اس کے لیے امی کا حیدر آباد جانا بھی ضروری نہیں تھا۔ چار دن بعد جب

میں امی سے ملی تو وہ مجھ سے پٹ کر دیر تک روتی رہیں۔ معاملہ تازہ تھا اور اس کا خدشہ تھا کہ برادری والے بچھا اور چا سوئی کرتے کہیں کراچی تک نہ چلے آئیں۔ اس لیے مجھے چھپا کر خالہ کے گھر تک لایا گیا تھا اور بہت دن میں اندر والے کمروں میں رہی۔ امی مجھے باہر تو کیا، مگن اور چھت پر بھی نہیں جانے دیتی تھیں۔ وہ مہینے بعد سب امی کے نام ہو گیا تو انہوں نے سب فروخت کر دیا۔ بھلت میں بیچے کی وجہ سے قیمت کم ملی تھی۔ پھر بھی دکان، مکان اور گاڑی کی قیمت کے ملا کر ایک کروڑ روپے مل گئے تھے۔

امی نے خالہ اور خالو کے مشورے سے ان کے بچکے کی چھت پر دو کمرے اور ایک لاونج بنوایا جس میں مگن بھی تھا۔ اس میں زیادہ خرچ نہیں آیا تھا۔ باقی رقم سے امی نے خالو کے مشورے سے پچھرا مجھے پڑچٹکس میں لٹکس لے کر کرائے پر چڑھا دیے۔ ان سے ماہانہ چالیس چالیس ہزار روپے ملنے لگے تھے جو ہم ماں بیٹی کے لیے کافی تھے۔ اس طرف سے اطمینان ہوا تو امی کو میری فکر لاحق ہوئی۔ ان کی دلوں صائم کی شادی کے سلسلے میں بات ہو رہی تھی۔ اس کی ملگجیر نے تعلیم مکمل کر لی تھی۔ جب کہ صائم جاب کے ساتھ آگے بڑھنے لگی ڈی کی تیاری کر رہے تھے۔ خالہ اور صائم دونوں ہی شادی کے لیے تیار تھے۔ علیٹا نے تاریخ طے ہونے سے پہلے صائم کی شادی کی شاہنگ شروع کر دی تھی۔ کئی مہینے گزر جانے کے بعد مجھے احماد آگیا تھا اور میں بھی کبھی باہر چلی جاتی۔ لیکن باہر جاتے ہوئے میں مکمل مہائے اور نقاب میں ہوتی تھی۔ شروع میں احتیاط کی وجہ سے ایسا کیا لیکن بعد میں مجھے عادت ہو گئی۔

اس روز بھی میں اور علیٹا اپنی گاڑی میں تھے۔ خالو نے کوشش کر کے ہماری کار پولیس کی تحویل سے نکلوا دی تھی۔ اس کا حشر ہو گیا تھا۔ خدمت پر اچھا خاصا خرچ آیا تھا۔ مگر ہمیں آنے جانے کے لیے اپنی گاڑی مل گئی تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی لیکن صرف کالونی کی سڑکوں پر چلاتی تھی۔ باہر جاتے ہوئے علیٹا ہی ڈرائیونگ کرتی تھی۔ ہم نزدیک ہی ایک شاہنگ مال تک آئے۔ وہاں کئی کھینے خریداری میں گزار دیے اور جب باہر نکلے تو میں چونگی تھی۔ ہماری گاڑی کے پاس ایک جانا پہچانا شخص کھڑا تھا اور وہ ہماری برادری کا تھا۔ خوش قسمتی سے میں نے اسے پہلے دیکھ لیا اور ہراساں ہو کر علیٹا کو بھی قادیا۔ وہ بھی پریشان ہو گئی، اس نے کہا۔ ”تم یہاں دکان میں اس سے پوچھ سکتی ہو کہ یہ

انگریزی اتنی اچھی نہیں تھی۔ صائم نے بتایا تھا کہ مجھے وہاں جا کر بھیچے خریدیں ہوں گے اور جب میں ان کے معیار پر پورا اتروں گی تو مجھے ماسٹر میں داخلہ ملے گا۔

مجھے ویزا مل گیا اور میں جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ ان ہی دنوں اچانک صائم کی طبیعت صبا نے اس سے شادی سے انکار کر دیا۔ صائم اور خالہ کے گھر والے حیران رہ گئے تھے۔ یہ اطلاع ہمیں صبا کے گھر والوں سے ملی تھی۔ صائم نے صبا سے پوچھا کہ اس نے کیوں انکار کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ اس کا ذہن بدل گیا ہے اب وہ صائم سے شادی نہیں کر سکتی ہے۔ صائم نے کھوج لگا کر اس کے پس پشت کیا بات ہے تو اسے بتا چلا کہ صبا جہاں جاب کر رہی تھی وہاں اس کی ایک مقامی آدمی سے ملاقات ہوئی اور وہ صائم کو بھول کر اس کے چکر میں پڑ گئی۔ صائم کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ خالہ اور باقی سب بھی شاک میں تھے۔ علیچا نے تو خاص تباہی بھی کر لی تھی۔ خود میں بھی دکھی تھی۔ خالہ کے گھر کی مکمل خوشی تھی اور وہ یوں اچانک ملیا میٹ ہو گئی۔

یہ سب ہو جانے کے باوجود میرے ذہن میں صائم کا خیال نہیں آیا تھا۔ اسی اور خالہ نے آپس میں کچھ بات کی اور ایک رات امی نے مجھ سے صائم کے بارے میں پوچھا۔ ”صمیمہ جانتی ہے کہ اس کی جلد از جلد شادی کر دی جائے اور وہ پیسے ہی نہیں چاہتی تھی۔“

خود میرے لیے اس سے اچھی بات نہ کہی ہو سکتی تھی۔ اس لیے میں نے ہاں کر دی اور میری روادگی سے پہلے صائم سے میرا نکاح کر دیا گیا۔ اب وہ اپنی بیوی کو رہیو کرتے۔ اس خوشی کے موقع پر سب کسی قدر افسردہ بھی تھے کہ وہ ہماری شادی کو اس بھر پر انداز میں نہیں کر سکیں گے جس طرح کرنا چاہتے تھے اور وجہ وہی تھی کہ میں تقریباً روپوش زندگی گزار رہی تھی۔ کل میری آسٹریلیا روادگی ہے اور جانے سے پہلے میں اپنی یہ سچا جانی اپنے پسندیدہ پرچے سرگزشت کے لیے بھیج رہی ہوں مجھے امید ہے یہ شائع ہوگی اور لوگوں کو مزید پتا چلے گا کہ بعض لوگوں کے لیے اس ملک میں رہنا اور زندہ رہنا کتنا دشوار بنا دیا جاتا ہے اور انہیں وطن چھوڑ کر دیار غیر میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ امکان ہے کہ میں بھی اب بھی وہاں نہیں آسکوں گی۔ صائم نے سوچ لیا ہے کہ وہ ایک سال کے اندر باقی سب کو بھی آسٹریلیا بلا لیں گے۔ اللہ کرے یہ کام خیر و خوبی سے ہو جائے آمین۔

ہماری گاڑی کے پاس کیا کر رہا ہے؟

”نہیں تم انہیں چاہتی نہیں ہو یہ بہت وحشی ہوتے ہیں تمہارے ساتھ کوئی مس لی ہو نہ کریں۔ اس لیے بات کرنے کے بجائے تم گاڑی لے کر بہ ظاہر یہاں سے جاؤ لیکن مال کے پیچھے اگلے حصے میں آ جانا۔“

علیچا نے ایسا ہی کیا وہ اس شخص کو نظر انداز کر کے سامان سمیت گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی پارکنگ سے نکال کر لے گئی۔ وہ شخص ہاؤس نظر آنے لگا کیونکہ اسے میری تلاش تھی۔ علیچا کا چہرہ کھلا تھا۔ اس نے صرف ہلکا سا ہنسنے کا تھا۔ جب تک میں شاہجی مال کے پچھلے حصے میں پہنچی وہ گاڑی لے کر آگئی تھی اور میرے جیسے ہی اس نے گاڑی دوڑا دی۔ کالونی آنے تک ہم بار بار پیچھے دیکھتے رہے کہ کوئی پیچھے تو نہیں آ رہا ہے۔ گھر پہنچ کر ہمارے دم میں دم آیا لیکن جب میں نے امی اور خالہ کو بتایا تو ان کا دم خشک ہو گیا تھا۔ شام کو خالو آئے تو اس سلسلے میں میٹنگ ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ مجھے یہاں سے کہیں دور بھیج دیا جائے۔ صائم بھی اسکا پ پر آگئے تھے اور انہوں نے مشورہ دیا۔ ”رہا اب کو اپنی تعلیم کے لیے آسٹریلیا بھیج دیں۔“

خالہ نے اعتراض کیا۔ ”وہاں یہ کیسی کیسی رہے گی؟“

”صبا کیسے رہ رہی ہے؟“ صائم نے اپنی منگتیر کا نام لیا۔ ”ایسے ہی رہا اب بھی رہے گی یہ یہاں بالکل محفوظ ہو گئی۔ میں اس کا یہاں داخلہ کر دیتا ہوں اس کی بیویاں اسے ویزا مل جائے گا اور یہ یہاں آ جائے۔“

امی مجھے اتنی دور بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھیں مگر ہم اداری کے آدمی کا یہاں پایا جاتا ایسی بات نہیں تھی جسے نظر انداز کیا جاتا اس لیے وہ مجبوراً مان گئیں۔ صائم نے نسل دی تھی کہ اگر رہا اب کو آسٹریلیا کی شہریت مل گئی تو امی بھی وہاں آسکیں گی جیسے صائم کو مل گئی تھی تو اب خالہ اور خالو وہاں جا سکتے تھے۔ بلکہ صائم نے کہہ دیا تھا کہ جیسے ہی خالو ریٹائر ہوں گے وہ سب کو وہاں بلا لیں گے۔ اس وقت تک علیچا کی شادی ہو جاتی۔ اگرچہ علیچا کی خواہش تھی کہ وہ بھی آسٹریلیا جائے مگر خالہ اس کے لیے رشتہ تلاش کر رہی تھیں۔ امی کے ماننے کے بعد خالو نے سب سے پہلے میرا پاسپورٹ بنوایا اور اس دوران میں صائم نے سنڈنی کی ایک یونیورسٹی میں میرا ماسٹر میں داخلہ کر دیا۔ میں نے یہاں ویزے کے لیے درخواست دی اور ساتھ ہی انگلش لینگویج کورس بھی کرنے لگی کیونکہ گریجویشن میں بہت اچھے مارکس کے باوجود میری

مرثیوں

محترم و مکرم معراج رسول
مودبانہ آداب

ہمارا معاشرہ کس رخ پر جا رہا ہے اس کے لیے صرف اتنا کہہ دوں کہ
تہا ہی مقدر بختی والی ہے اگر لوگوں نے ہوش کے ناخن نہ لیے۔ کلش
ایسر صاحب یہ غلطی نہ کرتے تو شاید اتنا بڑا حادثہ نہ ہوتا، قارئین
کو بیدار کرنے کے لیے میں نے یہ واقعہ من وعن لکھ دیا ہے۔ اب لوگ
سبق حاصل کریں نہ کریں یہ ان کی مرضی ہے۔ شمس احمد
(لاہور)۔



ایک ہی مہریت میں کام کرتے تھے اس لیے دوستی ہو گئی
تھی۔ پھر بڑی بھی تھی۔ قیصر صاحب تاجر تھے اور ہول
ٹیل کا کام کرتے تھے۔ اچھا کہاتے تھے بھی اس پرش
سوسائٹی میں یہ دوستی کا گھر بنایا تھا۔ گھر میں ہر سہولت اور

اس بات کو چار برس گزرے۔ قیصر صاحب ہمارے
گھر کے سامنے رہتے تھے اور ان سے میرے لڑکی بہت
ابھی دوستی تھی۔ ابو عمر میں ان سے خاصے بڑے تھے۔ ابو
بچاں کے تھے اور وہ چاہیں گے تھے۔ دونوں ساتھ ہی

کر رہا تھا اور دونوں بہنیں شادی اور شرمین ابھی کالج میں تھیں۔ قیصر صاحب کے بچے ہماری عمروں سے مختلف تھے۔ میں پچیس برس کا تھا اور شہزادہ بیس کا تھا۔ اس لیے بچوں سے بس پہلو ہائے تھی۔ البتہ ابھی قیصر صاحب سے بات ہو جاتی تھی۔ وہ بھی اس طرح کہ انہیں کپیوٹر کے معاملے میں میری مدد کی ضرورت ہوتی تھی۔ جیسے ونڈوز یا کوئی سالٹ ویٹر انسٹال کرنا ہو یا پھر کوئی مسئلہ ہو تو اسے حل کرنا ہو۔ وہ اپنی حادثات کے مطابق مجھ سے بے تکلفی سے پیش آتے تھے مگر میں حفظ مراعات کے پیش نظر ان سے ہمیشہ ایک خاص احترام سے ملتا تھا۔

قیصر صاحب کپیوٹر، ٹی وی اور موبائل کے شوقین تھے۔ ان کے پاس اس وقت چالیس انچ کا نیا ایلی سی ڈی ٹی وی تھا۔ اپنا لیپ ٹاپ الگ تھا۔ گھر کے لیے جدید ترین کپیوٹر رکھا ہوا تھا اور ان کے اور ان کی بیگم کے پاس آئی فون تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ اس قسم کے آلات کے کتنے شوقین تھے۔ اکثر ان پر ہی مجھ سے بات کرتے تھے خاص طور سے کپیوٹر پر کیونکہ یہ میری لیلڈ تھی۔ اس مقام میں آفس سے آرہا تھا کہ قیصر صاحب اپنے گیٹ پر دکھائی دیے۔ وہ کسی سے سوپاں پر بات کر رہے تھے اور انہوں نے بات کرتے ہوئے مجھے ہاتھ سے روکنے کا اشارہ کیا۔ میں دیک گیا۔ وہ بات کر کے میری طرف آئے۔ ”اچھا ہوا یا تم مل گئے۔۔۔ میرا لیپ ٹاپ تھوڑا مسئلہ کر رہا ہے اسے دیکھ لو۔“

”کیا مسئلہ کر رہا ہے؟“

”ڈائیک ٹاپ پر موجود فولڈرز کو ہین کرنا چاہوں تو وہ نہیں کھل رہے ہیں۔ میں ڈرائیو میں جا کر اوپر کروں تو کھل رہے ہیں۔ بڑی مشکل ہوئی ہے اور ہارڈ ڈرائیو میں گھسنا پڑا ہے۔“

”فوری دیکھنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں یاد فرمیں ہو کر آ جاؤ۔“ وہ بولے۔ ”میں گھر ہی ہوں۔“

”میں آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور ہانچ کھڑی کر کے امداد چلا گیا۔ راحیلہ کو بتایا اور پھر فرمیش ہو کر پیچ کر کے آدھے گھنٹے بعد قیصر صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے کال تھل بجائی تو ان کے بڑے بیٹے شمر نے دروازہ کھولا۔

”جی اٹھل۔“

”قیصر صاحب نے بلا یا تھا لیپ ٹاپ میں کوئی مسئلہ ہے۔“

آسان تھی۔ ان کے چاروں بچے ایک اہل درجے کے اسکول میں پڑھتے تھے اور ان کے پاس تقریباً نئی کار تھی۔ خرچ بھی کھاتا تھا۔ ہر پلٹے گئی ہا ہر جا رہے ہوتے تھے، ابھی تفریح پر اور ابھی باہر کھانے پر۔ آنا جانا اور مہمان نوازی بھی بہت تھی۔ رشتے دار محدود تھے۔ لیکن دوست احباب بہت تھے اور پھر محلے والوں سے ملنا ملنا تھا۔ ان کے چاروں بچے جو سب بچے تھے بہت پیارے اور دوستانہ فطرت رکھتے تھے اس لیے محلے میں سب بچوں سے ان کی ملتی تھی۔ سب سے بڑا بچہ دس سال کا تھا اور سب سے چھوٹا آٹھ سال۔ کھیل کود اور پڑھنے میں ہی نہیں محلے والوں کے کام آنے میں بھی آگے آگے تھے۔ کسی خاتون کو دکان سے کچھ منگوانا ہوتا اور گھر میں کوئی نہ ہوتا تو وہ بلا جھجک ان سے کہہ دیتی تھی اور وہ فوراً لاکر دے دیتے تھے۔

قیصر صاحب آزاد خیال تھے۔ میں نے ان کو جسے کی نماز کے لیے بھی جاتے نہیں دیکھا۔ بس عید بقرعید پر ملے جاتے تھے۔ لیکن شیعہ تھے اور بڑے دامن ایمان کے مال رکھے ہوئے تھے۔ ڈریسنگ بھی ایسی ہی کرتے تھے۔ البتہ ان کی بیگم اتنی آزاد خیال نہیں تھیں۔ باہر ڈھک چھب کر جاتی تھیں۔ باقاعدہ پردہ تو نہیں کرتی تھیں مگر چادر لٹکا لٹکیں۔ میں نے بھی ان کو خالی سر نہیں دیکھا۔ ابھی ہم اسے ہاں آتی تھیں تو اس طرح آتی تھیں۔ امی سے زیادہ ان کی میری بیوی راحیلہ سے ملتی تھی۔ میری شادی ایک سال پہلے ہی ہوئی تھی۔ سسر قیصر کا نام گفتہ تھا اور وہ جتنی سے زیادہ کی نہیں تھیں۔ مگر دیکھنے میں تیس کی بھی نہیں لگتی تھیں۔ چہرے کے نقوش بہت خوب صورت اور مصححانہ تھے۔ جسم ڈھکا چھپا ہوتا تھا پھر بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ اس لحاظ سے بھی خوب صورت ہیں۔ چار بچوں کے باوجود ان کی خوب صورتی ماند نہیں پڑی تھی۔ راحیلہ نے بھی ایک دو بار مجھ سے کہا تھا کہ گفتہ ہائی بہت خوب صورت ہیں۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ جتنیس برس کی اور چار بچوں کی ماں ہیں۔

میرے ابو حمزہ احمد بھی اسی مارکیٹ میں کام کرتے تھے۔ ان کا کام بیک وقت ہول سیل اور ریٹیل کا تھا۔ میں امی ابو کی سب سے بڑی اولاد ہوں۔ میرے بعد ایک بھائی اور دو بہنیں ہیں۔۔۔ ابو چاہتے تھے کہ میں تعلیم حاصل کر کے ان کے ساتھ کام کروں مگر میں نے آئی ٹی کی لیلڈ چنی اور۔۔۔ ایسی ایسی کے بعد ایک فرم میں جاب کر رہا تھا۔ جاب کے دو سال بعد میری شادی ہو گئی۔ مجھ سے چھوٹا شہزادہ ایم بی اے

"آپ آجائیں ابھی گئے ہوئے ہیں۔" اس نے کہا۔

"گئے ہوئے ہیں تو میں پھر آ جاؤں گا۔"

"آپ آجائیں انکل۔۔۔ ابو کسی دوست سے ملنے گئے ہیں ان کا فون آ رہا تھا۔"

میں نے سوچا اور اعداد چلا گیا۔ شمر نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور کچھ دیر بعد لیپ ٹاپ لے آیا اس نے لیپ ٹاپ سامنے میز پر رکھا اور بولا۔ "اسی پوچھ رہی ہیں کیا بزنس گئے؟"

"کلف نہ کریں میں بس یہ دیکھنے آیا ہوں۔" میں نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔ شمر اندر گیا تو میں نے لیپ ٹاپ اٹھا کر آن کیا۔ یہ ڈیل کا جدید لیپ ٹاپ تھا اور خاصا مہنگا بھی تھا۔ قیصر صاحب نے مسئلہ بتا دیا تھا میں اسی لحاظ سے چیک کرنے لگا۔ فولڈرز سیٹنگ میں گڑبڑ ہوئی تھی۔ میں نے پہلے اس کا ہڈن آپشن ختم کیا جس میں فولڈرز چھپا دیئے جاتے ہیں پھر سیٹنگ چیک کی اور اس کے بعد ڈرائیو کے اعداد جا کر فولڈرز کھول کر چیک کرنے لگا۔ سی ڈرائیو میں مالی ڈاکو شس اپن کی تو اس میں ایک چھپا ہوا فولڈر موجود تھا۔ اس پر مالی لوکلکس ہوا تھا۔ مجھے یہ فولڈر نہیں کھولنا چاہیے تھا مگر نہ جانے کیوں میں نے کھول لیا۔ اس میں تصاویر تھیں۔ میں نے پہلی تصویر فلک کی تو وہ وہ ڈھونڈا کل وچ میں کل کی اور یہ گفت کی تصویر تھی۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں اور بغیر دوپٹے کے بے تکلفانہ سا ہنستا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ صاف نگہ ہا تھا یہ تصویر قیصر صاحب نے بھیجی تھی۔ میں نے تصویر بدلی اور پھر بدلتا چلا گیا۔ اچانک ایک ایسی تصویر آئی کہ مجھے پسینا آ گیا۔ اس میں گفت نے بہت ٹھنڈی ٹانگی پہنی ہوئی تھی۔ جس میں ان کا جسم جھک رہا تھا اور بہت سا جسم تو ٹانگی سے باہر ہی تھا۔ میں نے آج تک ان کا چہرہ ہی دیکھا تھا۔ میں نے بتایا کہ وہ بہت خوب صورت اور مصومانہ سے نقوش رکھتی تھیں۔ جسم پھل ہار دیکھا تھا اور وہ جسمانی طور پر بھی بہت پُرکشش تھیں۔ میں نے گھبرا کر فائل بند کر دی اور پھر فولڈر بھی بند کر دیا۔ سیٹنگ ٹھیک ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے دوبارہ ہڈن آپشن سیٹ کر دیا۔ اب فولڈر ایک ٹاپ سے بھی کھل رہے تھے۔ میں نے کہیں پڑ بند کیا اور شمر کو آواز دی۔ وہ شربت کا گلاس فرے میں رکھے ہوئے آیا۔ "انکل۔۔۔"

"ہو گیا۔" میں نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا اور

کھڑا ہو گیا۔

"اتنی جلدی، انکل شربت تو پی لیں۔"

مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی مگر گھٹنگ ہو رہا تھا میں نے گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور فرے پر رکھتے ہوئے وہاں سے نکل آیا۔ گلی میں نکل کر میں نے کچھ دیر وہیں رک کر اپنی حالت درست کی۔ اسی اہو نے ہم بہن بھائیوں کی پرورش اس طرح کی تھی کہ اگر کبھی برائی کی طرف قدم اٹھیں بھی تو مارے شرمندگی کے فوراً واپس آ جاتیں۔ میں میٹرک کے زمانے سے کہیں شرمندگی کر رہا ہوں۔ لیکن شاید ہی کبھی ایسا ہوا کہ میں نے اس کا لفظ استعمال کیا ہو جو عارے ملک میں بہت عام ہے۔ اگر کبھی کیا بھی تو اس سے خوشی نہیں ہوئی بلکہ بے چینی سی ہوئی اور پھر میں نے آئندہ ایسا نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔ خوش قسمتی سے دوست بھی ایسے ملے جتنے جو پڑھنے لکھنے والے اور سلیجے ہوئے ذہن کے تھے۔ اس لیے ہم برائیوں میں نہیں پڑے اور کہیں لڑکاہٹ استعمال کیا تھا۔

میں انٹر کے دوران ہی چھوٹے موٹے سافٹ ویئر بنانے لگا تھا۔ پھر بی سی ایس کیا تو اپنی اسی صلاحیت کی وجہ سے مجھے اس آئی ٹی فیرم میں جاب مل گئی جس کا شمار پاکستان کی بڑی آئی ٹی کمپنیز میں ہوتا ہے۔ ہیڈ آفس لاہور میں ہے لیکن کراچی کا آفس بھی خاصا بڑا ہے۔ میں اس کے سافٹ ویئر ڈیولپر اینڈ سرورس کے شعبے میں کام کرتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ جاب کے کچھ عرصے بعد ایم سی ایس کروں گا۔ مگر جاب میں ایسا لگا اور پھر شادی ہو گئی تو اب تک موقع نہیں ملا تھا۔ مگر اپنی معلومات اپ ڈیٹ کرنا رہتا تھا۔ دراصل یہ لیڈ ہی ایس ہے کہ اس میں روز ہی کوئی نہ کوئی اپ ڈیٹ آتی ہے اس لیے کہیں پڑے متعلق کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں میری معلومات نہ ہوں۔ سافٹ ویئر سے لے کر ہارڈ ویئر تک اور میٹ ورننگ سے لے کر انٹرنیٹ تک سب کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ کہاں کیا ہو رہا ہے؟

میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے لو جو ان دوسری ٹیکنالوجی کی طرح کہیں پڑ اور انٹرنیٹ ٹیکنالوجی کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ ان کا بیشتر وقت نام نہاد سوشل میڈیا ورکس اور ملٹا سلاطین ویب سائنس دیکھنے میں گزرتا ہے۔ اس سے صرف ان کا قیمتی وقت اور پیسہ اٹا رہتا ہے ہوتا بلکہ وہ اپنا دماغ اور جسم بھی ہکا بکاتا لیتے ہیں۔ پہلے انٹرنیٹ کہنے پر ہلکی کا گڑبڑ بنے ہوئے تھے لیکن جب سے کہیں پڑ سستے ہوئے اور خاص طور

مگر میں نے سوچا نہیں تھا کہ مل کلاس بھی ایسے شوق رکھتی ہے۔ شاید یہ سب انسان کی فطرت میں ہے۔ دولت مندوں کو دراصل میسر تھے تو انہوں نے بہت پہلے یہ سب کر لیا تھا۔ مل کلاس کو ٹیکنالوجی کی ترقی سے یہ موقع ملا ہے تو وہ اب یہ سب کر رہے ہیں۔ میں نے بتایا کہ قیصر صاحب ذرا آزاد خیال تھیں تھے مگر مجھے گفت پر حیرت تھی، وہ تو واقعی مجھے رہنے والی قانون تھیں، انہوں نے ایسی تصاویر بنوانے پر آمادگی کیوں ظاہر کی؟ مجھے یاد ہے شادی کے ابتدائی دنوں میں جب انسان کو ویسے ہی شوق ہو رہا ہے ہوتے ہیں تو میں نے راحیلہ کی ایک تصویر لی تھی جس میں وہ چادر پہنے کے تھی تو اس نے جب تک وہ تصویر ڈیلیٹ نہیں کر لی اسے کتنی نہیں آیا تھا۔ میں نے کہا۔

"ایک تصویر ہی تو ہے۔"

"ہاں لیکن میں اس طرح تصویر بنوانے کی قائل نہیں ہوں اسے کوئی اور بھی دیکھ سکتا ہے۔"

راحیلہ گھر سے باہر نکل جایا اور نقاب کے ساتھ جاتی تھی۔

"کیسے یہ میرا سواگت ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے سوا کون دیکھے گا؟"

"کوئی بھی دیکھ سکتا ہے کسی کے ہاتھ لگ جائے وہ کھول لے یا آپ سے خدانہ خواست چھین جائے تو کوئی اور نہیں دیکھ لے گا۔"

میں کسی قدر قائل ہوا تھا مگر اسے پھیننے کے لیے بحث جاری رکھی۔ "تو میں اس پر سیکورٹی کوڈ لگا دوں گا۔"

"آپ ہی نے بتایا تھا کہ یہ سیکورٹی کوڈ صرف دل بہلانے والی چیزیں ہیں، ماہرین ایک سیکنڈ میں انہیں کھول لیتے ہیں۔" اس نے لا جواب کرتے ہوئے کہا۔ میں ہنس دیا تھا۔

"اچھا بابا اب خیال رکھوں گا آجیہ ایسی تصاویر نہیں لوں گا۔"

"ضرورت بھی کیا ہے میں آپ کی ہوں جیسے چاہیں جب چاہیں دیکھیں۔" اس نے کہا تو میں نے شرارت سے پوچھا۔

"جیسے اور جب چاہوں۔"

راحیلہ شرما گئی۔ "میں ایک بات کر رہی ہوں بلکہ فری ہونے کی نہیں ہو رہی۔"

راحیلہ امی ایڈ کی پسند تھی اور شادی کے بعد میری پسند

سے لپ ٹاپ اور اسارٹ فون آئے تو یہ سب آغا آسمان ہو گیا کہ اب انڈر ایج بچے بھی سب جانتے ہیں کیونکہ وہ سب دیکھتے ہیں اور ماں باپ یا ان کے بڑوں کو بتا ہی نہیں چکا ہے۔ ہمارا معاشرہ اتنی تیزی سے ہکا بکا کی طرف جا رہا ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔

تصور تو اس وقت کیا جائے گا جب لوگ یا معاشرے کے ٹھکاندار اس بارے میں سوچیں اور لوگوں میں شعور بیدار کرنے کی کوئی مہم چلائیں یہاں تو سب سوئے ہوئے ہیں۔ میرے ایک کولیک نے اتفاق سے اپنے تیرہ سالہ بیٹے کا اسارٹ فون چیک تو اس میں ایسی چیزیں نکلیں کہ وہ رنگ رہ گیا تھا۔ آنکھوں میں چڑھنے والا بچہ نہ صرف فحش ویب سائٹس کا باقاعدہ وزٹ کرتا تھا بلکہ اس نے کچھ ایسے سوشل نیٹ ورک بھی جوائن کیے ہوئے تھے جہاں لائیب سب کچھ دکھایا جاتا ہے۔ اس نے بیٹے کو بار اور اس کا اسارٹ فون توڑ دیا۔ مگر وہ پریشان تھا جو اس کا بیٹا دیکھ چکا تھا اسے تو اس کے ذہن سے نہیں نکال سکتا تھا۔ ایک دن وہ دفتر میں سر تھامے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا تو پھٹ چڑا۔ اس نے مجھے بیٹے کے بارے میں سب بتایا۔ میں سوائے افسوس کے اور کیا کر سکتا تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ وقت دے۔ ابو نے ہمارے ساتھ بھی کیا تھا کاروباری ہونے کے باوجود وہ ہمیں پورا وقت دیتے تھے اور ہماری ہر سرگرمی پر نظر رکھتے تھے۔ والدین بچوں کی جاسوسی نہ کریں صرف ان کے معمولات پر نظر رکھیں تو اس سے ہی انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا بچہ کیا کر رہا ہے۔

مگر یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہمارے ہاں میچور اور اتنی عمر دیکھ والے لوگ بھی ایسی حرکتیں کر سکتے ہیں۔ قیصر صاحب کے لپ ٹاپ کے اس جیسے فولڈر میں بلا مبالغہ سیکڑوں تصاویر تھیں، میں نے چند ایک ہی دیکھی تھیں اور یقیناً آگے اس سے بھی زیادہ سسٹمی ختم تصاویر ہو سکتی ہیں۔ یہ بہت آسان کام تھا آئی فون یا لائیکنل کیمرے سے تصویر لے کر اسے لپ ٹاپ میں منتقل کر دینا۔ یقیناً یہ سب وہ اپنی کسی جس کو شکمیں پہنچانے کے لیے کرتے تھے۔ وہ ان طالب علموں اگر وقت ملتا تھا تو میں ڈائجسٹ چڑھ لیتا تھا اور ان میں ایسی کہانیاں بھی پڑھیں کہ شوقین مزاح لوگ اپنی بیویوں کی خاص تصاویر بناتے تھے اور انہیں چھپا کر رکھتے تھے۔ وہ سب دولت مند اور اہلیٹ کلاس سے تھیں رکھتے تھے۔ ہماری اہلیٹ کلاس تو شروع سے آزاد خیال رہی ہے۔

کام کرتے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں۔ فراز کو اکثر سامان لینے کے لیے جانا پڑتا ہے اور اس کی فیر موجودگی میں بھی لڑکے شاپ دیکھتے ہیں۔ ایک دن وہ سامان لینے کے لیے نکلا تھا مگر کچھ دور گیا تھا کہ حالات خراب ہو گئے اور وہ واپس آ گیا۔ مارکیٹ بند ہو گئی تھی اس لیے اس نے لڑکوں کی چھٹی کر دی۔ خود رک گیا کیونکہ اسے کچھ کام تھا۔ دونوں لڑکے جو آپس میں دوست بھی تھے جلت میں جاتے ہوئے اپنی بو ایس بی دیں بھول گئے۔ فراز نے ایسے ہی بو ایس بی چیک کی کیونکہ اسے علم نہیں تھا کہ وہ یہاں بو ایس بی بھی لاتے تھے۔

جب اس نے بو ایس بی کمپیوٹر سے لگا کر لوہن کی تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس میں ایسی تصاویر اور ویڈیوز بھری ہوئی تھیں جن کو دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ وہ یہاں آنے والے کمپیوٹر اور موبائل فونز سے نکالی گئی ہیں۔ ان میں بعض افراد تو فراز کے جانے پہچانے تھے اور ان میں سے بیشتر تصاویر اور ویڈیوز دیکھنے کے قابل نہیں تھیں۔ اتفاق کی بات ہے اگلے ہی دن میں فراز کے پاس بیٹھے گیا تو وہ ان دونوں لڑکوں کو پھٹا کر دہا تھا اور پھر اس نے ان کی چھٹی کر دی۔ بو ایس بی اس نے پہلے ہی صاف کر دی تھی۔ میں نے پوچھا تو اس نے ان کے کرواتے تھے۔ اس پر ایک لڑکا ڈھٹائی سے بولا۔ ”ہمارا کیا قصور ہے لوگ کیوں مارتے ہیں ایسی تصویریں اور ویڈیوز۔۔۔ اب بھٹکیں۔“

فراز نے ان کی چھٹی کرنے کے بعد مجھے سب بتایا تو میں بھی حیران ہوا تھا۔ اگرچہ یہ ایسی بات ہے جس سے کوئی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ استعمال کرنے والا ناواقف ہو ہی نہیں سکتا مگر میں اسے بہت چھوٹے پیمانے پر سمجھتا تھا۔ یہاں فراز نے جو بتایا اس سے تو ایسا لگ رہا تھا کہ یہ دبا کس قدر کھیل چکی ہے۔ صرف ایک موبائل اور کمپیوٹر شاپ پر ایک بو ایس بی میں ایسی درجنوں تلف جھڑوں کی تصاویر اور ویڈیوز تھیں جو مجموعی طور پر یہ کتنی ہوں گی اس کا تصور بھی محال ہے۔ فراز نے بتایا کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی لیکن ایسے لوگ بھی تھے جو پیچور اور شادی شدہ لگ رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی تصاویر اور ویڈیوز بنا رکھی تھیں۔ پھر ان کو اتنی سمجھ نہیں ہوئی کہ وہ اسے کمپیوٹر اور موبائل سے ڈیلیٹ کر دیں۔ اکثر بے پروائی کرتے ہیں اور یہ چیزیں غیر متعلقہ لوگوں کے ہاتھ لگ جاتی ہیں یا وہ انہیں دیکھ لیتے ہیں۔

میں گئی۔ اس میں حسن اور دل کشی سے زیادہ اس کی سوچ اور سلیقے کا دخل تھا۔ وہ اتنی اچھی سوچ کی مالک ہے کہ میں اس سے سیکھتا ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے نہ جانے میری کس تنگی کے بدلے مجھے ایسی بیوی دی ہے۔ میں اس سے کوئی بات نہیں چھانتا ہوں لیکن یہ بات ایسی تھی کہ میں اس سے کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بلکہ مجھے تو خود اس کے بارے میں سوچنے یا تصور کرتے ہوئے گھبراہٹ ہو رہی تھی اور میں بار بار سوچ رہا تھا کہ کاش میں نے وہ فولڈر کھولا ہی نہ ہوتا۔ مگر یہ سچ ہے کہ شیطان انسان کے اندر راہ کی طرح رہتا ہے اور اسے ایک لمحے میں گمراہ کر دیتا ہے۔ اگر میں ایک لمحے کو سوچتا تو شاید بھی اسے نہ کھولتا مگر مجھے سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملی اور اس سے پہلے میں فولڈر کھول چکا تھا۔ اس کے بعد بھی میں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ کھلی ہوئی تصویر سامنے نہیں آئی تھی اور یہ میری کھلی تھی۔

میں گمراہ آیا تو راحیلہ نے کھانے کا پوچھا مگر مجھے بھوک نہیں تھی اس لیے میں نے یہاں نہ کر دیا کہ آج شام آفس میں پڑا کھانا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہر عورت راحیلہ کی طرح مضبوط اور کھداد کیوں نہیں ہوتی ہے۔ جس طرح راحیلہ نے مجھے سمجھایا تھا کیا اس طرح گفتہ اپنے شوہر کو نہیں سمجھا سکتی تھیں۔ مگر کیا کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے سمجھا ہوا اور قیصر صاحب نہ مانے ہوں۔ بعض شوہر اپنی خواہشات کے آگے بیوی کی بات کو اہمیت نہیں دیتے ہیں اور انہیں بھورا شوہر کی خواہش پر سر جھکانا پڑتا ہے۔ شاید یہ بھی ایسا ہی کیس تھا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا کہ ایک فیر مرد نے ان کی بیوی کو اس حال میں دیکھ لیا جس میں دیکھنے کا حق صرف شوہر کا ہوتا ہے۔ قیصر صاحب تصاویر ایک خفیہ فولڈر میں چھپا کر مطمئن ہو گئے تھے حالانکہ اسے تو ایک بچہ بھی کھول سکتا ہے۔ پھر بھی کمپیوٹر میں ایسا مسئلہ ہو کہ وہ آن ہی نہ ہو اور اسے کسی کے پاس لے جانا پڑے تو اس کا بھی بہت امکان ہوتا ہے کہ وہ یہ فولڈر اور اس میں موجود تصاویر دیکھ لے گا۔

میرے اسکول کے زمانے کا ایک دوست فراز ہے۔ اس نے آگے بڑھنے کے بجائے ہارڈ ویئر کو پس کر کے اپنی شاپ کھول لی تھی۔ وہ سامان بھی فروخت کرتا تھا اور ونڈوز کے ساتھ دوسرے سافٹ ویئر بھی انسٹال کر کے دیتا تھا۔ پھر اس نے موبائل ریپریئرنگ بھی شروع کر دی۔ فراز خود سنبھلے ہوئے ذہن کا آدمی ہے مگر اس کی شاپ پر جو لڑکے

دوران میں سوچا رہا کہ میں نے انہیں ایسے کیوں دیکھ لیا
اس لیے کہ میں انہیں تقریباً بے لباس دیکھ چکا تھا۔ بے ٹک
قصیر میں دیکھا تھا مگر تصویر تو ان کی ہی تھی۔ اس سے پہلے
ان کے لیے میرے اندر جو عزت و احترام تھا، میں نے خود کو
ٹوٹا تو اس کا شائبہ بھی اب باقی نہیں پایا تھا۔ ایک ذرا سی
بے احتیاطی نے ایک شریف عورت کو میری نظر میں بے
عزت کر دیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس میں ان کا کتنا قصور
ہے لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ اب ان کا سامنا نہیں کروں گا
ہو رہا کہ وہ سامنے آئیں بھی تو ان کی طرف نہیں دیکھوں گا۔

اگرچہ یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ وہ دن میں ہمارے
ہاں ایک دو چکر لگاتی تھیں۔ اسی طرح میں آٹمس سے آنے
کے بعد تین چار بار ضرور باہر جاتا تھا اور اکثر وہ دروازے
پر بچوں سے بات کہہ دیتی ہوتی تھیں یا خود کھانا آجاری ہوتی
تھیں۔ مگر کاروبار کا سودا وہ خود لے کر آتی تھیں۔ اس
لیے نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے سامنا ہو جاتا تھا۔ یہ ضرور
ہوا کہ اس دن کے بعد سے میں نے ان کے گھر جانا بند کر
دیا۔ اگر قیصر صاحب جلاتے تو کوئی بہانہ کر دیتا تھا۔ ان کو
کوئی کام ہوتا تو اپنے ہاں بیٹ منگوا کر رکھ کر دیتا تھا۔ قیصر
صاحب نے بھی اس گرج کو محسوس کر لیا اور انہوں نے ابو
سے شکایت کی تو ابو نے مجھے بلا لیا۔ "کیا بات ہے بد خود دار
تم قیصر صاحب کے ہاں کیوں نہیں جا رہے؟"

"ابو جاتا ہوں لیکن اکثر مصروفیت ہوتی ہے؟" میں
نے بہانہ کیا۔

"بیٹا جلاتیں تو چلے جایا کرو، پڑوسیوں کے بہت
حقوق ہوتے ہیں۔" ابو نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔
میں ان کو کیا بتاتا کہ پڑوسیوں کے حقوق کا مجھے بھی پتا
تھا اور میں اسی وجہ سے وہاں جانے سے گریزاں تھا۔ جو ہو
چکا تھا اسے لوٹایا تو نہیں جاسکتا تھا مگر میں اتنا تو کر ہی سکتا
تھا کہ حریج سوچنے اور دیکھنے سے گریز کروں جو میرے قصور
کو خراب کرے۔ دیکھا جائے تو قصور نہ میرا تھا اور نہ ہی
گفتہ کا تھا، یہ سراسر قیصر صاحب کا قصور تھا مگر میں تو انہیں اپنی
بیوی کی ایسی تصاویر لیتی ہی نہیں چاہیے تھیں۔ اگر لی تھیں تو
ان کو اتنی بے پروائی سے کپیوٹر میں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ میں
اسے بے پروائی ہی کیوں گا۔ دغ و ذکا استعمال کرنے والے
لوگ جانتے ہیں کہ کسی کپیوٹر میں کسی چیز کو تلاش کرنا کتنا
آسان ہوتا ہے۔ اگر صرف سرچ کے آپشن میں تصویر لکھ کر
تلاش کیا جاتا تو یہ ساری تصاویر سامنے آ جاتیں۔ اس سے

اگرچہ قیصر صاحب کے ساتھ دوسرا معاملہ تھا۔ ان کا
کپیوٹر میں نے ہی دیکھا تھا اور وہ بھی اتفاقاً۔ اس لیے یہ
امکان تو نہیں تھا کہ وہ چیزیں لپک کر جائیں۔ وہ واپس
آئے تو انہوں نے مجھے کال کی۔ میں اس وقت بھی گھبرا رہا
تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ انہوں نے جان لیا ہے کہ میں نے
خلیفہ فولڈر کھول لیا تھا مگر وہ میرا شکریہ ادا کر رہے تھے۔
"تمہیک یار تم نے مسئلہ حل کر دیا اور نہ بہت مشکل ہو رہی
تھی۔"

"وہیکم قیصر صاحب۔" میں نے کہا۔
"شکر بارہا تھا تم مشکل سے ہانچ منٹ بیٹھے تھے۔"
"کام ہو گیا تھا اور آپ تھے نہیں اس لیے میں بیٹھ کر
کیا کرتا۔"

"تمہیک ہے ایک بار پھر شکریہ۔"
کال بند کر کے میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ راحیلہ
پاس موجود تھی اور مجھے دیکھ رہی تھی اس نے کہا۔ "آپ
فینشن میں کیوں ہیں؟"

"نہیں تو۔"
"دیکھیں نا آپ کو اسے سی میں بھی بیٹھا آ رہا ہے۔"
اس نے میرا ہاتھ چھوا۔ "آپ کی طبیعت تمہیک ہے نا؟"
میں نے اسے یقین دلایا کہ میری طبیعت تمہیک ہے۔
اگلے دن چھٹی تھی اور میں چھٹی والے دن ذرا دیر سے اٹھتا
ہوں۔ البتہ راحیلہ جلدی اٹھ جاتی ہے کیونکہ ناشتا دی جاتی
ہے۔ میں واش روم سے ہو کر آیا تو ڈرائنگ روم کی طرف
سے بولنے کی آواز آئی۔ پھر راحیلہ گفتہ کے ساتھ ڈرائنگ
روم سے لگی۔ وہ جا رہی تھیں اور انہیں دیکھ کر مجھے بے اختیار
وہ تصویر یاد آ گئی۔ وہ رکی نہیں تھیں فوراً ہی چلی گئی تھیں مگر
جب تک میرے سامنے رہیں میں انہیں ہی دیکھتا رہا۔
راحیلہ دروازے تک چھوڑ کر آئی اور مجھ سے کہا۔ "کیا ہو گیا
ہے آپ کو آپ نے سلام کیا نہیں اور انہیں گھور رہے تھے۔"
میں چونکا۔ "سوری میں کسی سوچ میں تھا اور مجھے تو پتا
ہی نہیں چلا کہ میں انہیں دیکھ رہا تھا۔"

راحیلہ سمجھتی تھی کہ میں کس فطرت کا آدمی ہوں اس
لیے وہ مطمئن ہو گئی۔ "گفتہ باجی کہہ رہی تھیں کہ آپ اتنی
اجنبی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں، کیا بیچتا نہیں تھا۔"
"نہیں پھر دفتر کے ایک معاملے میں سوچ رہا تھا۔
ان سے میری طرف سے سوری کر لیتا اور اب ناشتا
دو۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا مگر ناشتے کے

اسے فطری سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ شاید قیصر صاحب نے اسے کسی وجہ سے ڈانٹا ہو یا اس کا کسی دوست سے جھگڑا ہو یا اسے آج کل نا سمجھ بچے معمولی سی بات پر ذہنی فتح کر لیتے ہیں۔ آئے دن ٹی وی اور اخبار میں ایسی خبریں آتی ہیں۔ بچے اسے معمولی بات سمجھتے ہیں اور جب انہیں کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا تو وہ اپنی ذہنی فتح کر لیتے ہیں۔

شام تک قیصر کا پوسٹ مارٹم ہو گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق اس نے خودکشی کی تھی اور دم گھٹنے سے موت واقع ہوئی تھی۔ لاش رات گئے لی گئی تھی اس لیے تدفین اگلے دن تک کے لیے ملتوی کر دی تھی۔ قیصر صاحب کے گھر والے نہیں تھے۔ مطلب ماں باپ گزر چکے تھے اور بہن بھائی نہیں تھے۔ دور کے بکھرے دارتھے جو حیدر آباد میں رہتے تھے، انہیں آنا تھا۔ وہ بھی رات تک پہنچے تھے۔ چڑھی اور قریب ہونے کے ناطے ہمارا سارا گھر قیصر صاحب کے ٹم میں شریک تھا۔ سارے معاملات ابو نے اپنے دستے لے رکھے تھے اور بڑا بیٹا ہونے کے ناطے میں برادر کا شریک تھا۔ قیصر اور کفن کا بندوبست میں ہی کیا تھا۔ پھر لاش لانا اور غسل اور دوسرے مراحل سے گزرتا، میں ان سب میں شامل رہا تھا۔ اگلے دن ظہر کی نماز کے بعد قیصر صاحب کی آخری آرام گاہ تک پہنچا یا گیا۔ میں کیمرہ نہیں تھی مگر موت عمرو کچھ کر نہیں آتی ہے۔ پھر اس کا تصور بھی نہیں تھا۔ وہ بچہ اور نا سمجھ تھا جو اپنی زندگی ہار گیا۔

ایسا سانحہ ہو جائے تو گھر والوں کو سننے میں دیر لگتی ہے ایسا ہی قیصر صاحب کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ بہنوں لان کے ہونٹوں سے کسی غائب رہی تھی۔ کبھی مسکراتے بھی تو یوں چمک جاتے جیسے کوئی جرم کر گئے ہوں۔ پولیس نے تفتیش کی اور سب کے ذہنوں پر یہ سوال تھا کہ آخر قیصر نے کیوں خودکشی کی۔ قیصر صاحب قسمیں کھا کر کہہ رہے تھے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ایک دن پہلے شر خوش ہاش تھا۔ شام تک وہ بھائیوں اور محلے کے لڑکوں کے ساتھ گلی میں کرکٹ کھیلا رہا اور پھر وہ اپنے دوست سے ملے گیا۔ دوست اس کے ساتھ ہی پڑھتا تھا اور پھر وہ رات کو بچے واپس آیا۔ گفتے نے اس سے کھانے کا پوچھا تو اس نے کہا کہ اس نے دوست کے گھر کھا لیا ہے پھر وہ کمرے میں چلا گیا۔ بڑا ہونے کے بعد اسے الگ کمرہ دے دیا تھا۔ پھر کسی نے اسے نہیں دیکھا اور صبح جب گفتے اسے اٹھانے گئیں تو اس کی لاش پھندے سے جمبول رہی تھی۔ وہ تو جی ہار کر بے ہوش ہو گئیں۔ قیصر

صاحب نے دیکھا تو ان کے حواس بھی گم ہو گئے تھے پھر انہوں نے ابو کو کال کی تو وہ فوراً کھینچ گئے تھے اور انہوں نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ ابو نے قیصر صاحب کو لاش اتارنے سے روکا ورنہ وہ جذباتی ہو کر لاش اتارنے جا رہے تھے۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ مر چکا ہے۔ اس لیے ابو نے انہیں روک دیا۔

گویا میرا اندازہ غلط تھا اگر اس نے لیپ ٹاپ میں ماں کی تصویریں دیکھی ہوتیں تو سارا دن اتکا خوش نہ رہتا۔ میں نے ابو سے کہا۔ "یہ دوست کے پاس گیا تھا اسی دوران میں کچھ ہوا ہے جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کی ہے۔" "دوست کا کہنا ہے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے اور وہ اس کے پاس سے بھی ٹھیک ٹھاک گیا تھا۔"

"ممکن ہے وہ غلط بیانی کر رہا ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔" ابو نے تائید کی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "پر لب وجہ جو بھی ہو جانے والا تو واپس نہیں آئے گا۔"

"ابو وجہ جانتا بھی ضروری ہے۔" میں نے دبے لفظوں میں کہا۔ "جس وجہ سے ایک فرد خودکشی کر سکتا ہے اسی وجہ سے کوئی دوسرا بھی کر سکتا ہے۔ اتنا سا لڑکا تھا اسے کیا ذہنی مسئلہ ہو سکتا تھا۔"

ابو نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "میں کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"ہو ممکن ہے مسئلہ ان کے گھر کا ہو۔"

"اگر گھر کا ہے تب بھی ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ کسی کے گھر کے مسئلے میں کس طرح دخل دے سکتے ہو؟"

ابو ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اگر چہ آٹھ بار ایسے نہیں تھے کہ شرنے اسی وجہ سے خودکشی کی ہو مگر نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا اس میں قیصر صاحب اور گفتے کا کسی نہ کسی طرح کردار ہے۔ ایک لڑکھینچے بعد وہ لوگ معمول پر آ گئے تھے۔ بچوں نے کھیلا اور تفریح کرنا شروع کر دیا تھا۔ شر کے چالیسویں کے بعد قیصر صاحب اہل خانہ کے ہمراہ پہلی باہر ہونٹنگ پر گئے تھے۔ اسی طرح گفتے نے ہمارے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ درمیان میں بھی وہ ایک دو بار آئیں مگر راجیلہ اور امی سے مل کر روٹی رہی تھیں۔ اب آئیں تو معمول کی بات ہوئی تھی۔ راجیلہ مجھے اپنا کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ لان دونوں وہ امید سے تھی اور ایسی حالت میں عورت حواس ہو جاتی ہے اور اس کا زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے اس لیے میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی باتوں میں...

دلچسپی لیتا تھا اور سنا تھا۔ ایک مدت اس نے قایا۔

”شکر ہے گفتہ باقی نازل ہوئی ہیں ورنہ ان کا بہت برا حال ہو گیا تھا سر کی جھڑکی میں۔“

”تم نے پوچھا نہیں کہ شرنے کیوں خودکشی کی؟“

”پوچھا مگر ان بے چاری کو بھی کچھ نہیں معلوم۔“ راحیلہ نے ناسف سے کہا۔ میرا دل چاہا کہ اسے اپنے قیاس سے آگاہ کروں لیکن پھر میری زبان رک گئی۔ راحیلہ مجھ پر پورا اعتماد کرتی تھی اور پھر اس معاملے میں میرا تصور بھی نہیں تھا اس کے باوجود کسی عورت کے لیے یہ برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کا شوہر کسی اور کو دیکھے اور وہ بھی کسی واقف کار عورت کو۔ اس لیے میں چپ رہا۔ قیصر صاحب بھی معمول پر آ گئے تھے۔ اب پہلے کی طرح ہمیں مذاق اور گلی میں چہلپہن کرنے لگے تھے۔ میں نظر آتا تو گھبر لیتے تھے۔ اب میں کتنا بچتا۔ اب سے قریبی تعلق کی وجہ سے ان سے ایک حد سے زیادہ گریز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ قیصر صاحب کی حد تک ٹھیک تھا مگر جب گفتہ سانس آتے تھے یا اس پاس ہوتے تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ ان کی نازیبا تصویر میرے ذہن میں آ جاتی۔ جب کہ میں اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ کبھی کبھی میں مجھنبلا جاتا تھا۔

ان ہی دنوں مجھے آفس کی طرف سے بکھڑائینگ کے لیے لاہور بھیجا گیا۔ جب مجھے بتایا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے تہہ پٹی چاہیے تھی جو اس طرح ملے گی۔ یہ تین ہفتے کا کورس تھا۔ ہمیں باہر سے بعض ہارڈ ویئر کمپنیوں نے ایک بڑا سافٹ ویئر آرڈر دیا تھا اور یہ ٹرینگ اسی کے سلسلے میں تھی۔ میں تین ہفتے لاہور میں رہا۔ پھر دفتر والوں کی طرف سے ایک گروپ ناردرن ایئر لائن چارہ تھا مجھے بھی اس میں شامل کر لیا گیا اور میں تقریباً پانچ ہفتے بعد واپس آیا۔ مگر والے اور خاص طور سے راحیلہ بے تابی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ کبھی اسے مرے مجھ سے دور نہیں رہی۔ سیکے بھی جاتی تو مشکل سے دو دن میں لوٹ آتی تھی۔ اس مرے میں جو باتیں جمع تھیں کرنے کی وہ کر رہی تھی۔ حالانکہ وہی فون پر بات ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اس کا دل نہیں بھرا تھا۔ اچانک وہ بولی۔ ”ایک بات تو بتانا بھول ہی گئی۔ گفتہ ہائی یہاں سے چلی گئی۔“

میں چونکا ہوا ٹوک چلے گئے۔ کب... کہاں؟

”مجھے ہونے آج چار دن ہو گئے ہیں کسی کو نہیں معلوم کہ کہاں گئے ہیں۔ اب کوئی نہیں معلوم۔۔۔ انہوں نے گری

ملہنامہ سحر جگشت

نہیں کاروبار بھی فروخت کر دیا ہے۔“

میں حیران رہ گیا۔ ”ایسا کیا کہہ چاہا کہ میں چلے گئے؟“

”جی تو کچھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ابھی ایک ہفتے پہلے تک تو سب ٹھیک تھا۔“

”ہاں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔“ ”پھر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟“

”خاص بات یہ کہ قیصر صاحب ابو کے بہت نزدیک تھے اس کے باوجود انہوں نے ابو کو کبھی نہیں بتایا کہ وہ کیوں سب بچ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔“

اس طرح اچانک جانے میں کوئی بات تو ہے۔ ورنہ کون یوں ایسا بے بسا بے بسا گھر ترک کر کے جاتا ہے۔ جن صاحب نے ان سے یہ مکان خریدا تھا ان کی قیامت اس علاقے میں اسے بڑے مکان کی قیمت سے پندرہ لاکھ کم تھی اور شاید اسی وجہ سے راتوں رات مکان بکا تھا۔ قیصر صاحب نے کاروبار بھی اسی طرح فروخت کیا تھا۔ اس کے بعد وہ کہاں گئے کسی کو علم نہیں تھا۔ ابو اور ہمارے گھر والوں کے پاس ان کے بچنے کو شک شک نہ رہتے تھے وہ سب آ رہا ہے تھے مگر سب بند جا رہے تھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ماضی سے ہر تعلق توڑ کر یہاں سے گئے تھے۔ اسی وجہ سے ہر نشان اور پتا مٹا کر گئے تھے۔ کوئی قفسی قدم نہیں تھا جو بتاتا کہ وہ کس طرف گئے تھے۔ بہت دن تک ہم حیران رہے تھے کہ وہ کہاں چلے گئے۔ ان کا ذکر ہوتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ انسانی لسیاں نے ان کی یاد دھندلی کر دی اور بالآخر وہ تقریباً بھول ہی گئے تھے۔ اب شاید ہی ان کا ذکر ہوتا تھا۔

راحیلہ نے بیٹے کو قہم دیا تو سب بہت خوش تھے۔ اس خوشی میں ابو نے شاعرانہ حقیقت کیا۔ سامنے خانہ ان اور جاننے والوں کی دعوت کی تھی۔ اس میں ابو کے وہ واقف کار بھی آئے تھے جو ان کے ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ قریب ایک لاکھ میں تھی۔ میں سب سے مل رہا تھا اور مبارک ہادیں وصول کر رہا تھا۔ جب اس میز کے پاس پہنچا جس پر ابو کے واقف کار بیٹھے تھے تو نعمان الکل نے اچانک کہا۔ ”بارہ قیصر صاحب نہیں تھے جہاں چاک کاروبار بچ کر چلے گئے۔“

”ہاں وہ تو میرے پڑوسی تھے؟“ ابو چلے گئے۔

”پارٹنر کو بچلے دنوں لاہور میں دیکھا۔“

”تم طے ان سے؟“

”نہیں... میں جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا اس کے سامنے سے ہائیگ پر جا رہا تھا۔ طیارہ خراب لگ رہا تھا شاید بھی بڑی

اگست 2014ء

233

ہوئی تھی۔

”پار نہیں دھوکا ہوا ہوگا۔ میں نے آج تک قیصر کو خراب چلے میں نہیں دیکھا۔“ ابو نے کہا۔

”تم جانتے ہو مارکیٹ میں میرا اس کا کئی گھنٹوں کا ساتھ ہوتا تھا۔ ہم ایک ہی کام تو کرتے تھے۔ میں اسے نہیں پہچانوں گا۔ پھر میں نے اسے آواز بھی دی تھی اور اس نے جاتے ہوئے سرگھا کر دیکھا بھی تھا۔ اگر وہ قیصر نہیں تھا تو نام پر سرکیوں گھا کر دیکھ۔“ نعمان اکل نے دلیل سے کہا۔

”بھئی وہ جس طرح گیا ہے لگتا تو ایسا ہے کہ شہر یا ملک ہی چھوڑ گیا ہوگا۔“ ابو کے ایک اور دوست نے کہا۔

”اسی شہر میں رہے ہوئے پہچنا آسان نہیں ہے۔ وہ قیصر ہی ہوگا۔“

اس کے بعد اس پر بات شروع ہو گئی کہ قیصر صاحب اس طرح کیوں گئے تھے۔ اکثر کی رائے تھی کہ انہوں نے کوئی چکر چلایا تھا یا ان سے کوئی کھپلا ہو گیا تھا۔ وہ آنے والی مصیبت یا کوئی کارروائی سے بچنے کے لیے اس طرح روپوش ہو گئے۔ مگر ان کے جانے کے بعد مفروضہ کھپلا سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ یہ تقریب کا موقع تھا اس لیے موضوع زیادہ طویل نہیں کیج سکا اور کچھ دیر میں کھانا لگ گیا تو لوگ سب بھول کر کھانے میں لگ گئے تھے۔ بعد میں ابو نے کہا کہ انہیں یقین نہیں آ رہا کہ نعمان صاحب نے قیصر صاحب کو دیکھا ہوگا۔ ”وہ اپنا تک سب سے خیال رکھنے والا شخص ہے، مارکیٹ میں جہاں کروڑ پتی اور ادب پتی چلے چلے میں بیٹھتے ہیں وہ صاف ستمور ہوتا تھا۔“

”ابو صاف ستمورے تو آپ بھی رہے ہیں۔“

”ہاں صاف ستمورے جاتے ہیں آتے ہوئے دیے نہیں دے رہے ہیں۔ وہ تو جیسا جاتا تھا ویسا ہی آتا تھا۔“

یہ تو اب ہلکے کہہ رہے تھے۔ شام کو قیصر صاحب آتے تو لگتا جیسے کسی اے سی آفس سے اٹھ کر آ رہے ہیں۔ اب پتا نہیں یہ کج تھا یا نعمان اکل کو دھوکا ہوا تھا۔ اس کے بات شاذ ہی ان کا ذکر ہوتا تھا۔ تھا شامیر کیا آیا کہ راحیلہ سب کو بھول کر اس میں ہی لگ گئی۔ دوسروں کا کیا کہنا بھی بھی مجھے ہی نظر اٹھا کر جاتی تھی۔ میں نے ان ہی دنوں ایک بچہ نرسی سے ایونک میں ایم سی ایس شروع کر دیا۔ وہ بچے میں نے کوہس بھی کیے تھے اور میرا تجربہ بھی خاصا ہو گیا تھا مگر آگے جانے کے لیے لاگنی لازمی ہوتی چاہیے اس لیے میں نے ماسٹر میں داخلہ لیا تھا۔ آنے والے دو سال بہت نص

گزرے تھے۔ صبح سے شام تک آفس اور پھر وہاں سے بچہ نرسی اور وہاں سے رات گئے دانیسی پر چکن آئی ہو چکی ہوئی تھی کہ راحیلہ اور شامیر سے بس دو باتیں کرتا اور آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ اتوار یا چھٹی کا دن مخصوص مصروفیتوں میں گزر جاتا۔ بعض اوقات تو خود اپنے لیے بھی وقت نہیں ملتا تھا۔

شروع میں تو راحیلہ نے اتنا محسوس نہیں کیا مگر جب شامیر چلے پھر نے لگا۔ اور اس کا بیشتر وقت داد و ادائی اور پھولی کے پاس گزرتا تو وہ اب پور ہونے لگی تھی اور اس کا ہر دوسرا سوال اسی بارے میں ہوتا تھا کہ یہ سلسلہ کب ختم ہوگا۔ میں اسے بھلاتا لکھ دیتا کہ جلد ختم ہو جائے گا۔ سچی بات ہے کہ ٹو دھیرا دل بھی ادب گیا تھا۔ آدمی کام بھی کرے اور پڑے بھی تو یہ کام اس صورت میں آسان نہیں ہے جب آدمی اکیلا ہو، میرے ساتھ تو بیوی اور بچہ تھا۔ بہر حال خدا خدا کر کے یہ وہ سال گزرے اور میرا ایم سی ایس مکمل ہو گیا۔ میں نے اور راحیلہ نے سکون کا سانس لیا تھا۔ شامیر خوش تھا کہ اب پاپا آفس سے جلدی آ جاتے ہیں۔ سب سے بڑی بات کہ مجھے اس لٹ کا فوری صلہ بھی ملا تھا اور مجھے اپنے شعبے میں شہر کی پوسٹ پر ترقی دی گئی تھی۔ تھوڑے تقریباً دو گنی اور دوسری مراعات بھی تھیں۔ مگر مسئلہ یہ تھا مجھے لاہور جانا تھا۔ یعنی یہ ترقی ہیڈ آفس ہاؤس سے شروع تھی۔ میں جھگھا رہا تھا۔ راحیلہ کا خیال تھا کہ مجھے مان لینا چاہیے۔ میں نے ابو سے پوچھا تو انہوں نے بھی یہی کہا اور میں نے ہاں کر دی۔

گھر والوں سے دور جانا کتنا مشکل ہوتا ہے یہ مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا جب میں کوہس کے لیے لاہور گیا تھا۔ اسی ابو سے دور نہیں رہا۔ شادی کے بعد بھی ان کے ساتھ رہا تھا اس لیے لاہور جانے کے بعد بہت دنوں تک اداس رہا تھا۔ اگر راحیلہ اور شامیر نہ ہوتے تو شاید میں یہ ترقی ٹھکرا کر بھاگ آتا۔ پہلے میں خود گیا تھا اور جب رہائش کا بندوبست ہو گیا تو میں نے راحیلہ اور شامیر کو بلوا لیا تھا۔ رہائش کرائے کی تھی مگر اس کا کرایہ پہنی ہوئے رہی تھی۔ اسی طرح مجھے گاڑی دی گئی تھی۔ تھوڑا دیر سے ہی اچھی تھی اب دو گنی ہو گئی تھی۔ رہائش گاہرگ میں ایک چھوٹی کوٹھی کا چھلا پورشن تھا۔ اوپر مالک مکان رہتا تھا۔ اس میں دو بیڈروم کے ساتھ لاؤنج اور ڈرائنگ روم تھا۔ ملاقات بہت اچھا تھا اور یہاں سارے پڑھے لکھے اور سچے ہوئے لوگ رہتے

ابن الکیم نے بتایا کہ روٹی سیدھے غلوٹ میں
سڑ کرتی ہے اور اسے گزرنے کے لیے کسی نہ کسی واسطے
کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ واسطے تین قسم کے ہوتے
ہیں۔ شفاف، نیم شفاف اور غیر شفاف۔ ابن الکیم نے
سب سے پہلے یہ بتایا کہ جب روٹی کی سوراخ میں سے
گزرتی ہے تو وہ سامنے کے پردے پر اس جسم کا الٹا
عکس بناتی ہے جس میں سے کہ وہ آ رہی ہو گویا اس نے
سولی چمید کمرے کا تصور پیش کیا۔

انتہاس: تا ظہرات اسلامی سائنس انڈیا انٹرنیشنل ورلڈ
میں دیکھا اور آج اس کی تصدیق ہو گئی۔ وہ قیصر صاحب ہی
تھے اور ان کی حالت ابھی نہیں گئی۔ یہ کھڑا ہائیک ویکھ رہی
ہو یہ ان ہی کی ہے۔

”وہ ابھی وہ تو بہت برے حال میں ہیں۔“
”ایک بیک اٹھائے اندر مارکیٹ کی طرف مجھے
ہیں۔“ میں نے کہا۔

راجیل کو بھی جھٹس ہو رہا تھا اس لیے ہم کچھ دیر وہاں
کھڑے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ وہ واپس آئیں۔ مگر
آدھا گھنٹہ گزر گیا اور ان کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہیں
آئے۔ راجیل تھک گئی تھی اور لب شامیر بھی خد کر رہا تھا۔
اسے آٹس کریم کھلانے کا دوا سادے کر لائے تھے۔ مجبوراً
ہمیں دہاں سے روانہ ہونا پڑا۔ میرے ذہن میں وہ رو کر
قیصر صاحب کا رخ لہجہ گھوم رہا تھا۔ ایسی کیا بات تھی جو میرے
علم میں ہوئی چاہے کئی گز نہیں تھی۔ ذہن پر بہت زور دیا مگر
کچھ میں نہیں آتا۔ ہم واپس گھر آ گئے تب بھی یہ بات میرے
ذہن پر سوار رہی تھی۔ بلکہ اگلے دن جب میں دفتر میں تھا
تب بھی سوچتا رہا تھا۔ میرے ساتھ دو نو جوان لڑکے کام
کرتے تھے۔ وہ میرے ماتحت تھے اور میں انہیں کام دیتا
تھا۔ میں کام بھی کرتا تھا اور ان کے کام کی نگرانی اور سپر
ویشن بھی کرتا تھا اس لحاظ سے میری ذمہ داری دو گنی تھی مگر
یہ میری پوسٹ کا تقاضا تھا اور اسی کی مجھے تنخواہ دی جاتی
تھی۔ ہمیں ایک بڑا کمرہ دیا گیا تھا۔ اس میں پارٹیشن کی عدد
سے میرا کمین الگ تھا اور ان دونوں کا حصہ الگ تھا۔ میں
شام کے وقت نکل رہا تھا اور کمین سے باہر آتا تو وہ دونوں
مانیٹر پر جھکے ہوئے تھے۔ اس کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا
اور اس پر جو سحر تھا وہ اس چھوٹے سے حصے سے بھی دکھائی
دے رہا تھا۔ یہ مقامی لڑکیوں اور عورتوں کی نازیبا تصاویر

تھے۔ راجیل نے چند دلوں میں ملے والوں سے ابھی خامی
سلام دعا کر لی تھی اور اس کا وقت اچھا گزرنے لگا تھا۔ چھٹی
والے دن ہم خریداری کے لیے جاتے تھے کیونکہ جانا گھر تھا
تو کسی نہ کسی چیز کی سامنے آتی رہتی تھی۔ اس دن بھی ہم
شاپنگ کے لیے نکلے تھے مگر راجیل کو اپنی شاپنگ کرنی تھی۔
گرمیوں کی آمد تھی اور وہ گرمی کے لحاظ سے کپڑے لینا
چاہتی تھی۔ ہم اتارنگی مارکیٹ میں تھے۔ راجیل ایک شاپ پر
کپڑے دیکھ رہی تھی اور میں شامیر کو لیے باہر فٹ پاتھ پر
کھڑا تھا۔ اچانک ہی سامنے ایک بانگ رکی اور اس سے
گرتے شلوار میں ایک ہارٹس شخص اتر ا۔۔۔ پال سلید ہو
رہے تھے اور چہرے سے مسکن کے آثار نمایاں تھے۔ میں
اسے دیکھ کر دو گ رہ گیا کیونکہ وہ قیصر صاحب تھے۔

میں بے اختیار ان کی طرف بڑھا۔ ”قیصر صاحب یہ
آپ...؟“

انہوں نے چمک کر مجھے دیکھا اور ایک بڑا سا ہلکا
شوٹ کا بیک اتار کر آگے بڑھے۔ میں ان کے راستے میں
آ گیا۔ ”قیصر صاحب آپ مجھے پہچانے نہیں؟ میں شمس
احمد ہوں، جزو احمد کا بیٹا۔“

”میں نے پہچان لیا ہے۔“ انہوں نے کہا اور مجھ سے
کھڑا کر آگے بڑھے میں نے پھر راستے میں آ کر انہیں روکا۔
وہ مجھ سے نظریں ملانے سے گریز کر رہے تھے۔

”قب ایسا کیوں کر رہے ہیں کیا ہمارے درمیان وہ
تعلق ختم ہو گیا ہے۔“

”ہاں کیونکہ اب میں کسی سے تعلق رکھنے اور کسی کو رو
دکھانے کے لائق نہیں رہا ہوں۔“

”ایسی کیا بات ہوگی قیصر صاحب؟“

”کیا تم نہیں جانتے یا جان پوجہ کر میرے دلوں پر
تھک چڑک رہے ہو۔“ انہوں نے رخ لے کر مجھ میں کہا اور میرے
پاس سے بڑھ کر آگے چلے گئے تھے۔ اس بار میں انہیں نہیں روک
سکا تھا۔ اسی لمحہ راجیل آ گئی۔ وہ مجھے تلاش کر رہی تھی۔

”واہ میں دکان میں تھی اور آپ قانع ہو کر یہاں
فیل رہے ہیں۔“

”راجیل میں نے ابھی قیصر صاحب کو دیکھا ہے۔“

”گفتہ ہائی کے شوہر؟“ وہ بھی حیران ہوئی

تھی۔ ”وہ یہاں کہاں سے آ گئے؟“

”شامیر کے حقیقی میں نعمان اگل نے کہا تھا کہ
انہوں نے قیصر صاحب کو لاہور میں اور بہت برے حال

اور پھر میں ایک کے بعد ایک تصویر دیکھتا رہا۔ آگے ناقابل بیان قسم کی تصاویر تھیں اور بعض میں قیصر صاحب بھی تھے۔ یہ تصویریں اب سے چار سال پہلے اپ لوڈ کی گئی تھیں۔ میں نے سائٹ کی ریٹنگ چیک کی۔ اب تو خاص نہیں مگر چار سال پہلے اس کی ریٹنگ بہت زیادہ تھی اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ یہاں روزانہ آتے تھے۔ یہ ایک سائٹ تھی۔ میں نے چیک کیا کہ یہ تصاویر حریف کتنی سائٹس پر تھیں تو ایسی درجنوں سائٹس نکلیں۔ ان سب پر یہ تصاویر چار سال پہلے لوڈ کی گئی تھیں۔ میں نے سرچام لیا۔ اب میں جان گیا تھا کہ شرنے کیوں خودکشی کی تھی۔ اس نے یقیناً یہ تصاویر دیکھ لی تھیں اور شاید اپنے اسی دوست کے ساتھ دیکھی تھیں جس کے گھر وہ گیا تھا۔ اس سے یہ بے عزتی برداشت نہیں ہوئی اور اس نے گھر آ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

میں نہیں جانتا کہ یہ تصاویر کسے قیصر صاحب کے لب ٹاپ سے نکلیں اور انٹرنیٹ پر آئیں مگر یہ واضح تھا کہ ان کے گھر کی باقی اور درجہ پوری میں ان تصاویر کا ہی ہاتھ تھا جو انہوں نے شوقینی بن لی تھیں۔ اکثر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں اور وہ اس کے نتائج کے بارے میں سوچتے ہی نہیں ہیں۔ لیکن وجہ ہے کہ انٹرنیٹ ایسے مواد سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے لوگوں کو اس حوالے سے اب بھی محفل نہیں آتی ہے۔ میں سرگزشت کے ان صفحات کے توسط سے لوگوں سے اپیل کرتا ہوں خدا ارچہ لمحے کی تفریح کے لیے خود کو اور اپنے گھر کو داؤ پر مت لگائیں۔ خاص طور سے شادی شدہ جوڑے۔ یہاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں اس لباس کو یوں سر عام مت اتاریں۔

شمارہ جولائی 2014ء کی منتخب کتابچا

ہندی جنریشن - آپ کا انتخاب

☆ **اول:** پھر وہی غلطی..... لے پیل (لاہور)

☆ **دوم:** بے حس..... شاہد صدیقی (کراچی)

☆ **سوم:** وارث..... ذرینہ (لاہور)

پہلے دیکھ لیں کہ آپ کی منتخب کتابچہ ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

تھیں۔ مجھے طعنا گیا۔
 ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو انہوں ہلکا ساٹ بند کر دی اور مجھ سے محذرت کرنے لگے۔ میں نے ان کو کچھ سنا نہیں اور پھر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کچھ کہنا پکار تھا۔ انہیں کرنا وہی تھا جو ابھی کر رہے تھے مگر اس واقعے سے اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ جیسے جیسے میں اس پر سوچتا رہا مجھے لگا کہ یہی بات ہے۔ میں گھر آیا تو راحیلہ ڈنر تیار کر رہی تھی اور شامیر بہت خوش گھوم رہا تھا میں نے پوچھا۔
 ”یہ کس پلنگر میں ہے؟“

”شادیب کی ساگرہ ہے۔“ راحیلہ نے کہا۔ ”مکے کے بچوں کو بلا دیا ہے۔“ میں اور شامیر بھی جائیں گے۔
 ”ابھی؟“

”ہاں بس ایک کانٹے کی تقریب ہے۔“ وہ بولی۔
 ”آدمے کھنے میں آ جائیں گے۔“

مجھے خیال آیا کہ یہ اچھا موقع ہے۔ راحیلہ اور شامیر کی غیر موجودگی میں آرام سے کام کر سکوں گا۔ کھانے کے بعد راحیلہ بھی ہلکا پھلکا تیار ہوئی، شامیر پہلے سے تیار تھا۔ شادیب مالک مکان کے چھوٹے بیٹے کا نام تھا۔ وہ شامیر کا ہم عمر ہی تھا۔ ان کے جاتے ہی میں نے اپنا لب ٹاپ آن کیا اور انٹرنیٹ پر سرچنگ کرنے لگا۔ یہ آسان نہیں تھا کیونکہ اس قسم کا اتنا مواد آگیا ہے کہ اس میں کوئی خاص چیز تلاش کرنا محنت والا کام ہے پھر یہ سب دیکھنا بھی آسان نہیں تھا۔ مجھے سائٹس کا پتا نہیں تھا اس لیے میں سرچنگ کی مدد لیتا رہا۔ مگر آدمے کھنے بعد بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میں تھک ہار کر چھوڑنے والا تھا کہ آخری ویب سائٹ پر مجھے ایک لنک نظر

آیا۔ اس پر کلک ہوا تھا۔ پاکستانی ہاؤس وائلٹ پیکچرل پاکستانی ہو پوں کی تصویریں (میں نے اس لنک کو اوپن کیا۔ یہ ایک پرانی سائٹ تھی جسے اب ڈیٹ ہوئے بھی تین سال سے زیادہ وقت رہا تھا۔ اس میں تصویروں کے فولڈرز تھے۔ فولڈر پر نام بھی لکھے ہوئے تھے۔ پھر ایک فولڈر دیکھ کر مجھے لگا کہ میں کامیاب رہا تھا اس پر گفتہ لکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ لکھے الفاظ نہایت دلہنیا اور ناقابل بیان تھے۔ میں نے فولڈر اوپن کیا تو اندر درجنوں تصاویر تھیں۔ پہلی تصویر گولی، یہ گفتہ کی ہی تھی۔ مگر اس تصویر سے کہیں زیادہ عریاں تھی جو میں نے چار سال پہلے دیکھی تھی



منجیور

جناب مذہر اعلیٰ سرگزشت!
سلام تہ نیت!

میں اپنے ایک دوست کا واقعہ ارسال کر رہا ہوں۔ اسے پڑھ کر آپ
بہس لطف اندوز ہوں گے۔ اس نے صحافی بننے کے چکر میں کس
طرح ٹھوکر کھائی، آج کل کے یہ دو نمبری لوگ کس طرح ہوام کو بی
وقوف بنارہے ہیں۔ سبق حاصل کرنے کے لیے اسے ضرور پڑھیں۔

ابرار احمد
(سہالکوٹ)

میرا تعلق ایک میگزین سے تھا۔
آپ نے بھی اس قسم کے بے شمار میگزین دیکھے ہوں
میں۔ میگزین نکالنے والوں کے پاس پیسے نہیں ہوتے۔ بس کسی
طرح ڈکریشن حاصل کر کے کوئی مخفی اسم کا میگزین نکالنا شروع
کر دیتے ہیں۔

ایسے میگزین میں ہندوستانی اور ہالی ووڈ کے اداکاروں
کی نیم عریاں تصاویر ہوتی ہیں،، ماڈل اور بچوں کو بے وقوف
بنانے کے ٹوکے ہوتے ہیں۔ اور کچھ اگلے سیدھے مضامین

ہوتے ہیں۔
 ان کی تو کیپٹننگ بھی ہوتی ہے علاوہ پر فٹنگ۔ بس
 کام چلنا ہوتا ہے۔ کسی طرح دھچکوں اور پھرج جیسے ریز کے
 اشتہارات مل جاتے ہیں اور نام ہوتا ہے کہ لائن آؤی رسالہ
 لانا ہے۔ مسمانی ہے۔ دلیر و دلیر۔
 تو ان دنوں میں بے روزگار تھا۔ جب مجھے اسی قسم کے
 ایک میگزین میں چاہ مل گئی تھی۔ اس میگزین کا نام "چمک
 دک" تھا۔ میں نے جب خورشید صاحب سے اس نام کی وجہ
 پوچھی تو مسکرا دیے۔
 واضح ہو کہ خورشید صاحب ہی اس کے مالک، ایڈیٹر اور
 کیپر ر بھی تھے۔ ان کے علاوہ ان کی بیگم بھی اس بے کار کام
 میں ان کا ہاتھ بٹا کرتی تھیں۔
 ایک چھوٹا سا کمراد دفتر کے طور پر استعمال ہوا کرتا۔ یہ کمر
 ان کے کمر میں ہی تھا۔ میں نے جب خورشید صاحب سے
 چمک دک کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا۔ "میں نے یہ نام اس
 لیے رکھا ہے کہ اول تو اس نام کا کوئی میگزین پھر سے پاکستان
 میں نہیں ہے دوسرے یہ کہ مجھے اس کا مستقبل شاندار نظر آ رہا
 ہے۔ یہ ضرور چمکے اور دکے گا۔"
 اب اس کے بعد میں کیا کہہ سکتا تھا۔
 "بھائی۔ تم کل سے کام شروع کر دو۔" خورشید صاحب
 نے کہا۔
 "لیکن میرا کام کیا ہوگا۔ سارا کام تو آپ خود کر لیتے
 ہیں۔"
 وہ بہت زور سے فیس دیے۔ "نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں
 ہے۔ اب بھی بھی بہت کام ہیں۔ مثال کے طور پر جتنے مضامین اور
 کہانیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کو سارٹ آؤٹ کرنا۔ لیڈ میں
 جا کر لوگوں کے اندر پوز لینے پر فیس کاپی لے جانا۔ اپنی مگرلی
 میں چھوڑنا اور ساری کاپیاں اٹھا کر گھر لانا۔"
 "اور میری تنخواہ کیا ہوگی۔"
 "بھائی۔ جب یہ میگزین خود مجھے کچھ نہیں دے رہا تو پھر
 جیسے کیا دے گا۔"
 "کیا مطلب ہے آپ کا۔ یعنی میں فوری میں کام کروں
 گا۔"
 "نہیں۔ فوری میں تو نہیں۔ وہ پھر کا کھانا ہمارے ساتھ
 کھاؤ گے اور چائے پتی رہے گی۔ اس کے علاوہ آنے جانے
 کے لیے ہزار روپے دے دیا کروں گا۔"
 "یہ تو بہت کم ہیں خورشید صاحب۔" میں نے احتجاج

کیا۔
 "جیسے معلوم ہے کہ میں نے جس بندے کو کل اعتراض
 کے لیے بلایا تھا۔ اس نے کیا آفر دی ہے۔"
 "نہیں تو آپ ہی بتادیں کیا آفر تھی۔"
 "اس نے یہ کہا تھا کہ وہ چھ مہینے تک ایک پیرا میں لے
 گا اور دھچک کا کھانا اپنی طرف سے کھائے گا۔"
 "یعنی اللہ رکھائے گا۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔
 "ہاں۔" خورشید صاحب کی مسکراہٹ اور گہری
 ہو گئی۔ "ہر روز وہی پیسے خرچ کرتا۔"
 "تو پھر آپ نے اس کو چاہ کیوں نہیں دی۔"
 "اس لیے کہ وہ میری بیوی کو آنکھیں پھال چلا کر دیکھ رہا
 تھا۔" خورشید صاحب نے بتایا۔ "اور مجھے ایسے بدتمیز لوگ پسند
 نہیں ہیں۔"
 "تھیک اسی وقت خورشید صاحب کی بیگم چائے لے کر
 آئیں۔ اور میرا دل چاہا کہ میں اس شخص کو گولی مار دوں جو ایسی
 بدتمیزی اور خبیث صورت صورت کا آنکھیں پھاڑ چلا کر دیکھ رہا
 تھا۔ کیا گھٹیا آدمی پایا تھا اس نے۔"
 "آپ نے اچھا کیا جو اسے چاہ نہیں دی۔" میری
 زبان میں دھچک مچی تھی۔
 "وہ کیوں۔"
 "اس لیے کہ ایسا بد آدمی اس قابل ہی نہیں ہے کہ
 کہیں لو کری کرے۔" میں نے کہا۔
 اس وقت خورشید صاحب کی بیگم چائے رکھ کر واپس
 جا چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میرے اس بے لاگ تھمرے پر
 خورشید صاحب خفے سے ہنرک اٹھیں گے، اس کی بجائے
 انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "میرے
 عزیز۔ میں خود بھی اس کی بد آدمی پر ماتم کرتا رہا ہوں۔"
 خورشید صاحب نے ایسی بات کہہ دی کہ میں فیس پڑا۔
 کیا سہائی تھی۔
 "اچھا تو بتاؤ۔ کیا سوچا ہے تم نے ہمیں جو ان کرنے
 کے بارے میں۔" خورشید صاحب نے پوچھا۔
 "جناب۔ میرے پاس کوئی آپشن نہیں ہے۔" میں نے
 کہا۔ "میں تیار ہوں۔ آپ یہ بتائیں میرا سب سے پہلا کام کیا
 ہوگا۔"
 "تم کل صبح میرے ہاتھ کے شلہ کا اندر دیکھو گے۔" خورشید
 صاحب نے بتایا۔
 "میں نے میرے ہاتھ کے شلہ کا نام بہت سنا تھا۔ ان کے

دہار میں نائی گرامی سیاست دان اور پیرو کرٹس حاضر ہوا کرتے تھے۔ وہ ایک پورفل قسم کے چہرے تھے۔ دہار کے بارے میں یہ بھی سنا گیا تھا کہ ان کی خبریں تو اخبار میں آتی ہیں۔ لیکن وہ کسی کا اعتراض نہیں دیتے۔

"ہاں تو کیا سوچنے لگے۔" خورشید صاحب نے پوچھا۔
"آپ نے پہلا ہی ہنسک اتنا خطرناک دے دیا ہے کہ میں جو کھلا کر رہ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم اسے اپنے لیے منتخب کچھ سکتے ہو۔" خورشید صاحب مسکرا کر بولے۔ "چلو۔ میں یہاں تک کہہ رہا ہوں کہ اگر تم ان کا انٹرویو لینے میں کامیاب ہو گئے تو میں اسی وقت تمہیں دہرہ دے دوں گا۔"

یہ ایک بڑی لالچی تھی۔ دہرہ اس زمانے میں میرے لیے بہت تھے۔ میرے بہت کام لگ سکتے تھے۔

"ٹھیک ہے جناب۔" میں نے منتخب قبول کر لیا۔ لیکن اس کے لیے مجھے بہت دیکار ہوئی۔ کچھ ہوم ورک کرنا ہو گا۔
"کیا ہوم ورک۔"

"یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ یہ بزنس پکرت ہے۔" میں نے کہا۔

"چلو یہ بھی منظور۔ اب تم اپنے جوہر دکھاؤ۔"
میں گھر واپس آ کر بہت دیر تک پلاننگ کرتا رہا کہ یہ انٹرویو کس طرح لیا جاسکتا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں سنا تھا کہ بہت ہی بے ادب قسم کا انسان ہے۔

خبروں کے علاوہ کسی صحافی، رپورٹر کو اپنے آستانے میں آنے ہی نہیں دیتا۔ اس کو بہت ہوشیاری سے قابو کرنا تھا۔ بہر حال میں دوسرے دن میرے ہاتھ شاد کے آستانے پر پہنچ گیا۔ آستانہ کیا ابھی خاصی بڑی کوئی تھی جس کے گیٹ پر دو دو سلاخ گارڈ کھڑے ہوئے تھے۔

اور گیٹ پر ہی ایک نوٹس لگا ہوا تھا جس پر خورشید صاحب سے ملاقات کے اوقات گھمے ہوئے تھے۔ صبح نوے گیارہ بجے سیاست دانوں اور پیرو کرٹس کے لیے۔ پھر سہ پہر تین بجے سے شام چار بجے تک تاجروں اور صنعت کاروں کے لیے۔ شام سات سے رات نو بجے عام افراد کے لیے۔ اور نوے دس بجے پھر سیاست دانوں کے لیے۔ اس کے بعد خورشید صاحب آرام اور اپنے وظائف کے لیے تفریبات لے جاتے تھے۔

میں چونکہ ایک عام انسان کی حیثیت سے ملنے والا تھا۔ اس لیے مجھے شام سات بجے آنا تھا۔ میں اس شام سات بجے پہنچ گیا۔ گیٹ پر بہت سے لوگ تھے۔ یہ سب عام لوگ تھے

چونکہ عام طور پر عام لوگ پریشان حال ہی ہوا کرتے ہیں۔ اسی لیے سب ہی پریشان حال تھے۔

گیٹ کے ساتھ ایک کٹھری تھی۔ جس کی کٹھری باہر کی طرف نکلتی تھی۔ اس کے اندر ایک آدھی بیٹھا ہوا نوکھن دے رہا تھا۔ خورشید صاحب سے ملنے والے باقاعدہ نوکھن لے کر چلا کرتے تھے۔

گیٹ کے ساتھ ایک بڑا سا شینڈ تھا۔ نوکھن لے کر اندر جانے والے اس شینڈ کے نیچے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ چلا کرتے۔ پانچ گارڈ تھے۔

اس کے بعد باقاعدہ اعلان کیا جاتا۔ نوکھن نمبر 12 نوکھن نمبر چالیس، وغیرہ وغیرہ۔ جس طرح لاکٹرز کے یہاں لاکٹروں میں ہوا کرتا ہے۔

پھر ملاقاتی اندر چلے جاتے۔ یہاں خورشید صاحب اسے شرفِ ملاقات بخشا کرتے۔ میرا نمبر اٹھارہ تھا۔ اسی لیے مجھے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔

میں خورشید صاحب سے ملنے کے لیے ہوم ورک مکمل کر کے گیا تھا۔ معاملہ منتخب کا تھا۔ ایک بندے نے اس کمرے تک درجہائی کی جس میں خورشید صاحب اپنی پہری شان کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔

وہ خامے صحت مند انسان تھے۔ مطلقاً احمد یونی صاحب نے ایسے بزرگوں کے لیے ایک بہت عمدے کا جملہ کھسا ہے کہ ان کی صحت کا دانا یہ ہے کہ یہ سادہ کھانے اور ورزش سے پرہیز کرتے ہیں۔

خورشید صاحب ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھے تھے۔ جس پر ایک بے دارغ سفید چادر بھی ہوئی تھی۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بے تحاشہ ان کے بعد سے صحت مند ہاتھ چھنے شروع کر دیے۔

"بس مل گئی۔ مل گئی۔ اب مجھے کہیں نہیں جتا۔ آپ ہی کے پاس بھیجا گیا ہوں۔ اور برسوں کے بعد روشنی ملی ہے۔ آپ ہی ہیں۔ سو فیصد اور آپ۔ آپ کے علاوہ کوئی اور ہی نہیں سکتا۔"

"بات کیا ہے۔ کیوں اتنے بے قرار ہو رہے ہو۔" خورشید صاحب نے نرمی سے پوچھا۔

"حضور۔ مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے۔" میں نے بہت سادہ ہو کر بتایا۔

"کس نے بھیجا ہے۔"

"حضرت ہوشیار شاہ قندوری نے۔" میں نے بتایا۔ "ناگہد والے۔"

ہے یہ سب۔ یہ میرا پناہ اور الماس یہ کیسے اشارے ہیں۔
"حضور۔ مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"
میں نے ہاتھ باندھ لیے۔ "مجھے جو حکم دیا گیا تھا وہ میں نے
آپ تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا۔"
"اچھا یہ بتاؤ۔ یہ قلندری بابا کا حوالہ کہاں ہے۔" میرے
صاحب نے مجھے گریبے کی کوشش کی۔

"حضور۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ناگپور کے فوارج
میں ہے۔" میں نے بتایا۔ "اکثر خواب میں دیکھا کرتا ہوں۔
اس کے علاوہ قلندر بابا سے بھی خواب میں ملاقاتیں ہوتی ہیں۔"
"قلندری بابا کا طیر بتاؤ، صورت کھل بتاؤ۔"

"حضور۔ آپ کیوں مجھنا چیز کا امتحان لے رہے ہیں۔
ایسے قلندر کھلے چروں کے ساتھ سامنے کہاں آتے ہیں۔ وہ تو
جب آتے ہیں ان کے چہرے پر غائب ہوتی ہے۔"

میرے صاحب واقعی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں
نہیں آ رہا تھا کہ میں کون ہوں، اور جو میں کہہ رہا ہوں اس کی کیا
حقیقت ہے۔

میں تو اپنا ہوم ورک کر کے گیا تھا۔ اسی لیے میں چاہتا تھا
کہ میرا پناہ اور الماس کون ہیں۔ یہ دراصل یازدہ حسن کی لڑکیاں
تھیں۔

میرے صاحب کے تعلقات میرا اور پنا سے تھے۔ جبکہ
الماس نے درمیان میں آ کر بارود کر دیا تھا۔ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ
چونکہ میرے صاحب کا تعلق اسی کے گاؤں سے تھا۔ اسی لیے میرے
صاحب پر اس کا حق زیادہ تھا۔

"ایک بات بتاؤ۔ کیا واقعی قلندری بابا نے میرا پناہ اور
الماس کے لیے اشارے دیے تھے۔" میرے صاحب نے پوچھا۔

"ظاہر ہے سرکار۔ ورنہ مجھے کیا معلوم کہ یہ کیسے
اشارے ہیں۔ آپ ہی بتائیں یہ کیسے اشارے ہیں۔" میں
نے التماس کر لیا۔

"بھائی۔ یہ معرفت کے درجات ہیں۔" میرے صاحب
نے اب اطمینان سے فرمایا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سرکار۔"

"تم بتاؤ۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"قلندری بابا کا حکم ہے کہ میں آپ کے دامن سے
وابستہ ہو جاؤں۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ قلندری بابا کا اشارہ سر آنکھوں پر۔"
میرے صاحب کچھ سوچ کر بولے۔ "لیکن کس طرح وابستہ
ہو گے۔"

"اوہ۔ ناگپور والے۔" میرے صاحب نے مجھ سے بھی
بڑھ کر مارا کیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کمرے میں چار پانچ آدمی
بھی تھے۔ یا تو وہ ساکین میں سے ہوں گے یا میرے صاحب کے
خاص بندے ہوں گے۔ اسی لیے میرے صاحب نے ایسے تھاک کا
مظاہرہ کیا تھا۔

"ہاں حضور نے کس لیے بھیجا ہے تمہیں۔" میرے صاحب
نے درپافت کیا۔

"خواب میں آکر۔ آپ نے شاید میرے دادا حضور کا
نام نہ سنا ہو۔ امجد شاہ بخاری۔ وہ قلندری بابا کے جانشین ہوا
کرتے تھے۔ اسی لیے قلندری بابا سے ہمارے خاندان کا بہت
قریبی رشتہ ہے۔"

"تو بابا قلندری تمہارے خواب میں آئے تھے۔" اس
بار میرے صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی حضور۔ انہوں نے مجھے آپ کی صورت دکھائی
تھی۔ آپ اس وقت الیکٹرک کے کعبے پر چڑھے ہوئے تھے۔"
"کیا۔" میرے صاحب کچھ جڑبڑھنے لگے تھے۔

"جی حضور۔ بابا قلندری نے آپ کی طرف اشارہ
کر کے فرمایا تھا کہ اس کو تلاش کر۔ جو روکنی پھیلانے کا کام
کرے گا۔ الیکٹرک کے کعبے پر چڑھنا اس بات کا اشارہ
ہے۔"

"سمعان اللہ سبحان۔۔۔۔۔" کمرے میں موجود دو چاروں
زور زور سے دودھ کرنے لگے۔

خود میرے صاحب بھی اپنی اس بزدلی سے متاثر ہونے لگے
تھے۔ اس بار انہوں نے بڑی شغف بھری نگاہوں سے میری
طرف دیکھا۔ "خدا جنت الفردوس میں جگہ دے قلندری بابا کو،
وہ اور کیا فرما رہے تھے۔"

"انہوں نے مزید فرمایا کہ میں آپ سے جا کر کہوں کہ
میرا اور پنا سے بہتر الماس ہے۔" میں نے بتایا۔

میں نے دیکھا کہ یہ سن کر میرے صاحب ہلک سے دھمکے
تھے۔

"واہ۔" میرے صاحب نے قلندری بابا کے لیے کہا۔ "میں
حضرت قلندری بابا کا اشارہ سمجھنے کی کوشش کروں گا۔" پھر انہوں
نے کمرے میں موجود افراد سے کہا۔ "آپ حضرات، دراپار
تشریف لے جائیں۔ مجھے اس نوجوان سے معرفت کی باتیں
کرنی ہیں۔"

ان کے جانے کے بعد میرے صاحب نے فرمایا۔ "آخر کیا

لال دیتے ہیں۔ جس سے اس کا نشی گنا بدھ جاتا ہے۔ اور وہ شراب خاص خاص لوگوں کے لیے لائی جاتی ہے۔ جبکہ عام لوگوں کے لیے عام شراب ہوتی ہے۔"

"کمال ہے۔ کیا پولیس کو شک معلوم؟" میں نے پوچھا۔
"سب جانتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جن خاص لوگوں کو وہ شراب معرفت پلائی جاتی ہے۔ وہ بڑے بڑے حاکم ہیں۔ اب کس میں اتنی اہمیت ہے کہ وہاں پہنچا دے۔"
"تو اب بتاؤ۔ کرنا کیا ہے۔" وہ صاحب تو بہت بڑا جرم کر رہے ہیں۔"

"یہ مگر اور جعلی اور پولیس سے تو نہیں لڑتا لیکن اپنی بدنامی سے بہت لڑتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "تم اب اس پر یہ ظاہر کر دو کہ تمہیں اس کا راز معلوم ہو گیا ہے اور وہ سارے اخبارات اور رسالوں کو بتا دیا جائے گا۔ پس اس سے کوئی کام نہیں کرنے کے لیے تمہارا اتنا کہنا ہی بہت ہوگا۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا۔"
"میں کے بعد میرے پاس دو تین راستے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ تمہیں خریدنے کی کوشش کرے گا۔ ظاہر ہے کہ تم اس کی باتوں میں نہیں آؤ گے اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ خود نشی کرے گا۔ جس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ بہت ہی اذیت قسم کا آدمی ہے۔ اور تیسرا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ راتوں رات یہاں سے بھاگ لے۔"

"تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ اذیت قسم کا آدمی ہے تو پھر ایسا کیوں کرنے لگا۔"

"اس لیے کہ ہمارے یہاں کے کسٹ معزفت جرم یا پکڑے جانے سے نہیں لڑتے۔ جتنا جرم کی پابندی سے لڑتے ہیں۔" اس نے کہا۔

اس کی بات سن کر میں نے ہنس دیا۔ میں اس پر تیار ہو گیا۔ یہ دیکھیں کہ یہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ میں ایک اخبار میں انٹرویو کے لیے پہنچا۔ اس نے میرے انٹرویو کی شرط لگا دی۔ میں نے منظور کر لیا۔ اور اب میں اس سے کوئی بیک میل کرنے جا رہا تھا۔

وہ دونوں کے بعد میں پھر وہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

پہلے کی طرح اس دن بھی ان کے کمرے میں ان کے خاص بندے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے پہلے کی طرح ڈرامے کرتے ہوئے ان کے ہاتھ چومے اور ایک طرف بیٹھ گیا۔

"ہاں اے سعادت مند تو جران۔ یہ بتاؤ کیا قلعہ دی پاپا

"یہ تو آپ جانیں سرکار۔" میں نے کہا۔ "میں تو حکم کا قلام ہوں۔ جو فرمائیں گے۔ میں وہی کروں گا۔"

"اچھا جاؤ۔ میں تمہارے لیے سوچتا ہوں۔" وہ صاحب نے فرمایا۔ "تم دونوں کے بعد آ جانا میرے پاس۔" میں نے آدمی کا مہالی تو حاصل کر لی تھی۔

قلعہ دی پاپا اور اصل میں وہ صاحب کا خاص چیلہ مقصود تھا۔ میں نے کسی طرح اسے توڑ لیا تھا۔ وہ برسوں سے وہ صاحب کی خدمت کیے جا رہا تھا اسی نے یہ بیش بہا معلومات مجھے فراہم کی تھیں۔

میں نے جس ہوم ورک کی بات کی ہے۔ وہ بھی ہوم ورک تھا۔ وہ صاحب سے ملاقات کے بعد میں نے مقصود کو فون کر کے اس مخصوص ہوٹل میں بلا لیا۔ جہاں ہماری ملاقات ہوا کرتی تھی۔

مقصود کو میں نے رشوت نہیں دی تھی اور نہ ہی میرے پاس اتنے پیسے تھے کہ میں اسے کچھ دے سکوں۔ مقصود کا پرانہ یہ تھا کہ وہ وہ صاحب کا بت گرا کر اس کی جگہ خود اپنے آپ کو رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے مجھ سے معاہدہ کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"میں اس جعلی اور کی حرکتوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ نہ جانے کتنے مخصوص لوگوں کو اس نے برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ میں اس کے اندر کا آدمی ہوں۔ اسی لیے اس کے بارے میں سب جانتا ہوں۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اس کے بارے میں مجھ کو معلوم ہو۔ بتاتے جاؤ۔ پھر ہم دونوں مل کر اس کا کھارہ کر دیں گے۔"

اسی نے مجھے ہیرا پنا اور ملا اس کے ہارے میں بتایا تھا۔ اب میں نے اسے پھر بلایا تھا تاکہ کچھ اور باتیں جان سکوں۔ وہ کام کا آدمی تھا۔

وہ آیا تو میں نے چائے اور بسکٹ و فیور کا آرڈر دے دیا۔ چائے پیچے کے دوران میں اس نے انکشاف کیا۔ "آپ کو معلوم ہے جناب۔ ہمارے وہ صاحب شراب معرفت کی جعلی چلا رہے ہیں۔"

"یہ کیا خبر ہوتی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"مکی شراب۔ وہ تو چھوٹی سی آگے اس شراب کو بنانے کی ایک غلطی ہوئی ہے۔ چند ہی لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں۔ جب شراب تیار ہو جاتی ہے تو کچھ ہنگاموں کو وہ صاحب اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ اور ان میں کوئی خاص دوا

بھرا آئے تھے تمہارے پاس۔" بھرنے پر چھا۔
 "ہاں سرکار۔ بھرا آتا ہوا تھا ان کا۔"
 "اوہ۔ تو اب کیا فرمایا انہوں نے۔"
 "آپ سے بہت ناراض تھے۔" میں نے بتایا۔
 "وہ کیوں؟"

"فرما رہے تھے کہ اس سے جا کر کہہ کہ شراب معرفت کو
 خاص کیوں کر رکھا ہے۔ عام کیوں نہیں کرتا۔"
 پھر صاحب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ انہوں نے پہلے
 کی طرح اپنے آدمیوں کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا اور
 ان کے جانے کے بعد کہنے لگے "تو جو ان کی جگہ بناؤ یہ سب کیا
 پکڑ ہے۔"

"کوئی پکڑ نہیں ہے جناب۔ میں تو قلندری بابا کے حکم کا
 غلام ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ جو ارشاد فرماتے ہیں میں آپ کو
 آکر بتا دیتا ہوں۔"
 "یہ تمہارے قلندری بابا میرے پیچھے کیوں پڑ گئے
 ہیں۔" پھر صاحب ہاتھ دھو کر اپنے گئے تھے۔

"میں کیا جانوں سرکار۔ یہ تو معرفت کے رشتے ہیں۔
 آپ جانیں اور وہ جانیں۔ ویسے انہوں نے مجھے ایک حکم دیا
 ہے۔"
 "وہ کیا ہے۔"

"وہ یہ ہے سرکار کہ میں آپ کی اس شراب معرفت کا
 چرچا عام کر دوں۔" میں نے کہا۔ "تاکہ شعل خدا کو اس سے
 قاندہ ہو اور چرچا عام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ میں ایک پریس
 کانفرنس کر کے سب کو بتا دوں۔ یہ بہت تو اب کا کام ہوگا۔"
 "نہیں۔ تم یہاں نہیں کر دو گے۔" پھر صاحب ہنسنے لگے۔

"اب تو میں کر چکا ہوں سرکار۔ میں قلندری بابا کے حکم
 کے خلاف نہیں جاسکتا۔" میں نے کہا۔ "اور ہاں۔ ایک بات
 اور۔۔۔ آپ نے مجھ سے یہ پوچھا ہی نہیں ہے کہ میں کون
 ہوں۔ اور کیا کرتا ہوں۔ آپ قلندری بابا میں اچھے نہ گئے۔"
 "چلو اب بتاؤ۔ کون ہو تم۔"

"سرکار۔ میں ایک صحافی ہوں۔" میں نے بتایا۔ "اور
 میرا کام ہی یہی ہے۔"

پھر صاحب مجھے آواز دیں دیتے رہ گئے لیکن میں ان کے
 کمرے اور ان کے مکان سے باہر آ گیا۔ سب دیکھنا یہ تھا کہ پھر
 صاحب کا اگلا قدم کیا ہوتا ہے۔ خود کشی یا فرار۔
 لیکن ہوا یہ کہ پھر صاحب نے نہ تو خود کشی کی اور نہ ہی

فرار ہوئے۔ بلکہ اٹا میں ہی پھنس گیا۔ اسی رات ملائے کا
 تھانے دار میرے گھر آدھکا تھا۔ وہ ایک غور و صودت انسان
 تھا اور اس کی آواز اس کے چہرے سے زیادہ خطرناک تھا۔
 میں احتجاج کرتا رہ گیا کہ مجھے کیوں اٹھا یا جا رہا ہے لیکن
 وہ مجھے اٹھا کر تھانے لے آئے۔ یہاں پھر صاحب بھی تھے۔
 منصور بھی تھا اور میجرین کے ایڈیٹر خورشید صاحب بھی تھے۔ جو
 مجھے دیکھتے ہی گالیاں دینے لگے تھے۔ پولیس نے ان کے
 ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا تھا۔
 آہستہ آہستہ بہت کچھ بتا چکا تھا۔

پھر صاحب ایک شاطر انسان تھے۔ انہوں نے بڑی
 ہوشیاری کے ساتھ منصور کو اس کام کے لیے نگاہ رکھا تھا کہ ان
 کے پاس اگر کوئی باقی قسم کا بندہ آئے تو بظاہر پھر صاحب کے
 خلاف نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا جائے۔ تاکہ وہ مکمل کر
 سامنے آجائے کہ اس کے آنے کا مقصد کیا ہے۔ اس کے بعد
 اس کو پھر صاحب کے خلاف اٹنی سیدھی باتیں کر کے بہکا یا
 جانے اور جب وہ اپنے اردوے کا اظہار کر دے تو اس پر ہاتھ
 ڈال دیا جائے۔

ایسے ہیروں کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔
 کرپٹ پولیس والے ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ہائر
 لوگ بھی ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور منصور جیسے لوگ جو سازش
 کی ٹونگھتے رہتے ہیں۔

یہ امر بھی یہی کرتا ہے۔ اپنا اقتدار بچانے کے لیے اس
 قسم کی حرکتیں کرتی پڑتی ہیں۔ ورنہ ہر ایسا غیر ایسے ہیروں پر
 ہاتھ ڈال دے۔

میں تو اس لیے پھنسا تھا اور بے چارے خورشید صاحب
 اس لیے پھنسے تھے کہ میں ان ہی کے میگزین سے وابستہ تھا اور
 مجھ پر پھر صاحب کو مگلی دینے کا الزام تھا۔
 مجھے چھ مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ خورشید صاحب کو تھانے
 میں سے ہٹا دیا گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد مجھے یہ سب مل گیا ہے کہ اس قسم کے
 لوگوں پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے مکمل ہوم ورک بہت ضروری
 ہے۔ جبکہ ہوم ورک اور مکمل ہوم ورک کا جو امتزاج تھا۔

اس لیے میں اپنے پڑھنے والوں کو یہ بتانا ضروری سمجھتا
 ہوں کہ مکمل تو اس قسم کے ہیروں، تقیروں، سیاست دانوں
 جاگیرداروں وغیرہ کو نہ پھیڑیں اور اگر پھیڑیں تو اسے
 ہوم ورک مکمل رہیں۔ منصور جیسے لوگوں سے بھیجیں۔



رازِ دانا اپنا

جناب ایدہر سرگزشت !
السلام علیکم !

میں آج اپنی ایک بے وقوفی کا احوال سناتے آیا ہوں۔ گوکہ یہ قصہ اس طرح رونما نہیں ہوا مگر میں نے اسے لطافت سے آراستہ کر دیا ہے لیکن واقعہ یوں ہی ہے۔

اختر
(کراچی)

~~~~~

میں اس وقت ایک دکان سے باہر نکل رہا تھا جب راجیلہ پر نظر پڑی۔

وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ میں آنکھیں میاڑھا ذکر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں عام طور پر اس قسم کی حرکتیں بہت پلاننگ کے ساتھ کرتا ہوں۔ چند لمحوں پہلے ہیں جنہیں میں نے مٹ لیے ہیں انہیں دہرانے پر اکتفا کرتا ہوں۔

راجیلہ نے جب یہ دیکھا کہ کوئی شخص اسے گھور گھور کر



زیر لب مسکرا رہی تھی۔ اس وقت وہ مجھے اور بھی اچھی لگی۔  
اس پہلوان کی بیٹی واقعی بہت شاعر تھی۔  
"لو جو ان کی بھی ہمارے گھر بھی آؤ۔" اس کے ہاتھ

کہا۔  
"ضرور ضرور۔" میں نے تکلیف برداشت کرتے  
ہوئے گردن ہلا دی۔ "ضرور آؤں گا۔"  
"بیٹی۔ اس شریف لو جو ان کو ہمارا ہاتھ تو معلوم ہوگا۔"  
پہلوان ہانے راجیل سے پوچھا۔

"نہیں ابا۔ یہ بھی ہماری طرف نہیں آئے۔"  
"لو جو ان، ہمارا ہاتھ ہے۔ ایف سترہ۔"  
دھیرے کا لونی، سمجھ گئے۔

"میں ہاں سمجھ گیا۔" میں نے راجیل کی طرف دیکھا۔  
اس کی آنکھوں میں یہ پیغام تھا کہ اے اچھی فوجیوں تم  
ہمارے یہاں ضرور آؤ اسی لیے اس نے اپنے ابا سے غلط  
حالی کی تھی۔

"اچھا چٹا۔" میں سامنے والی دکان سے اپنے لیے  
بادام اور پستے لے کر آتا ہوں۔ سب ختم ہو گئے ہیں۔ تم  
جب تک ان سے باتیں کرو۔"

ابا جلدی سے ایک طرف چلا گیا۔  
اس کے بچے ہی راجیل نے میری طرف  
دیکھا۔ "اب جلدی سے اپنا نام بتا دو، ورنہ ہمارا کیا کہیں گے  
کہ دوست کے بھائی کا نام بھی نہیں معلوم، اور میرا نام تو سن  
ہی چکے ہو۔ راجیل۔"

"میرا نام اختر ہے۔" میں نے بتایا۔ "اختر عالم۔  
میں ہر تھوڑے نام آباد میں رہتا ہوں اور ایک فرم میں کام کرتا  
ہوں۔"

"بس اتنا ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن تم ضرور  
آنا۔"

اسی دوران میں اس کا ابا ہادام اور پستے لے کر آچکا  
تھا۔ بھرہ دو لوں ایک طرف چلے گئے۔ ان کے جانے کے  
بعد میں نے اپنی ہڈیوں کا جائزہ لیا۔ کوئی نقصان نہیں ہوا  
تھا۔ ویسے اس کا ابا خطرناک آدمی تھا۔

اپنے قیث میں واپس آ کر بھی میں اسی کے بارے  
میں سوچتا رہا۔ اس کا ابا چاہے جیسا بھی ہو۔ راجیل بہت دل  
کش تھی۔ اس کے چہرے پر جو طبعیت تھی، وہ بہت کم  
دیکھنے میں آتی ہے۔

اس کے ابا خطرناک ہیں لیکن وہ تو ٹھیک تھی اور میں

مجھے کے عالم میں دیکھے جا رہا ہے تو مجھے سے بھاتی ہوئی  
میرے پاس آگئی۔ "کیا بات ہے۔ اس طرح کیا دیکھ رہے  
ہو۔ کیا بھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔"

"ہزاروں لڑکیاں دیکھی ہیں۔" میں نے گہری  
سانس لی۔ "لیکن خوبصورتی کا یہ معیار میں نے پہلے بھی نہیں  
دیکھا۔ صاف کہتے گا۔ میں ایک سہذب انسان ہوں لیکن  
اس وقت خود پر قابو نہیں رہا۔ سو رہی۔ اگر آپ میری وجہ سے  
اڑسٹ رہیں تو میری سو رہی۔"

یہ ایک ایسا حربہ تھا۔ جس سے بہت ہی کم لڑکیاں بچ نکلتی  
ہوں گی لیکن وہ صاف لکھ گئی تھیں۔ اس نے منہ ہاتھ کر  
کہا۔ "بس بس۔ زیادہ کہیں لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔  
میری تعریف کا حق صرف اسی کو ہوگا جو میرا جیون ساتھی  
ہوگا۔"

اس نے ایک اشارہ تو دے دیا تھا۔ "ٹیک بخت  
تمہارا جیون ساتھی کون ہوگا؟"

"جس کو میرے ابا چاہیں گے۔" وہ مسکرا کر بولی۔  
"اور تمہارے ابا کا معیار کیا ہے۔"

"وہ آ رہے ہیں ابا۔ ان ہی سے پوچھ لو۔"  
اور اس سے پہلے کہ میں اپنے بچاؤ کی فکر کرتا۔ وہاں  
سے نکل لیتا۔ اس کا ابا وہاں کی طرف سے سودا رہ گیا۔ کیا  
بڑا خطرناک ابا تھا۔

پورا پہلوان تھا۔ یہ قدر، یہ پھل ہوئی چھاتیاں، یہ بھی  
موت نہیں۔ سب کچھ خطرناک۔ بہت بڑے گھر کی شہرہ  
اور کرتے پہنے ہوئے۔ مجھے وہ پروڈیکشنل ریسلر ہی معلوم ہو رہا  
تھا۔ وہ ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا بات ہے بھئی۔  
کون ہے یہ۔" اس نے راجیل سے پوچھا۔

"ابا۔ وہ جو میری دوست ہے نا شہباز، یہ اس کے  
پھوپھی زاد بھائی ہیں۔" راجیل نے مجھے صاف چھایا۔ "یہ  
مجھے یہاں مل گئے تو خیریت پوچھنے گئے۔"

"اچھا اچھا۔" ابا نے مصافحہ کے لیے میری طرف  
ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے اس سے مصافحہ کیا تو ایسا لگا جیسے میرا کاغذ کا  
ہی اتر گیا ہو۔ انگلیاں کڑکڑانے لگی تھیں۔ آنکھوں کے آگے  
اندھیرے چھا گئے تھے۔

"لو جو ان۔" کچھ کھایا یا کرو۔" ابا نے بے تکلفی سے  
میرے شانے پر ہاتھ مار دیا۔

شانے پر جیسے پہاڑ گر پڑا تھا۔ میں نے دیکھا راجیل



میرے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ بہت خطرناک جسم تھا اس کا۔  
اک دم کسا ہوا۔ رزٹی۔

"اس بھائی۔ کون ہے تو۔" اس نے پوچھا۔  
"جناب۔ میں اختر عالم ہوں۔" میں نے پریشان  
ہو کر بتایا۔ "آپ کو یاد ہوگا۔ اس دن مارکیٹ میں آپ سے  
ملاقات ہوئی۔ آپ باوام لینے گئے تھے۔"

"اے باوام بہت تو میں روز لینے جاتا ہوں۔ تو کس  
خاص دن کی بات کر رہا ہے۔"

"جس دن آپ کی صاحبزادی بھی آپ کے  
ساتھ تھیں۔"

"وہ تو روز میرے ساتھ ہوتی ہے۔ اب تا۔"  
"جناب۔ اس نے آپ کو بتایا تھا کہ میں اس کی  
دوست کا بھائی ہوں۔"

"اے۔ وہ تو ہر ایک کے لیے بھئی کہتی ہے۔ تجھ میں  
کیا خاص بات ہے۔"

لب اس پہلوان سے بحث کرنی بے کار ہی  
تھی۔ "فیک ہے صاحب۔ آپ نہیں پہچان رہے ہیں تو  
جہنم میں ڈالیں۔ میں واپس جا رہا ہوں۔"

"ایسے کیسے واپس چلا جائے گا۔" اس نے جو  
میری گردن میں ہاتھ ڈال کر مٹا دیا ہے تو میں سہمے لان  
میں جا کر۔ جو پوری طرح کھدا ہوا تھا۔ یعنی وہ لان اس  
پہلوان کے لیے کھازے کا کام کرتا ہوگا۔

اس وقت کچھ میں آگیا کہ وہ لوگ ایڈریس پوچھنے پر  
کیوں میرا مذاق اڑا رہے تھے اور یہ کیوں کہہ رہے تھے کہ  
واپس میں میری بیگمیں نکل آئیں گی۔

ایسا بے عزتی تو پہلے بھی نہیں ہوئی ہوگی۔

اس نے میرے قریب آ کر میرا گریبان پکڑ کر مجھے  
اٹھا دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور حرکت کرتا۔ داخلہ  
رحمت کے فرشتے کی طرح اندر سے نمودار ہو گئی۔ "ابا۔ یہ  
کیا کر رہے ہو۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔ "یہ اختر صاحب  
ہیں۔"

"کون اختر صاحب ا۔"

"ارے وہی جو اس دن ملے تھے۔ میری دوست  
شہناز کے پھوپھی زاد بھائی۔"

"اچھا اچھا یہ وہ ہے۔ (فاصلہ کم کریں) پہلوان ابا  
خفیہ ہو کر بولا۔ "تو جوان۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"بتایا تو تھا جناب۔ لیکن آپ نے پہچانا ہی نہیں۔"

نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ہنسنے کی جذبات بھی  
دیکھے تھے۔ اس کا بتایا تھا مجھے۔ ایف سترہ ہو چکی۔

میں دوسری شام کو اس ملائے میں پہنچی گیا۔ وہ ایک  
اسٹریٹ تھی۔ جس کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے عام  
سے مکانات بنے ہوئے تھے۔

یہ سفید پائش لوگوں کی آبادی تھی۔ عام طور پر پڑھے  
لکھے رہا کرتے۔ مجھے ایف سترہ تلاش کرنا تھا۔ کراچی میں  
ایک مصیبت یہ ہے کہ لوگ مکانوں کے گیٹ پر نمبر کے علاوہ  
سب کچھ لکھ دیتے ہیں۔ کہاں کے رہنے والے تھے، باپ  
دادا کے نام کیا تھے۔ کس مینے میں پیدا ہوا۔ کون کون  
سی ڈگریاں حاصل کیں۔ یہ سب لکھا ہوتا ہے۔ صرف مکان  
نمبر نہیں لکھتے۔ خدا جانے یہ کون سا نولکا ہے یا کسی قسم کی  
احتیاط۔

مجھ پر ایک مکان کے سامنے بیٹھے کچھ لوگوں سے  
ایف سترہ معلوم کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک مجھے دیکھ کر زور  
دور سے چنے لگا۔ اس کی بدقسمتی پر مجھے خسر آ گیا تھا۔  
"خیریت ہے بھائی۔ یہ تم مجھے دیکھ کر اس کیوں رہے ہو۔  
کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔"

"نہیں بھائی۔ ابھی نہیں۔ لیکن ایف سترہ سے واپس  
پر سینگ ضرور نکل آئیں گے۔" اس نے کہا۔

لب وہ سب کے سب چنے لگے۔ بدقسمت قسم کے لوگ  
تھے۔ میں بھنا کر وہاں سے چلنے ہی دلا تھا کہ اس آدمی نے  
جو زور زور سے فیس رہا تھا۔ کونے والے ایک مکان کی  
طرف اشارہ کیا۔ "وہ مکان دیکھ رہے ہوتا۔ وہی ایف سترہ  
ہے۔"

میں جب اس مکان کی طرف جانے لگا تو اس نے  
آواز لگائی۔ "بھائی جان۔ واپس میں اپنی بیگمیں ضرور  
دکھا دیں۔"

میں ان کی بدقسمتی پر انہیں دل ہی دل میں برا بھلا  
کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ دیکھو وہ لوگ اس قسم کی جو باتیں  
کر رہے تھے تو کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔

بہر حال یہی سب سوچتا ہوا میں ایف سترہ تک پہنچی  
گیا۔ جس کا گیٹ لوہے کا تھا۔ میں نے گیٹ پر دستک دے  
دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے اسی پہلوان ابا کی فراہم شائی  
دی۔ "کون ہے۔"

"جناب۔ میں ہوں اختر۔"

دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ پہلوان ابا انگوٹ ہاتھ



میں نے اپنے لباس سے ٹلی جھاڑتے ہوئے کہا۔  
"صاف کرنا تو جرم ہے۔ آج کل میری یادداشت کچھ  
کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ایک دن پہلے کے واقعات بھول  
جاتا ہوں۔"

"جناب۔ آپ اگر ہر بار اسی طرح بھولتے رہے تو  
پھر میں آجیدہ تو آنے سے رہا۔"  
"ہلو کوئی بات نہیں۔" اس نے راحیلہ کی طرف  
دیکھا۔ "جاؤ بیٹا۔ ان کو اندر لے جا کر چائے پلاؤ۔  
میں جب تک ٹیکس لگا کر آتا ہوں۔"

راحیلہ مجھے مکان کے اندر لے آئی۔ چھوٹا سا قالیگین  
سیلنے سے سجایا گیا تھا۔ پیلوان لہا سے تو ایسی خوش روئی کی  
آئینہ نہیں تھی۔ یہ سب راحیلہ کا نام نہ ہو سکتا تھا۔

"آخر مجھے اسوس ہے کہ اہا نے تمہارے ساتھ ایسا  
سلوک کیا۔" اس نے کہا۔ "لیکن یہ اہا کی عادت ہے۔ وہ  
عشق کا امتحان اسی طرح لیا کرتے ہیں۔"  
"عشق کا امتحان؟ لیکن میں ان سے عشق کب کر رہا  
ہوں۔"

"نہ ہو۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں آنے والا ہر شخص مجھ  
سے عشق کرنے آتا ہے۔"  
"کیا اور بھی کچھ لوگ آچکے ہیں۔"

"دیکھو نا۔ میں ایک ماڈرن لڑکی ہوں۔" اس نے  
کہا۔ "لڑکوں سے دوستی تو رہتی ہے نا۔ جیسے کالج کے لڑکوں  
اور دوستی دونوں کے ساتھ اچھی دوستی تھی۔ مگر کاروبار شروع  
پڑ گیا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ بھی ایک دو پار ہوٹل جانا  
پڑا۔ افضل اور جیم سے نیٹ پر دوستی ہوئی تھی۔ پھر ملاقاتیں  
ہونے لگیں۔ لڑخ تو بالکل پڑوس میں ہی رہتا تھا۔ جواد اور  
ساجد سے مارکیٹ میں ملاقات ہوئی تھی۔ خورشید تو غیر  
قائم رہا ہی کا تھا۔"

"ماشا اللہ۔ ماشا اللہ۔" میں ہلکا کر بولا۔ "بہت ہی  
منظر پرست ہے تمہارے چاہنے والوں کی۔"

"اب سب کے نام تو یاد نہیں ہیں نا۔ لائری میں  
کھسے ہوئے ہیں، مگر تو لائری لے آؤں۔"

"نہیں رہنے دو۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ تم  
مجھے کس کھاتے میں ڈال رہی ہو۔"  
"بیاد کے کھاتے میں۔" وہ مسکرا کر بولی۔  
"کیا مطلب؟"

"بیاد کے آخر عالم صاحب۔ میں نے جتنے نام

بتائے۔ یہ سب میرے دوست تھے۔ صرف دوست۔ جبکہ تم  
سے عیار کا رشتہ استوار ہونے لگا ہے۔"  
"کب ہے۔"

"جب سے اہا نے تمہاری لٹکائی کی ہے۔" اس نے  
بتایا۔ "تم میری بات کو خدائی مت سمجھو۔ میں تمہارے لیے  
واقعی سنجیدہ ہو گئی ہوں۔"

پھر اس نے میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ رکھ دیا اور میں  
اس طرح بھٹل گیا جیسے موسم کو چھو لے ہر دکھ دیا گیا ہو۔

"راحیلہ۔ تم یہ بتاؤ۔ تمہارے اہا کو راضی کرنے کے  
لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔" میں نے پوچھا۔

"ایک شرط پوری کرنی ہوگی۔" اس نے بتایا۔  
"اور وہ شرط ہے کیا۔"

"وہ شرط یہ ہے کہ جو انکس رہ سینگ میں ہر اسے۔  
لہا سے اپنا نام دیکھائیں گے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے اس ویج ویکل لہا  
کو ہر انکسوں گا۔"

"یہ سوچنا تو تمہارا کام ہے۔" اس نے کہا۔ "اگر تم  
مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو تو کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا پڑے  
گا۔"

"میں کیوں نہ تمہارے اہا کے لیے کرائے کے کسی  
ریسر کا بندوبست کر دوں۔" میں نے کہا۔ "وہ میرے ہی  
ہاتھ پر لڑے گا۔"

"تو پھر اہا اس سے میری شادی کرادیں گے۔"

"یہ تو واقعی بہت بڑی مصیبت ہے۔" میں نے  
کہا۔ "چلو۔ تم ٹکرنہ کرو۔ میں کچھ نہ کچھ سوچتا ہوں۔"

"دیکھو، میرا دل مت توڑنا۔ ایسا نہ ہو کہ اہا کے  
در سے تم غائب ہی ہو جاؤ۔" اس نے کہا۔ "میں اپنی اس  
زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔ لگتا ہے ایسا کوئی نہیں ہوگا جو  
آکر میرا ہاتھ تھام لے۔"

اس وقت میں اس کے لیے سنجیدہ ہو گیا۔  
اس کا باپ اس کے عشق کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا  
تھا۔ کوئی بھی مستقل آدمی اس کے گھر میں اپنا رشتہ لے کر نہیں  
آ سکتا تھا۔

راحیلہ کی آنکھوں میں اگر آنسو تھے تو وہ اپنی قسمت پر  
ماتم کرنے کے لیے حق بجانب تھی۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔  
خوبصورت، سلیقہ مند۔ اس کے گھر کو دیکھ کر اس کے سلیقے کا  
احساس ہونے لگا تھا۔



”مجھے ان سے ملنا تھا۔“

”کب ملنا تھا۔“

”آپ جب کہیں۔ ویسے آپ کون ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”میں ان کی سیکرٹری ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”میں

آپ کو ایک نمبر دے دیتی ہوں۔ یہ آپ کا نوکرن نمبر ہوگا۔ آپ

ہمارے دفتر آ کر اس نمبر کے حوالے سے بات کر سکتے ہیں۔“

”تھیں۔“ نمبر ہی دے دیں، اور ان کی لمب

”وینکس برسٹ وڈٹ کے ہزار روپے ہوتے

ہیں۔ اس کے بعد ہر وڈٹ کے تین سو۔“ اس نے بتایا۔

”اوکے۔ آپ نمبر دیں۔“

اس نے مجھے نمبر دیا۔ میرا نام پوچھا اور شاید کوئی

ڈائری وغیرہ دیکھنے کے بعد بتایا کہ میں کل شام کو خرم

صاحب سے ملنا سکتا ہوں۔“

واہ۔ کیا سروس تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی ڈاکٹر

سے اپائنٹمنٹ لے رہا ہوں۔ خرم نسیم نے اپنے ساتھ ہاما

Alternative & Integrated medicine

جنی اور دلہنہ اجازت سے تیار کرنا دیکھنا ہے۔ یہ آپ کو بتاتے ہیں

آپ کو بتاتے ہیں

مردوں میں جڑو مسوں کی کمی اور کمزوری کو دور کر کے ادک پیدا

کرنے کے قابل بناتا ہے۔ مقوی دستور ہے

شادی کو دس

صرف غیر شادی شدہ مردوں کے لئے زائل شدہ توانائی کی

ہمائی کا مستقل اور مکمل کورس۔ انتہائی کسی قسم کی اور عمری

محسوس نہ ہوگی

ازدواجی کورس

شادی شدہ حضرات کے لئے بحالی قوت کا فوری اور مستقل

طلاج۔ کامیاب اور لذت دہانی زندگی کے لئے سہترین کورس

زمرہ: 1۔ کلاسنگ گروہ: 1۔ 2۔ 3۔ 4۔ 5۔ 6۔ 7۔ 8۔ 9۔ 10۔ 11۔ 12۔ 13۔ 14۔ 15۔ 16۔ 17۔ 18۔ 19۔ 20۔ 21۔ 22۔ 23۔ 24۔ 25۔ 26۔ 27۔ 28۔ 29۔ 30۔ 31۔ 32۔ 33۔ 34۔ 35۔ 36۔ 37۔ 38۔ 39۔ 40۔ 41۔ 42۔ 43۔ 44۔ 45۔ 46۔ 47۔ 48۔ 49۔ 50۔ 51۔ 52۔ 53۔ 54۔ 55۔ 56۔ 57۔ 58۔ 59۔ 60۔ 61۔ 62۔ 63۔ 64۔ 65۔ 66۔ 67۔ 68۔ 69۔ 70۔ 71۔ 72۔ 73۔ 74۔ 75۔ 76۔ 77۔ 78۔ 79۔ 80۔ 81۔ 82۔ 83۔ 84۔ 85۔ 86۔ 87۔ 88۔ 89۔ 90۔ 91۔ 92۔ 93۔ 94۔ 95۔ 96۔ 97۔ 98۔ 99۔ 100۔ 101۔ 102۔ 103۔ 104۔ 105۔ 106۔ 107۔ 108۔ 109۔ 110۔ 111۔ 112۔ 113۔ 114۔ 115۔ 116۔ 117۔ 118۔ 119۔ 120۔ 121۔ 122۔ 123۔ 124۔ 125۔ 126۔ 127۔ 128۔ 129۔ 130۔ 131۔ 132۔ 133۔ 134۔ 135۔ 136۔ 137۔ 138۔ 139۔ 140۔ 141۔ 142۔ 143۔ 144۔ 145۔ 146۔ 147۔ 148۔ 149۔ 150۔ 151۔ 152۔ 153۔ 154۔ 155۔ 156۔ 157۔ 158۔ 159۔ 160۔ 161۔ 162۔ 163۔ 164۔ 165۔ 166۔ 167۔ 168۔ 169۔ 170۔ 171۔ 172۔ 173۔ 174۔ 175۔ 176۔ 177۔ 178۔ 179۔ 180۔ 181۔ 182۔ 183۔ 184۔ 185۔ 186۔ 187۔ 188۔ 189۔ 190۔ 191۔ 192۔ 193۔ 194۔ 195۔ 196۔ 197۔ 198۔ 199۔ 200۔ 201۔ 202۔ 203۔ 204۔ 205۔ 206۔ 207۔ 208۔ 209۔ 210۔ 211۔ 212۔ 213۔ 214۔ 215۔ 216۔ 217۔ 218۔ 219۔ 220۔ 221۔ 222۔ 223۔ 224۔ 225۔ 226۔ 227۔ 228۔ 229۔ 230۔ 231۔ 232۔ 233۔ 234۔ 235۔ 236۔ 237۔ 238۔ 239۔ 240۔ 241۔ 242۔ 243۔ 244۔ 245۔ 246۔ 247۔ 248۔ 249۔ 250۔ 251۔ 252۔ 253۔ 254۔ 255۔ 256۔ 257۔ 258۔ 259۔ 260۔ 261۔ 262۔ 263۔ 264۔ 265۔ 266۔ 267۔ 268۔ 269۔ 270۔ 271۔ 272۔ 273۔ 274۔ 275۔ 276۔ 277۔ 278۔ 279۔ 280۔ 281۔ 282۔ 283۔ 284۔ 285۔ 286۔ 287۔ 288۔ 289۔ 290۔ 291۔ 292۔ 293۔ 294۔ 295۔ 296۔ 297۔ 298۔ 299۔ 300۔ 301۔ 302۔ 303۔ 304۔ 305۔ 306۔ 307۔ 308۔ 309۔ 310۔ 311۔ 312۔ 313۔ 314۔ 315۔ 316۔ 317۔ 318۔ 319۔ 320۔ 321۔ 322۔ 323۔ 324۔ 325۔ 326۔ 327۔ 328۔ 329۔ 330۔ 331۔ 332۔ 333۔ 334۔ 335۔ 336۔ 337۔ 338۔ 339۔ 340۔ 341۔ 342۔ 343۔ 344۔ 345۔ 346۔ 347۔ 348۔ 349۔ 350۔ 351۔ 352۔ 353۔ 354۔ 355۔ 356۔ 357۔ 358۔ 359۔ 360۔ 361۔ 362۔ 363۔ 364۔ 365۔ 366۔ 367۔ 368۔ 369۔ 370۔ 371۔ 372۔ 373۔ 374۔ 375۔ 376۔ 377۔ 378۔ 379۔ 380۔ 381۔ 382۔ 383۔ 384۔ 385۔ 386۔ 387۔ 388۔ 389۔ 390۔ 391۔ 392۔ 393۔ 394۔ 395۔ 396۔ 397۔ 398۔ 399۔ 400۔ 401۔ 402۔ 403۔ 404۔ 405۔ 406۔ 407۔ 408۔ 409۔ 410۔ 411۔ 412۔ 413۔ 414۔ 415۔ 416۔ 417۔ 418۔ 419۔ 420۔ 421۔ 422۔ 423۔ 424۔ 425۔ 426۔ 427۔ 428۔ 429۔ 430۔ 431۔ 432۔ 433۔ 434۔ 435۔ 436۔ 437۔ 438۔ 439۔ 440۔ 441۔ 442۔ 443۔ 444۔ 445۔ 446۔ 447۔ 448۔ 449۔ 450۔ 451۔ 452۔ 453۔ 454۔ 455۔ 456۔ 457۔ 458۔ 459۔ 460۔ 461۔ 462۔ 463۔ 464۔ 465۔ 466۔ 467۔ 468۔ 469۔ 470۔ 471۔ 472۔ 473۔ 474۔ 475۔ 476۔ 477۔ 478۔ 479۔ 480۔ 481۔ 482۔ 483۔ 484۔ 485۔ 486۔ 487۔ 488۔ 489۔ 490۔ 491۔ 492۔ 493۔ 494۔ 495۔ 496۔ 497۔ 498۔ 499۔ 500۔ 501۔ 502۔ 503۔ 504۔ 505۔ 506۔ 507۔ 508۔ 509۔ 510۔ 511۔ 512۔ 513۔ 514۔ 515۔ 516۔ 517۔ 518۔ 519۔ 520۔ 521۔ 522۔ 523۔ 524۔ 525۔ 526۔ 527۔ 528۔ 529۔ 530۔ 531۔ 532۔ 533۔ 534۔ 535۔ 536۔ 537۔ 538۔ 539۔ 540۔ 541۔ 542۔ 543۔ 544۔ 545۔ 546۔ 547۔ 548۔ 549۔ 550۔ 551۔ 552۔ 553۔ 554۔ 555۔ 556۔ 557۔ 558۔ 559۔ 560۔ 561۔ 562۔ 563۔ 564۔ 565۔ 566۔ 567۔ 568۔ 569۔ 570۔ 571۔ 572۔ 573۔ 574۔ 575۔ 576۔ 577۔ 578۔ 579۔ 580۔ 581۔ 582۔ 583۔ 584۔ 585۔ 586۔ 587۔ 588۔ 589۔ 590۔ 591۔ 592۔ 593۔ 594۔ 595۔ 596۔ 597۔ 598۔ 599۔ 600۔ 601۔ 602۔ 603۔ 604۔ 605۔ 606۔ 607۔ 608۔ 609۔ 610۔ 611۔ 612۔ 613۔ 614۔ 615۔ 616۔ 617۔ 618۔ 619۔ 620۔ 621۔ 622۔ 623۔ 624۔ 625۔ 626۔ 627۔ 628۔ 629۔ 630۔ 631۔ 632۔ 633۔ 634۔ 635۔ 636۔ 637۔ 638۔ 639۔ 640۔ 641۔ 642۔ 643۔ 644۔ 645۔ 646۔ 647۔ 648۔ 649۔ 650۔ 651۔ 652۔ 653۔ 654۔ 655۔ 656۔ 657۔ 658۔ 659۔ 660۔ 661۔ 662۔ 663۔ 664۔ 665۔ 666۔ 667۔ 668۔ 669۔ 670۔ 671۔ 672۔ 673۔ 674۔ 675۔ 676۔ 677۔ 678۔ 679۔ 680۔ 681۔ 682۔ 683۔ 684۔ 685۔ 686۔ 687۔ 688۔ 689۔ 690۔ 691۔ 692۔ 693۔ 694۔ 695۔ 696۔ 697۔ 698۔ 699۔ 700۔ 701۔ 702۔ 703۔ 704۔ 705۔ 706۔ 707۔ 708۔ 709۔ 710۔ 711۔ 712۔ 713۔ 714۔ 715۔ 716۔ 717۔ 718۔ 719۔ 720۔ 721۔ 722۔ 723۔ 724۔ 725۔ 726۔ 727۔ 728۔ 729۔ 730۔ 731۔ 732۔ 733۔ 734۔ 735۔ 736۔ 737۔ 738۔ 739۔ 740۔ 741۔ 742۔ 743۔ 744۔ 745۔ 746۔ 747۔ 748۔ 749۔ 750۔ 751۔ 752۔ 753۔ 754۔ 755۔ 756۔ 757۔ 758۔ 759۔ 760۔ 761۔ 762۔ 763۔ 764۔ 765۔ 766۔ 767۔ 768۔ 769۔ 770۔ 771۔ 772۔ 773۔ 774۔ 775۔ 776۔ 777۔ 778۔ 779۔ 780۔ 781۔ 782۔ 783۔ 784۔ 785۔ 786۔ 787۔ 788۔ 789۔ 790۔ 791۔ 792۔ 793۔ 794۔ 795۔ 796۔ 797۔ 798۔ 799۔ 800۔ 801۔ 802۔ 803۔ 804۔ 805۔ 806۔ 807۔ 808۔ 809۔ 810۔ 811۔ 812۔ 813۔ 814۔ 815۔ 816۔ 817۔ 818۔ 819۔ 820۔ 821۔ 822۔ 823۔ 824۔ 825۔ 826۔ 827۔ 828۔ 829۔ 830۔ 831۔ 832۔ 833۔ 834۔ 835۔ 836۔ 837۔ 838۔ 839۔ 840۔ 841۔ 842۔ 843۔ 844۔ 845۔ 846۔ 847۔ 848۔ 849۔ 850۔ 851۔ 852۔ 853۔ 854۔ 855۔ 856۔ 857۔ 858۔ 859۔ 860۔ 861۔ 862۔ 863۔ 864۔ 865۔ 866۔ 867۔ 868۔ 869۔ 870۔ 871۔ 872۔ 873۔ 874۔ 875۔ 876۔ 877۔ 878۔ 879۔ 880۔ 881۔ 882۔ 883۔ 884۔ 885۔ 886۔ 887۔ 888۔ 889۔ 890۔ 891۔ 892۔ 893۔ 894۔ 895۔ 896۔ 897۔ 898۔ 899۔ 900۔ 901۔ 902۔ 903۔ 904۔ 905۔ 906۔ 907۔ 908۔ 909۔ 910۔ 911۔ 912۔ 913۔ 914۔ 915۔ 916۔ 917۔ 918۔ 919۔ 920۔ 921۔ 922۔ 923۔ 924۔ 925۔ 926۔ 927۔ 928۔ 929۔ 930۔ 931۔ 932۔ 933۔ 934۔ 935۔ 936۔ 937۔ 938۔ 939۔ 940۔ 941۔ 942۔ 943۔ 944۔ 945۔ 946۔ 947۔ 948۔ 949۔ 950۔ 951۔ 952۔ 953۔ 954۔ 955۔ 956۔ 957۔ 958۔ 959۔ 960۔ 961۔ 962۔ 963۔ 964۔ 965۔ 966۔ 967۔ 968۔ 969۔ 970۔ 971۔ 972۔ 973۔ 974۔ 975۔ 976۔ 977۔ 978۔ 979۔ 980۔ 981۔ 982۔ 983۔ 984۔ 985۔ 986۔ 987۔ 988۔ 989۔ 990۔ 991۔ 992۔ 993۔ 994۔ 995۔ 996۔ 997۔ 998۔ 999۔ 1000۔ 1001۔ 1002۔ 1003۔ 1004۔ 1005۔ 1006۔ 1007۔ 1008۔ 1009۔ 1010۔ 1011۔ 1012۔ 1013۔ 1014۔ 1015۔ 1016۔ 1017۔ 1018۔ 1019۔ 1020۔ 1021۔ 1022۔ 1023۔ 1024۔ 1025۔ 1026۔ 1027۔ 1028۔ 1029۔ 1030۔ 1031۔ 1032۔ 1033۔ 1034۔ 1035۔ 1036۔ 1037۔ 1038۔ 1039۔ 1040۔ 1041۔ 1042۔ 1043۔ 1044۔ 1045۔ 1046۔ 1047۔ 1048۔ 1049۔ 1050۔ 1051۔ 1052۔ 1053۔ 1054۔ 1055۔ 1056۔ 1057۔ 1058۔ 1059۔ 1060۔ 1061۔ 1062۔ 1063۔ 1064۔ 1065۔ 1066۔ 1067۔ 1068۔ 1069۔ 1070۔ 1071۔ 1072۔ 1073۔ 1074۔ 1075۔ 1076۔ 1077۔ 1078۔ 1079۔ 1080۔ 1081۔ 1082۔ 1083۔ 1084۔ 1085۔ 1086۔ 1087۔ 1088۔ 1089۔ 1090۔ 1091۔ 1092۔ 1093۔ 1094۔ 1095۔ 1096۔ 1097۔ 1098۔ 1099۔ 1100۔ 1101۔ 1102۔ 1103۔ 1104۔ 1105۔ 1106۔ 1107۔ 1108۔ 1109۔ 1110۔ 1111۔ 1112۔ 1113۔ 1114۔ 1115۔ 1116۔ 1117۔ 1118۔ 1119۔ 1120۔ 1121۔ 1122۔ 1123۔ 1124۔ 1125۔ 1126۔ 1127۔ 1128۔ 1129۔ 1130۔ 1131۔ 1132۔ 1133۔ 1134۔ 1135۔ 1136۔ 1137۔ 1138۔ 1139۔ 1140۔ 1141۔ 1142۔ 1143۔ 1144۔ 1145۔ 1146۔ 1147۔ 1148۔ 1149۔ 1150۔ 1151۔ 1152۔ 1153۔ 1154۔ 1155۔ 1156۔ 1157۔ 1158۔ 1159۔ 1160۔ 1161۔ 1162۔ 1163۔ 1164۔ 1165۔ 1166۔ 1167۔ 1168۔ 1169۔ 1170۔ 1171۔ 1172۔ 1173۔ 1174۔ 1175۔ 1176۔ 1177۔ 1178۔ 1179۔ 1180۔ 1181۔ 1182۔ 1183۔ 1184۔ 1185۔ 1186۔ 1187۔ 1188۔ 1189۔ 1190۔ 1191۔ 1192۔ 1193۔ 1194۔ 1195۔ 1196۔ 1197۔ 1198۔ 1199۔ 1200۔ 1201۔ 1202۔ 1203۔ 1204۔ 1205۔ 1206۔ 1207۔ 1208۔ 1209۔ 1210۔ 1211۔ 1212۔ 1213۔ 1214۔ 1215۔ 1216۔ 1217۔ 1218۔ 1219۔ 1220۔ 1221۔ 1222۔ 1223۔ 1224۔ 1225۔ 1226۔ 1227۔ 1228۔ 1229۔ 1230۔ 1231۔ 1232۔ 1233۔ 1234۔ 1235۔ 1236۔ 1237۔ 1238۔ 1239۔ 1240۔ 1241۔ 1242۔ 1243۔ 1244۔ 1245۔ 1246۔ 1247۔ 1248۔ 1249۔ 1250۔ 1251۔ 1252۔ 1253۔ 1254۔ 1255۔ 1256۔ 1257۔ 1258۔ 1259۔ 1260۔ 1261۔ 1262۔ 1263۔ 1264۔ 1265۔ 1266۔ 1267۔ 1268۔ 1269۔ 1270۔ 1271۔ 1272۔ 1273۔ 1274۔ 1275۔ 1276۔ 1277۔ 1278۔ 1279۔ 1280۔ 1281۔ 1282۔ 1283۔ 1284۔ 1285۔ 1286۔ 1287۔ 1288۔ 1289۔ 1290۔ 1291۔ 1292۔ 1293۔ 1294۔ 1295۔ 1296۔ 1297۔ 1298۔ 1299۔ 1300۔ 1301۔ 1302۔ 1303۔ 1304۔ 1305۔ 1306۔ 1307۔ 1308۔ 1309۔ 1310۔ 1311۔ 1312۔ 1313۔ 1314۔ 1315۔ 1316۔ 1317۔ 1318۔ 1319۔ 1320۔ 1321۔ 1322۔ 1323۔ 1324۔ 1325۔ 1326۔ 1327۔ 1328۔ 1329۔ 1330۔ 1331۔ 1332۔ 1333۔ 1334۔ 1335۔ 1336۔ 1337۔ 1338۔ 1339۔ 1340۔ 1341۔ 1342۔ 1343۔ 1344۔ 1345۔ 1346۔ 1347۔ 1348۔ 1349۔ 1350۔ 1351۔ 1352۔ 1353۔ 1354۔ 1355۔ 1356۔ 1357۔ 1358۔ 1359۔ 1360۔ 1361۔ 1362۔ 1363۔ 1364۔ 1365۔ 1366۔ 1367۔ 1368۔ 1369۔ 1370۔ 1371۔ 1372۔ 1373۔ 1374۔ 1375۔ 1376۔ 1377۔ 1378۔ 1379۔ 1380۔ 1381۔ 1382۔ 1383۔ 1384۔ 1385۔ 1386۔ 1387۔ 1388۔ 1389۔ 1390۔ 1391۔ 1392۔ 1393۔ 1394۔ 1395۔ 1396۔ 1397۔ 1398۔ 1399۔ 1400۔ 1401۔ 1402۔ 1403۔ 1404۔ 1405۔ 1406۔ 1407۔ 1408۔ 1409۔ 1410۔ 1411۔ 1412۔ 1413۔ 1414۔ 1415۔ 1416۔ 1417۔ 1418۔ 1419۔ 1420۔ 1421۔ 1422۔ 1423۔ 1424۔ 1425۔ 1426۔ 1427۔ 1428۔ 1429۔ 1430۔ 1431۔ 1432۔ 1433۔ 1434۔ 1435۔ 1436۔ 1437۔ 1438۔ 1439۔ 1440۔ 1441۔ 1442۔ 1443۔ 1444۔ 1445۔ 1446۔ 1447۔ 1448۔ 1449۔ 1450۔ 1451۔ 1452۔ 1453۔ 1454۔ 1455۔ 1456۔ 1457۔ 1458۔ 1459۔ 1460۔ 1461۔ 1462۔ 1463۔ 1464۔ 1465۔ 1466۔ 1467۔ 1468۔ 1469۔ 1470۔ 1471۔ 1472۔ 1473۔ 1474۔ 1475۔ 1476۔ 1477۔ 1478۔ 1479۔ 1480۔ 1481۔ 1482۔ 1483۔ 1484۔ 1485۔ 1486۔ 1487۔ 1488۔ 1489۔ 1490۔ 1491۔ 1492۔ 1493۔ 1494۔ 1495۔ 1496۔ 1497۔ 1498۔ 1499۔ 1500۔ 1501۔ 1502۔ 1503۔ 1504۔ 1505۔ 1506۔ 1507۔ 1508۔ 1509۔ 1510۔ 1511۔ 1512۔ 1513۔ 1514۔ 1515۔ 1516۔ 1517۔ 1518۔ 1519۔ 1520۔ 1521۔ 1522۔ 1523۔ 1524۔ 1525۔ 1526۔ 1527۔ 1528۔ 1529۔ 1530۔ 1531۔ 1532۔ 1533۔ 1534۔ 1535۔ 1536۔ 1537۔ 1538۔ 1539۔ 1540۔ 1541۔ 1542۔ 1543۔ 1544۔ 1545۔ 1546۔ 1547۔ 1548۔ 1549۔ 1550۔ 1551۔ 1552۔ 1553۔ 1554۔ 1555۔ 1556۔ 1557۔ 1558۔ 1559۔ 1560۔ 1561۔ 1562۔ 1563۔ 1564۔ 1565۔ 1566۔ 1567۔ 1568۔ 1569۔ 1570۔ 1571۔ 1572۔ 1573۔ 1574۔ 1575۔ 1576۔ 1577۔ 1578۔ 1579۔ 1580۔ 1581۔ 1582۔ 1583۔ 1584۔ 1585۔ 1586۔ 1587۔ 1588۔ 1589۔ 1590۔ 1591۔ 1592۔ 1593۔ 1594۔ 1595۔ 1596۔ 1597۔ 1598۔ 1599۔ 1600۔ 1601۔ 1602۔ 1603۔ 1604۔ 1605۔ 1606۔ 1607۔ 1608۔ 1609۔ 1610۔ 1611۔ 1612۔ 1613۔ 1614۔ 1615۔ 1616۔ 1617۔ 1618۔ 1619۔ 1620۔ 1621۔ 1622۔ 1623۔ 1624۔ 1625۔ 1626۔ 1627۔ 1628۔ 1629۔ 1630۔ 1631۔ 1632۔ 1633۔ 1634۔ 1635۔ 1636۔ 1637۔ 1638۔ 1639۔ 1640۔ 1641۔ 1642۔ 1643۔ 1644۔ 1645۔ 1646۔ 1647۔ 1648۔ 1649۔ 1650۔ 1651۔ 1652۔ 1653۔ 1654۔ 1655۔ 1656۔ 1657۔ 1658۔ 1659۔ 1660۔ 1661۔ 1662۔ 1663۔ 1664۔ 1665۔ 1666۔ 1667۔ 1668۔ 1669۔ 1670۔ 1671۔ 1672۔ 1673۔ 1674۔ 1675۔ 1676۔ 1677۔ 1678۔ 1679۔ 1680۔ 1681۔ 1682۔ 1683۔ 1684۔ 1685۔ 1686۔ 1687۔ 1688۔ 1689۔ 1690۔ 1691۔ 1692۔ 1693۔ 1694۔ 1695۔ 1696۔ 1697۔ 1698۔ 1699۔ 1700۔ 1701۔ 1702۔ 1703۔ 1704۔ 1705۔ 1706۔ 1707۔ 1708۔ 1709۔ 1710۔ 1711۔ 1712۔ 1713۔ 1714۔ 1715۔ 1716۔ 1717۔ 1718۔ 1719۔ 1720۔ 1721۔ 1722۔ 1723۔ 1724۔ 1725۔ 1726۔ 1727۔ 1728۔ 1729۔ 1730۔ 1731۔ 1732۔ 1733۔ 1734۔ 1735۔ 1736۔ 1737۔ 1738۔ 1739۔ 1740۔ 1741۔ 1742۔ 1743۔ 1744۔ 1745۔ 1746۔ 1747۔ 1748۔ 1749۔ 1750۔ 1751۔ 1752۔ 1753۔ 1754۔ 1755۔ 1756۔ 1757۔ 1758۔ 1759۔ 1760۔ 1761۔ 1762۔ 1763۔ 1764۔ 1765۔ 1766۔ 1767۔ 1768۔ 1769۔ 1770۔ 1771۔ 1772۔ 1773۔ 1774۔ 1775۔ 1776۔ 1777۔ 1778۔ 1779۔ 1780۔ 1781۔ 1782۔ 1783۔ 1784۔ 1785۔ 1786۔ 1787۔ 1788۔ 1789۔ 1790۔ 1791۔ 1792۔ 1793۔ 1794۔ 1795۔ 1796۔ 1797۔ 1798۔ 1799۔ 1800۔ 1801۔ 1802۔ 1803۔ 1804۔ 1805۔ 1806۔ 1807۔ 1808۔ 1809۔ 1810۔ 1811۔ 1812۔ 1813۔ 1814۔ 1815۔ 1816۔ 1817۔ 1818۔ 1819۔ 1820۔ 1821۔ 1822۔ 1823۔ 1824۔ 1825۔ 1826۔ 1827۔ 1828۔ 1829۔ 1830۔ 1831۔ 1832۔ 1833۔ 1834۔ 1835۔ 1836۔ 1837۔ 1838۔ 1839۔ 1840۔ 1841۔ 1842۔ 1843۔ 1844۔ 1845۔ 1846۔ 1847۔ 1848۔ 1849۔ 1850۔ 1851۔ 1852۔ 1853۔ 1854۔ 1855۔ 1856۔ 1857۔ 1858۔ 1859۔ 1860۔ 1861۔ 1862۔ 1863۔ 1864۔ 1865۔ 1866۔ 1867۔ 1868۔ 1869۔ 1870۔ 1871۔ 1872۔ 1873۔ 1874۔ 1875۔ 1876۔ 1877۔ 1878۔ 1879۔ 1880۔ 1881۔ 1882۔ 1883۔ 1884۔ 1885۔ 1886۔ 1887۔ 1888۔ 1889۔ 1890۔ 1891۔ 1892۔ 1893۔ 1894۔ 1895۔ 1896۔ 1897۔ 1898۔ 1899۔ 1900۔ 1901۔ 1902۔ 1903۔ 1904۔ 1905۔ 1906۔ 1907۔ 1908۔ 1909۔ 1910۔ 1911۔ 1912۔ 1913۔ 1914۔ 1915۔ 1916۔ 1917۔ 1918۔ 1919۔ 1920۔ 1921۔ 1922۔ 1923۔ 1924۔ 1925۔ 1926۔ 1927۔ 1928۔ 1929۔ 1930۔ 1931۔ 1932۔ 1933۔ 1934۔ 1935۔ 1936۔ 1937۔ 1938۔ 1939۔ 1940۔ 1941۔ 1942۔ 1943۔ 1944۔ 1945۔ 1946۔ 1947۔ 1948۔ 1949۔ 1950۔ 1951۔ 1952۔ 1953۔ 1954۔ 1955۔ 1956۔ 1957۔ 1958۔ 1959۔ 1960۔ 1961۔ 1962۔ 1963۔ 1964۔ 1965۔ 1966۔ 1967۔ 1968۔ 1969۔ 1970۔ 1971۔ 1972۔ 1973۔ 1974۔ 1975۔ 1976۔ 1977۔ 1978۔ 1979۔ 1980۔ 1981۔ 1982۔ 1983۔ 1984۔ 1985۔ 1986۔ 1987۔ 1988۔ 1989۔ 1990۔ 1991۔ 1992۔



"ہمارے یہاں ہر کام جدید اعزاز سے ملتا ہے۔"  
اس نے بتایا۔ "دعا، تعویذ اور چلہ وغیرہ کا ہمارے پاس  
رواج نہیں ہے۔"

"تو پھر کیسے کرتے ہیں۔"  
"جدید علوم کے ذریعے۔ جو جدید نہیں۔ بہت قدیم  
ہیں۔ لیکن سائنسک ہیں۔" اس نے بتایا۔ "جیسے ٹیلی ویشن،  
مسرح پریم، روکی وغیرہ۔"

"ہاں۔ میں نے بھی ان کے بارے میں سن رکھا  
ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا ان سے کام ہو جاتا ہے۔"  
"سو فیصد۔" اس نے کہا۔ "ان کے اثرات تعویذ  
گنڈوں سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ آپ اپنا مسئلہ  
بتائیں۔"

"بہت ہی بڑا مسئلہ ہے۔"  
"کوئی دل کا معاملہ ہے کیا؟"  
"ہاں۔ دل ہی کا معاملہ ہے۔ لیکن کیس بہت بے تکا ہے۔"  
"کوئی بات نہیں۔ بتائیں مجھے۔"

میں نے اسے راجیلہ لاد اس کے باپ کے بارے  
میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ بہت دیر تک ہنستا رہا تھا۔ "واقعی  
بہت دلچسپ کیس ہے۔ ایسا باپ تو لاکھوں میں ایک ہی ہوتا  
ہوگا۔"

"جی جناب۔ لاکھوں میں ایک ہے۔"  
"چلیں۔ اس کا ایڈریس لکھوا دیں۔ آپ کا مسئلہ حل  
ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔

"حل ہو جائے گا؟ کیسے۔ کیا آپ مجھے ڈارڈن  
مٹا دیں گے کہ میں اس سے کشتی فرسکوں۔"

"جی نہیں۔ میں ٹیلی ویشن اور مسرچیم کی طاقت سے  
اس شخص کو آپ کے لیے ہموار کر دوں گا۔" اس نے  
بتایا۔ "اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ہمارے یہاں ناممکن کو ممکن  
بنایا جاتا ہے۔"

"مگر ایسا ہو جائے تو پھر کہاں ہو جائے گا۔"  
"آپ گھر نہ کریں۔ آپ کا کیس ہمارے پاس آچکا  
ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ کے لیے کامیابی کا سامنا ہی ہے۔"  
"آپ کی فیس کتنی ہوتی ہے۔"

"سیکرٹری نے بتا دیا ہوگا۔ مکلی وارنٹ کے ہزار۔  
اس کے بعد تین تین سو۔"

"جی ہاں۔ اس نے بتایا تھا۔"  
"آپ جاتے ہوئے کاؤنٹر پر پیسے جمع کروادیتے"

وغیرہ کام چلائیں لگایا تھا۔ بالکل جدید اسٹائل پر کام کرنے  
والی پارٹی معلوم ہوتی تھی۔

میں دوسری شام اس کے دفتر پہنچی گیا۔  
جی ہاں۔ وہ کسی باادبیرہ کے آستانے جیسا نہیں تھا۔  
بلکہ باقاعدہ آفس تھا۔ بہت شاندار شیشے لگے ہوئے۔ کمپیوٹر  
پر کام کرتے ہوئے لوگ۔ ایک کاؤنٹر جس کے پیچھے ایک  
اسٹارٹ سیٹریٹیشن ہوتی تھی۔

میں نے اپنے بارے میں بتایا تو اس نے رجسٹر کھول  
کر بتایا۔ "آپ کو کن نمبر یاد دیا گیا ہے۔"  
"جی ہاں۔" میں نے گردن ہلائی۔ پھر پوچھ  
لیا۔ "شاید کل آپ ہی سے میری بات ہوئی تھی۔"  
"جی ہاں۔ میں ہی سر کی سیکرٹری ہوں۔" اس نے  
بتایا۔ "آپ شریف رہیں۔"

سامنے دیوار کے ساتھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں بھی  
چاکر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں انتظار کرنے والے  
خاصے ماڈرن اور بڑے لکھے لوگ معلوم ہو رہے تھے۔

یعنی عام روایتی باباؤں کے پاس جس قسم کے لوگ  
چلایا کرتے ہیں۔ یہ ان سے بہت فرق تھے۔ دو عورتیں بھی  
تھیں اور وہ بھی بڑی لکھی دکھائی دیتی تھیں۔

کچھ دیر بعد ایک نوکن نمبر پکارا گیا۔ اور ایک آدمی  
اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اس کی داہنی ہندوہ میں صحت کے بعد  
ہوئی تھی۔ پھر دوسرا۔ اس کے بعد ایک عورت، پھر میری  
باری آئی۔

میں اس کے کمرے کی سہاوت دیکھ کر حیران رہ گیا۔  
وہ کمرہ جدید اعزاز سے سجا ہوا تھا۔ دیوار پر بڑی سی پینٹنگ  
دیوار کے ساتھ خوبصورت صوفے، شیشے والی بڑی سی میز اور  
ایک ماڈرن سا آدمی گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا۔

یہ سب دیکھ کر مجھے حیرانی ہو رہی تھی۔  
"کیا بات ہے۔ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔" اس  
نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"سب کچھ میرے اعزازے کے بالکل برعکس ہے۔"  
"میں نے جواب دیا۔"

"ہاں۔ سب لوگ یہی کہتے ہیں۔ میں روایتی  
باباؤں کی طرح نہیں ہوں۔ یہاں نہیں اگر قیاس چلتی  
ہوئی اور شیر کی کھال ہو گیڈ کی کھوپڑی نہیں ملے گی۔"

"وہی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" اب میں اس کے  
سامنے بیٹھ گیا تھا۔



1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

ترمیمی بیماریوں کا موثر اور سب سے ضروری علاج

پکھلیہری  
قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

اصل زیندی کی اور دنیا کا سب سے بڑا کامیاب اور سب سے ضروری علاج

ملٹی  
ابولڈ  
بولڈر



ASIAN EXCELLENCE  
PERFORMANCE AWARD



AWARD OF  
BEST ACHIEVEMENT

9-اپریل 30% مئی  
9-اگست 30% ستمبر  
9-دسمبر 30% جنوری



AWARD  
PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

14-فروری 27% فروری  
14-جولائی 27% جولائی  
14-اکتوبر 27% اکتوبر

یکم فروری 19% فروری  
یکم جون 11% جون  
یکم اکتوبر 11% اکتوبر

ملتان

28-اپریل 62% اپریل  
28-جولائی 62% جولائی  
28-دسمبر 72% دسمبر

کراچی

13-مارچ 27% مارچ  
13-جولائی 27% جولائی  
13-دسمبر 27% دسمبر

Email: info@ajma-zaidi@hotmail.com www.ajma-zaidi.com



گا۔" اس نے کہا۔ "اور مجھے ایڈریس لکھوا دیں۔"

میں نے اس کو راجیلہ کا ایڈریس لکھوا دیا۔

"آپ ایک ہفتے کے بعد آجائیں۔" اس نے

کہا۔ "ایک ہفتے کے بعد آپ کو رپورٹ مل جائے گی۔"

میں نے کاؤنٹر پر ہزار روپے دے دیے۔ دل کچھ مطمئن بھی تھا۔ اور کچھ بے اطمینانی بھی ہو رہی تھی۔ پتا نہیں۔ یہ سب کیسے ہوتا۔

میں راجیلہ کی طرف بھی نہیں جاسکتا تھا کہ کہیں اس کے باپ سے مل بھیل ہونے کا خطرہ تھا اور میں فی الحال پٹنے کے سوا میں نہیں تھا۔ اتنی مشکلوں سے تو کھلی ٹھکانی کے اثرات کم ہوئے تھے۔

ایک ہفتہ میں نے بڑی بے قراری میں گزارا تھا۔ پتا نہیں۔ ایک ہفتے بعد کیا ہوتا۔

اس کی سروس بہت ہی پرہیزگاری تھی۔

ٹھیک ایک ہفتے کے بعد اس کی سیکریٹری کا فون آگیا۔ "سر۔ آپ کو خرم صاحب نے یاد کیا ہے۔ ٹھیک چار بجے آپ کی میٹنگ ہے۔"

دل زور زور سے دھڑک اٹھا۔ اس نے بیٹھا کوئی کارنامہ کھا دیا ہوگا۔

میں ٹھیک چار بجے اس کے دفتر پہنچی گیا۔

انتظار کے مرحلوں سے گزرے بغیر ہی اس کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اور بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"آئیں جناب۔ آئیں۔"

"آپ نے خود ہی بلا لیا مجھے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں شاید کل آتا۔"

"جی ہاں۔ میں نے سوچا کہ آپ کو وہ خبر شادی دوں۔"

"ضرور سنائیں جناب۔ میں تو بے شک بیٹھا ہوں۔" میں نے کہا۔

"جناب۔ میں خود آپ کے بتائے ہوئے ایڈریس پر گیا۔ پہلے تو اس پہلوان اہا سے ملاقات ہوئی۔ پھر اس کی بیٹی سے ملا۔"

"کیا پایا آپ نے اسے؟" میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"بہت اچھی لڑکی ہے۔ اپنے باپ کے بالکل برعکس۔" اس نے بتایا۔ "ایسی لڑکی کسی بھی شخص کے لیے مبارک ثابت ہو سکتی ہے۔"

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ راجیلہ کی تعریف مجھے

ابھی لگی تھی۔

"پھر کیا ہوا جناب۔"

"میں نے اس کے پہلوان لہا پر اپنے حربے آزمائے۔" اس نے بتایا۔ "میں نے پہلے اسے چٹا بنا کر کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی قوت ارادی بہت مضبوط ہے۔ اسی لیے یہ حربے کام نہیں آئے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی اندازہ تھا۔ وہ آدمی اس طرح کا تو نہیں آنے والا۔"

"اس کے بعد میں نے اپنا دوسرا خطرناک ہتھیار یعنی ٹیل چمچی استعمال کیا۔ اور اس میں کامیاب ہوتا چلا گیا۔"

"اول۔ یہ بات ہوئی نا۔"

"میں نے اس کو اپنی اس طاقت سے ذبح کر لیا۔" اس نے بتایا۔

"بہت بہت شکر یہ خرم صاحب۔" میں نے کہا۔ "یعنی اب میں اس کے گھر جاسکتا ہوں۔"

"کیا کریں گے وہاں جا کر کیونکہ راجیلہ اب میری منگیتر ہے۔" اس نے بتایا۔

"کیا؟" میں تو بھک سے ہو کر رہ گیا تھا۔ "تہا دی منگیتر ہے۔"

"ہاں جناب۔ چونکہ میں نے اس کے باپ کو ذبح کر لیا تھا۔ اس لیے اس نے خود ہی راجیلہ کی بات کر لی۔ اور راجیلہ تو مکمل ہی نظر میں خود مجھے بھی پسند آگئی تھی۔ اسی لیے میں نے فوراً ہی کرنے میں دوہ نہیں لگائی۔"

"لغت ہو تم پر ذلیل انسان۔" میں غصے سے بھڑکتا جا رہا تھا۔

"دیکھیں گالیاں نہ دیں۔ اس کی جو شرط تھی۔ وہ میں نے پوری کر دی۔ اب اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

"بورہ۔ وہ راجیلہ۔"

"وہ بھی اس دشت پر بہت خوش ہے۔" اس نے بتایا۔

میں اسے برا بھلا کہتا ہوا جب کمرے سے جانے لگا تو اس نے آواز لگائی۔ "سنیں۔ چونکہ آپ کا کام نہیں ہوا ہے اس لیے کاؤنٹر سے اپنی فیس واپس لے لیجئے گا۔"

میں فیس لیے بغیر ہی واپس آ گیا۔

اس کہانی کو بیان کرنے کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ بھی زبان فیر سے شرح آواز نہ کریں۔ ورنہ کیا کہنا پڑے گا کہ "رقیب بن گیا آخر کو کتنا جبردار وہاں اپنا۔"







## طالع

محترمہ عذرا رسول !  
السلام علیکم !

میں سرگزشت کی بہت پرانی پڑھنے والی ہوں۔ کافی عرصہ سے سوچ رہی ہوں کہ سرگزشت کے قارئین کو اپنی انوکھی داستان سننا تو لیکن حوصلہ نہیں ہو رہا ہے۔ کسی بھی ڈائجسٹ یا اخبار میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔ تعلیمی دور میں بھی مضمون لکھنے سے جان جاتی تھی، پھر بھی تھوڑا تھوڑا کر کے اپنی داستان لکھ لی ہے۔ امید ہے یہ انوکھی داستان ہلکے ہوں کہیں کہ یہ انوکھا مگر سائنس کی طرح علاج آپ کو بھی پسند آئے گا۔ اگر ممکن ہو تو ضرور شائع کریں۔

ناٹھ

(فیصل آباد)

شرجائے کیا ہوا تھا۔

میں نے آوازیں سنیں جیسے کوئی زور زور سے دروازے پر لاقیم مار رہا ہو۔ میں اس وقت بچن میں چائے پکاتی تھی۔ پوکھلا کر دو لٹریں کی طرف بھاگی لیکن آوازیں

تو اندر سے آ رہی تھیں۔

او خدا۔ یہ آوازیں تو فصل خانے سے آ رہی تھیں جہاں میرے شوہر گمن نہانے کے لیے گئے تھے۔ وہ دختر جانے سے پہلے ضرور نہایا کرتے۔ چاہے کوئی بھی موسم ہو۔

ماہنامہ سرگزشت

251

اگست 2014ء



لیٹے تھے۔ میں دوڑ کر لن سے لپٹ گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن ان کی زبان ہی ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

دایاں حصہ فالج سے بری طرح متاثر تھا۔ اس دوران میں ارشد نے فون کر کے ایس۔ اینس منگوائی تھی۔ میں نے محسن اور اسے گھر والوں کو فون کر دیا۔ ذرا سی دیر میں سب ہی جمع ہو گئے اور محسن کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اسپتال پہنچتے ہی محسن کا علاج شروع ہو گیا تھا۔

میں صرف رو رہی تھی۔ محسن کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ تو صحت مند آدمی ہیں۔ ہتے بولتے ہوئے۔ مکمل بصورت۔ انہیں فالج کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ سب درم حقیقت ہمارے سامنے تھی۔

☆ ☆ ☆

ہماری شادی کو ابھی صرف ایک سال ہوا تھا۔ ایک سال ہوتا ہی کیا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے اور باتیں کرتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ یہ ہماری اور شادی میرج تھی۔ دونوں کے گھر والوں نے یہ رشتہ لگا دیا تھا۔

محسن کے ابو میرے ابو کے دوست تھے۔ بس یہ تعلق تھا اور شادی ملے ہوئی تھی۔ ہم دونوں ہی اس معاملے میں خوش نصیب تھے کہ محبت ہمیں شادی کے بعد ہی ملی تھی۔ نہ تو کوئی محسن کی زندگی میں آئی تھی اور نہ ہی کوئی میری زندگی میں آیا تھا۔

میرے گھر کی تربیت ہی ایسی تھی کہ بوجھ اور دیکھنے کا موزج ہی نہیں مل سکا اور محسن اپنی تعلیم کے بعد اپنا کیریئر بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ اسی لیے لن کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔

لیکن شادی کے بعد ہم دونوں نے لوٹ کر ایک دوسرے سے محبت کی تھی۔ محسن نے شادی سے کچھ پہلے ایک جدید خواہشورت ساقیٹ خرید لیا تھا۔

ہم دونوں میں بحالیاتی حس موجود تھی۔ اسی لیے ہم نے بہت خواہشورتی سے اپنے فلیٹ کو ڈیکوریت کر دیا تھا۔ ہمارے درمیان مکمل دفنی ہم آہلی تھی جس پر ہم دونوں ہی خدا کے شکر گزار تھے۔

میرا سارا وقت فلیٹ کی دیکھ بھال میں گزر رہا تھا۔ ہم بہت خواہشورتی سے شکر خریدا لائے تھے۔ جنہوں نے اس گھر کی خواہشورتی میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔

ہمارا معمول تھا کہ شام کے وقت ہم آؤنگ پر کل

میں نے فصل خانے کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے پوچھا۔ ”محسن۔ محسن۔ دروازہ کھولیں۔ کیا ہوا۔“

لیکن جواب میں دروازے پر لاکھیں پڑی رہیں اور ساتھ ہی محسن کے ٹکلیا نے کی آواز آئی۔ وہ کچھ کہہ رہے تھے لیکن کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔

میں پریشان ہو کر اپنے فلیٹ سے باہر آ گئی۔ برابر کا فلیٹ ارشد صاحب کا تھا۔ میں نے دروازہ سے دستک دے دی۔ ارشد کو کھلائے ہوئے باہر آئے تھے۔ ”کیا ہوا بھائی۔“

خبر بتاؤ ہے۔“

جلدی آئیں۔ خدا جانے محسن کو کیا ہوا ہے۔ وہ ہاتھ روم میں ہیں۔“

ارشد بھی میرے ساتھ آ گئے۔ لن کی بیوی بھی ساتھ ہی آ گئی تھی۔ دروازے پر ابھی تک لاکھیں پڑی تھیں لیکن ان کی قوت بہت کم ہو گئی تھی۔ جیسے محسن جھک گئے ہوں۔

ارشد نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ تو اندر سے بند تھا۔ اس دوران میں ارشد کی بیوی فلیٹ کے ایک اور آدمی کو بلا کر لے آئی تھی۔ جو کیدار بھی آ گیا تھا۔

اب تینوں مل کر دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”نزہت“ ارشد نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ ”بھالی کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔“

میں وہاں سے ہٹا نہیں چاہتی تھی لیکن نزہت مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی تھی۔ اس دوران میں، میں مسلسل کانپتی رہی۔ میرے احصاب جواب دے رہے تھے۔ میں نے رونٹا شروع کر دیا تھا۔

دوسرے کمرے سے دروازہ ٹوٹنے کی آواز آرہی تھی۔ ساتھ ہی وہ لوگ کچھ کہہ بھی رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ارشد کمرے میں آیا۔ اس کا چہرہ متا ہوا تھا۔ ”بھالی۔ ہم نے محسن صاحب کو لارا ٹنگ روم میں لٹا دیا ہے۔“

”خدا کے لیے تائیں تو کسی کیا ہوا ہے ان کو۔“

”فالج۔“ ارشد نے بتایا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ راتیں طرف ہے۔ ہاواں حصہ ٹھیک ہے۔ اسی ٹانگ سے وہ دروازے پر ٹھوکر مار رہے تھے۔“

میرے پردوں تلے سے زمین ہی کل مل گئی تھی۔ محسن جیسے جوان، خوش مزاج اور اسارت محسوس ہونے لگا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں دلدلی ہوئی لارا ٹنگ روم میں نکلی گئی۔

جس کے ایک صوفے پر محسن بے بسی کی تصویر بنے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



جائے۔ رات کا کھانا عام طور پر باہر ہی کھایا جاتا۔ یعنی خدا نے ہر طرح کی خوشیاں دے رکھی تھیں اور ہم بہت خوش تھے کہ اچانک یہ حادثہ ہو گیا۔

ایک قیامت تھی۔ قیامت۔

حسن بستر کا ہو کر رہ گئے تھے۔ میں ہی ان کی ساری ضروریات کا خیال رکھا کرتی۔ میں سمجھ لیں کہ وہ کسی بچے کی طرح ہو گئے تھے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس وقت ہم اس قابل تھے کہ ان کا علاج کروا سکتے۔ حسن اور میرے چنگ اکاؤنٹ میں بھی رقم تھی۔ اس کے علاوہ دلوں کے گھروالے بھی اس مشکل وقت پر ہمارے ساتھ آکر کھڑے ہوئے تھے۔ اس طرف سے تو کوئی پریشانی نہیں تھی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اچانک ہو گیا کیا ہے؟ حسن کو بہت کیسے ہوئی۔ خدا نہ کرے کیا وہ اسی طرح ایک ذمہ داری کی طرح بستر پر پڑے رہیں گے۔

اسپتال سے فارغ کرتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا تھا۔ ”اب ان کو اسپتال میں رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ ایسا مرض ہے جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کب ٹھیک ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ مچھل لگ جائیں۔“

ڈاکٹر صاحب کیا وہ دن ملک بھی ان کا علاج نہیں ہو سکتا۔“

”میرے خیال میں نہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”مب اصل امتحان آپ کا ہے۔ میری مانی تو آپ ان کے لیے میل نرس رکھ لیں۔ ان کو سنبھالنا آپ کے بس کا روگ نہیں ہوگا۔“

ڈاکٹر صاحب۔ کیا یہ پھر سے چلے پھرنے اور بولنے کے قابل ہو جائیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”چلے پھرنے کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن کچھ دنوں کے بعد زبان کی انٹھن ختم ہو جائے گی۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔ ”کم از کم بولنا تو شروع کر دیں گے اور ویسے بھی اس قسم کے مریضوں کا علاج خود ان کے اپنے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ایسے مریض اپنی قوتِ ارادی ختم کر کے اپنے آپ کو اپنے مرض کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ لڑنا نہیں چاہتے۔“

”تو پھر کیا کیا جائے۔“

”ابھی نہیں۔ کچھ دنوں کے بعد انہیں نفسیاتی علاج کی ضرورت ہوگی۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔ ”تا کہ ان میں پھر سے جینے کا حوصلہ اور خواہش پیدا ہو جائے۔“

ڈاکٹر صاحب نے بے شمار ہدایات اور نصیحتوں کے بعد ہمیں اسپتال سے فارغ کر دیا۔ ہم حسن کو لے کر گھر آ گئے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر دل خون کے آنسو رو دیا کرتا۔

زندگی سے بھرپور کسی شخص کے ساتھ ایسا ہو جائے تو پھر جو کچھ نہ کیا جائے، وہ کم ہے۔ اسپتال میں کچھ دنوں رہنے کے بعد کم از کم اتنا تو ہو گیا تھا کہ حسن کی زبان کی گفت بڑی حد تک دور ہو چکی تھی۔ اب وہ جو بولتے وہ کم از کم سمجھ میں آ جاتا کرتا۔ ویسے تو ہم نے ان کے لیے ایک میل نرس بھی رکھ لیا تھا لیکن عام طور پر میں ہی ان کی خدمت میں لگتی رہتی۔

حسن ایسے موقعوں پر آنسو بہایا کرتے۔ ”نانک۔ میں جنہیں زندگی کا کوئی سکھ نہ دے سکا۔“ وہ کہا کرتے۔ ”ابھی ہماری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ تم پر یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ تم صرف میری خدمت کی ہو کر رہ گئی ہو۔“

”حسن نہ کریں ایسی باتیں۔“ میں خود پر جبر کرتے ہوئے کہتی۔ ”خدا نے چاہا تو آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”نہیں نانک۔ اب کوئی امید نہیں ہے۔ میں نے اس مرض سے کسی کو شفا پاتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ حسن کے لیے میں بے پناہ مایوسی ہوتی۔

اس وقت میں اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے کسی کام کا بہانہ کر کے حسن کے پاس سے ہٹ جاتی اور وہ حسرت سے بچھہ دیکھتے رہتے۔

میں سمجھ گئی تھی کہ حسن نے اس چھوڑ دی ہے۔ وہ زندگی اور موت کی اس جنگ میں سر بیڑا کرنے لگے ہیں اور یہ بہت خطرناک علامت تھی۔

میں نے ان ہی ڈاکٹر سے مشورہ کیا جس کے وہ ذریعہ علاج تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”ہاں ایسا ہوتا ہے۔ اس قسم کے مریض مایوس ہو جاتے ہیں۔ ان میں جا کی جنگ لڑنے کی طاقت نہیں رہتی۔“

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ جب ایسی کیفیت شروع ہو جائے تو کسی سائیکاٹرسٹ سے مدد شروع کریں۔ اب آپ کے شوہر کا نفسیاتی علاج شروع ہوگا۔ یہ بھی بہت اہم



"دیکھیں۔ میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھوں گا۔ آپ کے شوہر زندگی سے ماہوس ہوتے جا رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "ان میں مثبت تحریک، نئے حوصلے اور دلہنے کی ضرورت ہے۔ وہ حوصلہ پیدا کرنا ہوگا۔ کوئی شدید جذبہ۔ کوئی شدید خواہش۔ ویسے میڈیکل وہ بہت حد تک ٹھیک ہو چکے ہیں لیکن نفسیاتی طور پر انہوں نے اپنے آپ کو مردہ سمجھ لیا ہے۔"

"خدا کے لیے کچھ کریں ڈاکٹر صاحب۔"

"کوشش کرنا میرا کام ہے۔" ڈاکٹر ڈیشان نے کہا۔ "اس کے بعد جو خدا کی مرضی۔"

ڈاکٹر ڈیشان کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک محسن کو سمجھاتی رہی کہ وہ خود میں حوصلہ پیدا کرے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ وہ صحت کرے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ڈاکٹر ڈیشان نے ہاتھ دھو کر آنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ مجھے بھی محسن کے ساتھ کمرے میں بیٹھنے کی اجازت دے دیا کرتے۔

اس کے بعد باتیں شروع کر دیجے۔ ان کی باتیں ہی بہت دلچسپ ہوا کرتیں۔ حس مزاج بھی بہت نرم و دست تھی۔ ان کی باتیں سن کر میں بے حواس ہوتی رہتی۔ کبھی کبھی محسن بھی اس کی باتوں پر ہنس پڑتے تھے۔

یہ سب تو تھا لیکن ابھی تک محسن میں بہتری کی خاص علامات ظاہر نہیں ہوئی تھیں اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس قسم کا علاج ہے۔

کیا صرف باتوں کے ذریعے محسن کا علاج ممکن ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے نہ جانے کتنے سوالات تھے۔ دوسری طرف میں ایک عجیب بات محسوس کرنے لگی تھی۔

وہ بات جس کا احساس عورت کو بہت جلد ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ڈیشان میرے شوہر سے زیادہ اب مجھ میں دلچسپی لینے لگے تھے۔

وہ جب میری طرف دیکھتے تو ہنس دیکھتے ہی رہ جاتے جبکہ میں شرما کر اپنی گردن پر دھڑا دھڑا کرتی۔ جب مجھ سے باتیں کرتے تو ان کی آواز میں خاص قسم کی متعاس شامل ہو جاتی۔

ظاہر ہے کہ یہ سب مجھے پسند نہیں تھا لیکن میں محسن کی وجہ سے مجبور تھی۔ میں ہر صورت میں ان کی صحت یابی چاہتی تھی۔

مرطہ ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ میں تو کسی سائیکالوسٹ کو نہیں جانتی کیونکہ کبھی ایسا مرطہ سامنے نہیں آیا تھا۔" میں نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کو ڈاکٹر ڈیشان کے پاس بھیج رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ میرے جانتے والے ہیں۔ باہر سے تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں اور اب پاکستان میں پریکٹس کر رہے ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ ہمارے ملک میں اس قسم کے علاج وغیرہ کا دستور نہیں ہے اسی لیے ڈاکٹر ڈیشان کے پاس بہت کم مریض ہوں گے لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کہ وہاں لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

زیادہ تر پش علاقوں کے رہنے والے دکھالی دے رہے تھے۔ کھاتے پیچے لوگ۔ ان کو دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسے لوگ بھی نفسیاتی مریض ہو سکتے ہیں۔

بہر حال بہت دیر کے بعد میری ہارپی آئی۔ ڈاکٹر ڈیشان کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ وہ میری توقع کے برعکس نوجوان آدمی تھے۔

اسمارٹ اور خوش لباس۔ میں نے جب محسن کے بارے میں بتایا تو بہت دیر تک سوچنے کے بعد بولے۔

"دیکھیں۔ ان کا ٹریٹمنٹ گھریلو کیا جائے گا کیونکہ آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔"

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔ وہ تو اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر ایسی صورت میں مجھے آپ کے گھر آنا پڑے گا اور ایسے مریضوں کا علاج ایک دو مہینوں میں نہیں ہوتا۔ بلکہ کئی سیشن کرنے پڑتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ اتنا تو میں بھی جانتی ہوں۔"

"اوکے۔ تو پھر میں آپ کے گھر آ رہا ہوں۔ آپ اپنا ایڈریس دے دیں۔"

ڈاکٹر ڈیشان نے جو وقت دیا تھا وہ اسی وقت پہنچے۔ انہوں نے کمرے سے مجھے ہٹا دیا تھا اور بہت دیر تک محسن سے باتیں کرتے رہے تھے۔

پھر جب وہ اس کمرے سے باہر آئے تو میں ان کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ "جی ڈاکٹر صاحب۔ کیا اندازہ لگایا آپ نے؟" میں نے پوچھا۔



اسی کمرے سے باہر جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کا چہرہ تاریک سا ہو گیا تھا۔

پھر ڈاکٹر صاحب دو دنوں تک قہقہے آئے۔ تیسرے دن جب وہ آئے تو میں نے ان سے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب۔ اس دن محسن نے آپ سے کیا باتیں کی تھیں؟" نے کہا۔ "ارے کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔" ڈاکٹر "وہ کہہ رہے تھے نا کہ انہیں کوئی ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے یاد دلایا۔

"ہاں کہا تو تھا۔ لیکن کوئی بات نہیں کی۔" اب باتیں وہ سچ بول رہے تھے یا محسن نے واقعی کوئی بات نہیں کی تھی۔

لیکن اسی دن اس کہانی کا اختتام بھی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے ایک ایسی حرکت کی۔ جس کا میں نے تصور ہی نہیں کیا تھا۔ اس دن بھی جب اس نے مجھے اس کمرے میں بلانے کے لیے کہا تو محسن نے بہت تلخ ہو کر پوچھا۔ "آخر پھر کیا ہے۔ تم میرا علاج کرنے آتے ہو یا میری بیوی کی صورت دیکھنے۔"

"سچ یہ ہے کہ میں تمہاری بیوی کی صورت ہی دیکھنے

اس لیے مجھے اپنے آپ پر جبر کرنا پڑ رہا تھا ورنہ ڈاکٹر ڈیٹان کی تیز نگاہوں کی بخش میری برداشت سے باہر تھی۔ کئی بار سوچا کہ انہیں ٹوک دوں کہ ڈاکٹر صاحب آپ مریض پر توجہ دیں۔ میری طرف دھیان نہ دیں تو بہتر ہے۔

لیکن پھر وہی خوف کہ اگر ڈاکٹر نے برامان لیا تو پھر کیا ہوگا۔ محسن کا علاج رک گیا تو میں کسی اور سائیکالرسٹ کو تو جانتی بھی نہیں تھی۔ اسی لیے دل پہ جبر کرتی رہی۔

ایک دن حسب معمول ڈاکٹر ڈیٹان نے جب مجھے بھی ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی تو محسن بول پڑے۔ "نہیں نا تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ مجھے ڈاکٹر صاحب سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

میں سمجھ گئی تھی کہ محسن کو بھی اس بات کا احساس ہونے لگا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اب اس کے سامنے بھی مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔

وہ اپنا سچ کسی لیکن ڈانی سفور تو نہیں تھے۔ وہ سب مجھ رہے تھے اس لیے انہوں نے مجھے کمرے سے چلے جانے کو کہا تھا۔

### لکڑیوں کے اسیر

اکثر ہاتھ کی دیکھائیں قدموں تلے ایسے رستے بچھا دیتی ہیں کہ ٹھوکر لگنے کے باوجود چلنا مجبوری بن جاتا ہے۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر عبدالرب بخش کا نیا انداز

### فقیر دوست

تاریخ کے سمندر سے واقعات کی سرکش موجوں کا احوال۔ ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر مساجد امجد کے قلم کی روانی

### ستاروں پر کمند

بعض اوقات لرزیدہ قدموں کو محبت ایسا استحکام بخشتی ہے کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے۔ طاہر جاوید مغل کا دلربا انداز

### ماروی

ہم شکل، ہم مزاج مگر تقدیر کی انفرادیت کا الجھنا تھا کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے۔ محی الدین نواب کے خیالات کی اثران

اگست 2014ء کا شمار  
رمضان اور عید کے لمحات کے ساتھ

خواہشوں کی کہانیوں کا مجموعہ  
سپر سسٹم  
ماہنامہ

مزین  
خطوط کی محفل،  
محفل شعر و سخن  
ملک مشرق حیات کی عرق و تیزی

کاشف ذہن پر ڈاکٹر شیر شاہ سید، تنویر ریاض  
منظر املر اور سلیم انور کا دلچسپ تمنا پر

لکڑیوں کے اسیر



”ڈاکٹر صاحب اس سے پوچھیں کہ اس نے کل کیا حرکت کی تھی۔“

”سز محسن۔ آپ کو میری حرکت یاد ہے لیکن بھول گئیں کہ اسی جوش میں محسن صاحب بستر سے اتر کر کئی قدم چل پڑے تھے۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے کہا۔  
”اے۔۔۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔“  
”یہ ڈاکٹر ڈیشان کا فریٹ تھا سز محسن“ پہلے ڈاکٹر نے کہا۔

”جی ہاں۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“  
”اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“  
”اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“

”جی ہاں۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“  
”اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“  
”اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“

”جی ہاں۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“  
”اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“  
”اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“

”جی ہاں۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“  
”اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“  
”اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“

”جی ہاں۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“  
”اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“  
”اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“

”جی ہاں۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“  
”اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“  
”اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“ ڈاکٹر ڈیشان نے بتایا۔ ”میں نے کہا تھا کہ شدید جسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہڈیوں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈی پڑ جائے گی۔“

آہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔  
”کیا؟“ محسن کے ساتھ ساتھ میں بھی حیران رہ گئی تھی۔

”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ محسن نے غصے سے کہا۔  
”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تم ایک ایسا ہی انسان ہو۔ تمہاری بڑی جوانی اور خوبصورتی ہے۔ یہ کب تک تم جیسے کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکتی ہے۔ اسے آزاد کر دینا کہ میں اس سے شادی کر لوں۔“  
”خاموش دلیل انسان۔ خاموش۔“ محسن دہانے لگے تھے۔

ڈاکٹر نے اس کی پردا کیے بغیر میرا ہاتھ قلم لیا۔ ”جان من میں تمہیں اپنا ماننا چاہتا ہوں۔“  
”تیری تو۔“ محسن نے ایک سوٹی سی گالی دی۔  
اور اچانک وہ بستر سے نیچے اتر آئے۔ اس حال میں ہی۔ وہ غصے سے کانپ رہے تھے۔ ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن وہ بستر سے اتر کر ڈاکٹر پر بھٹ پڑے تھے۔

ڈاکٹر ڈیشان نے سب دیکھ کر فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ محسن کمرے کے درمیان آکر ٹوکڑا کر گر پڑے تھے۔  
میں نے انہیں سہارا دے کر بڑی مشکل سے بستر پر لٹایا تھا۔

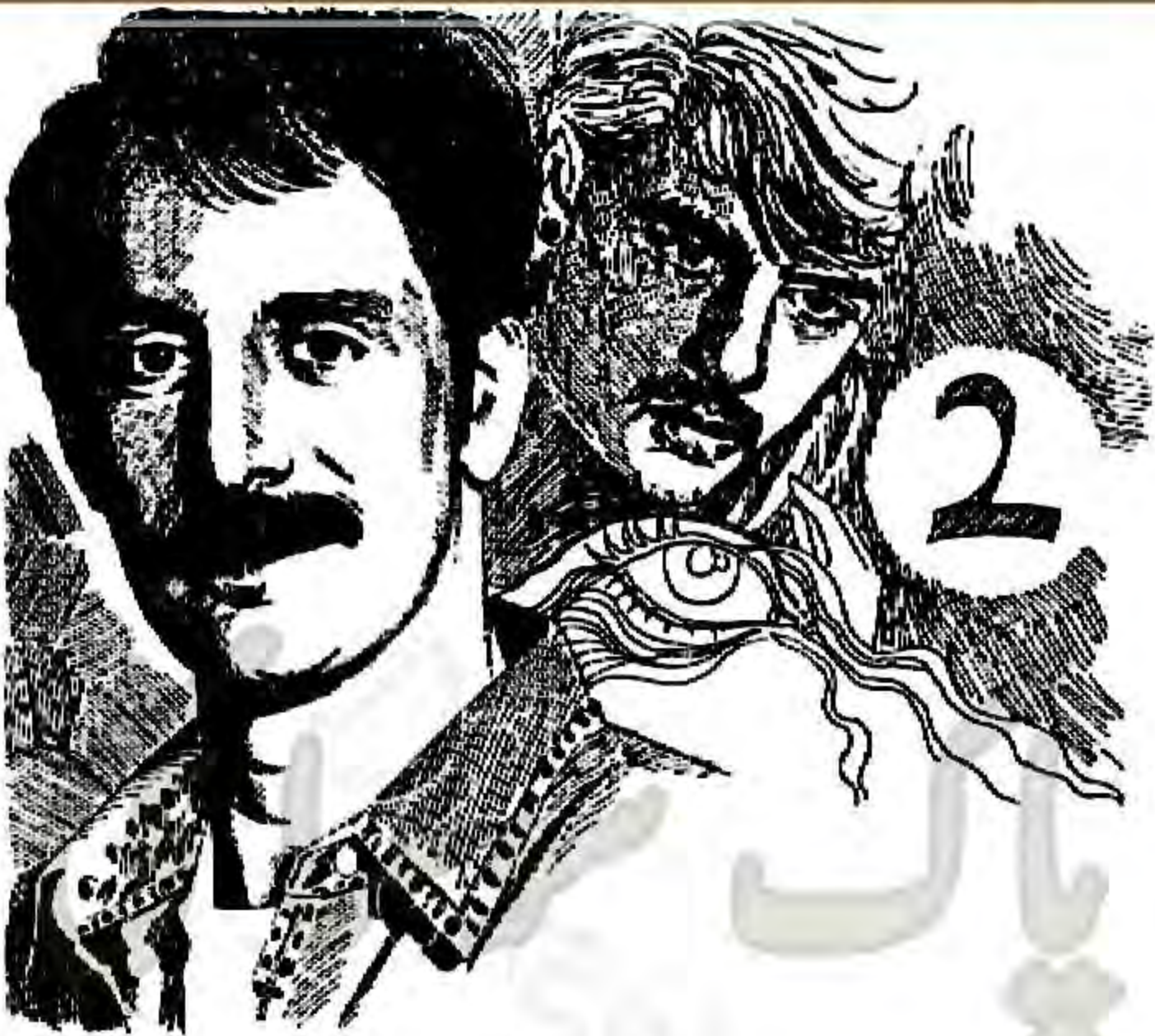
”یہ تم کس کہنے کو لے آئی تھیں۔“ محسن نے مجھ سے کہا۔

”میں کیا جانتی تھی کہ وہ ایسا آدمی نکلتے گا۔“  
”تم اس ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔ جس نے اس کو بھیجا تھا بلکہ کل مجھے بھی اسے ساتھ لے چلو۔“  
”ہاں۔ آپ بھی چلیں میرے ساتھ۔ صحت ہے ایسے ڈاکٹر پر۔“

دوسرے دن میں کسی نہ کسی طرح محسن کو اس ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ جس نے محسن کے قاتل کا علاج کیا تھا اور یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے تھے کہ وہاں ڈاکٹر ڈیشان بھی موجود تھے۔

اس کو دیکھتے ہی میں برس پڑی تھی۔ ”کہنے انسان۔ تم جیسے ڈاکٹر اس نے اس بچے کو بدنام کر کے دکھا دیا ہے۔“  
”سز محسن آپ کیوں بلا وجہ بے چارے پر ہراس پور رہی ہیں۔“ پہلے والے ڈاکٹر نے کہا۔





## چھوٹا آدمی

جناب ایڈیٹر صاحب !

آداب و نیاز !

ایک معمولی سے آدمی کی سرگزشت بھیج رہا ہوں کہ عشق انسان کو کھا سے کھا بنادیتا ہے۔ وہ ایک معمولی سا آدمی تھا مگر اس نے عشق کی خاطر کتنی بڑی قربانی دی یہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

عزیز ہمدانی

(ملتان)

=====

اس کی آنکھوں میں ایک بے نامی اداسی کی کیفیت رہا کرتی۔

ایسے لوگوں پر کلن دھیان دیتا ہے۔ کس کو اتنی فرصت ہوتی ہے۔ لیکن ہر کام ہی ایسا تھا کہ میں ایسے کرداروں کی تلاش میں رہا کرتا۔

میں ان کے چہرے کی کتاب پڑھتا۔ ان کو غور سے دیکھتا۔ ان کا مشاہدہ کرتا۔ ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا اور جب کچھ معلوم ہو جاتا تو پھر ان کی کہانیاں



لکھ لیا کرتا۔

مٹی ہاں۔ میں کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ اسی لیے کہ دروں کی تلاش رہا کرتی اور چہرے دیکھتا رہتا۔ اس خطے نے انسانوں کو بچھڑا دیا تھا۔

کیسے کیسے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ ان کی کیسی کہانیاں ہوتی ہیں۔ پریشان کر دینے والی، خوفزدہ اور مایوس کر دینے والی کہانیاں۔

خدا جانے ہماری دنیا میں اتنے دکھ کیوں بکھرے ہوئے ہیں۔ آج تک کسی ایسے انسان سے میری ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ جس کی زندگی میں مکمل خوشیاں بھری ہوں۔ جس سے بات کر دے اس کے ساتھ دکھ ہوتے ہیں۔ شاید خوشیوں کی کہانیوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بلکہ کہانیاں فتنی ہی اس وقت ہیں جب زندگی میں دکھ شامل ہو جائیں۔

تو مجھے اس کے چہرے پر بھی کئی کہانیاں دکھائی دے سکتی تھیں۔

انسانوں کو بچھڑنے کا یہ ہنر مجھے بتا دیا کرتا کہ کسی نے اپنے سینے میں طوفان چھپا رکھا تھا۔ وہ ایک ہوٹل کا ڈیڑھا تھا۔

یہ ہوٹل اس خطے میں تھا جہاں پچھلے دنوں میں کرائے کے قلیٹ میں گیا تھا۔ ہوٹل کا نام ہی بہت اچھا تھا۔ پکوان گھر۔ صاف ستھری میزیں اور کرسیاں۔ باقاعدہ چھپا ہوا مینو کھانے بھی بہت لذیذ اور صاف ستھرے ہوا کرتے۔ چونکہ یہ ہوٹل میرے حراج اور جیب دونوں کے مطابق تھا۔ اسی لیے عام طور پر رات کا کھانا میں اسی ہوٹل میں کھایا کرتا۔

میرے قلیٹ سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ دس منٹ کی داک پر تھا۔

میں اکیلا رہا کرتا تھا۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ صرف بیوی تھی۔ وہ بھی دوسرے شہر میں۔ یہاں میں اپنے روزگار کے سلسلے میں رہتا تھا۔

دن بھر ایک آفس میں کام کرتا اور جو وقت ملتا۔ اس میں کہانیاں لکھا کرتا۔ ان کہانیوں کی وجہ سے میری پزیرائی ہوا کرتی۔ لوگ مجھے جانتے لگتے تھے۔

بہر حال وہ دیکھ کر مجھے اس پکوان گھر میں دکھائی دیا تھا۔

ایک شریف سا انسان جس کے چہرے پر کہانیاں لکھی ہوئی تھیں۔ وہ بہت خوش اخلاقی سے مسکرا کر سلام کرتا اور

میرا آؤر لینے کے بعد فوراً ہی آؤر کی تحویل کر دیا کرتا۔ چونکہ میں تقریباً ہر رات وہاں آنے لگا تھا۔ اسی لیے وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ کبھی کبھی ہاتھ بھی کر لیا کرتا۔ میں بھی اس کی خیریت معلوم کرتا۔

ایک دن میں نے اس کا نام پوچھ لیا۔ "نمبر دو ہوں جناب۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ دیکھیں۔" اس نے اپنے سینے پر لگے بے کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر دو لکھا ہوا تھا۔ "یہ میرا نمبر ہے جناب۔ ہم جیسوں کے نمبر ہی ہوا کرتے ہیں۔ نمبر ایک، نمبر دو، نمبر گیارہ وغیرہ۔"

اس کی باتوں نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اس کی باتیں سچ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی غلط فہمی بھی تھیں۔ سوچنے کا موقع فراہم کرتی ہوئی باتیں تھیں۔ اس نے اپنی باتیں جاری رکھیں۔ "یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں جناب کہ یہاں کوئی ہمیں نام سے نہیں پکارتا ہے۔ بس یہی آوازیں آتی ہیں۔ دو نمبر ادھر آؤ۔ دو نمبر کونڈورنگ لے آؤ۔ دو نمبر جلدی سے مل لے آؤ۔ ہم چھوٹے لوگ ہیں صاحب۔ ہمارے نام نہیں ہوتے۔ نمبر ہوتے ہیں۔"

اس کی باتوں نے اور بھی حیران کر دیا تھا۔ "نہیں بھائی۔ دنیا میں کوئی بھی شخص چھوٹا نہیں ہوتا۔ اس کی حرکتیں اسے چھوٹا یا بڑا بناتی ہیں اس کا کام نہیں۔ کام تو شخصروں کی میراث ہوا کرتا ہے۔"

"آپ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں صاحب۔ دل میں اڑ کر رہتی ہیں۔ ویسے صاحب آپ خود کیا کرتے ہیں۔"

"میں کہانیاں لکھتا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"اس لیے تو۔" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اسی لیے آپ ایسا باتیں کر رہے ہیں۔ کیونکہ لکھنے والے بہت دور سے دل رکھنے والے ہوا کرتے ہیں۔"

"لکھا ہے تم بچھے لکھے بھی ہو۔" میں نے کہا۔

"مٹی ہاں صاحب۔ میں نے اصرار کر رکھا ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور باتیں کرتا۔ کسی نے اسے دو نمبر کہہ کر آواز دی اور وہ بے چارہ اس کی میز پر چلا گیا۔ بہر حال اس کے بعد آہستہ آہستہ اس سے میری باتیں ہونے لگیں۔ اس نے اپنا نام نہ پوچھا تھا۔ ایک دن



اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے بھی میری کہانیاں پڑھ رکھی ہیں۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ ”مذہب۔ تم کسی اور جگہ ملازمت کیوں نہیں کرتے۔ یا تم نے کوشش ہی نہیں کی۔“

”کوشش کی تھی جناب، اور ایک دفتر میں ملازمت بھی مل گئی تھی۔“

”تو پھر یہاں کیوں آ گئے۔“ میں نے پوچھا۔

”کیا آپ میری کہانی لکھیں گے صاحب۔ میں نے یہاں ایک خاص شخص سے ملازمت کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو یہ سب سن کر حیرت ہو۔ لیکن کیا کروں صاحب۔ مجبوری اس ہوئی تک لے آئی ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔ آج کل زندگی بہت دشوار ہونے لگی ہے۔“

”نہیں صاحب۔ وہ عیسویوں والی مجبوری نہیں۔ بلکہ کوئی اور مجبوری مجھے یہاں تک لے آئی ہے۔“

”اور کون سی مجبوری رہ جاتی ہے۔“

”محبت کی مجبوری صاحب۔“ اس نے بتایا۔

”محبت کی مجبوری؟“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ”میں نہیں سمجھا۔ محبت نے کیسے مجبور کیا تم کو۔“

”بتاتا ہوں صاحب۔“ اس نے ایک گہری سانس لے کر ”رات گیارہ بجے میں یہاں سے گھنٹی کر جاتا ہوں صاحب۔ آپ مجھ سے گیارہ کے بعد ملیں۔ پھر میں آپ کو اپنی مجبوری بتا دوں گا۔“

چونکہ میں بھی بکس میں چلا ہو گیا تھا۔ اسی لیے رات گیارہ کے بعد میں نے اس سے ملاقات کر لی۔ میں اسے اپنے ساتھ اپنے قیٹ میں لے آیا تھا جو کہ ہوٹل سے قریب ہی تھا۔ وہیں اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔ جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

”وہ بہت ہی خوبصورت ہے صاحب۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی جذبات پائی جاتی ہے، اور اس کی آنکھیں۔ بس صاحب ایسی آنکھیں جن کے بارے میں شاعروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان آنکھوں کے لیے صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ان میں ادب جانے کو دل چاہتا ہے۔“

”واہ مذہب تم تو شاعری کرنے لگے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں صاحب۔ آپ ایک نظر اسے دیکھیں تو آپ

کو میرے جنون کی اصلیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے صاحب۔ بہت ہی خاص ہے۔ کم از کم میرے لیے تو بہت خاص ہے۔“

وہ چٹنی روٹی سے ایسی سلیم ہوئی ہاتھیں کر رہا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ صرف انٹرنک ڈگری یافتہ نہیں بلکہ تعلیم یافتہ بھی ہے۔

”میں اس زمانے میں اس ہوٹل میں ملازم نہیں تھا صاحب۔“ اس نے کچھ دیر بعد پھر بولنا شروع کر دیا۔ ”آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس ہوٹل کے سامنے ایک فاسٹ فوڈ بھی ہے۔ برائنٹ فاسٹ فوڈ کارنر۔“

”ہاں دیکھا ہے میں نے۔“

”تو میں اس کے کازنٹر پر بیٹھا کرتا تھا اور وہ لڑکی عام طور پر اپنے گھر والوں یا اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس ہوٹل میں آ کر کھاتی تھی۔“

اس کے آنے کا وقت تو اور دس کے درمیان ہوا کرتا تھا۔ اس وقت میری نگاہیں اسی ہوٹل کی طرف لگی رہتی تھیں۔ سامنے ہی تو ہے۔ جب وہ دکھائی دیتی تو میں سرپا شوق بن جاتا تھا۔ میری نگاہیں صرف اور صرف اس کو دیکھتی رہتیں۔“

”یعنی تم اس سے محبت کرنے لگے تھے۔“

”محبت تو ایک عام ساقط ہے صاحب۔“ اس نے کہہ ”میں اس سے شوق کرنے لگا تھا۔ شوق کی تو کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ محبت میں تو پھر بھی کچھ حاصل کر لینے کا شوق ہوتا ہے۔ جبکہ شوق ایسی باتوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے محبوب کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ چاہے محبوب کو اس کی خبر بھی نہ ہو کہ اس کو کوئی اس طرح بھی چاہنے والا ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو مذہب۔ شوق میں محبوب سے کچھ مانگ نہیں جاتا بلکہ اسے سب کچھ سونپ دیا جاتا ہے۔“

”خدا آپ کا بھلا کرے صاحب۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔“ اس نے کہا۔ ”میں صرف اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اور اس کے گھر والے عام طور پر آیا کرتے اور جب دو چار دنوں تک وہ لوگ نہیں آتے تو میں بے چین ہو جایا کرتا۔ بہت اداس ہو جاتا۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا صاحب، اور جب وہ دکھائی دے جاتی تو جیسے ہر طرف پھول پھرجاتے۔“

”واہ مذہب۔ تم تو میری بھی ایک مشکل آسان کرتے جا رہے ہو۔“ میں نے کہا۔

”اگست 2014ء“



"کہا تم نے اس سے کھل کر بات نہیں کی تھی؟" میں

نے پوچھا۔

"نہیں صاحب۔ میری اتنی ہمت کہاں تھی۔" اس نے کہا۔ "میری کیا حقیقت تھی صاحب۔ میں تو ایک ہوٹل کا معمولی سا ویٹر تھا اور وہ کس قدر تھی۔ میں اس سے کیسے کوئی بات کر سکتا۔ لیکن خاموشی کی تو اپنی زبان ہوا کرتی ہے صاحب اور خاموشی کی زبان بہت کچھ کہہ دیا کرتی ہے۔"

میں اس کی باتیں سنتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اس کم بخت محبت کے بھی کھیل خرابے ہوا کرتے ہیں۔ یہ کیسے کیسے خواب دیکھایا کرتی ہے۔ انسان اس کے ہاتھوں میں آکر کھ پکلی بن کر رہ جاتا ہے۔

"تو صاحب ایک بار ایک بہت اچھا موقع مل گیا۔" نذیر نے بات آگے بڑھائی۔ "اس رات وہ اکیلی آئی تھی۔ اس کے گھروالے اس کے ساتھ نہیں تھے۔ میں ایک کمرہ اس کے پاس بکلی گیا۔" لہذا۔ "آج آپ اکیلی آئی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ مسکرا دی۔ "گھروالے راستے میں ہیں۔ میں نہیں اور سے ہوتی ہوئی آئی ہوں۔"

"فرمائیں۔ کیا پیش کردیں۔" میں نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"اوہ۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "نذیر۔ تم تو بہت بڑے کھے معلوم ہوتے ہو۔ پھر اس ہوٹل میں ویٹر کیوں ہو گئے۔"

دل چاہا کہ اسے بتا دوں کہ میں نے یہ ملازمت صرف اسی کے لیے کی ہے۔ اس سے قریب ہونے کے لیے۔ اس سے دو چار باتیں کرنے کے لیے۔ لیکن پھر وہی اپنی حیثیت کا خیال آ گیا صاحب۔ اس لیے صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ "بعض مجبور ہاں بھی انسان کو ادھر سے ادھر کر دیتی ہیں لہذا۔ میں سامنے والے فاسٹ فوڈز میں ہوا کرتا تھا۔"

"ہاں۔ میں نے تمہیں کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔" اس نے بتایا۔ "لی لہا۔ پھر کوئی طاقت مجھے یہاں کھینچ کر لے آئی۔" میں نے کہا۔ "بعض حالات بہت بے رحم ہوتے ہیں لہذا۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بٹھایا ہے۔ وہاں وہ اپنی مراد حاصل کر سکے گا یا نہیں۔"

"وہ کیا صاحب۔"

"تم اسے اچھے اور خواہصورت انداز میں اپنی کہانی سنا رہے ہو کہ مجھے اس میں اپنی طرف سے کچھ لگانے اور اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ارے صاحب محبت نے بولنا سکھا دیا ہے۔" اس نے کہا۔ "ورنہ میں تو ایک جاہل سا انسان ہوں۔ ایک ہوٹل کا معمولی سا ویٹر۔ میری حیثیت ہی کیا ہے۔"

"نہیں نذیر۔ لیکن بات نہیں ہے۔ تم میں جو سلیقہ ہے۔ وہ میں نے بہت کم لوگوں میں پایا ہے۔ خیر، آگے سناؤ۔" میں نے اپنی ڈائری اور قلم سنبھال لیا تھا اور وہ جو بول رہا تھا۔ وہ میں گھنٹا جا رہا تھا۔

"پھر یہ ہوا صاحب کہ میرا جنون اس حد تک بڑھ گیا کہ میں اس سے صرف دو باتیں کرنے کے لیے بے چین ہوتا رہا۔ اگر وہ ہمارے فاسٹ فوڈ سینٹر کی طرف آتی تو شاید اس سے بات کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ لیکن وہ تو سیدھی ہوٹل کی طرف چلی جاتی تھی اور اس سے بات کرنے کی خواہش پوری کرنے کا یہی طریقہ تھا کہ میں خود اسی ہوٹل میں کام کرنے لگ جاؤں۔"

"اوہ۔" میں مسکرا دیا۔ "اب سمجھا۔ تو تم نے اس لیے ہوٹل کی نوکری کر لی۔ ایک ویٹر بن گئے۔"

"جی صاحب صرف اسی لیے۔ اس سے بات کرنے کی خواہش میں۔ اسے قریب سے دیکھ لینے کی آرزو میں۔ ہوٹل والے بھی مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ انہیں جیت تو ضرور ہوتی ہوگی۔ لیکن انہوں نے مجھے نوکری دے دی تھی۔"

"تجرباں صاحب۔ وہ جب بھی آتی۔ اس کو میں ہی سر دیکھا کرتا۔ کسی دوسرے ویٹر کو اس کی طرف جانے نہیں دیتا تھا۔ اس طرح اس سے بات ہونے لگی۔ وہ اور اس کے گھروالے بھی مجھے نام سے جان گئے تھے۔ میرا نام لے کر بلا دیا کرتے۔"

"آپ تو جانتے ہیں صاحب کہ ایسے موقع پر لوگوں کی عین کھلی کام کرتی ہیں۔ انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ کون ان کی طرف کس ٹکاؤ سے دیکھ رہا ہے۔ شاید اسے بھی اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ میں اسے پسند کرنے لگا ہوں۔ اس لیے وہ مسکرا کر دیکھا کرتی۔ کبھی کبھی خیریت بھی معلوم کر لیتی۔ میرے لیے تو اتنا ہی بہت تھا صاحب۔ وہ دل کی بھی بہت اچھی بات ہوتی تھی۔"



"ارے واہ۔" وہ چونک پڑی۔ "یہ تم نے کیسی بات کر دی۔ یہ تو بہت فلسفیانہ اور شاعرانہ جملہ ہے۔"

"بس بی بی۔"

"بی بی نہیں۔ راعیہ۔" اس نے کہا۔ "میرے گھر والوں کے سامنے تم بی بی کہہ سکتے ہو۔ اس کی اجازت ہے۔ لیکن جب میں اکیلی آؤں تو پھر نام سے پکارا کرو۔"

"یہ آپ بہت بڑی بات کی اجازت دے رہی ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔ تم بھی انسان ہو۔" اس نے کہا۔ "تم بھی اس معاشرے کے لیے اتنے ہی اہم ہو جتنے دوسرے ہو سکتے ہیں۔ تم میں خوبیاں ہیں۔ تو پھر کس بات کی احساس کرتی۔"

"اپنی حیثیت کو دیکھتا ہوں تو شرم آنے لگتی ہے۔"

"پاگل ہو تم۔" وہ ہنس پڑی۔ "کیا کسی ہے تمہاری حیثیت میں۔ محنت کرتے ہو۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور رزق حلال کھاتے ہو۔ ایک انسان میں اس کے علاوہ اور کیا خوبی ہوتی ہے۔"

"والف۔ آپ دوسروں سے الگ باتیں کرتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجھ سے اس طرح کی باتیں کسی نے نہیں کیں۔"

"لیکن میں تو کر رہی ہوں نا۔"

"اسی بات پر تو حیران ہو رہا ہوں۔"

"خیر۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ اب جلدی سے کچھ لے کراؤ۔ مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

"ایک بات کہوں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گی۔"

"ارے۔ تمہاری بات کا برا کیا مانا۔"

"آج کاٹلی میں دوں گا۔" میں نے کہا۔ "یہ میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" وہ ہنس دی۔ "لیکن اب لے کر آ جاؤ۔"

"واہ نہ ہر۔" میں نے کہا۔ "یعنی تم اپنے مقصد میں کامیاب ہونے لگے تھے۔"

"ہاں صاحب۔ میری سب سے بڑی آرزو پوری ہوتی جا رہی گی۔ یعنی اس سے بات کرنا۔ اس کو قریب سے دیکھنا۔ اس کی باتیں سننا۔ ورنہ میرے نصیب ایسے کہاں تھے۔ میرے لیے تو وہ شوکیں میں لگی ہوئی کسی خوبصورت چیز کی طرح تھیں۔ جس کو صرف دیکھا جاسکتا ہے۔ خریدنا نہیں

وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے صرف ایک بار مجھے دیکھا اور اپنی گردن جھکا لی۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے میری بات سمجھ لی ہو۔ یا بالکل نہیں سمجھی ہو۔ انسان تو ایسا ہی خوش گم ہوتا ہے صاحب۔ وہ بہت اگلے سیدھے خواب دیکھنے لگتا ہے۔"

"خیر کچھ دیر بعد اس نے اپنی گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور دیر سے بولی۔ "نہیں نہ ہر۔ ایسی بات نہیں ہے۔ انسان کا ارادہ اگر پختہ ہو اور اس کی طلب لگی ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے۔"

"میں تو یہ سن کر نہال ہو گیا تھا صاحب۔ کیونکہ اس نے نہ صرف میری بات سمجھ لی تھی۔ بلکہ مجھے اشارہ بھی دے دیا تھا۔ اس نے میرا دل نہیں توڑا تھا۔ بلکہ حوصلہ افزائی کی تھی صاحب۔"

"ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "میں کی اس بات سے تو یہی اعزازہ ہوا ہے۔"

"میں صاحب۔ بالکل سچی بات تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں اس سے کچھ اور باتیں کروں۔ کچھ اور پوچھوں۔ لیکن اسی دوران میں اس کے گھر والے بھی آ گئے اور میں ان کی خدمت میں مصروف ہو گیا۔"

خیر صاحب اس کے بعد دو چار دنوں تک نہیں آئی۔ ظاہر ہے۔ کوئی بھی ہو بار بار ہونگ تو نہیں آ سکتا۔ یہ تو ایک طرح کی آؤنگ ہوتی ہے صاحب۔ جی چاہا اور فرصت ہوئی تو چلے آئے۔ اس لیے مجھے کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔"

"حالانکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ پہلی کہاں رہتی ہے۔ اس لڑکی کا نام کیا ہے۔ اس نے میرا نام تو جان لیا تھا۔ لیکن میں اس کا نام نہیں معلوم کر سکا تھا۔ آخر کس طرح اس سے نام پوچھتا۔"

تین چار دنوں کے بعد پھر آ گئی۔ اس بار بھی وہ اکیلی آئی تھی۔ اس نے بتایا۔ "آج میرے گھر والے نہیں آئیں گے۔ میں اکیلی آئی ہوں۔"

"بی بی۔ کیا آپ کہیں قریب رہتی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ تیار اگر زبادہ قافلے پر نہیں ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور دوسری بات یہ ہے کہ میرا نام بی بی نہیں ماننا ہے۔"

"تاؤ کیا نام ہے۔"

"بہت خوبصورت۔" میں دیر سے بولا۔ "آپ کے حوالے سے جو کچھ بھی ہے۔ وہ خوبصورت ہی ہوگا۔"



جاسکتا۔

لہذا حق الزادہ ہوا۔ میرا دل ٹوٹ گیا تھا صاحب۔ اس کو کیا حق پہنچتا تھا کہ میرا مذاق اڑاتا اور یہ تو دیکھیں کہ وہ لڑکی اس کے ساتھ بیٹھ کر ایک مضروری کسٹرمین گئی تھی۔ اس کے نزدیک میری تو اب کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔

”تمہاری کیفیت کو کچھ سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”صاحب میں بے بس آدمی تھا۔ لیکن میرے اندر لاوا اٹھنے لگا تھا۔ تم اور فیس کی ایسی کیفیت تھی کہ بتائیں سکتا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا مجھے۔ شاید ایسا نہیں کرتا چاہئے تھا۔ میں نے آملا سرد کرتے ہوئے ایک پلیٹ اس آدمی پر اس طرح گرا دی جیسے اتنا ٹا کر گئی ہو۔“

”پھر کیا تھا صاحب۔ اس نے مجھے برا بھلا کہا شروع کر دیا۔ جاہل، بدتمیز، دو کوڑی کا انسان۔ اندھا، اس نے اتنی باتیں سنائی صاحب کہ خود مجھے بھی طعنے آ گیا۔ میں نے اس کی بات کا جواب اسی گئی سے دیا۔ اس کو تو اور آگ لگ گئی۔ شاید اس نے مجھے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا کہ اس لڑکی نے اس کا ہاتھ قلم کر ایک بات کہی اور وہ بات ایسی ہے صاحب کہ اس کے بعد شاید مجھے زندہ نہیں رہنا چاہئے تھا۔“

”کیا کہہ دیا تھا اس نے۔“

اس نے کہا تھا۔ ”جانے دو غم۔ چھوٹے آدمیوں کے من نہیں کھتے۔“

اتنا بتا کر اس نے گردن جھکا لی۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں صاحب۔ میں تو چھوٹا آدمی ہوں۔ اور ایک چھوٹے آدمی کو ایسے خواب دیکھنے کا، ایسی محبت کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اسے تو مر جانا چاہئے۔ لیکن میں مرا نہیں۔ زندہ ہوں صاحب۔ اور اب تک اسی ہوٹل میں وغیرہ ہوں۔ اس کے بعد وہ پھر آج تک نہیں آئی۔ لیکن وہ چھوٹا آدمی اسی جگہ اسی ہوٹل میں ہے۔ اس کی راہ دیکھتا ہوا ایک بے حیثیت انسان۔“

یہ تھی اس کی کہانی۔

میں جب یہ کہانی لکھ رہا تھا تو یہی خیال آ رہا تھا کہ محبت پر تو کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ پھر کوئی انسان کیا محبت کے بازار میں بھی چھوٹا بڑا، کم قیمت یا بیش قیمت ہو سکتا ہے۔

اس نے پھر ایک ایسی بات کہہ دی تھی۔ جس سے اس کے ذہنی معیار کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ہمارا بھی کیا معاشرہ ہے۔ کسے کسے لوگ اس طرح بد وقعت ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی گفتگو بہت سے چڑھے کھسے لوگوں کی گفتگو سے بھی اچھی تھی۔

”وہ دن میری خوش نصیبی کا تھا صاحب۔“ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”میں نے تو صرف یہ خواہش کی تھی کہ اس کے قریب ہو سکوں۔ اس سے دو چار باتیں کر سکوں اور قسمت نے اتنی بڑی مہربانی کر دی تھی کہ اس نے میری پیشکش قبول کر لی تھی۔ آپ کو میری خوشی کا اندازہ نہیں ہو سکتا صاحب۔“

”نہیں مذہب۔ اندازہ کر سکتا ہوں میں۔ تم نے جس انداز کی بغیر زندگی گزاری اس میں اگر بارش کے چھینٹے چڑ جائیں تو ایسی ہی خوشی ہوتی ہے۔“

”جی ہاں صاحب۔ یہی بات ہے۔ لیکن صاحب۔ اس کے بعد وہ کچھ ہو گیا۔ جس نے مجھے آسمان سے لا کر زمین پر پھینک دیا۔“

”وہ کیا ہو گیا تھا۔“

وہ کچھ بتانے سے پہلے سوچا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔ ”صاحب۔ وہ اس دن کے بعد سے کئی دنوں تک نہیں آئی۔ آپ سوچ لیں کہ میری بے قراری کا کیا عالم ہوگا۔ کچھ ایسے سانے تک رہیں کہ شاید وہ کبھی سے آ رہی ہو۔ ایسی نہ سہی اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی آؤ چاہئے۔“

”تو کیا وہ پھر نہیں آئی۔“ میں نے پوچھا۔

”آئی صاحب۔ وہ آئی۔ وہ ایک نوجوان کے ساتھ آئی تھی۔ اس کی طرح اسلٹ اور خوبصورت۔ دونوں بہت بے تکلفا سا انداز میں ہوٹل میں داخل ہوئے تھے۔ ہتے ہوتے ہوئے۔ نہ جانے کیوں صاحب۔ یہ دیکھ کر میرا دل پٹنے لگا تھا۔ بہت برا لگ رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا تھا۔ لیکن نظر انداز کر گئی تھی۔ اس نے آرڈر دیا تھا صاحب لیکن میرے نام سے نہیں صاحب۔ دو نمبر سے۔ دو نمبر ادھر آؤ، اور میں دو نمبر دیکھ رہی تھی صاحب۔ ایک معمولی سا دیکھ۔“

پھر یہ ہوا کہ اس نوجوان نے اس کے کان میں کوئی بات کہی اور وہ فوراً سے انہیں چلی۔ اس وقت وہ دونوں میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ شخص میرا







## چھپارتم

محترم مدیر سرگزشت !

السلام علیکم !

ایک سچا واقعہ جس میں کہانیت لانے کے لیے میں نے کچھ لوازمات شامل کر دیے ہیں آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔ اگر یہ سرگزشت میں شائع ہو جائے تو بہت سے لوگوں کی آنکھوں پر سے پردہ ہٹ جائے گا۔  
سید طاہر شاہ طاہری

”اس کا تو پتا نہیں... البتہ اس کی لاش آج سویرے پھیل کے درخت سے لگی ہوئی ملی ہے۔ پتھر کے پورے چوڑم تھے پیٹ پر۔“ میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔  
”چلو اچھا ہوا..... خس کم جہاں پاک۔ اب اس کی

”چھوٹے شاہ جی اہا سوکھا رقتل ہو گیا ہے“ میں نے حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں امام صاحب کو خبر دی۔

”کب اور کیسے؟“

ماہنامہ سرگزشت

اگست 2014ء

263



لاش کہاں ہے؟" امام صاحب نے پوچھا۔

"وہ تو پولیس لے گئی۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوں.... اور کچھ چاہئے تو قاتل۔" اسکا کہہ کر امام

صاحب نے تپائی پر کھلے قرآن پاک پر نگاہ جمائی، رمضان کا مہینہ تھا اور انہیں رات کو تراویح میں سنا سنا ہوتا تھا اس لیے میں جب بھی مسجد میں آیا انہیں قرآن پاک کی تلاوت کرتے پایا۔

میں نے سلام کیا اور اگلے قدموں واپسی کی راہ لی۔ گھر پہنچنے سے پہلے سارے عداوتے میرے ذہن میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا کہ آخر کس نے اتنی جرأت دکھائی اور ایک بے غیرت سے اس زمین کو پاک کر دیا پھر خود ہی بڑبڑایا۔ "کی غیرت مند کی بہن بٹی پر نگاہ ڈالی ہوگی تو اس نے بھی اسے رونا جھنم پر ڈال دیا ہوگا لیکن کھوم پھر کر سوال یہی تھا کہ اتنا غیرت مند اور جرأت مند ہے کون؟ اس پر سے گاؤں میں تو کوئی نہیں تھا، یہاں تک کہ گاؤں کا بیچ بھی ہاسو سے ڈرتا تھا۔... شاید کسی ساتھ والے گاؤں کا۔ جو بھی ہوگا پولیس پالکا لے گی مجھے اپنا دماغ کھانے کی کیا ضرورت۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میں حویلی کے دروازے پر پہنچ گیا۔

ابا جی کے ساتھ جھوٹے پرچار اٹولنے کے بعد میں ایک بار پھر جائے وقوعہ پر تھا۔

"اوتے گائے پترا" مجھے عقب سے چاہے غلام رسول کی نکالت بھری آواز سنائی دی۔ میرا نام تو غلام محمد تھا لیکن گاؤں والے سارے مجھے گاما ہی کہتے تھے۔

"جی چاچا!" میں نے جواب دیا۔  
"او پتر مجھے تو کمر کی پل (دود) لے ملے پھرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ وہ تیری بہن زینت ڈاکٹر کے پاس گئی تھی میری دوائی لینے، ابھی تک واپس نہیں آئی، اس کا تو پتا کر دے۔" کھسکے وہ گئی۔

پہلے تو زینت کو میری بہن کہنے پر میں نے دل ہی دل میں چاہے کو پانچ سات سنائیں۔ بچپن سے نہ جانے میں اس کے بارے میں کون کون سے خواہد دل میں بھلے بیٹھا تھا اور چاچا جب بھی ملتا تھا سارے خوابوں پر یوں ڈال دیتا تھا۔ میں "اچھا چاچا" کہتا ڈاکٹر کے ٹیکہ کی طرف ہل پڑا۔

وہ کھیت مہور کرنے کے بعد سیدھی گئی ڈاکٹر کے ٹیکہ کو جاتی تھی۔ ابھی میں گلی میں داخل ہی ہوا تھا کہ مجھے اسلم منو کی حویلی میں زینت کی جھٹک نظر آئی۔ اس کی میر سولہ سال ہو گئی تھی جبکہ اپنی عمر سے وہ دو تین سال بڑی ہی لگتی تھی

لیکن ابھی تک وہ اپنے بچپن سے باہر نہیں آئی تھی۔ وہی الہ پین، وہی شرارتیں اور وہی مصیبت، کچھ بدلتا تھا تو صرف اس کا قد کاٹھ ورنہ ابھی تک وہ وہی لگی تھی جو کیتوں میں ہمارے ساتھ آگے بھڑکی کھیلا کرتی تھی یا گلیوں میں گلی ڈھرا۔ ہر کی ایک لمبی شاخ سے وہ جاسن جھار رہی تھی اور جو جاسن زمین پر گرتا اسے اٹھا کر اپنی جھولی میں سیٹھ لیتی تھی۔ "زیبا" میں نے آواز لگائی۔

"کیا ہے۔" اس کی بھری ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ ہر ایک سے اسی لہجے میں بات کرتی تھی اسی لیے زیادہ تر لوگ اس سے دور رہتا ہوتا پسند کرتے تھے۔  
"خیر ابا تجھے یاد رہا ہے۔ اس نے تجھے دوپٹی لینے بھیجا تھا اور تو یہاں جاسن اکٹھے کر رہی ہے۔"  
"لھیک ہے لھیک۔" ہوا آتی ہوں میں تو جا... اسے کہہ دے آرہی ہے۔"

کوئی اور بات کرنے کی بجائے میں نے وہاں سے کھینچے میں ہی عاقبت گئی۔ ورنہ اس کا کیا پتا میری کی شاخ سے میرے ہی تلے لینے لگ جاتی۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی اس نے ہاسو کے ایک ڈھکرے کی دھولی پاٹ بند کرنا تک توڑ دی تھی۔ ہاسو ٹھلا یا تو کافی تھا لیکن اس کے بھائی رشتی مرل ٹیکے نے اسے ٹھنڈا کر لیا تھا۔

ہاسو دو سال پہلے ہمارے گاؤں "بسم اللہ گڑھ" میں آیا تھا۔ یہ شکر گڑھ کے نواح میں ہارڈر کے قریب واقع ہے۔ یہاں بجلی تو کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گئی ہے لیکن گیس ابھی تک جیس بچپس کلو میٹر دور ہی ہے، پچھلے کئی سالوں سے من رہے ہیں کہ گیس آرہی ہے، پتا نہیں لبا کیسے دے رہی ہے۔ شاید خود ہی آرہی ہے اور ساتے سے بھی بے خبر ہے۔

ہاسو ایک چھٹا ہوا بد معاش تھا۔ اس کے ہارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ جو بھی جانتا تھا بس اسکا کہ یہ جو کہتا ہے سر جھکاؤ اور مان لو... ابتداء میں یہ صرف بہتالیا کرتا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ گاؤں والوں کی لڑکیوں پر نظر رکھنی شروع کر دی۔ اگر کوئی اس کی راہ میں رکاوٹ بناتا تو اگلے دن کسی کھیت میں اس کی لاش ملتی تھی۔ پولیس میں کئی دفعہ رپورٹ درج کروائی لیکن کوئی قاعدہ نہیں ہوا، پولیس کو ہر میسے ان کا حصہ پہنچتا رہتا تھا، انہیں کیا تکلیف تھی بلاوجہ ٹانگ اڑانے کی اور اگر کسی کو ایسا اندازی کا بخار چڑھ بھی جاتا تو چند دن بعد وہ کسی اور شہر میں بیٹھا ہوتا تھا۔ ٹیکہ اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ اس سے چار



کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ سارے گاؤں والے پریشان تھے کیونکہ چھوٹے شاہی کو وہ سب اپنے گھر بیٹوں کی طرح ہی سمجھتے تھے۔

چھوٹے شاہی کا اصل نام تو عبدالباسط تھا لیکن سب ان کو ان کے بچپن سے ہی چھوٹے شاہی ہی کہا کرتے تھے۔ وہ اسی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد عالم تھے۔ وہ نہایت فطرتاً ہی یک اور پرہیزگار شخص تھے۔ گاؤں والے آنکھیں بند کر کے ان پر اعتماد کرتے تھے، ان کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے جن میں کبھی خیانت نہیں ہوتی۔ چھوٹے شاہی کی والدہ ان کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔ اور ان کی پرورش ان کے والد کے ہاتھوں ہی ہوئی تھی۔

میں نے اور چھوٹے شاہی نے دس بھائیوں گاؤں کے اسکول میں انٹرمیڈیٹ کی تھی۔ ہم بچپن سے ہی اچھے دوستوں کی طرح تھے۔ بے تکلفی کی کئی حدیں عبور کرنے کے باوجود دین کا ایک احترام تھا جو ہمیشہ میرے دل میں رہا۔ اور ویسے بھی وہ اتنے سلیبے ہوئے اور شریف شخص تھے کہ کوئی کچھ کہہ بھی دیتا، چاہے فطرتاً دوسرے کی ہوتی یہ معذرت کر لیا کر لیا کرتے تھے۔ میٹرک کے بعد میں لہائی کے ساتھ کیت لور جانور سنبھالنے لگا اور ساتھ ساتھ پرائیویٹ پڑھائی بھی جاری رکھی جبکہ چھوٹے شاہی شہر کے ایک بڑے مدرسے میں داخل ہو گئے۔

باسو کھار ابھی گاؤں میں نیا تیا ہی وارد ہوا تھا کہ چھوٹے شاہی کے والد صاحب فوت ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد چھوٹے شاہی کچے ہی شہر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ وہ ساتھ ساتھ کالج میں بھی پڑھ رہے ہیں جس کے بعد میں انہوں نے خود تصدیق کر دی تھی اور پھر میں نے دو سال بعد وہ اچانک گاؤں میں لوٹ آئے۔ ان کی آمد پر گاؤں والوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور پھر گاؤں والوں نے اس مولوی کو فارغ کر دیا اور چھوٹے شاہی نے اپنے والد صاحب کی منہ سنبھال لی۔

چھوٹے شاہی کو یہاں آئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ وہ اپنے والد ہی کی طرح فطرتاً ہی مہربان اور یک تھے۔ انہوں نے گریجویٹ کے ساتھ مدرسہ تعلیم بھی پوری کر لی تھی اور پھر اس زمین کی طرف لوٹ آئے تھے جہاں انہوں نے تعلیم ہمارا کچھ کھولی تھی۔ اور آج اس شریف شخص نے ایک بد معاش کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔ جہاں

قدم آئے تھا لیکن خطہ اکر کے کھانے کا عادی تھا۔ شکار کو اس طریقے سے سمجھتا تھا کہ شکار کو شیلے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ دو سال میں کئی لڑکیوں کی آمدورفتی ہوئی اور کئی لوگ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن ان دو بھائیوں کی صحت پر کیا اثر پڑنے والا تھا چاہے پورا گاؤں ہی اپنے گھریا چھوڑ کر نکل جاتا۔ سارے گاؤں کی غیرت جو سولی ہوئی جن میں میں بھی شامل تھا۔

اور آج دو سال بعد ہاسو کی لاش پھیل پر لگی ہوئی ملی تھی۔ گاؤں والوں کے چہرے سے خوشی کے سوتے پھوٹ رہے تھے لیکن وہ کھل کر خوشی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ایسا کرتے تو شاید کل اسی جگہ ان کی اپنی لاش بھی نظر آتی کیونکہ یہ تو ابھی زندہ تھا۔

اگلے دن لاش واپس آ گئی۔ لیکہ امام صاحب کے پاس پہنچا کہ وہ جنازہ پڑھا دیں۔ اور اس وقت پورے گاؤں نے ایک حیرت کن منظر دیکھا جب امام صاحب نے کمال اطمینان سے کہا: "میں کسی کافر کا جنازہ نہیں پڑھا سکتا" جس کے سامنے کسی کی لاش آواز نہیں نکلتی تھی اس کے سامنے کل کا یہ لڑکا اس کے بھائی پر کفر کا فتویٰ لگا کر جنازے سے انکار کر رہا تھا۔

لیکے کا چہرہ غصے سے لال بھبھکا ہو گیا۔ اس نے رات پیچھے اور امام صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مگر چاہا۔ "کیا کہا وہ بارہ بول ڈرا۔"

"میں نے کہا میں کسی کافر کا جنازہ نہیں پڑھا سکتا۔ بہرہ ہو گیا ہے تو چاہئے کان کا علاج کروا۔" امام صاحب نے دوسری بار مگر گرج کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔

لیکے کا دایاں ہاتھ گھوما اور امام صاحب کے منہ پر پڑا۔ امام صاحب کے قدم ڈگمگائے اور ہاتھوں سے خون بہہ لگا۔ لیکے نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ انہیں روکی کی طرح دھن کے رکھ دیا اور ہم اسی بے حسی کی تصویر بنے کھڑے رہے۔ ہم میں سے کوئی آگے نہ بڑھا کہ اس کا ہاتھ روک لے۔

"اسے اٹھا کر ڈیرے پر لے جاؤ دیکھنا ہوں میں یہ کیسے جنازہ نہیں پڑھاتا۔ اس کا تو ہاں بھی جنازہ پڑھائے گا۔" اس نے اپنے ایک گرجے کو اشارہ کیا۔

باسو کا جنازہ ہو گیا۔ جنازہ کی لور مولوی نے پڑھایا تھا۔ تین دن گزر چکے تھے چھوٹے شاہی کا کوئی ہاتھ نہیں تھا



سب حیران تھے وہیں ان کی سلاحتی کی دعائیں بھی کر رہے تھے۔ قرین از قیاس تھا کہ ٹیکے نے کہیں ان کو مردہ ہی نہ دیا ہو۔

باسو کی لاش لے جانے کے بعد پولیس دوبارہ گاؤں میں نظر نہیں آئی۔ لوگوں کا یہی کہنا تھا کہ ٹیکے نے پولیس کو گھنٹیش کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اب حقیقت کیا تھی۔ اللہ ہی بہتر جانتا تھا۔

چوتھے دن شام کے وقت اقبال عرف والا مجھے ملا۔ میں اس وقت سائیکل کے پیچھے ڈول لاوے ساتھ والے گاؤں میں دودھ دینے جا رہا تھا۔ وہ میرے پاس آتے ہوئے بولا "گائے تجھے پتا ہے پھولے شاہتی ڈیرے سے بھاگ گئے ہیں۔"

اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا "تجھے کس نے کہا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ تجھے پتا ہے نادیرے سلی سے میری تھوڑی گل بات ہے۔۔۔ وہ ٹیکے کا بندہ ہے، اسی نے قاتل ہے۔۔۔ تو آگے کسی کو نہ بتانا، ٹیکے نے یہ بات سب سے چھپا کر رکھی ہے۔ تجھے بھی اس لیے بتا رہا ہوں کیونکہ تو اپنا پکا ڈیرہ ہے۔" اس نے اپنی آواز کو دہاتے ہوئے منہ میرے کان کے نزدیک کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ بات کیا ہے نا۔ یہ تو ہو کہ ٹیکے نے امام صاحب کو مردہ دیا ہو اور دینا تجھ سے جھوٹ بول رہا ہو۔" میں نے تشویش کا اظہار کیا۔

"سولہ آنے کی بات ہے۔"

اس کی بات نے میرے اندر خوشی کی ایک لہر دوڑا دی۔ "واہ ہالیا کیا خبر سنائی ہے۔۔۔ دل کرتا ہے کہ تیرا منہ چوم لوں۔" میں نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

بس بس۔۔۔ اتنا بھی خوش نہ ہو کہ لوگ حیرانہ چہرے کی آرزو کرتے لگیں۔

اس کی بات کا واضح مطلب تھا کہ میں کہیں بات آگے نہ کر دوں۔

"میں نے آج تک کوئی بات آگے کی ہے؟" میں نے غلغلے سے منہ مٹاتے ہوئے کہا۔

"جان سن! اسی لیے تو تجھے بتائی ہے کیونکہ حیرانیت اتنی ہائیں لو مینے سے بھی زیادہ برداشت کر جاتا ہے۔" اور پھر فستادہ دوسری گلی میں مڑ گیا۔

اس دن میں بہت خوش تھا۔ خوشی ایسی تھی کہ چھائے

چھپ نہیں رہی تھی۔۔۔ حالانکہ ابھی تک اس بات کی کوئی پکی تصدیق نہیں ہوئی تھی لیکن پھر بھی مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ امام صاحب ٹیکے کی قید سے بھاگ گئے ہیں۔۔۔ جب میں دودھ دے کر واپس لوٹا تو وہی آواز میں سنی بجاتا ہوا گھر میں داخل ہوا سامنے ہی اماں چڑھنے کے سامنے بیٹھی انگاروں پر خشک گلڑیاں رکھ کر پھونکی سے پھونک کر انہیں ہلکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ "یہ اخوش نظر آ رہا ہے۔" اماں کی آواز میرے کانوں سے گزری۔ "کچھ نہیں اماں بس ابویں ای۔" کہتا ہوا میں اپنے کمرے میں گھس گیا۔

رات دو بجے کا وقت ہو گا، اماں نے مجھے جگایا۔ گا سے پترانہ بڑے زور کا مینڈ (ہارن) آیا ہوا ہے۔۔۔ میں رات ڈگر باہر ہی پانچھ آیا تھا۔۔۔ جا انہیں وراٹھے (ممن) میں کر آ۔۔۔ بے چارے پوری رات ٹھنڈ میں کھڑے بددعا کیے ہی نہ دیتے رہیں۔

"اچھا ابائی۔" کہہ کر میں نے گرم بستر چھوڑا، برساتی لی اور حویلی کی طرف چل دیا۔ ابھی میں حویلی سے کچھ دور ہی تھا کہ میں نے کسی کو کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے چادر کی ہلکے مار دی تھی۔ ہمارے گاؤں میں ڈیروں پر دفع حاجت کا کوئی انتظام نہیں ہے اس لیے لوگ کھیتوں کا رخ ہی کرتے ہیں۔۔۔ اگر موسم خوشگوار ہوتا تو میں ایسا ہی سمجھتا لیکن اسے خراب موسم میں کسی کا اتنی دور کھیتوں میں آنا غلاف محفل تھا۔ میں بھس سے مجبور اس کے پیچھے چل دیا۔ قصور فاصلہ رکھ کر میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کھیت عبور کر کے اس نے اپنا رخ ٹیکے کے ڈیرے کی طرف موڑ لیا۔ کچھ دیر وہ ٹیکے کے ڈیرے کے پاس کھڑا سن گن لیتا رہا پھر وہ گھوم کر ڈیرے کی چھلکی جانب مڑ گیا۔ میں اس کے پیچھے پکا لیکن اتنی دیر میں وہ کھیت عبور کر کے ایک گلی میں داخل ہو چکا تھا۔ میرے کپچے کپچے اس کا نام و نشان ناہید ہو چکا تھا۔

پتا نہیں وہ کون تھا۔ کہاں سے آیا اور کہاں غائب ہو گیا۔۔۔ ٹیکے کے ڈیرے کے پاس وہ کیا لیتے گیا تھا۔۔۔ انہی سوچوں میں غلغلے میں حویلی پہنچا۔ ڈگر کھول کر اندر پانچھ سے اور گھر لوٹ آیا۔ خینڈ کی آغوش میں گم ہونے سے پہلے حلق قسم کے کئی سوال میرے ذہن میں گھل رہے تھے۔ اگلے دن وہی معمول کے کام نہانے کے بعد میں چائے لٹام رسول کے گھر چلا گیا۔ ڈینو گھر میں جھاڑو دے رہی تھی اور چاچا چار پائی پر بیٹھا تھے کے کشش لگا رہا تھا۔



”جمل اب تو لٹلی ہو گی آئندہ میری تو بہ جولے کو لی بات بتائی۔“

”آئندہ کے لیے اگر تو بچا تو پھر سوچیں گے۔“

”یار ڈراما نویس۔“

”میں ڈراما نویس رہا حقیقت بتا رہا ہوں۔۔۔ جمل اب مجھے اجازت دے ابے نے آج شہر جانا تھا۔۔۔ گھر میں ملاں اکیلی ہو گی کوئی کام ہی پڑ جاتا ہے تو وہ کہاں وصولی بھرے گی مجھے۔“ میں نے اجازت طلب کی اور گھر آ گیا۔۔۔

ابا جی شہر جا چکے تھے۔۔۔ ملاں چار ہائی پڑ چکی چاول سال کر رہی تھی۔۔۔ میں گھر میں داخل ہوا تو ملاں کی آواز کانوں سے نکلا۔

”گھر آئی۔“ گھر آئے گا میں بھری گاں (گائے) کو بیٹا گلا لیتا۔۔۔ تین دن ہو گئے ہیں دودھ کم دے رہی ہے۔“

”اچھا ملاں۔“ کہہ کر میں چھت پر پڑ گیا۔۔۔ کچھ دیر بعد اکر آتا تو میں اسے لے کر حویلی چلا گیا۔

یہ رات کے قالبا احوال تین بجے کا وقت ہو گا۔۔۔ جب کسی نے دروازے پر زور دار دھک دی۔۔۔ میرا کراہیوں کہ دروازے کے ساتھ ہی تھا اس لیے میں فوراً اٹھ گیا۔۔۔ اس کے ساتھ ہی چاہے غلام رسول کی آواز سنائی دی۔

”او گھر آئے ہر!“ میں تیزی سے بستر چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکا کہ چاہے کو اتنی رات میں کوئی مشکل ہی ہو گی جو پہری کے باوجود خود ہی آ گیا۔ اتنی دیر تک ابا جی بھی جاگ چکے تھے۔

میں نے دروازہ کھولا۔۔۔ چاچا فوراً آگے بڑھا اور روتے ہوئے بولا۔

”ہر وہ کہینہ زین کو اٹھا کر لے گیا ہے۔“

میرے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔۔۔ مجھے نہیں پتا کہ کس نے مجھے روکا بھی ہے۔۔۔ ابا میرے پیچھے لپکا لیکن میں اپنے ہوش کھو چکا تھا۔۔۔ میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔۔۔ میرا رخ ٹھیکے کے ڈبرے کی طرف تھا اور مجھے اس کی خبر نہیں تھی کہ میں کہا کر سکتا ہوں۔۔۔ ذہن میں بس یہی تھا کہ وہاں زینڈ ہے اور آج مجھے غیرت مند بننا ہے۔۔۔ زینڈ کو اس دندے کے ہاتھوں بچانا ہے یا خود مر جانا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں ڈبرے پر پہنچتا میں نے چیخ مچی۔۔۔ آدرا ڈبرے کے اندر سے آئی تھی اور کسی مرد کی معلوم ہوتی تھی۔۔۔ میں سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر تیزی سے ڈبرے کی طرف بھاگا۔

ڈبرے میں داخل ہو کر میری سب سے پہلے جس شخص

چاہے کا حال احوال پر چہنچہ کے بعد میں زینڈ کے پاس چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولی۔

”گھر آئے چھوٹے شاہ جی کا کچھ پتا چلا؟“

”نہیں۔۔۔ مجھے تو کچھ نہیں پتا تھے کچھ پتا ہے تو بتاؤ۔“

۔۔۔ میری زبان لڑکھائی لیکن پھر میں نے اسے قایم کر لیا۔ وہ واحد شخصیت تھی جس کے سامنے مجھے جھوٹ بولنا مشکل ہو جاتا تھا۔

”وہ ہالا کہہ رہا تھا کہ چھوٹے شاہ جی ٹھیکے کے ڈبرے سے بھاگ گئے ہیں۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”تک۔۔۔ کیا، کب اور ہالے کو کس نے کہا۔“ مجھے اُمید تو تھی کہ ہالے کے پیٹ میں بات نہیں رہے گی لیکن یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ اس کو بھی بتا دے گا۔ زینڈ کا پیٹ اتنا بڑا تھا کہ لگے چھ گھنٹوں میں پورے گاؤں میں یہ بات پھیل جاتی تھی۔

”اسے دیے نے بتایا ہے۔۔۔ وہی جس کی پچھلے مجھے میں نے ڈانٹ کر دی تھی۔“

”جمل میں پتا کرتا ہوں بات یہی ہے یا کسی نے ایسے ہی پھیلا دی ہے۔ اتنا کہہ کر میں وہاں سے اٹھا اور سیدھا ہالے کے گھر کے سامنے بریک لگا لی۔

بالا گھر میں ہی تھا۔ سلام دعا کے بعد میں نے اس کے لئے لینے شروع کر دیے۔“ مجھے تو بڑا کہہ رہا تھا کہ بات پیٹ میں رکھ خود جا کے زینڈ کو بتا دی۔ اب پورے گاؤں کو پتا چل جائے گا۔“ میں نے غصے اور تنگی کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

”تھے بتا دیا اس نے۔“ اس نے حیرانگی سے کہا۔

”نہیں! مجھے تو الہام ہوتا ہے۔۔۔ سویرے جا گا تو الہام ہوا کہ تو نے زینڈ کو بتایا ہے۔“ میں نے الفاظ چبانے ہوئے کہا۔

”جمل چھوڑ پار۔۔۔ اب بندہ کس پر اعتبار کرے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کسی کو نہیں بتائے گی۔“

”اور تو اس کے وعدے پر اعتبار کر گیا۔۔۔ دلو دلو۔۔۔ اوئے دماغ کے قادر اس نے بھی اپنے آپ کی بات بھی چھپائی ہے۔ اس دن گاؤں میں اعلان کر لی پھرتی تھی ”ابے کی سوتے میں دھوئی کھل گئی۔“ جس کو ابھی تک یہ نہیں پتا کہ کیا بتانا ہے اور کیا نہیں اسے تو جا کے سب بتا آیا ہے۔ جمل ہر اب تو بھی تیار ہو جا ہا سو والی جگہ قلعے کے لیے۔“



پر نظر پڑی وہ ہلکے تھا... اس کی قیاس خون میں حسری ہوئی تھی اور وہ پشت کے بل زمین پر پڑا تھا... اسی اثناء میں میری نظر ایک سائے پر پڑی جو دیوار پچھل کر ڈیرے سے باہر جا رہا تھا... میں اس کے پیچھے لپکا اتنی دیر میں وہ دیوار پچھل چکا تھا... میں نے جوئی دیوار پچھل کر ڈیرے سے باہر آ گیا... اس کا چہرہ دیکھ کر میری زبان گنگ رہ گئی وہ چھوٹے شاہ جی تھے۔

”جی... چھوٹے شاہ جی آپ...؟“ میرے منہ سے پھنس پھنس کر الفاظ نکلے۔

”ہاں میں... اب جلدی کرو زینت کو لو اور گھر جاؤ... اور کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں... سو رہے ہیں خود سارے گاؤں والوں کے سامنے بتا دوں گا کہ ٹیکے کو میں نے مارا ہے۔“

”کُل... لیکن آپ نے...؟“ میں بمشکل اتنا ہی کہہ سکا۔

”ہاں غلام محمد میں نے... تم سوچ رہے ہو گے کہ ایک ایسا شخص جو دوسروں کی غلطیوں پر بھی خود معافی مانگا کرتا تھا آج قاتل بنا سامنے کھڑا ہے۔“ ایک ڈھکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر لہرائی اور پھر محدود ہو گئی۔

وہ دوبارہ گویا ہوئے... ”غلام محمد تمہیں پتا ہے ہاسو کو کس نے مارا تھا...؟“

”نہیں چھوٹے شاہ جی!“ میں نے جواب دیا۔

”اے بھی میں نے مارا تھا!“ انہوں نے اطمینان سے کہا۔

”گنگ... کیا... اے... بھی آپ... نے مارا تھا؟“

”ہاں! اے بھی میں نے ہی مارا تھا لیکن کیوں مارا

تھا یہ میں سو رہے گاؤں والوں کے سامنے بتاؤں گا۔“ اتنا کہہ کر وہ رکے نہیں اور گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل دیے۔

میرا ڈیرے میں واپس آیا۔ زینت چار پائی سے بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کھولا اور سہارا دے کر گھر لے آیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ گاؤں کی کوئی لڑکی اس ڈیرے سے صحیح سلامت واپس آئی تھی۔ سب حیران تھے اور یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ سب میں نے کیا ہے۔ چاہے غلام رسول کے لبوں سے دعا میں نکل رہی تھیں۔ ان کا بس چلنا تو وہ ساری دعا میں قبول کروا کر ہی چھوڑتے۔

زینت بھی پہلے سے کچھ بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ کیونکہ

حقیقت حال کا اسے بھی نہیں پتا تھا... سارے گاؤں والے جان چکے تھے کہ لپکا مرچکا ہے اور یہی سمجھ رہے تھے کہ اسے میں نے مارا ہے لیکن حقیقت کیا تھی یہ صرف میں جانتا تھا اور وہ جس نے اسے مارا تھا... انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ پولیس مجھے لے جائے گی۔ اس بات نے کئی لوگوں کے چہرے پر سوگاری طاری کر دی تھی لیکن جب میں نے انہیں حقیقت حال سے روشناس کر دیا تو وہ سب پہلے سے زیادہ حیران نظر آنے لگے۔

میرا کے اٹھ بیٹھے تھے۔ بچائیت لگی ہوئی تھی۔ پولیس موجود تھی۔ یہ انسپٹر نیا نیا آیا تھا اور سنا تھا کہ ایمان دہر بھی ہے۔ سب کو کسی کا انتظار تھا اور آخر وہ آ گیا۔ جوئی چھوٹے شاہ جی نے بچائیت میں قدم رکھا ہر چھوٹے بڑے کی نگاہ ان پر جم گئی۔

”اسلام علیکم!“ چھوٹے شاہ جی نے سلام کیا اور ایک خالی نشست پر بیٹھ گئے۔

سلام کا جواب دینے کے بعد سب سے پہلے انسپٹر نے ہی ان سے سوال کیا۔ ”مولوی صاحب کیا آپ نے ہی ٹیکے اور ہاسو کو کُل کیا ہے؟“

”جی!“ انہوں نے مختصر جواب دیا۔

”کیوں...؟“

”بختیار کو جانتے ہو...؟ اس نے انسپٹر کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”ایم ایم اے بختیار کی بات تو نہیں کر رہے؟“

”ہاں دی... یہ دونوں بھائی اسی کے لیے کام کرتے

تھے... اور مولوی صاحب بھی لمبی موت نہیں مرے انہیں بھی ان دونوں نے کُل کیا تھا۔“ انہوں نے انکشاف کیا اور

بچائیت میں موجود گاؤں کے لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

”یہ مولوی صاحب کون ہیں؟“ انسپٹر نے پوچھا۔

وہ ان کے والد صاحب تھے... بیٹے نے جواب دیا۔

گاؤں والے شروع سے ہی چھوٹے شاہ جی کے والد

کو مولوی صاحب ہی کہا کرتے تھے جن کی دیکھا دیکھی

چھوٹے شاہ جی نے بھی ان کو مولوی صاحب کہا شروع کر

دیا تھا۔

”وہ کب فوت ہوئے...؟“ انسپٹر نے پھر پوچھا۔

”تقریباً دو سال ہو گئے ہیں۔“ بیٹے نے جواب دیا۔

”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ بختیار کے

بندے ہیں اور انہوں نے ہی تمہارے باپ کو کُل کیا ہے...“



جبکہ سارے گاؤں والے جانتے ہیں کہ وہ فیصلی موت مرے تھے۔" انسپکٹر نے چھوٹے شادی سے پوچھا۔  
چھوٹے شادی کے آنے سے پہلے ہی شیخ انسپکٹر کو ان کے بارے میں سب کچھ بتا چکے تھے۔

"جو میں جانتا ہوں وہ گاؤں والے نہیں جانتے... سب سے پہلے مجھے جب شک پڑا تھا جب شیخ شہر سے لوٹا تھا اور مولوی صاحب کی چار پائی کے سرہانے دامیں پانے کے ساتھ ان کی تسبیح گری دیکھی تھی... مولوی صاحب سوتے وقت تسبیح بیٹھتے تھے کے لیے رک رک کر سوتے تھے اور آج تک ان کی تسبیح کبھی چار پائی سے نیچے نہیں گری... یقینی بات ہے کہ کسی نے ان کے سر کے نیچے سے نکیہ لالا تو تسبیح نیچے جا گری اور پھر اس نیچے کے ساتھ ان کا منہ بند کر دیا اور وہ ہمارا اسی طرح کبھی ان کے سر کے نیچے رکھ دیا... دوسری بات یہ کہ سب سے پہلے انہیں دیکھنے والا چاچا اللہ بخش تھا، ان کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب سر تک چادر لوٹھے سو رہے تھے جبکہ میں نے اپنی چوٹیں سالہ زندگی میں آج تک انہیں سینے سے اوپر چادر لے کر سوتے نہیں دیکھا... اور تیسری بات شاید کسی نے بھی غور نہیں کیا کہ دروازہ احمد سے کھلا تھا... جبکہ کوئی بھی رات کو اسے گھر کا دروازہ کھول کر نہیں سوتا۔" چھوٹے شادی اٹا کہہ کر چپ ہو گئے۔

"گاؤں والے جانتے ہیں کہ تمہارے والد صاحب ان دنوں بیمار تھے اور اس بیماری کی وجہ سے ہی ان کی موت ہوئی... اور باقی سب تو اتفاقات میں آتا ہے یہ تو کوئی شگرت نہ ہوتی۔" انسپکٹر نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب بھی یہی ہیں ان سے پوچھ لیں کیا مولوی صاحب اسے بیمار تھے کہ وفات پا جاتے...؟" انہیں ان سب کو اتفاق مان لیا لیکن یہ تو اتفاق نہیں ہے۔" چھوٹے شادی نے ایک سوہاگل فون نکال کر انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے...؟" انسپکٹر نے پوچھا۔  
"سوہاگل فون ہے گی۔"

"وہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ یہ سوہاگل فون ہے... میں اتنا بھی گھماؤ نہیں ہوں... اس میں کیا شگرت ہے۔" انسپکٹر نے منہ مٹاتے ہوئے کہا۔

چھوٹے شادی نے سوہاگل فون لے کر ایک ویڈیو چلائی اور انسپکٹر کے سامنے کر دی... انسپکٹر نے ویڈیو دیکھنے کے بعد چھوٹے شادی کی طرف دیکھا اور حیرت سے بولا "یہ ویڈیو تمہیں کہاں سے ملی اور یہ بتائی کس نے ہے...؟"

"ویڈیو کس نے بتائی یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے... البتہ مجھے یہ ہاسو کے ڈبرے سے ملی ہے اور سوہاگل بھی ہاسو کی ہے۔"

"اس ویڈیو میں کیا ہے انسپکٹر صاحب۔" شیخ نے پوچھا۔  
"آپ خود ہی دیکھ لیں۔" انسپکٹر نے سوہاگل ان کی طرف بڑھا دیا اور پھر وہ ویڈیو بہت سے لوگوں نے دیکھی... اس ویڈیو میں ہاسو گھار مولوی صاحب کے منہ پر نکیہ رک کر ان کو مار رہا تھا۔

"لیکن ہاسو کی تمہارے باپ سے کیا دشمنی تھی۔" انسپکٹر نے سوال کیا۔

"ہاسو کی مولوی صاحب سے کوئی دشمنی نہیں تھی... اس کی دشمنی پاکستان سے تھی اور میرے والد صاحب کو پاکستان سے محبت تھی بس یہی صداقت انہیں لے گئی۔"

"تم بات بہت گھما گھرا کر کرتے ہو جو بات ہے وہ صاف صاف بتاؤ۔"

"یہ آج سے ڈھائی سال پہلے کی بات ہے... اس وقت پاکستان میں فرقہ واریت کا طغیانی شہروں سے ہو کر سادہ لوگوں تک پہنچا تھا۔ کوئلے کے لیے لپکا... میں ان دنوں شہر میں پڑھتا تھا۔ کبھی کبھی ہی گاؤں کی طرف پکڑ لگتا تھا... ایک دن لوٹا تو مولوی صاحب کا پی پر بیٹھا تھا۔ میرے احتیاط پر انہوں نے بتایا کہ کچھ لوگ قریب قریب اشتہار دہانتے پھر رہے ہیں جن سے فرقہ واریت کو ہوا ملے گی اور گھر گھر فساد پھیلے گا... اس سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ انہیں بھی اس بات پر مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ بھی اس ہم میں شامل ہو جائیں... جب کہ ان کی ساری زندگی سب کو ایک کرتے گزری ہے... اور اس سب کے پیچھے بھتیجا تھا... جو کہ اسلام مخالف گروں کا آلہ کار ہے... اسی کی شد پر جگہ جگہ کفر کے فتووں کا ہزار گرم تھا... جب مولوی صاحب نے صاف انکار کر دیا تو انہیں لگ کی دھمکی دی گئی اور ایک دن وہ ایسے سوئے کہ وہ بارہ اٹھ ہی نہ سکے۔

ان کے قتل سے دو ماہ پہلے ہاسو اور اس کا بھائی قہقہہ اس گاؤں میں وارد ہوئے تھے... ہاسو اور قہقہہ نہ بھائی تھے اور نہ ہی مسلمان ہم نے پوری چھان بین کی ہے۔ ان کے نام شہروں کے کار اور شیخ شہا ہے، یہ دونوں اٹھ پانچ کے باپ کلاس کے غریب تھے جنہیں ہائر کر کے غریب کاری کے مقصد سے پاکستان بھیجا گیا تھا جہاں انہیں بھتیجا کی معاونت کرنی تھی... اور اس سے ابھی غریب کاری کیا ہوتی کہ مسلمانوں کو آج میں ہی بڑا دیا جائے... شروع شروع میں



انہوں نے صرف لوگوں پر اپنی دھاک بٹھائی اور جب وہ جان گئے کہ اس گاؤں کے لوگ اتنے بزدل ہیں کہ اگر ان کی عزتیں بھی خراب کر دی جائیں تو یہ چوں بھی نہ کریں گے، تب انہوں نے اپنا اصلی روپ دکھانا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے گاؤں کے اکثر لوگ شہروں کی طرف بھاگ گئے۔

پھر گاؤں میں ان کی مرضی کا ایک مولوی آیا وہی کہتا تھا جس کا اسے حکم دیا جاتا تھا۔ شرون اور شیوم نے صرف اس گاؤں پر ہی بس نہیں کیا تھا بلکہ وہ دوسرے گاؤں پر بھی منہ مارتے تھے اور ان کی پشت پناہی اختیار کرتا تھا جس کی وجہ سے کوئی بھی پولیس والا ان پر ہاتھ ڈالنے سے ڈرتا تھا۔ اور اگر کسی کو ایسا انداز کی بھرت چڑھ بھی جاتا تو اسے لٹا کر کسی اور شہر میں پھینک دیا جاتا۔ پھر دو ماہ پہلے میں اس گاؤں میں آیا۔ گاؤں والوں نے جب دوسرے مولوی کو چٹا کیا تو شرون اور شیوم میرے پاس آئے اور وہی بات سامنے رکھی جو واقعی سال پہلے مولوی صاحب کے سامنے رکھی تھی۔ اگر میں جب انکار کر دیتا تو آج ان دونوں کی جگہ میں اور پرکھی چکا ہوتا۔

میں ڈیڑھ مہینے تک راتوں کو جاگ جاگ کر ڈیرے کی ریکی کرتا رہا کہ کوئی موقع ملے اور میں کچھ کر سکوں اور آخر ایک دن مجھے موقع مل گیا۔ اس دن شرون (باسو) ڈیرے پر آگیا تھا اور شیوم شہر گیا ہوا تھا۔ میں دوپہر چھ بج کر ڈیرے میں داخل ہو گیا میں اسی وقت شرون ریح حاجت کے لیے ڈیرے کے ایک کمرے سے باہر نکلا اور میں اس کمرے میں گھس گیا۔ وہ دس منٹ بعد لوٹا اتنی دیر میں میں کمرے کی اچھی طرح تلاشی لے چکا تھا۔ سر ہانے پر ایک فخر بھی میری تحویل میں آچکا تھا اور اب مجھے شرون کا انتظار تھا۔ جو فحشی وہ فراغت کے بعد کمرے میں داخل ہوا میں نے دروازے کی اوٹ سے نکل کر پہلا وار اس کے سینے پر کیا اور آدھا فخر اس کے سینے میں ترانہ ہو گیا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پے در پے پانچ مزید وار کیے اور جب وہ ٹھنڈا ہو گیا تو چار پانی کی گواڑے اسے پسندانگہ کر ڈیرے کے اندر ہی پھینک کے درخت سے لٹکا دیا۔

تلاشی کے دوران میں جو چیزیں میرے ہاتھ لگی تھیں ان میں ایک یہ موہاں بھی تھا۔ جس میں ثمر نے ویڈیو بنائی تھی شاید اپنے آقا کو اپنا کارنامہ دکھانا چاہتا ہو۔ اسے چاہیے تو یہ تھا کہ موہاں ہی ضائع کر دیتا لیکن اس نے صرف ویڈیو بلیٹ کرنے پر ہی اکتفا کر لیا۔ مجھے جب موہاں ملا تو میں نے "ڈیجاری کور" کے ذریعے اس کا سارا ڈیجاری کور کیا

اور اسی ڈیجاری میں یہ ویڈیو بھی ملی۔ جس بات کا پہلے مجھے صرف شک تھا اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ میں کوئی مجرم نہیں تھا لیکن جب انسانیت پر ضرب پڑنے لگی تو شیوم اور معنی چھوڑ کر مشیر تھا ملی پڑی۔ جب انسان کی بات کا مسم ارادہ کر لیتا ہے تو اللہ خود ہی راستے پیدا کرتا جاتا ہے۔

میرے اناڑی پن کی وجہ سے درجن کو میری کارکردگی کا علم ہو گیا اور اگلے دن وہ جتارے کے بہانے مجھے لٹا کر ڈیرے پر لے گیا۔ جہاں سے میں موقع پا کر فرار ہو گیا۔ تین چار دن میں نے چکر لگائے کہ کوئی موقع ملے اور میں درجن کا بھی کچھ کر سکوں اس دوران میں گاؤں کے ایک شخص نے میرا بیٹھا بھی کیا لیکن میں نے اس پر غاہر نہ ہونے دیا کہ میں اس کے بیٹھا کرنے سے واقف ہوں اور اسے جلی دینے میں کامیاب ہو گیا۔ چھوٹے شادی کاواٹھ اشعار میری طرف تھا۔

"اور کل رات وہ چاہے نظام رسول کی بیٹی زینت کو اٹھا لے گیا۔ اس وقت اس کے ڈیرے پر اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اور اب اس بات کی گنجائش ہی نہیں بچی تھی کہ اسے اور مہلت دے جائے۔ لہذا کل میں نے اس کو بھی اس کے منہ پر لے بھاگی کے پاس بھیج دیا۔"

"تم ان کو قانون کے حوالے بھی کر سکتے تھے۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں کیوں لیا۔"

"جس وجہات میں یہ غلط ہوئی۔ مجھے قانون ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے تھا۔ میں نے برا کیا۔ اب اسے سنبھالنا آپ کا کام ہے۔"

ٹھیک ہے۔ یہ نین موہاں ہیں، ان میں میسجور کالز کے مکمل دیگر موجود ہیں اور کچھ لوگوں کے ٹیک کی ویڈیو بھی۔ جن میں تین بڑے علماء اور دو سیاسی لیڈر بھی شامل ہیں۔

اسپیکل شوٹ اور چھوٹے شاہ جی کو لے گیا۔ چند ماہ بعد وہی ہوا جس کا ڈر مجھے تھا۔ بختیار کو باعزت بری کر دیا گیا اور چھوٹے شاہ جی کو دو بے قصور لوگوں کو قتل کرنے کے جرم میں سزا سنائی گئی۔ جس دن ان کو سزا ہوئی اس کے ایک ہفتہ بعد سننے میں آیا کہ وہ جیل سے فرار ہو گئے ہیں اور ان کے فرار کے کچھ ہی دن بعد بختیار اپنی حویلی میں مردہ پایا گیا۔ اس کے جسم پر بھی فخر کے چھ زخم تھے۔

بختیار کو مرے آج تین سال ہو گئے ہیں لیکن وہ چھپا رستم آج تک پولیس کو نہیں مل سکا۔ جس کی شرارت کی سارا گاؤں مٹا لیں دیا کرتا تھا۔





## بازو گر

جناب معراج رسول

السلام علیکم

اس دنیا میں کہسے کہسے پہنچاتے ہیں اس کا ایک نمونہ حاضر ہے۔  
یقین کریں اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی میں اسے بھول نہیں سکا ہوں۔  
نصرت حسین کاظمی  
(کراچی)

میں راؤد مارکیٹ میں اسٹیشنری کی دکان کے  
سامنے گئے ایک اسٹینڈ پر نئے مینے کا سرگزشت تلاش کر رہا  
تھا۔ رسالہ نظر نہیں آ رہا تھا اور تاریخ ہو چکی تھی۔ سب تک  
رسالہ لازمی آ جانا چاہیے تھا۔ میں رسالوں کے پیچھے دسپے  
ہوئے رسالے نکال کر دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے برابر میں  
آکھڑا ہوا۔ سالوں کا رنگ جو سفید شلووار میں اور بھی  
نمایاں ہو رہا تھا۔ رخساروں پر معمولی سے ہال اور تھوڑی  
کے نیچے چل دیں اور آنکھوں میں سرمد تھا۔ سر پر سفید جالی



اگست 2014ء

271

ماہنامہ سرگزشت



اٹھاتے ہیں۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو جو عمل رکھتا ہے اور ہنگامتا بھی نہیں ہے اور وہی ان عیاروں سے محفوظ رہتا ہے۔ مگر یہ طبقہ بھی بہت کم ہے۔

”جلدی بولو میرے پاس وقت کم ہے۔“ میں نے جلت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”میں ہنگامی ہوں۔“ اس نے یوں آہ بھری جیسے ہنگامی ... ہونا کوئی جرم ہو۔“ ماں باپ بگڑدیش بننے کے بعد یہاں سے نہیں گئے مگر ہم آج بھی ہنگامی ہیں۔“

مجھے اس سے کوئی دل چسپی نہیں تھی کہ وہ ہنگامی تھا اور اگر وہ اب بھی ہنگامی تھا تو اس سے میرا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ ”ہاتھ مختصر کر دیجئے مگر جانا ہے۔“

اس نے بہ ظاہر میری بات کا کوئی اثر نہیں لیا اور اپنے مخصوص طعنے لہجے میں بولا۔ ”آپ یہیں پاس رہتے ہیں؟“

میں ہنگامی۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”میں نے بہت بار آپ کو دیکھا ہے۔ آپ یہاں سے خریداری کرتے ہیں۔ جینا اللہ نے آپ کو بہت دے رکھا ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے لیکن حالات ٹائٹ چل رہے ہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ اتنی سمجھ تو مجھے بھی تھی کہ وہ بات کو کس طرف لے جا رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جلد ہی جلد اپنا دم کا بیان کرے اور میں انکار کر کے اپنی راہ لوں۔ مگر وہ اس طرف آتی نہیں رہا تھا۔

”مجھ سے زیادہ کون بھڑ جان سکتا ہے کہ حالات کتنے ٹائٹ چل رہے ہیں۔“ اس نے پھر سرد آہ بھری۔ ”جس کے گھر میں کھانے کو نہ ہو۔ ایک بوڑھی ماں اور چار چھوٹے بہن بھائی سارا دن براہ نکتے ہوں کہ میں کچھ کھا کر لاؤں گا تو چوہا لہا جیٹے گا۔“

”اس شہر کی نصف آبادی اسی طرح روز کھاتی اور روز کھاتی ہے۔“ میں نے گویا اسے جواب دیا اس دوران میں میرے امداد سے مسلسل آواز آ رہی تھی

.... جھوٹ.... جھوٹ....

”ہاں لیکن آدمی آبادی کی کوئی جوان بہن کیلر کا شکار ہو کر سرکاری اسپتال میں نہیں پڑی ہوتی ہے۔“ کہتے ہوئے اس کا لہجہ اور آنکھیں غم ہو گئی تھیں۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا تو اس نے کہا۔ ”آپ شاید میری بات پر اظہار نہیں کریں گے۔ آج کل کوئی کسی پر اظہار نہیں کرتا ہے۔“

دور لڑی سے اس کے ہال ٹک کر گردن تک آرہے تھے۔ مخصوص ہنگامی تعویذ تھے۔ اس نے شانے پر دیکھے ہوئے تولیہ لٹا دیا ہالوں کا ٹھنڈا ہوا تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں مسواک کا گٹھا تھا۔ چہرے اور آنکھوں سے ایک خاص نوع کی عیاری ٹپک رہی تھی۔ یہ عیاری ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں کھینچ کر رہی تھیں کہ میں وہی ہوں جو تم سمجھ رہے ہو مجھ سے بچ کر دکھاؤ۔ مگر وہ بولا تو اس کے لہجے میں سٹخاس اور نرمی تھی۔

”بھائی صاحب اگر آپ مجھ سے کچھ رو مال اور مسواک لے لیں تو ایک غریب کی مدد ہو جائے گی۔“

”مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے سرگزشت کی تلاش جاری ہو گئی۔

”ضرورت تو کسی کو نہیں ہوتی ہے۔“ اس نے فحشی سانس لی۔ ”مگر میں بہت ضرورت مند ہوں۔ کیا آپ ایک منٹ کے لیے میری بات سنیں گے۔“

میں چاہنے کے باوجود انکار نہ کر سکا۔ اسے ٹالنے کے لیے میں نے کہا۔ ”ایک منٹ ذرا میں رسالہ تلاش کر لوں پھر تمہاری بات سنتا ہوں۔“

”مجھے بتائیں میں آپ کی مدد کرتا ہوں۔“

”اس سینیے کا سرگزشت چاہیے.... لوگ بھی رسالے الٹ پلٹ کر چلے جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ لیں۔“ اس نے ایک منٹ میں سرگزشت نکال کر مجھے پکڑا دیا۔ میں حیران ہوا تھا۔ میں دس منٹ سے تلاش کر رہا تھا اور دکان والے سے بھی تصدیق کی تھی کہ سرگزشت موجود ہے۔ مجھے نہیں ملا تھا اور اس نے ایک منٹ میں تلاش کر لیا۔ اب میں اس کا زیر بار بھی ہو گیا تھا۔ مجبوراً رسالے کی ادائیگی کر کے میں اس کے ساتھ ایک طرف آیا۔ میرے اندر سے کوئی مسلسل کہہ رہا تھا کہ وہ دھوکے باز ہے، دغا دیا ہے، میں اس کی بات نہ سنوں۔ ہمارے معاشرے میں نین طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک عام طبقہ جو سب سے بڑا ہے۔ یہ ذہانت رکھتا ہے مگر اس کے اندر ایک مخصوص قسم کی ہنگامیت اسے صحیح فیصلہ کرنے سے روکتی ہے۔ عام طور سے وہ غلط فیصلہ کرتا ہے اور اس سے نقصان اٹھاتا ہے۔ میں اسی طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ دوسرا طبقہ ان عیاروں کا ہے جن کے پاس عقل ہوتی ہے اور وہ اپنے مقصد کے لیے اسے استعمال کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ یہ ہم جیسے لوگوں کو استعمال کرتے ہیں۔ وہ ہماری ہنگامیت کا فائدہ



دھوکا اور غریب اتار زیادہ ہو گیا ہے کہ آدمی کیسے کسی کا اعتبار کرے۔

”مجھے افسوس ہے۔“ میں نے وہی انداز میں کہا۔  
 ”آپ کے افسوس کا شکریہ، لیکن مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ یقیناً زکوٰۃ خیرات نکالتے ہوں گے۔ میں آپ سے اس سے زیادہ نہیں مانگتا جو آپ نے کسی کو دینا ہی ہے اس میں سے مجھے دے دیں اور چاہیں تو اسپتال چل کر میری بہن کو بھی دیکھ لیں تاکہ آپ کو یقین آجائے کہ آپ کی زکوٰۃ خیرات غلط ہاتھوں میں نہیں جا رہی ہے۔“  
 ”دیکھو میرے پاس وقت نہیں ہے میں جا ب کر دے گا۔“  
 ”وہ آدمی ہوں۔“ سچ جانتا ہوں اور شام کو آتا ہوں۔ یہ پھنسی کا دن ملتا ہے تو گھر کے کام دیکھتا ہوں۔ میں کہاں اسپتالوں میں پھرتا پھروں؟“

”میں جانتا ہوں.... میں آپ سے زیادہ توقع بھی نہیں لگاؤں۔ آپ کسی دن اپنے قیمتی وقت سے صرف ایک گھنٹہ نکالیں، آپ کہاں کام کرتے ہیں۔“  
 ”میں ایک سوبائٹ فون مین میں کام کرتا ہوں جس کا دفتر شاہراہ فیصل پر ہے۔“ اس نے اس طرح پوچھا کہ میں نے بے ساختہ بتا دیا۔

اس نے سر ہٹا دیا۔ ”یہ تو.... اسپتال کے بالکل نزدیک ہے آپ کو آدھا گھنٹہ بھی نہیں لگے گا۔“  
 وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ ”میں بھی تو رمضان میں وقت ہے ہم اپنی زکوٰۃ رمضان میں نکالتے ہیں۔“

”اگر آپ رمضان سے پہلے دے دیں گے تو کسی غریب مجبور کے کام آئے گی۔“ الفاظ کی عاجزی سے قطع نظر وہ ایک مخصوص لون میں بول رہا تھا اور اس دوران میں اس کی آنکھیں مستقل میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور میں اٹھ دے مسلسل پسپا ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے اپنے ٹرائس میں لے رہا ہے۔ اس نے عام دھوکے باز بھکاریوں کی طرح پیچھے پڑے بغیر بہت نرمی اور آہستگی سے میرے قریب جگہ جالی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔  
 ”میں سوچوں گا۔“

”ضرور جناب زکوٰۃ بھی ایک عبادت ہے اور اسے پوری چھان بین کر کے لدا کرنا چاہیے۔ آپ کا کوئی سوبائٹ نمبر ہوگا۔“

”تمہارے پاس سوبائٹ ہے؟“ میں نے کسی قدر

ظہریہ انداز میں پوچھا۔

”ہی ہے۔“ اس نے جیب سے ایک نہایت قدیم اور مکھسا ہوا سوبائٹ نکالا وہ باؤل لب تھیں نظر نہیں آتا تھا۔ اس پر جگہ جگہ ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ میں شرمندہ ہو گیا۔ ”بس گزرا ہے کے لیے ہے۔“ کبھی کبھی اسکرین پر نمبر آتا بند ہو جاتے ہیں تو اندازے سے ڈائل کرنا پڑتا ہے۔ آج کل اس کے بغیر گزراہ بھی نہیں ہے۔“

”تمہاری بہن کا کیا نام ہے اور کس وارڈ میں ہے؟“  
 ”میرا نام شمس الدین ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میری بہن کا نام نورالتسا ہے اور وہ کینسر کے جرنل وارڈ میں ہے۔ لیڈن اور بچوں والے وارڈ میں۔ بیڈ نمبر سولہ ہے۔ آپ کا نام کیا ہے؟“  
 ”نصرت علی۔“ میں نے نام بتایا۔

”آپ کا سبب نمبر؟“  
 میں نے اپنا نمبر دینے کی بجائے اس کا نمبر لیا اور کہا۔ ”ٹھیک ہے میں لڑکتی نکال کر دیکھوں گا اور پھر تم سے رابطہ کروں گا۔ اگر میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں تو....“  
 ”ساری بات اللہ کی توفیق کی ہے۔ اگر اس نے آپ کے نصیب میں رکھی ہے تو مجھے ضرور ملے گی۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اس سے کچھ سواک اور دمال لیے۔ یہ ساری چیزیں یہاں کی بھی نہیں تھیں لیکن میں نے اسے سودے دینے۔ گھر جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ فراڈ یا نہیں تھا تو میں کچھ اس کی کچھ مدد کروں گا۔ میرے پاس ایک فلیٹ تھا جو کرائے پر دیا ہوا تھا اور میری بیوی زرین کے پاس تقریباً بیس تو لے گولڈ تھے۔ پچھلے سال میں نے تقریباً ساٹھ ہزار روپے زکوٰۃ دی تھی۔ اس سال گولڈ کی قیمت بڑھ گئی تھی اور میرا اندازہ تھا اس بار ستر ہزار تک زکوٰۃ جائے گی۔ میں نے گھر جا کر زرین کو ساری بات بتائی تو اس نے کہا۔ ”نصرت وہ آپ کو فراڈ یا لگ رہا تھا تو آپ نے یہ سب کیوں لیا اور اب آپ زکوٰۃ دینے کی بات کر رہے ہیں۔“

”دیکھو یاں بعض اوقات آدمی وہ نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے اور میں ابھی طرح تصدیق کر کے ہی زکوٰۃ دوں گا۔“  
 ”مرضی آپ کی، یہ آپ کا شعبہ ہے۔“ زرین نے بے نیازی سے کہا تو میں نے اسے گھبرا۔

”زکوٰۃ، جناب کے ذمہ داری کی جاتی ہے۔“  
 ”تو یہ زیادہ آپ اور آپ کے بچوں کے کام آئے گا۔“



کون سا میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گی۔" اس نے جھک کر کہا۔ "یہ مکان خریدنا تھا اب بھی تو میں نے اپنا آدھا ٹکڑا دیا تھا کہ نہیں... آج ہمارا مکان ہے اور آپ کو رکوع بھی کم دینا پڑتی ہے۔"

"تم لاجواب کر دیجی ہو۔" میں نے اس کر کہا۔ ہمارے دو بچے ہیں۔ ایک چٹا منگھٹ جسات سال کا ہے اور بیٹی رانیا پانچ سال کی ہے۔ دونوں اسکول جاتے ہیں۔ صبح میں دفتر جاتے ہوئے انہیں اسکول چھوڑ جاتا ہوں اور دوپہر میں زمین جا کر انہیں لے آتی ہے۔ اسکول پاس ہی ہے۔ زمین بیدل چلی جاتی ہے یا موسم گرم ہوتا رکشا کر لیتی ہے۔ جب سے اسکول دینوں میں بچوں کے ساتھ آنے والے حادثات دیکھے اور سننے جب سے ہم نے بچوں کی اسکول دین چھڑا دی تھی۔ بچے بھی خوش تھے کہ آتے جاتے ماں باپ کا ساتھ میسر ہو جاتا تھا۔ خاص طور پر رانیا میرے ساتھ جاتے ہوئے خوش ہوتی تھی۔ وہ پاپا کی دیوانی تھی۔ شام کو میں گھر میں داخل ہوتا تو وہ پہلے سے دروازے پر منتظر ہوتی تھی۔ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہر سہولت اور آسانی دی ہے۔ اس لیے میں اور زمین دوسروں کا خیال کر کے اس کا شکر ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میرے دفتر جانا شروع کیا اور میرا ہمیشہ مصروفیت لانا تھا۔ کیونکہ اوتار کو ہونے والی ٹرانسکشن بھی اکاؤنٹس میں آتی تھیں اور کام دوگنا ہو جاتا تھا۔ سرکھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی اور عام طور سے اچھے اچھے سات آٹھ بیج جاتے تھے۔ میرے والے دن میں ہمیشہ لیٹ گھر آتا ہا تھا دلوں میں میں چھ بجے تک گھرا جاتا تھا۔ اس روز بھی دفتر سے اچھے ہوئے ساڑھے سات بج گئے تھے۔ مجھے باہر نکل کر خیال آیا کہ میں نورالتسا کو دیکھ لوں تصدیق ہو جاتی کہ جس الدین بی بی کہہ رہا تھا یا جھوٹ، مگر پھر ہمت نہیں ہوئی۔ ممکن بہت زیادہ تھی، سردار دن کر سیدی کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا اور بڑی مشکل سے لنگے کیا تھا۔ میں نے یکا م اگلے روز کے لیے ملتوی کیا اور گھر روانہ ہو گیا۔ اب اتفاق کی بات تھی آنے والے ہر روز کوئی نہ کوئی کام یا مصروفیت نکل آتی تھی جس کی وجہ سے اسپتال جانا ملتوی ہو جاتا تھا۔ یہی بات ہے مجھے سرکاری اسپتال جا کر رخت ہوتی تھی۔ وہاں کا ماحول، گندگی اور سب سے بڑی بات انسانوں سے بے پروائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے میں جب بھی کسی سرکاری اسپتال گیا دل پر جبر کر کے ہی گیا۔ شاید اس لیے بھی

میں روز نال جاتا تھا۔

پورا ہفتہ گزر گیا اور اوتار آیا۔ میں عام طور سے شام کے وقت جا کر بیٹے بھر کا سامان لے آتا تھا۔ لیکن کا تارہ سامان جیسے گوشت، ہنری اور پھل زمین خود لیتی تھی۔ میں جرنل اسٹور اور دوسری دکانوں سے ملنے والا سامان لاتا تھا۔ بیکری اسٹلم ہمارے ہاں کم آتے تھے۔ زمین ناشتا بھی خود بناتی تھی۔ اس لیے مجھے ہرے بیٹے میں بس ایک بار جانا پڑتا تھا۔ زمین مجھے لہرست بنا دیتی تھی اور میں چیزیں لے آتا۔ یوں سمجھ لیں کہ ہمارے ہاں ماہوار کی بجائے بیٹے ولد سامان آتا تھا۔ اس بار سامان زیادہ تھا اس لیے میں گاڑی لے گیا۔ رولڈ مارکیٹ کی پارکنگ میں جیسے ہی گاڑی سے اترا مجھے سامنے سے شمس الدین آتا دکھائی دیا۔ ظاہر وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ سر جھکائے آ رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگا وہ میری طرف ہی آ رہا ہے۔ اس نے پاس آ کر سر اوپر اٹھایا اور مجھے دیکھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسا بھی نظر پڑتا ہو۔

"تھرت بھائی۔" اس نے مخصوص لہجے میں کہا۔ "کیسے ہیں آپ؟"

"اللہ کا شکر ہے... تم سناؤ۔"

"ویسے تو اللہ کا شکر ہے۔" اس نے سرد آواز بھری جو اصل میں اشارت تھا اور پھر وہ شروع ہو گیا۔ "مگر نور کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے لیے انجکشن کہا ہے اس سے وہ بہتر ہو جائے گی مگر انجکشن چندہ ہزار کا ہے اور یہاں اتنی رقم نہیں ہے۔"

"سوری مجھے وقت نہیں ملا تھا۔" میں نے معذرت کی۔ "یہ پورا ہفتہ بہت مصروف رہا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں گے۔ زندگی بہت مصروف ہو گئی ہے۔ یہ ذمہ لوگوں کے لیے ہے۔ مگر جن کی جان انکی ہو ان کے لیے تو ایک ایک مل صدی بن کر گزرتا ہے۔" اس نے السردگی سے کہا۔ "اللہ مالک ہے۔ اگر نصیب میں ہو تو نورالتسا کی زندگی میں آپ کو فرصت مل جائے اگر نصیب میں نہ ہو تو..." وہ بولتے ہوئے چپ ہو گیا اس کا لہجہ آدرا رہا تھا۔ "معاف کیجئے گا آپ کام سے آئے ہیں اور میں اپنے دکان سے لے کر بیٹھ گیا۔"

آج اس نے ازار بند کے پیکٹ تھام رکھے تھے۔ مجھے ضرورت نہیں تھی۔ لیکن میں نے اس سے ایک پیکٹ لے لیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ "تم مختلف سامان



تھا۔ میں نے اس سے نور انسا کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اسے بلڈ کیئر ہے۔ گویا کس الدین اس حد تک درست تھا کہ اس کی بہن کو کیئر تھا اور اسے طلاق کی ضرورت تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”کیا مریض کو کوئی انجکشن بخورے ہوا جس کی ماییت پندرہ ہزار ہے؟“

”جی ہاں... ہم نے اس کے بھائی سے کہا ہے کہ وہ بندوبست کر لے کیونکہ حکومت کے پاس اس کا اسٹاک نہیں ہے۔“

”اگر اسٹاک نہیں ہے تو مارکیٹ سے خرید کر دیا جائے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔“

ڈاکٹر مسکرایا۔ ”دواؤں کی خریداری کے لیے ہمارے پاس بجٹ محدود ہوتا ہے۔“

میں کھڑا ہو گیا۔ ”اس ملک میں حوام کے لیے ہرچیز محدود ہے۔ یہ بتائیں کہ اگر انجکشن مل جائے تو عرو کی کیا فرق پڑے گا؟“

”کیئر کے غلیوں کی انفرانکس کی بوتل رقم ہو جائے گی اور ہمیں کیئر قہرانی کے لیے زیادہ وقت ملے گا۔ ہم زیادہ سے زیادہ دو مہینے میں ایک بار کر سکتے ہیں۔“

”میں سمجھ گیا۔“ میں نے کہا۔ اب میں مطمئن تھا۔ اسپتال سے نکلنے کے بعد میں نے کس الدین کا نمبر دیا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”ہلو کون بول رہا ہے؟“

”نصرت عظمیٰ بات کر رہی ہوں۔“

”نصرت بھائی۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”کیسے مجھ غریب کو کیسے یاد کیا؟“

”میں اسپتال سے آ رہا ہوں تمہاری بہن کو تو دیکھنے نہیں دیا لیکن میری ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی ہے۔“

”وہ کیا کہہ رہا ہے؟“ اس نے اسی انداز میں کہا۔

”اس کا کہنا ہے کہ انجکشن سے انہیں نور انسا کے طلاق کے لیے مزید وقت مل جائے گا۔ تم ایسا کرو کل مجھ سے آ کر رقم لے لو۔“

”کہاں آنا ہوگا؟“ وہ خوش ہو گیا۔

”راڈ تو آ جاؤ میں بینک سے نکلوا کر وہیں لے آؤں گا۔“

”کس وقت؟“

”شام میں تم وہیں ہوتے ہو میں آؤں گا تو کال کر

کیوں رکھتے ہو؟“

”سواک تو میں لازمی رکھتا ہوں۔ یہ ہمارے نئی ٹکنک کی سنت ہے اور ہر مسلمان کو سواک کرنی چاہیے۔ چاہے وہ تو تھ پیٹ کیوں نہ استعمال کرنا ہو۔ ہائی چیزیں میں بکٹن سے لیتا ہوں جو چیز سستی مل رہی ہو وہ اٹھا لیتا ہوں۔ میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہوتے ہیں۔ من سے ہی خریداری کرنی ہوتی ہے۔ شام تک دو تین سو روپے فگ جاتے ہیں جس سے گھر کا چلو لہا جاتا ہے۔“

میں نے خریداری کی اور واپس آیا تو میرے اندر لاسر دی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ واقعی بہت ضرورت مند ہو۔ زرین ازار بند کا پکٹ دیکھ کر سمجھ گئی۔ اس نے کہا۔ ”آج پھر وہی ملا تھا؟“

”ہاں بار کام کی چیز تھی میں نے سوچا لے لوں۔۔۔ ضائع نہیں جائے گی۔“

”آپ عید جرمید پر دو تین جوڑے بنواتے ہیں ان کے لیے تو یہ پکٹ دس سال بھی چلے گا۔“ اس نے طعنے لگا تو میں مسکرا کر رہ گیا۔

”کوئی بات نہیں بار دوسروں کو بھی ہانت دیں گے۔ لڑیہ سواک پکٹ تو ہے۔“

”بات ڈیڑھ سو کی نہیں ہے۔ میں آپ کے لیے جو ازار بند لاتی ہوں ایک کی قیمت پچاس روپے ہوتی ہے۔ لیکن آپ اس سے ٹھگ کر آتے ہیں یہ مجھے اچھا نہیں لگتا ہے۔ وہ خرابا ہے۔“

”بھوسکا ہے۔“ میں نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔ ”اب اس سے کچھ نہیں لوں گا۔“

”مرضی ہے آپ کی۔“ زرین نے منہ پھلا کر کہا۔ ”پیسے تو آپ کے ہی خرچ ہو رہے ہیں۔“

زرین کی بات نے مجھے اکسایا کہ میں کس الدین کی اصلیت جاننے کی کوشش کروں اور میں نے سوچ لیا کہ میں کل اسپتال ضرور جاؤں گا چاہے مجھے دیر ہو جائے۔ اگلے دن دفتر سے نکل کر میں اسپتال روانہ ہوا مگر مجھے خیال نہیں رہا کہ سات کے بعد ملاقات کا وقت نہیں ہوتا ہے۔ میں وارڈ تک پہنچ گیا تھا۔ اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ البتہ وہاں کا ڈاکٹر سے تصدیق ہو گئی کہ یہاں انہیں سالہ نور انسا نامی لڑکی داخل ہے اسے دوسرے درجے کا کیئر ہے اور اس کا طلاق جاری ہے۔ میں نے اس کے ڈاکٹر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اتفاق سے ڈاکٹر ڈیوٹی پر



لوں گاسات ساڑھے سات بج سکتے ہیں۔"

"یہ آپ کا نمبر ہے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا اور دل میں سوچا کہ اب یہ کال کتنا رہے گا۔ مگر اس نے کال نہیں کی۔ میں نے رات درین کو بتایا کہ محس الدین کی بہن بچہ کیلنسر کی سرینہ ہے اور اسپتال میں داخل ہے۔ اس کے علاج کے لیے پندرہ ہزار کے ایک انجکشن کی ضرورت ہے اور میں نے سوچا ہے کہ میں زکوٰۃ کی رقم میں یہ رقم محس الدین کو دے دوں۔ درین بھی متاثر ہوئی تھی اس کے خیال میں محس الدین فرالایا تھا مگر اب ثابت ہو گیا تھا کہ اس نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ وہ بچہ کی ضرورت مند تھا۔ درین نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ اسے پندرہ ہزار روپے دے دیں یا چاہیں تو اور بھی دے دیں اس ہار زکوٰۃ بھی زیادہ جائے گی۔ اگر ہماری زکوٰۃ سے کسی لڑکی کی جان بچ جائے تو بہت اچھی بات ہے۔"

"نی اٹھال تو پندرہ دے رہا ہوں۔ پھر دیکھوں گا۔" اگلے دن دفتر سے واپسی پر میں نے بینک سے رقم نکلائی۔ بینک بھی گلستان جوہر میں تھا۔ میں نے سہاگہر جانے سے پہلے یہ کام نمٹا دوں۔ راز و مارکیٹ آیا تو محس الدین مجھے باہر ہی بل گیا تھا۔ کارڈ دیکھتے ہی وہ لپک کر آیا۔ میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "امداد آ جاؤ۔۔۔ آج کل یہاں ٹیرے گھومتے رہتے ہیں سو قح پاتے ہی رقم موہاں چھین لیتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" مہلی ہار اس کا لہجہ کسی قدر مضطرب تھا۔ "میں پتا نہیں سکتا کہ جب میں نے نور انسا کو بتایا کہ اس کے لیے انجکشن کا بندوبست ہو گیا ہے تو اس کے کیا تاثرات تھے۔ وہ آپ کو دعا میں دیتے نہیں تھک رہی گی۔"

"اللہ اسے صحت اور زندگی دے۔" میں نے جیب سے رقم نکال کر اس کے حوالے کی۔ "مگن لو پورے پندرہ ہزار ہیں۔"

"گنتا تو وہ ہے جو بدلے میں کچھ دیتا ہے۔ میرے پاس تو سوائے دعاؤں کے کچھ نہیں ہے۔" اس نے رقم جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بس تو پھر دعا کرنا۔۔۔ انجکشن جلد لگوا لو ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ اگر دیر ہوئی تو انجکشن بیکار جائے گا۔"

"کل صبح دو اونس کی مارکیٹ کھلتے ہی میں سب سے

پہلے یہی کام کروں گا۔ کل ہی اسے لگ بھی جائے گا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ انجکشن بہت سخت ہوتا ہے۔ اس کے بعد مریض کو طاقتور غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ انجکشن اپنا کام ٹھیک سے کر سکے۔ خیر اللہ مالک ہے جیسے انجکشن کا بندوبست ہوا ہے اسی طرح نور انسا کے لیے اچھی خوراک کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

مجھے درین کی بات یاد آئی اگر ہماری وجہ سے ایک لڑکی کی زندگی بچ جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں نے پرس سے ایک ہزار روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ "یہ رکھ لو۔۔۔ اس کے لیے کھانے پینے کا سامان لے لیتا۔"

اس نے کسی قدر ہنگامہٹ کے ساتھ نوٹ لے لیا۔ "آپ بہت کر رہے ہیں۔ میں بچ میں آپ کا شکر یہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پندرہ ہزار میں نے زکوٰۃ سے دیئے ہیں لیکن یہ ہزار میری طرف سے ہے۔"

اس نے گرم جوش سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے اتر کیا۔ میں گھر کی طرف روانہ ہوا تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ میں نے درین کو بتایا تو وہ بھی خوش ہو گئی۔ "آپ نے اچھا کیا، واقعی صرف علاج سب کچھ نہیں ہوتا ہے مریض کو اچھی غذا کی ضرورت بھی ہوتی ہے جب ہی وہ بیماری سے ٹھیک ہو سکتا ہے۔"

"بس یہی سوچ کر میں نے ہزار روپے دیئے تھے۔"

آنے والے اتوار میری مگر محس الدین سے ملاقات ہوئی اور وہ بہت خوش تھا اس نے بتایا کہ نور انسا کی حالت اچھی ہے۔ دو دن بعد اس کی اگلی کیمرہ رانی ہے۔ "اب امید ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ان شاء اللہ۔" میں نے کہا۔

"آپ نے جو رقم دی تھی اس سے اسے اچھی خوراک دی ہے۔ رقم تو نہیں لیکن اب ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ کیمرہ رانی کے بعد وہ دو تین دن دیسے ہی کچھ نہیں کھائے گی۔"

"تم اگلے اتوار کو ملنا شاید میں تمہارے لیے اور کچھ کروں۔"

وہ خوش ہو گیا۔ "میں یہیں ہوں گا۔"

شرورج میں مجھے لگا تھا کہ وہ دن لوگوں میں سے ہے جنہیں ایک ہار کچھ دو تو پھر وہ جان کو آ جاتے ہیں اور اس



"ہاں تم اس بنگالی کے ساتھ بات کر رہے تھے۔ مجھے پہلے بھی کسی نے بتایا تھا لیکن آج تو میں نے خود اسے آپ سے بات کرتے دیکھا اور آپ نے اسے کچھ دیا بھی تھا۔"

"ہاں یا مدوہ ضرورت مند ہے۔"

"ضرورت مند۔" تو قیر ہٹا۔ "نصرت بھائی وہ ایک فیسر کا لڑا ہوا ہے۔"

"نہیں یا راج کج ضرورت مند ہے اس کی بہن کینسر کی مریض ہے اسپتال میں داخل ہے۔"

تو قیر نے نگلی میں سر ہلایا۔ "اس کا بھکر ہو گا لوگوں سے اسی قسم کی کہانیاں کی مدد سے رقم ٹھکرا ہے۔ اس مارکیٹ میں آنے والے بہت لوگوں کو ٹھک چکا ہے۔ دکاندار تقریباً سب جانتے ہیں۔ اس لیے دوسروں پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔"

"دکانداروں کو کون لوٹ سکتا ہے اس ملک کی سب سے بڑی ذکیت ایسوی ایشن تم لوگوں نے بنا رکھی ہے اور انہوں نے ہاتھ سے حمام کو لوٹ رہے ہو۔"

"مگر بدلے میں چیز تو دیتے ہیں۔ اس جیسے لوگ تو دھوکے کے سوا کچھ نہیں دیتے۔ یہ قاذوک آپ نے کچھ دیا تو نہیں ہے۔"

اگر میں تو قیر کے سامنے اقرار کر لیتا کہ میں اسے نہ صرف اٹھارہ ہزار سے اوپر رقم دے چکا ہوں بلکہ میری بیوی نے خاصا سامان بھی دیا ہے تو یہ بے وقوف بننے کا اقرار کرنے والی بات ہوتی۔ دوسرے مجھے تو قیر کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ کم سے کم نور النساء کی لڑکی اسپتال کے کینسر وارڈ میں تھی اور اس کی وہی کیفیت تھی جو شمس الدین نے بیان کی تھی۔ اس نے اس بارے میں جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اب مجھے گھر لگ رہی تھی کہ کہیں میں کج فکری تو دھوکا نہیں کھا گیا تھا۔ میں گھر آیا تو زدرین نے پوچھا۔ "آپ نے سامان دیا اسے۔"

"ہاں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "وہ بہت شکر یہ ادا کر رہا تھا۔"

"اللہ کرے اس کی بہن ٹھیک ہو جائے۔" زدرین نے غلوں سے کہا تو میں نے سوچا کہ وہ اس کی بہن تھی مگر یہ نہیں؟ لیکن میں نے یہ بات زدرین کو نہیں بتائی۔ پہلے میں اس معاملے میں پوری چھان بین کرنا چاہتا تھا۔ اگلے دن میں دفتر سے ذرا جلدی اٹھا تھا۔ میں آج نور النساء کو دیکھنا چاہتا تھا۔ چوبیس ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا تھا اس

وقت تک وہ چھان نہیں چھوڑتے جب تک آدمی اپنی طبیعت پر چر کر کے انہیں دھکا نہ دے۔ مگر خلاف توقع وہ ایسا ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے تو نگار ہاں لیکن ایسے طریقے سے کہ نگار نہیں گزرتا تھا۔ اپنی ضرورت مہذب انداز میں پیش کی اور پیشہ ور ہنکار ہیں والا رویہ نہیں اپنایا تھا۔ جس سے چڑ آتی ہے۔ اس نے میرا فیسر پاس ہونے کے باوجود ایک بار بھی مجھے کال نہیں کی تھی۔ اب تو زدرین بھی اس سے متاثر ہو چکی تھی۔ اسے شمس الدین اور نور النساء سے ضروری ہوگئی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا ارادہ شمس الدین کو مزید مدد دینے کا ہے تو وہ نہ صرف متعلق ہوگئی۔ بلکہ اس نے نور النساء کے لیے اپنے کچھ پرانے لیکن اچھے جوڑے بھی لٹالے۔ ساتھ ہی کچھ چیزیں اور بھی تھیں۔

"یہ سب بھی اسے دے دیجئے گا۔" زدرین نے کہا۔ "اچھا ہے کسی کے کام آجائے گا۔"

شمس الدین کے بارے میں ابتدائی تاثر جو تھا لیکن اس کی بات بھی ثابت ہونے کے بعد ہمارے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ آ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی ہم دل سے اس کی مدد کرنا چاہ رہے تھے۔ اگلے اتوار کو میں مارکیٹ پہنچا تو وہ وہاں موجود تھا۔ میں نے کپڑوں اور سامان کا شاہچہ دیکھا اور ساتھ ہی اس کی بہن کے لیے کچھ رقم دی تھی۔ وہ بہت شکر گزار ہوا تھا۔ ممنونیت کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اس کا گلہ رندہ کیا تھا۔ "نصرت بھائی وہ تو بہت سے لوگوں نے کی لیکن آپ نے جس طرح اپنا نیت کے ساتھ کچھ کیا ہے اس کے لیے میں اپنے جذبات الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"حالانکہ تم بہت اچھا بولتے ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے بہت کم لوگوں کو تمہاری طرح اتنا نپاٹا بولتے سنا ہے۔ تم بڑے مہذب لگتے ہو۔"

"اسکول تک پڑھا ہے اور یہ تو آپ جیسے مہربانوں کا ساتھ ہے جو مجھے چند الفاظ بولنا آگئے ہیں۔"

شمس الدین سے بات کر کے میں امداد آیا۔ زدرین نے کاسٹیکس شاپ سے کچھ چیزیں منگوائی تھیں۔ اس کے مالک تو قیر سے میری بہت اچھی سلام دعا بلکہ کپ شپ تھی۔ اگر وہ غائب ہوتا تو ہم بات کر لیتے تھے۔ میں اس کی شاپ پر پہنچا تو جیسے وہ یہاں ہی منتظر تھا۔ اس نے سلام دعا کے بعد چھوٹے ہی کہا۔ "نصرت یاد رہے کس کے چکر میں پڑے ہو؟" میں چٹکا۔ "چکر میں اور میں؟"



کیونکہ میں انہیں بھکاری ہی سمجھتا تھا۔ ساتھ ہی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ جس الدین دھوکے باز نہیں لگتا تھا اور نہ اس کو دیکھنے والی زکوٰۃ بھی خالص جاتی۔ اس سے زیادہ مجھے درویش کا خطرہ تھا۔ وہ مجھے اس حالت پر آسانی سے معاف نہ کرتی جیسا کہ بیویوں کا دھوکہ ہوتا ہے۔ سالوں تک مجھے اس کے طعنے سنتا پڑتے۔ اب میں مطمئن تھا۔

اگلے اتوار کو مجھے مارکیٹ میں جس الدین نظر نہیں آیا تھا۔ شاید وہ آج نہیں آیا تھا۔ دوسرے دنے بھی نظر نہیں آیا تو وہ میرے ذہن سے نکلنے لگا تھا۔ ایک مہینے بعد میں نے اس کا نمبر بھی صاف کر دیا تھا۔ اس لیے جب چند دن بعد اس کی کال آئی تو میں نمبر سے شناخت نہیں کر سکا میں نے کال ریسیو کی۔ "ہلو..."

"نصرت بھائی، ایک بھئی سی آواز آئی تو میں پہچان نہ سکا۔

"ہاں میں نصرت ہوں کون بات کر رہا ہے؟"

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں... جس الدین ہوں۔"

میں حیران ہوا تھا۔ "تمہاری آواز بالکل نہیں پہچانی جا رہی ہے۔"

"میری تو آواز بھی نہیں نکل رہی ہے۔" اس نے رنج سے لہجے میں کہا۔ مجھے کھٹکا ہوا۔

"کیا ہوا خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے... نور اقسا کی دن سے بہت بیمار تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کا انتقال ہو گیا ہے۔"

مجھے جھٹکا لگا تھا۔ "انا اللہ ہے وانا الیہ راجعون۔"

میں نے بے ساختہ کہا۔ "مگر کیسے اس کی حالت تو ٹھیک ہو رہی تھی۔"

"بس جی اللہ کی مرضی۔" وہ رونے لگا۔ "ہم بھی خوش تھے... مگر ایک دن پہلے اس کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ آج اس نے آخری سانس لی... وہ اب زور و شور سے رونے لگا تھا۔"

"جس الدین مت رو... مرد بنو وار..." میں اسے تسلی دینے لگا۔ اس وقت میں گھر میں تھا بیوی بچوں کے ساتھ دات کے کھانے کے بعد لی وی دیکھ رہا تھا۔ ذہین نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آہستہ سے اسے بتایا۔

"نور اقسا کا انتقال ہو گیا ہے۔"

کے بعد کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ ٹریک کے باوجود میں خوش قسمتی سے چھپتے میں دس منٹ پہلے پہنچ گیا۔ وہاں بے شمار لوگ اپنے اپنے عزیزوں سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ کسی نے مجھے بھی نہیں روکا۔ مجھے بیڈ نمبر یاد تھا۔ بیڈ پر دو طرف اسکرین کھڑی ہوئی تھی اور ایک طرف سے کھلا ہوا تھا۔ میں اندر آیا تو بیڈ پر ایک نوجوان اور ساتویں بنگالی نقوش والی لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ بیماری نے اسے گھلا دیا تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ کیونکہ رپائی کی وجہ سے اس کے بال جڑ گئے تھے اور سر پر رد مال بندھا ہوا تھا۔ وہ خود کی میں گئی یا اسے کوئی دوا دی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے تو میں چڑھا کیونکہ اس کے جسم پر ذہین کا ایک سوٹ تھا اور یہ باقاعدہ فٹنگ کر کے پہنا ہوا تھا۔ میں اس سوٹ کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں میری سانس لے کر رہ گیا۔ اب کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں واپس پلٹے لگا تھا کہ لڑکی نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر چوکی۔

"آپ... آپ ڈاکٹر ہیں؟"

میں نے کسی قدر ٹانگہ اٹھانے کے ساتھ سر ہلایا۔ "ہاں جی میں آپ کو دیکھنے آیا تھا آپ سو رہی تھیں۔"

"میں اب بھتر ہوں۔" وہ ہنسی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "ڈاکٹر صاحب میں ٹھیک ہو جاؤں گی؟"

"کیوں نہیں... میں نے تسلی دی۔" تمہارا علاج اتنا اچھا چل رہا ہے امید ہے چند مہینوں میں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"ج ڈاکٹر صاحب؟" اس کا چہرہ ہلکا تھا۔

میں نے سر ہلایا اور پوچھا۔ "جس الدین تمہارا کیا لگتا ہے؟"

"بھائی۔" اس نے سلامتی سے جواب دیا۔ "میرا بہت خیال رکھتا ہے بہت اچھا ہے۔"

"ہاں وہ بہت اچھا ہے۔" میں نے دل ہی دل میں ٹامہ ہوتے ہوئے کہا اور وہاں سے نکل آیا۔ ایک تو میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا لیکن اصل غداست مجھے جس الدین پر شک کی ہو رہی تھی۔ میں تو قیر کی باتوں میں آ گیا تھا۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ ایسے لوگ عام طور سے دھوکے باز اور بھکاری سمجھ لیے جاتے ہیں جو کمانے کے لیے ایسی چھوٹی سوتی چیزیں لیے بچ رہے ہوتے ہیں ان میں سے اکثر بھکاری ہی ہوتے ہیں۔ بہت بار میں نے ایسے لوگوں سے خاص طور سے بچوں سے کچھ لیے بغیر انہیں رقم دی تھی۔



"اور۔۔۔" وہ بھی دنگی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ میں شمس الدین کو چپ کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ چپ ہوا اور پھر بھرائی آواز میں بولا۔

"نصرت بھائی۔۔۔ اللہ گواہ ہے۔۔۔ ابھی میں اسپتال میں اس کی لاش کے ساتھ ہوں اور میری جیب میں اس کے پیسے نہیں ہیں کہ اسے ایسولینس میں گھر لے جاؤں۔۔۔ ایک ہفتے سے کام پر نہیں گیا۔ صبح شام اس کے سر ہانے رہا۔ آپ میری پوزیشن کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ابھی تو لورائٹسا کو آخری آرام گاہ تک پہنچاتا ہے۔ میری جگہ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں تو آپ کو کال کر دی۔۔۔ اگر آپ کو یہ لگا ہو۔۔۔"

"نہیں یاد۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تم ایک منٹ رکو میں تمہیں کال کرتا ہوں۔"

میں زورین کو دوسرے کمرے میں لایا۔ بچوں کے سامنے اس قسم کی باتیں کرنا مناسب نہیں تھیں۔ میں نے زورین کو مختصر الفاظ میں شمس الدین کے بارے میں بتایا۔ "وہ مجھ سے توقع لگا رہا ہے کہ میں اس کے لیے کچھ کروں گا اس کا کہنا ہے کہ اس کے پاس کفن دفن تو کیا لاش گھر لے جانے کے لیے ایسولینس کا کرایہ بھی نہیں ہے۔"

زورین نے جلدی سے کہا۔ "نصرت ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔"

"میرے پاس وہ ہزار ہیں۔۔۔ وہ دے آتا ہوں۔۔۔ آج کل کفن دفن بھی سستا نہیں ہے۔"

"ایک منٹ میرے پاس بھی کچھ رقم ہے۔" زورین نے کہا اور الماری سے رقم نکال لائی۔ یہ کچھ نوٹوں پر مشتمل تھی اس نے مٹی۔ "سات ہزار دو سو روپے ہیں۔۔۔ سو دے سے جو فٹا جاتے ہیں وہ میں ایک طرف رکھ دیتی ہوں۔"

میں سترہ ہزار روپے لے کر اسپتال کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں میں نے شمس الدین کو کال کر دی کہ میں آ رہا ہوں۔ اس نے بتایا۔ "ڈاکٹر نے اچھو ٹولکلیٹ تیار کر دیا ہے۔ لاش ابھی سرد خانے میں ہے۔ میں بھی وہیں ہوں۔"

"بس میں منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

شمس الدین مجھے سرد خانے کے باہر لے گیا۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے جیسی ہی شلووار نہیں پہن رکھی تھی۔ وہ مجھے سرد خانے میں لے گیا۔ وہاں لورائٹسا کی لاش چھری سل پر پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ پھر رو دیا تھا۔ میں اسے سلی ویتارہا اور میر کی تلقین کرتا رہا۔ پھر میں نے اسے رقم دی۔ "اب تم لیجے گا ڈی ریلیز

کراؤ۔"

"میں ڈاکٹر سے اجازت نامہ لے کر آتا ہوں۔" شمس الدین نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ میں نے اپنا کام کر دیا تھا اس لیے اب میں چلا ہوں۔ اس سے نیاہہ جس کی اور کیا مدد کر سکتا تھا۔ اس لیے میں واپس چل پڑا۔ گھر آ کر زورین کو بتایا تو وہ بھی المردہ ہو گئی تھی۔ اس رات ہم بہت بوجھل دل سے سوئے۔ رورہ کر خیال آ رہا تھا کہ جب جوان لڑکی کی لاش گھر پہنچے گی تو شمس الدین کے گھر والوں پر کیا گز رہے گی؟ اگلے دن بھی میں دفتر جاتے ہوئے المردہ تھا۔ پھر دفتر کی مصروفیت میں ذہن سے نکل گیا اور میں کام کر رہا تھا کہ زورین کی کال آئی۔ وہ یہاں میں تھی۔

"نصرت ہم بے وقوف بن گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ دھوکے باز تھا۔۔۔ میں نے ابھی اخبار میں خبر پڑھی ہے۔ لورائٹسا نامی لڑکی کا سرکاری اسپتال میں کیسٹریک ویز سے انتقال ہوا ہے۔ وہ لاوارث تھی کیونکہ اس کے ورثہ اسے داخل کرا کے غائب ہو گئے تھے اور لڑکی نے جو چاہتا تھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ پولیس تحقیق کر رہی ہے اور لڑکی کی تدفین ایک خیراتی ادارے نے کی ہے۔"

میں نے سر قیام لیا تھا۔ آج کے دور میں کوئی اتنی ویدہ دلیری سے آنکھوں میں دھول بھونک سکتا ہے میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ دفتر سے چھٹی کے بعد میں اسپتال پہنچا تو وہاں تین افراد اور بھی موجود تھے جو اسپتال انتظامیہ سے جھگڑ رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ شمس الدین نامی شخص اس لڑکی کا بھائی بن کر ان سے لاکھوں روپے بھڑ کر لے گیا۔ انتظامیہ کا ایک آدمی ان سے کہہ رہا تھا کہ یہ ان کی غلطی ہے اس میں اسپتال انتظامیہ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لڑکی لاوارث تھی اور شدید بیمار تھی۔ وہ مہینے سے وہ اسپتال میں داخل تھی۔ جھگڑا بڑھ گیا کیونکہ شمس الدین ان لوگوں کو آزادانہ اسپتال میں لا کر لڑکی سے ملو اتار رہا تھا اور یہ اسپتال کے عملے کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا یہ جھگڑا بڑھے گا یا ختم ہو جائے گا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا کیونکہ شمس الدین اپنا کام کر کے چا چکا تھا۔ اب وہ ہمیں نظر نہیں آتا۔ میں شخصہی سانس لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔





محترم معراج رسول!

السلام علیکم!

پرانے کاغذات سے میاں صاحب کا ایک اور واقعہ نکل آیا۔ یہ روشن واقعہ لوگوں کی اصلاح کی خاطر میں بھیج رہا ہوں جو لوگ خدا کے حضور سجدہ کرنے کی بجائے شیطان کو اپنا مددگار بناتے ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو جائے گا۔

مغایت حسین چشتی

(چندر آباد)

بزرگانہ انداز میں مخاطب کیا۔

”خادم کو عبداللہ اللہ کہتے ہیں۔ میں حیدر آباد میں پرانے قلعہ کے قریب بستی میں رہتا ہوں۔“

”میرے پاس آنے کا سبب کیا ہے؟“

”اس سال میں میٹرک کے امتحان دے رہا ہوں

میاں صاحب۔“ اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

”مشتمل امتحان میں بس گرتے پڑتے پاس ہوا تھا اس

لئے آپ دعا کر دیں کہ اب سالانہ امتحان میں ناکامی نہ

ہو۔“ عبداللہ اللہ نے مودبانہ انداز میں درخواست کی ”اگر

ناکام ہو گیا تو پھر تعلیم کا سلسلہ بھی جاری نہ رکھوں گا۔“

”سلسلہ ختم ہو جانے کا کوئی سبب بھی ہوگا؟“ میں

نے اس کے چہرے کو بخور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”میرے سر سے والد صاحب کا سایہ اٹھ گیا ہے

میاں صاحب۔ ماں کے علاوہ ایک دس سال کی بہن بھی

ہے۔“ عبداللہ اللہ نے رک رک کر بات جاری رکھی۔ ”والد

صاحب کے مرنے کے بعد ان کے دفتر والوں نے جو رقم دی

تھی اسی سے اونے پانے گھر کا خرچ چل رہا ہے۔ میں نے

ایک جنرل اسٹور میں شام کے اوقات میں ملازمت کر رکھی

ہے۔ سالانہ امتحان میں پاس ہونے کی صورت میں والد

صاحب کے دفتر والوں نے لکڑی دینے کا وعدہ کیا ہے۔

ناکام ہو گیا تو مجھے جنرل اسٹور پر بیچ سے رات تک ڈیوٹی

دینی ہوگی۔۔۔۔۔ تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں رکھوں گا۔“

”تمہاری بہن کیا کرتی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ وہ

حسب معمول میں مصر کی قنداز سے فارغ ہو کر

حجرے میں داخل ہوا تو سکندر علی وہاں پہلے سے موجود تھا۔

میرا روزمرہ کا معمول بھی یہی تھا کہ جب میں اپنے تخت پر

بیٹھ جاتا تو سکندر علی سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد ہی اس

بات لی اجازت دیتا تھا کہ وہ ضرورت مندوں کو ترتیب وار

انداز میں بھیجا شروع کرے۔

آنے والے حاجت مندوں میں عورتوں کے ضمن میں

میری خاص ہدایت تھی کہ انہیں مطرب سے پہلے فارغ

کر دیا جائے۔ سکندر علی اسی ہدایت کے غائبی نظر مل کرنے کا

عادی تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ گہرے عقیدت مند بھی

سکندر کی عزت کرنے لگے تھے اس لیے اگر کسی مرد کے فیر

پر کسی عورت کو مطرب کے پیشتر فارغ کرنے کی ہدایت کے

غائبی نظر حجرے میں بھیجا جاتا تو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں

کرتا تھا۔

بہر حال، میں نے تخت پر بیٹھنے کے بعد سکندر علی سے

آنے والوں کی تعداد کے بارے میں اور ایک دہائی بات کی

جس کے بعد سکندر علی نے باہر بیٹھک میں جا کر ضرورت

مندوں کو اندر بھیجا شروع کیا۔ پہلا فیر ایک نوجوان کا تھا

جس کی عمر بھی کوئی سترہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ لباس اور

صورت شکل کے اعتبار سے وہ بس اوسط درجے کا نظر آ رہا

تھا۔ حجرے میں داخل ہو کر اس نے مجھے بڑے ادب سے

سلام کیا پھر فرش پر بھیجی ہوئی چاندنی پر بیٹھ گیا۔

”تمہارا نام کیا ہے برخوردار؟“ میں نے اسے



کے اختیار میں نہیں۔۔۔۔۔ ہوتا ہی ہے جو اسے منظور ہو لیکن صدق دل سے جو دعا مانگی جائے وہ بھی اسے قبول کرنے سے گریز نہیں کرتا۔" میں نے عبدالمنان کو سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ "میں تمہیں ایک وظیفہ بتا رہا ہوں، اسے کم از کم چالیس روز تک بلا ناغہ پابندی سے پڑھتے رہنا۔ میں بھی تمہارے حق میں دعا کروں گا۔ خدا نے چاہا تو تمہاری صحت وایمان نہیں جائے گی۔"

"میاں صاحب۔۔۔۔۔" عبدالمنان نے پہلو بدل کر شرمندگی کا اظہار کیا۔ "میں نے قرآنی تعلیم نہیں حاصل کی اس لیے وظیفہ کیسے یاد کروں گا۔"

"یہ بھی انسان کی بد نصیبی ہے کہ وہ دنیا کے پیش و معشر کے لیے تو سارے پاؤں تل لیتا ہے لیکن آخرت کے لیے اس کتاب کو سینے سے نہیں لگاتا جو قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ بہر حال وظیفہ آسان ہے جو تم یاد کر سکتے ہو۔۔۔۔۔ اولاً اور آخر گیا رہ گیا رہ بارود و شریف اور درمیان میں گیا رہ قل ہا رہ" رب زدنی علما (اے رب میرے علم کو زیادہ کر) پڑھنا ہے۔" میں نے عبدالمنان کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ "روز رات کو سونے سے قبل اسے پابندی سے

بھی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔"

"جی نہیں۔۔۔۔۔ حالات کی جھل نے گھر کی چار دیواری تک قید کر رکھا ہے۔" اس بار عبدالمنان نے تھوڑے وقفے سے اپنی کیفیت بتائی۔ "ماں نے کہہ دیا ہے کہ آنے والے وقتوں کے پیش نظر آئندہ کے لیے کچھ رقم بھی جوڑنی ہوگی۔۔۔۔۔ میری ناکامی کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس غریب کو بھی آس پڑوس میں گھر کے اوپر ہی کام کرنے کی ملازمت کرنی پڑے جو میری عزت گوارا نہیں کرے گی اسی لیے کسی کے مشورے پر آپ کی قدم پوسی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ کی نظر کرم ہوگی تو میرا مستقبل بھی سنور جائے گا۔"

عبدالمنان کی مصوم باتیں میرے دل پر اثر کر رہی تھیں۔ سترہ سال کی عمر میں قدرت نے اس غریب کو باپ کے سایہ سے محروم کر کے جن امتحان سے دوچار کیا تھا وہ ہر اعتبار سے ایک آزمائش تھی۔ جبرے میں کچھ دیر خاموشی رہی، میں نے آنکھیں بند کر کے مراقبہ کیا پھر وہ بارہ آنکھیں کھول کر عبدالمنان سے کہا۔

"برخودار۔۔۔۔۔ سادی قانون اٹل ہوتے ہیں۔ لوح محفوظ پر ازل سے جو رقم کر دیا جائے اس کو تبدیل کرنا انسان





پڑھنا۔۔۔ خدا نے چاہا تو وہ تمہیں کامیابی سے ہم کنار کرے گا۔ ایک بات اور یاد رکھو۔۔۔ مجھ سے براہِ مہرے رہنا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں اسے پورا کرنے کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔"

عبدالمنان نے مجھے شکراۃ نظروں سے دیکھا پھر ادب سے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں یہاں چھ مہینے کے لیے عرض کروں کہ مراقبہ کے دوران میں مجھے محض ایک اشارہ ملا تھا کہ عبدالمنان کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی ورنہ۔۔۔ غیب کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں ہوتا۔ جو پیر و فقیر ہو کر بھی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں وہ محض اپنی دکان چکانے کی خاطر ضرورت مندوں کی جیب پر ڈاکا مارتے ہیں۔ قادرِ مطلق ایسے رنگے سیاروں کو بھی معاف نہیں کرے گا جو اس کی مخلوق کو فریب میں جتا کر کے اپنی روزی کھاتے ہیں!

عبدالمنان کے جانے کے بعد دوسرے نمبر پر ایک برقع پوش خاتون نے حجرے میں قدم رکھا۔ مجھے سلام کرنے کے بعد اس نے از خود حجرے کا نقاب الٹ دیا! میں نے ایک نظر دیکھنے کے بعد اس کی عمر کا تخمینہ تیس اور چالیس کے درمیان لگا دیا تھا۔

"کیسے رحمت کی بی بی؟ میں نے اس کے چہرے کے بعد حسب معمول تمام انداز میں سوال کیا۔

"جلی بات یہ عرض کروں میاں صاحب کہ میں حیدر آباد کی رہائشی نہیں ہوں۔" اس نے سنبھل سنبھل کر گفتگو شروع کی۔ "بھل آواز سے آئی ہوں۔ کسی نے یہی کہا تھا کہ بس آپ تک پہنچ جاؤں تو میری ساری پریشانی دور ہو جائے گی۔"

"ہر حاجت مند یہی کہتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہوتا ہی ہے جو شیتِ ایزدی کو منکور ہے؟ میں بھی اسی کے دربار سے ہاتھ جوڑ کر مانگتا ہوں۔ اس کی مرضی جسے چاہے لو! دے۔"

"لب میں اتنی دور سے آپ کے در سے آس لگا کر آئی ہوں تو خالی ہاتھ نہیں جاؤں گی۔ خاتون جنہوں نے میرے در یافت کرنے پر اپنا نام حسہ بی بی بتایا تھا پہلو بدل کر اپنی لہرت کا اظہار کر دیا۔ "اللہ کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے۔ آپ میرے حق میں دعا کرنے کی خاطر جو نذرانہ طلب کریں گے میں اس سے زیادہ بھی دے سکتی ہوں۔"

"ایک بات میری بھی من لو حسہ بی بی۔" میں نے

پہلو بدل کر بے حد صاف گوئی سے عرض کیا۔ جس کام کی بنیاد لائی سے وابستہ ہو وہ کسی حسبِ توقعی پورا نہیں ہوتا۔ نذرانہ کے بارے میں تم سے جس نے کہا ہے، ملا بی بی کی ہے، لیکن دین کا کام محض دنیا میں ہوتا ہے۔ اس کے دربار سے مانگنا ہے تو پھر دل کے سارے میل دور کرنے پڑتے ہیں۔ دیا کا دی کسی کام نہیں آتی۔"

"میں معافی چاہتی ہوں میاں صاحب۔" حسہ نے بات بدلنے کی کوشش کی۔ میں نے نذرانہ کی بات اس لیے کی تھی کہ کسی کا مقصد پورا ہو جائے تو بعد میں غمِ فرا میں نذر و نیاز بھی دی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایسا دستور ہے۔"

"میرے پاس وقت کم ہے حسہ بی بی!" میں نے اس بار قدرے بے رنگی سے کہا۔ "باہر بیٹھک میں اور بھی حاجت مند اپنی باری کے منتظر ہوں گے۔ تم کل کر اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔"

"مجھ سے کوئی بھول ہو گئی تو معاف کر دیں میاں صاحب۔" حسہ ایک دم ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ "میں پہلے ہی نصیبوں میں تھی ہوں۔ آپ نے بھی نظریں پھیر لیں تو بالکل ہی در بدر ہو جاؤں گی۔ قادرے بھی لات مار کر الگ کر دے گا۔"

"یہ قادرے کون ہے؟" حسہ سوچ کی طرح نرم پڑ گئی تو میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"نام تو اس کا قدیر احمد ہے لیکن پیار سے سب اسے قادرے ہی کہتے ہیں۔" حسہ نے کسمسہ کر اپنی جتا کا آغاز کیا۔ "چار سال پہلے میری مالا جیتا تھا لیکن اب ایسی آنکھیں دکھاتا ہے جیسے سارا قصور میرا ہو۔ آپ ہی بتائیں میاں صاحب۔۔۔ اگر قدرت ہی کو مشکور نہ ہو تو پھر میں فریب کیا کر سکتی ہوں۔"

حسہ روانی میں اپنا جملہ کہہ گئی جب احساس ہوا تو نظریں جھکا لیں۔ میں اس کے آنے کا مقصد سمجھ گیا۔

"قدیر احمد کرتا کیا ہے؟" میں نے دیدہ و دانستہ ایک قانونی سوال کر لیا۔

"جدی پستی ٹھیکیدار ہے۔" حسہ نے کسمسا کر کہا۔ "اوپر والے نے بھی چھیڑ چھاڑ کر دے رکھا ہے مٹی کو بھی ہاتھ لگاتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے اس کے کارندے دن بھر خون پینا ایک کرتے ہیں۔ خود وہ شام ڈھلے حویلی نما مکان کے سامنے نیم کے جھاڑتے تخت پر لو لہوں کی طرح بیٹھ کر دن بھر کا حساب کرتا ہے۔ ایک ایک پیسے پر نظر رکھتا ہے۔ کسی کی



رکاوٹ کیا تھی؟ اس بارے میں مجھے کوئی واضح اشارہ نہیں ملا تھا۔

اس رات میں سونے کے لیے لیٹا تو سکندر علی حسب معمول میرے لیے پانی کا جگہ لودر گلاس رکھنے کی خاطر آیا۔ یہ اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے آنکھیں موند لیں، کچھ دیر تک میں حنہ بی بی کے بارے میں طے والے اشاروں پر غور کرتا رہا۔ خاص طور پر میرا ذہن اس رکاوٹ کے لیے جتنی گھوڑے دوڑاتا رہا جس کی وجہ سے حنہ اور اس کے شوہر کی خواہش پوری نہیں ہو رہی تھی لیکن کوشش بسا اے کے باوجود جب کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکا تو میں نے جتنی بچھا کر سونے کا ارادہ کیا اسی تھا کہ ایسا محسوس ہوا جیسے خواب گاہ میں کوئی ذی نفس بھی موجود ہے۔

فوری طور پر میرے ذہن میں ارسلان نامی جن کا خیال ابھرا جو دہلی والے حضرت خواجہ کے حوالے سے بھی اکثر بیشتر میرے کام آتا رہتا تھا۔ اس وقت وہ جس حصہ میں تھا اس میں بارہا آچکا تھا اس لیے میں نے مسکرا کر حسب معمول بڑی اہمیت سے دریافت کیا۔ "اس وقت کیسے صحت کی برخوردار؟"

"سب سے بیشتر اس بات کی معذرت چاہوں گا محترم کہ اس وقت نکل ہوا۔" ارسلان نے ادب سے جواب دیا پھر مسکرا کر بولا۔ "میں یہ محسوس کر کے آیا ہوں کہ شاید آپ کو خا کسار سے کوئی خدمت درپیش ہو؟"

"میں انکار نہیں کروں گا برخوردار۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔ "ایک گھی ہے جو وہ رہ کر ذہن میں الجھ رہی ہے۔"

"سمجھ گیا۔ آپ شاید حنہ بی بی اور تقدیر احمد کے بارے میں دریافت کرنا چاہتے ہیں۔" ارسلان نے سمجھدگی سے کہا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس شخص میں خادم صرف یہی کہہ سکتا ہے کہ حنہ کو جو مشکل درپیش ہے اس میں حنہ بی بی سے زیادہ تقدیر احمد کی ایک لفظی کو مدخل ہے جو راستے کی رکاوٹ بن گئی ہے۔"

"اس لفظی کی کوئی تفصیل بھی ضرور ہوگی۔۔۔۔۔؟"

"جی ہاں لیکن آپ جانتے ہیں کہ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جس کے سلسلے میں ہمیں ضرورت سے زیادہ زبان کھولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

"تمہارے اس جواب سے میں کیا نتیجہ اخذ کروں؟"

بھول چک بھی صاف نہیں کرتا اور۔۔۔۔۔"

"تم بتا رہی تھیں کہ چار سال سے تقدیر احمد تمہاری مالا جیتا تھا۔" میں نے اصل مقصد کی طرف اس کی توجہ مبذول کرائی تو سنبھل کر بیٹھ گئی۔ نظریں جھکا کر دہلی زبان میں اپنے آنے کا دعائیں بیان کر دیا۔

"قادرے سے میری شادی کو چار سال ہو گئے میاں صاحب لیکن ہماری بکیتی پوری نہیں ہوئی۔ اسی لیے آپ کی چوکت پر بڑی آس لگا کر آئی ہوں۔"

"کسی دانی یا لڑکی ڈاکٹر سے بھی رجوع کیا ہوگا؟"

"سارے جن جن کر چکی ہوں لیکن شاید نئی چھتری والے ہی کو۔۔۔۔۔"

"نہیں بی بی۔۔۔۔۔ نہیں" میں نے حنہ کو لوکا۔ "اس کے نظام میں کبھی کوئی بھول یا کمی نہیں ہوتی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس کے حکم کے بغیر کوئی سوکھا پتا بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتا۔"

"میں نے بھی قادرے کو یہی سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کشور کے دل میں بارود ستوں نے یہ بات بیخدا دی کہ میرے اندر ہی کوئی کمی ہے۔" حنہ نے عاجزی کا اظہار کیا۔ "دو چار گھر کی عورتیں بھی اپنی لڑکیوں کے ہاتھ پہلے کرنے کی خاطر قادرے پر نظریں جمائے بیٹھی ہیں۔ آج میرا کاٹھا درمیان سے نکل جائے تو کل وہ قادرے کو رشتہ دینے میں دیر بھی نہیں کریں گی۔"

"میں تمہاری بھوری سمجھ گیا ہوں بی بی۔" میں نے حنہ سے بھوری کا ہر کرتے ہوئے تسلی دی۔ "تم اپنی دودھ سے چل کر آئی ہو تو میں تمہیں خالی ہاتھ واپس بھی نہیں لوٹاؤں گا۔ آج منگل ہے اور تمہارا مطلوبہ تعویذ میں جھرات کو تیار کروں گا۔ تم جود یا سیکر کو کسی وقت بھی آکر لے جانا لیکن ایک بار پھر یہ یاد کرو کہ وہاں ہی ہے جو قدرت کو منظور ہوا اس لیے تم بھی اللہ سے نہایت عاجزی اور اکساری سے ہاتھ اٹھا کر برا بدعا مانگتی رہنا۔"

حنہ چلی گئی تو میں نے سکندر علی کو بلا کر دوسرے ضرورت مندوں کو بلائے کو کہا۔۔۔۔۔ یہاں ایک بات یہ بھی عرض کروں کہ حنہ کی موجودگی میں، میں نے اس کے بارے میں مراقبہ بھی کیا تھا۔ جو اشد سے طے وہ بھی یہی تھے کہ حنہ بی بی اور اس کی اولاد کی خواہش کے درمیان کوئی ایسی رکاوٹ ضرور تھی جس کے درمیان سے ہٹ جانے کے بعد ہی اس کی اور تقدیر احمد کی خواہش پوری ہو سکتی تھی۔۔۔۔۔"



”حضرت خواجہ کی جوتیوں کے خیل مجھے جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کے پیش نظر فی الحال یہی عرض کروں گا کہ آپ حسد کو اس کی خواہش کے مطابق تعویذ لکھ دیں یہ بھی تاکید کر دیں کہ قدرِ احمد کو اولاد کے سلسلے میں کسی خوشخبری کے لیے چار پانچ ماہ انتظار کرنا لازم ہے اور اس عرصہ میں وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گا۔“

”غلط قدم سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں نے وضاحت چاہی تو ارسلان نے کچھ توقف سے دہلی زبان میں پھر اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایک تعویذ قدرِ احمد کے سلسلے میں بھی لکھ کر حسد بی بی کے حوالے کر دیں۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دیں کہ وہ پانی یا شربت میں گھول کر شہر کو اس طرح پلا دے کہ اسے پتا بھی نہ چلے ورنہ سارا کھیل خراب ہو سکتا ہے۔“

”اوہ۔۔۔“ میں نے ارسلان کی جوتی پر ایک نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا ”گو یا جو غلطی حسد کے آڑے آرہی ہے اس کا کچھ نہ کچھ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔“

”ہو بھی سکتا ہے۔۔۔“ ارسلان نے اس بار بھی کل کر جواب دینے سے گریز کیا تو میں نے دوسرے رخ سے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے میں تمہاری جوتی اور قدرِ احمد کے لیے بھی ایک موثر تعویذ لکھ دوں گا لیکن تم حسد کے سلسلے میں کیا کہو گے؟“

”میں سمجھا نہیں یہاں صاحب۔۔۔“ ارسلان چمکا۔  
”میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ جو غلطی قدرِ احمد سے سرزد ہوئی، کیا کسی نہ کسی زاویے سے حسد بھی اس کی ذمہ دار ٹھہر سکتی ہے؟“

”حضرت خواجہ کی خاص نظرِ کرم آپ پر ہے تو پھر میری کیا حقیقت؟“ ارسلان نے بڑی انکساری سے مگر سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ویسے یہ بات دنیا جانتی ہے کہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بچتی۔“

میں ارسلان کی مجبوری کے علاوہ اس کے جوابات پر بھی بطور خاص غور کر رہا تھا چنانچہ جب اس نے ایک ہاتھ سے تالی نہ بچنے والی مثال کے ساتھ حضرت خواجہ کا حوالہ بھی دیا تو مجھے تعجب ہونا قدرتی امر تھا اس لیے کہ مراقبہ کے بعد مجھے جو اشارے ملے تھے اس میں کم از کم ایسی بات واضح طور پر نظر نہیں آتی تھی جس کی بنیاد پر میں حسد کے کردار میں کوئی عیب محسوس کر سکتا، میں اسی نکتے پر غور کر رہا تھا جب

ارسلان نے دبے لہجے میں کہا۔  
”خاکسار کا وہ مطلب نہیں تھا میرے محترم جو آپ کے ذریعہ غور ہے۔ مرد اپنی برتری کے احساس کی وجہ سے عورت کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیتا۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ جس عورت کو دل و جان سے چاہے اور اس کے حسن پر فریفتہ ہو تو درگزر سے بھی کام لیتا ہے لیکن عورت کی زبان اگر تیز سے تیز تر ہوتی جائے تو مرد کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو کر پھٹک بھی جاتا ہے۔ حسد کے سلسلے میں بھی اس کی زبان اور بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے کا کچھ مسئلہ درپیش تھا جس کو قدرِ احمد سال دو سال سے برداشت کرتا رہا۔۔۔ پھر جو کچھ درمیان میں آڑے آئی اس کی بنیاد سے قاعدہ اٹھا کر کسی نے ایسی ڈگڈگی بھائی کہ سب ہی بے بس ہو کر رہ گئے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بھی یقین ہے کہ آپ نے اگر خدا کے حکم سے نظرِ کرم کر دی تو حسد کی ابھی ذمہ داری سنبھل جائے گی۔“

کچھ دیر بعد ارسلان چلا گیا تو میں نے حق بھائی پھر کروٹ لے کر آنکھیں سوندھ لیں۔ یہ بھی عرض کروں کہ ارسلان کے جانے کے بعد بھی حسد بی بی کا مسئلہ خاصی دیر تک میرے ذہن میں چکراتا رہا۔ خاص طور پر جو اشارے دہلی زبان میں ارسلان نے دیئے تھے وہ بھی میری رہنمائی کے لیے یقیناً مفید تھے لیکن ایک اہم بات جو میرے لیے بطور خاص قابلِ توجہ تھی وہ اس فریق کی تھی جس نے قدرِ احمد اور حسد بی بی کے درمیان ہونے والی رسائی سے قاعدہ اٹھا کر ڈگڈگی بھائی شروع کر دی تھی۔ ارسلان نے ڈگڈگی کا حوالہ بھی ایسے انداز میں دیا تھا جس کے کئی پہلو نکلتے تھے۔ بہر حال خاصی دیر تک ان ہی باتوں پر غور کرتے کرتے میں سو گیا۔

میں نے حسد بی بی کو تعویذ کے سلسلے میں جمعہ یا منیچر کو آنے کا کہا تھا لیکن جب وہ نہیں آئی تو میرے ذہن میں یہی خیال ہوا کہ یا تو قدرِ احمد آ کر اسے سمجھا بجا کر لے گیا ہے یا پھر اس نے جبر و فقیر کے پکڑوں میں وقت خراب کرنے کی بجائے کسی اور راستے پر قدم اٹھانے کی ٹھان لی ہے۔ میں نے بہر حال حسبِ وعدہ اس کے لیے ایک آزمودہ تعویذ حضرت کو مشاء کی نماز کے بعد لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔

اس دن اتوار تھا۔ میں ناشتے سے فارغ ہو کر حسبِ معمول دروازے میں آ کر بیٹھا تو کچھ دیر بعد سکندر علی بھی آ گیا۔ میں اخبارات کی الم نظم خیریں پڑھنے کا عادی نہیں تھا



خاموشی کو غالباً نیم رضا مندی جان کر پوچھا تو میں نے ہاں  
ناخواستہ اثبات میں سر ہلادیا۔

پھر وہ منٹ بعد میں نے جبرے میں قدم رکھا تو حنت  
بی بی، میری خطر میں نے سمجھ گئی سے اسے قاطع کیا۔

"بی بی!۔۔۔ میں اتوار کے دن کسی سے نہیں ملتا  
اور۔۔۔ تمہیں میں نے بعد پانچ بجے کو آنے کی تاکید کی تھی۔"

"میں ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتی ہوں میاں  
صاحب۔" حنت بی بی نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے

ہوئے اتوار کے دن آنے کی وضاحت بھی کر دی۔ "کچھ  
ضروری باتیں تھیں جو میں۔۔۔ آپ کو تفصیل سے بتانا چاہتی

تھی اس لیے آج ہی آئی اگر آپ ناراض ہوتے ہیں تو پھر  
کل۔۔۔"

"اب آگئی ہو تو میں تمہیں خالی ہاتھ واپس بھی نہیں  
کر سکتی گا۔" میں نے تیار شدہ تعویذ اس کے حوالے کرتے

ہوئے کہا۔ "اس کو اگر ممکن ہو تو کسی ہرے بھرے تیار  
درخت کے نیچے اس طرح دبا دینا کہ نہ کسی کی نظر پڑے نہ

یہ ہے حنت بی بی! اگر آپ اندیشہ ہیں۔"

"جیسا آپ کا حکم ہے ویسا کروں گی میاں  
صاحب۔"

پہلا تعویذ حنت بی بی کے حوالے کرنے کے بعد میں  
نے دوسرا تعویذ نکالا جو ارسلان کے اشارے پر قدر احمد

کے لیے تیار کیا تھا "یہ ایک اور تعویذ ہے جو میں نے خاص  
طور پر قدر احمد کے لیے لکھا ہے۔ میں نے ہدایت کی۔ اسے

پانی یا شربت میں گھول کر اس طرح اسے پلا دینا کہ اسے کسی  
قسم کا پتا نہ ہو۔"

"یہ کام بھی میں آسانی سے کر لوں گی میاں صاحب  
لیکن۔۔۔ کچھ باتیں اور ہیں جو میں آپ کو تفصیل سے بتانا چاہتی

ہوں۔ اسی لیے اتوار کے دن آپ کو زحمت دینے آئی  
ہوں۔"

"تم شاید یہ بتانا چاہتی ہو کہ گزشتہ دو سال سے قدر  
احمد اور تمہارے درمیان پیدا ہونے والے کھنڈ کی کیا وجہ

ہے؟" میں نے ارسلان کی گول مول باتوں کی روشنی میں  
ایک ممکنہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے حنت بی بی کو متاثر کرنے کی

خاطر کہا۔ "کوئی فرق ہے جو تم دونوں کے درمیان آڑے  
آگیا ہے؟"

"آپ نے اصل بات کی جڑ کو پکڑ لیا ہے میاں  
صاحب۔" حنت بی بی نے چونک کر جواب دیا پھر اپنی نفرت

اس لیے سکندر علی نے بطور خاص از خود اتوار کے دن مجھے  
پہلے ملنے کی خاص خاص خبریں سنانا اپنا معمول بنالیا تھا۔

جتنی دیر وہ خبریں سنانا رہتا میں آگن میں ہی کیاری کے  
پودوں کو دیکھتا رہتا۔ وہ کیاری بھی سکندر علی نے ہی بنائی

تھی۔ ان کو پانی دینا اور تراش تراش کا سارا کام بھی وہی  
حد دیکھتا سے کرتا تھا۔ ان پودوں میں خاص طور پر موتیا کا

پودا تھا جس کی تیل اب منڈ پر تک پہنچ گئی تھی۔ موسم کے  
اعتبار سے اس میں کلیاں بھی پھوٹنے لگی تھیں۔ میری نظریں

اس وقت بھی اسی پودے پر مرکوز تھیں جب کسی نے  
دروازے پر دستک دی۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اتوار کے دن میں کسی  
ضرورت مند سے نہیں ملتا تھا۔ یہ بات میرے عقیدہ مندوں کو

معلوم تھی۔ چنانچہ دستک کی آواز پر سکندر علی کے علاوہ میں  
بھی چونکا۔ ایک خیال یہ بھی گذرا کہ ممکن ہے کہ میرے

پڑوسی افضل احمد جو پختہ دو پختہ میں ایک آدمہ چکر ضرور  
لگاتے تھے۔ ان سے میری یاد اللہ کی ایک خاص چیز بھی لگی

کہ ان کے گھر پر فون موجود تھا جس سے میں بھی بھیجی  
استقارہ کر لیا کرتا تھا۔ کبھی کوئی خاص آدمی مجھے فون کرتا تو

افضل احمد کا بیٹا امیر مجھے بلانے آ جاتا۔ ہاپ بیٹے دونوں  
میں نہ صرف نہایت مہذب اور منساہ تھے بلکہ چھری و دوگی

میں بھی ہر طرح سے میری دیکھ بھال کا پورا خیال رکھتے  
تھے۔

"اس وقت کون آگیا؟" سکندر علی نے اٹھتے ہوئے  
کہا پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ "کیا حکم ہے میاں جی کوئی

ضرورت مند ہوتا ہے ناں دوں۔۔۔؟"

"دیکھ لو کون ہے؟" میں نے جمیدگی سے کہا۔ "اگر تم  
سمجھو کہ وہاں کسی کو ہے تو اسے اندر ہی بلا لینا۔"

سکندر علی چلا گیا تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ دو منٹ کے  
بعد اس نے واپس آ کر مجھے حنت بی بی کے آنے کی اطلاع

دی تو میں ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گیا۔ کار میں کو بھی یہ بات  
بخوبی معلوم ہے کہ میں جبرے میں بھی خواتین کو اول وقت

میں فارغ کر دینے کا عادی تھا۔ پہلے بھی میں نے کسی خاتون  
کو گھر بلانے یا آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ بہر حال حنت

بی بی کے سلسلے میں چونکہ ارسلان بھی مجھ سے رابطہ کر چکا تھا  
اس لیے میں نے فوراً ہی کوئی فیصلہ جلد بازی میں نہیں کیا۔

"وہ تمہارا آگیا ہے میاں جی اس لیے اگر آپ اجازت  
دیں تو مجھ کو مل کر ادھر ہی بیٹھا دوں۔" سکندر علی نے میری



کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ”اس جذبات نئے کا نام نور جمال ہے لیکن قادرے سے بڑے لالہ سے نور جمال کہہ کر لگاؤ کی باتیں کرتا ہے۔“

”یہ نور جمال غالباً تمہارے قادرے کی کوئی قریبی عزیز ہے؟“

”نہ ہوتی تو میرے سامنے بیسی نکال کر قادرے سے کوئی گل بات کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی تھی۔“ اس بار حسہ بی بی نے اپنی زبان کی تیز طراری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ ”قادرے کی خالہ کی بیٹی نہ ہوتی تو میں اس حرافہ کی منڈیا اپنی جوتیوں تلے رگڑنے میں دیر بھی نہ کرتی۔۔۔۔۔ ساری جوانی کا نشہ نکال کر کھدوتی اس کی پھٹکی پر۔“

”میری بات ہے حسہ بی بی۔“ میں نے اسے سرد لاش کی۔ اپنی زبان پر قابو رکھنے کی عادت ڈالو۔ تم نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ کسی عورت کی زبان سے بھلے نہیں کہتے۔“

”مم۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ میں معافی چاہتی ہوں میاں صاحب لیکن وہی بس کی گاتھ بھی ہے۔“

”ایک بات نور معلوم کرنا چاہوں گا۔“ میں نے ارسلان کی گھٹی ہوئی باتوں کی روشنی میں حسہ بی بی کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر بے حد عجیبی سے دریافت کیا۔ ”کیا تم نے قدیم احمد کو اپنے قابو میں کرنے یا نور جمال اور اس کے درمیان جدائی پیدا کرنے کی خاطر کسی تعویذ گنڈے کرنے والے سے بھی رابطہ قائم کیا تھا؟“

”میں انکار نہیں کروں گی۔“ حسہ بی بی نے کچھ توقف سے بدستور ہر بھرے لہجے میں اقرار کیا۔ ”اے سہاگ کو برقرار رکھنے کی خاطر میں نے جو جن کیسے وہ نیلی پھتری والا بھی جانتا ہے۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ پہل میں نے نہیں کی تھی۔ فلیٹے اور تعویذ گنڈوں کا کام بھی پہلے نور ہالویا اس کے گھر والوں نے شروع کیا تھا۔۔۔۔۔ میں خاموش بیٹھی تماشا دیکھتی رہتی تو شاید وہ کم ذات لوگ کامیاب بھی ہو جاتے۔“

”قسمت میں ایک بار کا جب تقدیر کی جانب سے جو رقم کروایا جائے وہ اٹل ہوتا ہے۔ کوئی تعویذ یا گنڈا کسی کام نہیں آتا۔“

”میاں صاحب۔۔۔۔۔“ میرا جواب سن کر حسہ بی بی نے اپنی تاخیر پکاری کی بناء پر بی زبان میں کہا۔ ”اگر پورے والے کا کھانا اٹل ہے تو پھر آپ کے تعویذ بھی کیا کر سکیں گے؟“

”میرے تعویذ اور دعا نہیں ٹیک مقصد اور صرف اور صرف اس ذوالجہل والا کرام کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہوتے ہیں بی بی۔۔۔۔۔ اس کے عوض میں کسی سائل کے سامنے ہاتھ بھی نہیں پھیلاتا۔۔۔۔۔“ اس بار میں نے قدرے خشک لہجہ اختیار کیا۔ ”تم نے بھی پہلی ملاقات میں یہی کہا تھا کبھی کسی بزرگ یا اللہ والے کو خریدنے کی بھول نہ کرنا۔“

جواب میں حسہ بی بی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”میں ایک بار پھر معافی کی درخواست کروں گی میاں صاحب۔ آپ بس کچھ ایسا کرویں کہ میرا قادرے مجھے واپس مل جائے۔۔۔۔۔ اس کے سوا مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔۔۔۔۔“

”اس کے لیے تمہیں خدا پر توکل کرنا پڑے گا جو سزا اور جزا کا مالک ہے۔ صبر و ضبط اور برداشت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔“ میں نے حسہ بی بی کی آنکھوں کو نشانہ بناتے ہوئے دیکھ کر قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”اس مالک دو جہاں نے بندوں کی قسمت میں جو لکھ دیا وہی اٹل ہے۔ انسان زندگی میں جو عمل کرتا ہے اس کا مکمل اختیار بھی اسے محض اس لیے دیا گیا ہے کہ قدرت کو اس کی آزمائش مقصود ہے۔ نیکی اور بدی کے فرشتے شب و روز ہماری ایک ایک نفل و حرکت بلا کم و کاست رقم کرتے رہتے ہیں۔ اسی کی روشنی میں ہر روز قیامت جنت و جہنم کا فیصلہ بھی صادر ہوگا۔ دنیا میں جو نا عاقبت اندیشی ہو و فقیر اور تعویذ گنڈا کرنے والے تقدیر کے لکھے کو بدلنے کا دعویٰ کرتے ہیں ہر روز قیامت ان کا انجام بھی قابلِ عبرت ہوگا اس لیے اب تم تعویذ گنڈوں کے لیے ان لوگوں سے دور رہو جو محض دولت پسند کے لیے اپنی طاقت کے ساتھ ساتھ بے گناہ ضرورت مندوں کو بھی فریب میں مبتلا کرتے ہیں۔ اپنی زبان پر بھی قابو رکھنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔ خدا نے چاہا تو تمہاری سربراہی ضرور پوری ہوگی۔ اس لیے کہ اس کے ہاں دیر ہے لیکن اندھیر نہیں ہے۔“

”آپ نے جیسا کہا ہے اب میں ویسا ہی کرنے کی کوشش کروں گی۔“ حسہ نے مجھ سے وعدہ کیا پھر دونوں تعویذ لے کر رخصت ہو گئی۔ جاتے جاتے میں نے احتیاطاً حسہ بی بی کو اپنا ہاتھ کھوا دیا۔ یہ تاکید بھی کرائی کہ اگر کوئی قابلِ ذکر بات ہو تو وہ مجھے فوری طور پر بذریعہ ڈاک آگاہ کر دے۔۔۔۔۔ ۱۱

دوسرے روز سے میں حسبِ معمول اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ خدا کے فضل و کرم سے میرے حجرے میں روزانہ پندرہ بیس حاجت مند آتے جاتے ہیں اس لیے ہر



قابل ذکر بات میرے علم میں نہیں آئی جسے بیان کرنا ضروری ہے لیکن اس کے بعد حالات نے عجیب انداز میں جو رخ اختیار کیا اس کی تفصیل بھی ضروری ہے۔

اس روز مغرب کی نماز میں نے حسب معمول اپنے حجرے میں ادا کی۔ نماز کے دوران میں سکندر علی اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ میری عبادت میں کوئی غلطی نہ پیدا ہو..... نماز ادا کرنے کے بعد میں اٹھا تو حجرے میں ایک بوڑھا شخص اس انداز میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ اس کا چہرہ واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ سکندر علی نے اس سائل کو کب اور کن حالات میں آنے کی اجازت دی مجھے اس کا مطلق علم نہیں تھا۔ میں نے براہ راست اس بوڑھے کو مخاطب کرنے کے بارے میں سوچا ہی تھا کہ اس نے چہرہ اٹھا کر بڑی مصیبت سے کہا۔

”میرے محترم..... میں ادھر سے گزر رہا تھا تو خیال آیا کہ کچھ وقت آپ کی صحبت میں بھی گزار لوں۔ آپ اپنا کام جاری رہیں۔ میں چل ہونے کی گستاخی نہیں کروں گا۔“

”میرے خوردار.....“ میں نے ارسلان کو پہچان کر کہا۔

تمہاری آمد بھی خالی از حیت نہیں ہوتی، خاص طور پر حجرے میں تم جب بھی آتے ہو اس کی پشت پر کوئی نہ کوئی مستند ضرور ہوتا ہے جو میری رہنمائی بھی کرتا ہے۔“

”آپ مجھے گنہگار کر رہے ہیں میرے عزیز.....“

ارسلان نے انکساری سے جواب دیا۔ ”چہ نسبت خاک رہا عالم پاک“

ارسلان سے ایک دو بات کرنے کے بعد میں نے سکندر علی کو بلا کر حاجتمندوں کو حجرے میں بلانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس بار پہلے نمبر پر جو شخص امداد آیا وہ ادھیڑ عمر کا تھا۔ حجرے میں آنے کے بعد اس نے مجھے سلام کیا پھر میرے قدموں کو ہاتھ لگانے کے ارادے سے آگے بڑھا تو میں نے اسے روک کر بیچدگی سے ہدایت کی۔

”میں فیضول دسموں سے پرہیز کی عادت ڈالیں جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔“

آنے والا جس نے بعد میں اپنا نام نوازش علی بتایا تھا خلیفہ ساہوکر میرے سامنے چاندنی پر بیٹھ گیا۔

”میں معافی چاہتا ہوں بزرگ.....“ اس نے دوبارہ انکساری سے کہا۔ ”آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔“

”فرمائیں.....“ آپ نے اس وقت میرے پاس آنے کی زحمت کیسے کی؟“

ایک کو یاد رکھنا بھی میرے لیے ممکن نہیں ہے البتہ کچھ معاملات ایسی خاص نوعیت کے ہوتے ہیں جو ذہن میں نہیں نہ کہیں اپنی جگہ بھی بناتے ہیں۔ میں بطور خاص قارئین کے لیے بھی عرض کر دوں کہ میرے حجرے تک جو لوگ آتے ہیں ان میں ہر کوئی کھرا سکھ نہیں ہوتا۔ یہ بھی انسان کی فطرت ہے کہ وہ خود کو ہمیشہ مظلوم سمجھتا ہے اور دوسرے فریق کو ظالم ظاہر کرنے کی خاطر تصویر کا ایک ہی رخ پیش کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی خاطر وہ کتر بیعت کرنے سے پرہیز بھی نہیں کرتا۔ جملہ لادود نمبر کے حامل ایسے لوگوں کی حجامت اٹے استرے سے کرنے کے لیے سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو ان کا گزارا بھی نہ ہو۔

قسمت کا حال تو خدا کے سوا اور کسی کو نہیں معلوم ہوتا لیکن خدا کا کرم ہے..... بزرگوں کی صحبت اور حضرت خواجہ کی جوتیوں کی طفیل مجھے کشف اور مراقبے کے ذریعے ہر آنے والے کے حالات کا قہوڑا بہت کم ضرور ہو جاتا ہے۔ میں اس اصلیت کا اقتدار کر کے کسی سائل کو شرمندہ نہیں کرتا۔ اصل صورت حال کو فحش بجا کر دیکھ لینے کے بعد ہی کوئی ایسا قدم اٹھاتا ہوں جو روز قیامت خدا کے حضور میری بکرا کا باعث نہ بنے۔ اس ضمن میں مجھے ارسلان جن کی حمایت بھی حاصل تھی جو حضرت خواجہ کے اشارے پر اکثر دین شریعت میرے کام آتا رہتا تھا۔ اسی نے مجھے اس اہم بات سے آگاہ بھی کیا تھا کہ حسہ بی بی اور قدیر احمد کے درمیان دوسرے کسی کی ایک وجہ خود حسہ بی بی کی زبان تھی۔

قدیر احمد کے بارے میں حسہ بی بی نے جو تفصیل بتائی تھی اس کے مطابق وہ خاصہ دولت مند تھا چنانچہ اس کی خالہ نے حالات سے فائدہ اٹھاتے اور اپنی جینی ٹور بھال کا مستقبل بنانے کی خاطر ایک طرف بی بی کو قدیر احمد سے کھلنے ملنے کا اشارہ کیا۔ دوسری طرف اس نے کسی تعویذ گنڈا کرنے والے سے رابطہ کر کے حسہ بی بی اور قدیر احمد کے درمیان مستقل جدائی کے اوجھے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیے جس کو بہر حال نیک قدم نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہ بھی اس کا درمطلق کرم تھا جو حسہ بی بی اور قدیر احمد کے درمیان جدائی کی نوبت نہیں آسکی تھی۔ میں نے جو تعویذ حسہ بی بی کو دیا تھا وہ بھی سماں بیوی کے درمیان پیدا ہونے والی خلاء کو چھڑ کرنے اور قائم و دائم رکھنے کی خاطر دیا تھا۔

حسہ بی بی کے جانے کے تقریباً چار ماہ تک کوئی ایسی



"ایک کام الجھ گیا ہے بزرگو۔۔۔ ضرور خند ہوں اس لیے رات تلاش کرتے ہوئے آپ کے حجرے تک بھی پہنچ گیا۔"

"شکل پوری کرنا خداوند کریم کا اختیاری کام ہے۔۔۔ بندہ صرف دعا کر سکتا ہے۔"

میرا جواب سن کر اس نے پہلو بدلا پھر دہلی آواز میں بولا۔

"میری ایک ہی بیٹی ہے بڑے صاحب، ہم نے اسے بڑے لاڈ پیار سے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ اب خدا کے فضل سے اس کے ہاتھوں میں مہندی رہ جانے کا وقت بھی آ گیا ہے لیکن۔۔۔ ایک شکل درمیان میں آڑے آرہی ہے۔"

"کچھ مالی پریشانی یا کوئی اور بات ہے؟"

"اللہ کا دیا سب کچھ ہے بزرگو۔۔۔ اس کی ماں نے تھوڑا تھوڑا جوڑ کر سارا سامان بھی تیار کر رکھا ہے۔" نوازش علی نے رک رک کر دوبارہ بات شروع کی۔ "رشتہ بھی خاندان میں موجود ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرنے لگے تھے لیکن ایک کالی بلی راستہ کاٹ رہی ہے۔ آپ ایسا تعویذ عطا کر دیں کہ ساری رکاوٹیں درمیان سے ہٹ جائیں۔"

"کالی بلی سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ہے ایک آفت کی پرکالہ جو ہماری مصوم بیٹی اور لڑکے کے درمیان آنے کی خاطر سادے چٹن کر رہی ہے۔"

نوازش علی نے بڑی عاجزی سے استدعا کی۔ "آپ کوئی تعویذ دیں یا ایسا عمل کر دیں کہ اس کا خنا درمیان سے نکل جائے۔"

"میں معذرت خواہ ہوں نوازش علی۔" میں نے نہایت صاف گوئی سے کہا۔ "میں دونوں کے درمیان ہدائی والے کا عمل نہیں کرتا۔"

"ہدائی والے میں پہل تو دوسری لڑکی نے کی ہے بڑے صاحب۔ میں دو چار چوکنوں پر اور بھی ہاتھ پھیلا کر آچکا ہوں۔ سب نے ایک ہی بات کہی ہے کہ دوسری لڑکی نے کوئی ایسا عمل کر لیا ہے کہ لڑکے کا دل میری بیٹی کی طرف سے اچاٹ ہو گیا۔"

"اگر دوسروں نے ایک بات کھل کر کہی ہے تو پھر تم ان ہی سے طال مل کا توڑ کیوں نہیں کراتے؟"

"لن کا مطالبہ پورا کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔" نوازش علی نے اپنی تنگ دامنگی کا اظہار بڑے دل گرفتہ انداز میں کیا۔ آپ کے پاس یہ سن کر آیا ہوں کہ آپ نہ صرف خدا کے نیک بندے ہیں بلکہ فی سبیل اللہ بھی ہم سب کی حاجت پوری کر دیتے ہیں۔"

نوازش علی کا لہجہ میرے دل پر اثر کر گیا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں میں باوانگلی میں ناحق کسی حقدار کو اپنے در سے خالی ہاتھ تو نہیں بولتا رہا ہوں میں نے مراقبے میں جا کر اصلیت کی کنوچ لگانی چاہی لیکن اس کے بعد جو صورت حال سامنے آئی اس نے مجھے ششدر کر دیا۔ "آپ کے مراقبے اور سخت کسی کام نہ آسکیں گے بزرگو اس لیے کہ میں نے آپ کو اپنا نام اور کام کی نوعیت بتانے میں ایک مددے برابر بھی راست گوئی سے کام نہیں لیا۔ صرف اس ناپاک مراد سے آئے ہوں کہ آپ کو اپنی کتنی چڑی باتوں سے حاشا کر کے کوئی ایسا تعویذ حاصل کر لوں جو حسد بی بی کے لمبے والے گھر کو اجاڑ کر کھنڈ بنا دے۔ یہ بھی کان کھول کر سن لیں کہ اگر آپ نے میری براہ میں مانگ پھسانے کی کوشش کی تو پھر آپ کو بھی یہ سولہ مہنگا پڑے گا۔"

میں نے حیرت سے نوازش علی کو آنکھیں کھول کر دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ وہ بدستور کسی صورت بتائے میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اچانک کسی خیال سے میں نے نظریں گھما کر ارسلان کی سمت نظر ڈالی تو وہ اپنی جگہ بیٹھا سکر رہا تھا۔ مجھے حیرت زدہ دہر کچھ کر اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"حضرت خواجہ کی دور رس نگاہوں نے آپ کا انتخاب قطع نہیں کیا تھا۔ خدا کا کریم آپ کے شامل حال ہے لیکن بے عیب ذات خدا کے سوا کسی اور کی نہیں ہوتی۔ ہر شخص کو کمال بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اس عالم رنگ و بو میں سب کچھ سراپ ہے۔ جو دامن بچا کر چلتے ہیں وہی کامیاب کہلاتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح ایک ذرہ بھی دوسرے کے کام آجاتا ہے۔ اس وقت مجھے آپ کے پاس آنے کا حکم بھی حضرت خواجہ نے دیا تھا تا کہ آپ کو بروقت یہ بتا سکوں کہ آپ کے سامنے نوازش علی جو نیل کا فرشتہ بنا بیٹھا ہے ایک نمبر کا جھوٹا فریبا اور دغا باز ہے جو آپ کو اپنی کتنی چڑی باتوں سے لظا راستے پر ڈالنے کا منصوبہ بنا کر آیا ہے۔ میں نے اس وقت اس کی اصلیت کو بے غائب کرنے کی خاطر وقتی طور پر اس کے جسم پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی کی زبان سے اس کی اصلیت بھی اگلوادی۔"



دوسرے طریقے سے نکالو۔" اگر لڑکی کا نام بتانا مناسب نہیں سمجھتے تو اس لڑکے کا نام بتادو جس لڑکے سے تم اسے چاہتا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر تم نے جسے کالی ملی کہا تھا اسی کا نام بتادو۔۔۔۔۔ نام بتائے بغیر کوئی بھی نہ تو کوئی عمل کر سکتا ہے نہ ہی توبہ لکھ سکتا ہے۔"

نوازش علی نے اس بار بھی فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک مایوسی کے اعزاز میں نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے نظریں اٹھا کر کسمپاسے ہوئے کہا۔  
"بزرگ۔ اگر میں کالی ملی کے ماں باپ کا نام بتا دوں تو کیا کام نہیں بن سکتا؟"

"چلو وہی بتادو۔" میں نے ارسلان کا اشارہ پا کر اپنی آمیزگی کا اظہار کیا تو نوازش علی نے اس بار بھی تقدیر سے ہچکچا کر کہا۔

"اس کے باپ کا نام کبیر دین ہے۔ ماں کو علاتے کی ساری عمر میں صغریٰ بی بی کے نام سے جانتی ہیں۔" میں نے نظر کاراویہ بدل کر ارسلان کی طرف دیکھا تو اس نے ہلکتے ہوئے تپڑ سے کہا۔

"میرے محترم اگر آپ اجازت دیں تو میں اس خبیث کو گردن سے تمام کر باہر پھینک آؤں اس لیے کہ یہ نابکار مجھے نام بتا رہا ہے وہ حسد لہانی کے والدین کا ہے۔" "گو یا خود اس کا تعلق پھر نور جمال سے ہوگا؟" میں نے دل ہی دل میں ارسلان سے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ اس بد ذات کا تعلق اس کم ذات سے ہے جو کلہ گو مسلمان ہونے کے باوجود گڈ گڈی بھانے کا گھدا کاروبار کر رہا ہے۔" ارسلان کا چہرہ غصے سے شمتانے لگا۔  
"اسی نے قد پر احمد اور حسد بی بی کے درمیان جدائی ڈالنے کی خاطر نور جمال کے والد سے ابھی خاصی رقم اٹھائی ہے۔" ارسلان کی رہائی مجھے قصور کے دوسرے رخ کے بارے میں علم ہوا تو میں بھی تھلا کر رہ گیا۔ حسد بی بی نے بتا تھا کہ نور جمال قد پر احمد کی خالہ کی بیٹی ہے۔ لہذا صورت میں محض ایک فریق اگر اپنی کسی لالچ کی غرض سے دوسرے فریق کے حق میں زہر کے بیج بوئے تو اسے خود غرض ہی کہا جاسکتا تھا۔ میرے سامنے ایسی سیکڑوں مثالیں پہلے بھی آچکی تھیں جہاں خوبی رشتے بھی ایک دوسرے کے جانی دشمن بن کر مرنے پامال اٹنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے عمل کی سزا بھی خاطر خواہ ہونی ضروری ہے۔ وہ فرد بھی زیادہ سزا کا مستحق ہے جو کسی ایک فریق کو نہ صرف

ارسلان کی بات سن کر میں جبر جبری لے کر رہ گیا۔ یہاں یہ بھی کار نہیں کی معلومات کے لیے عرض کر دوں کہ اجنبی کے گروہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جس نے خدا کے کسی محبوب بندے کو مقدس کتاب کی احکامات کرتے سنا اور خدا پر ایمان لے آیا۔ اس گروہ کے جن کسی کے ہر خواہ نہیں ہوتے۔ نہ ہی کسی کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے قبیلے سے تعلق رکھنے والے لاکھ شیطان کے پیروکار ہوتے ہیں۔ ان سے ہر قسم کی خواہش کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہ انتہائی خطرناک اور دغا باز ہوتے ہیں۔ اپنے کسی مقصد کی تکمیل کی خاطر یہ کسی نئی نو انسان کی جان لینے سے بھی نہیں بچتے۔

جنوں کے یہ دونوں اقسام اپنی صورت فعل اور وضع و قطع بدلنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ خبیث قسم کے جن زیادہ تر سیاہ ملی کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ ان کو قابو کرنا اور کسی معاملہ کو ان خواہشوں سے بچانا بھی بڑے جان جو کھوں کا کام ہوتا ہے۔۔۔۔۔ خود میں نے بھی اس قسم کا عمل کرنے والے اکثر مالکوں کو دیوانگی کی کیفیت سے دوچار ہوتے دیکھا ہے۔

بہر حال۔۔۔۔۔ نوازش علی کی اصلیت معلوم ہو جانے کے بعد میں نے دل ہی دل میں دوبارہ آبیہ انگریزی پڑھ کر خود اپنے اوپر دم کی، مجرے کو حصار میں لیا پھر نوازش علی سے مخاطب ہوا۔

"ایک بات ذہن نشین کر لو کہ جو لوگ فلفلہ بیانی کر کے کسی کو گمراہی کے راستے پر ڈالنے کی حماقت کرتے ہیں ان کا انجام بھی بخیر نہیں ہوتا۔"

"میں اپنی ضرورت لے کر آپ کی چوکھٹ پر حاضر ہوا ہوں تو پھر جھوٹ کیوں بولوں گا بزرگ؟" نوازش علی نے بدستور مصیبت سے کہا۔ "اگر آپ کے اختیار میں بھی میری مشکل آسان کرنی نہیں ہے تو پھر کسی دوسرے در کی تلاش کروں گا۔"

"تم اپنی جس بیٹی کے راستے کی دوری ختم کرنے کے مقصد سے آئے ہو اس کا نام کیا ہے؟"

"مجھے السوس ہے بزرگ۔ کسی خاص وجہ سے میں اس کا نام درمیان میں نہیں لانا چاہتا۔" نوازش علی نے پھر ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے درخواست کی۔ "موصوم بچیوں کی عزت بھی کالج کی طرح ہوتی ہے۔۔۔ ایک بار ہال آجائے تو پھر وہ بھی نہیں جاتا۔"

"تم فلا بھی نہیں کہہ رہے ہو۔" میں نے اسے



ایسی شرمناک اور معیوب حرکت پر اکسائے بلکہ اس کی مدد کی خاطر خود بھی آمادہ ہو جائے۔

حقیقت پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں نے بھی ایک امر کا فیصلہ اخذ کیا تھا کہ میں نے جو تعویذ حسد بی بی کو دیئے تھے ان کے بارے میں کسی نہ کسی طور پر بحال کے والدین کو بھی علم ہو گیا اور اب شاید انہوں نے ڈگڈگی بجاتے والے سے رابطہ قائم کرنے کے بعد اسی کے مشورے پر نوازش ملی کی خدمات حاصل کی تھیں جو اس وقت کسی صورت بتائے میرے سامنے موجود تھا۔

”آپ کس سوچ میں گم ہیں بزرگو؟“ نوازش ملی نے میرے چہرے کے بدلتے تاثرات سے کچھ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا مجھے آپ کے در سے بھی خالی ہاتھ ہی جانا پڑے گا؟“

”تم نے لکھا اندازہ لگا ہے۔“ میں نے اس بد بخت کو اسی کے حربے سے سزا دینے کا ارادہ کر کے بات بتائی۔ ”تم نے اپنی بیٹی کے سلسلے میں جو کچھ بھری داستان سنا ہے اسی کے پیش نظر میں تمہیں کوئی ایسی آزمودہ اور موثر تعویذ دینے کے بارے میں غور کر رہا ہوں جس سے سانپ بھی اپنے انہام کو پہنچے اور لاٹھی بھی سلامت رہے۔“

میں بھی آس لگا کر تو آپ کے قدموں میں بیٹھا ہوں۔ آپ کے طفیل میری بیٹی کا گھر آباد ہو جائے تو جب جگ دعا میں دوں گا۔“

نوازش ملی خاصہ جب زبان تھا جس کا اندازہ میں پہلے ہی لگا چکا تھا۔ چنانچہ اس کی چالچلی نے متحیر کرنے کی بجائے اور ہوا دی۔ میں نے یہ سوچ کر ایک تعویذ لکھنا شروع کیا سب سے پہلے اسی بد بخت کو تھوڑی بہت سزا دی جائے جو ارسلان کے بیان کے موجب مجس میں چنگاری لال کر تماشہ کھینے کی خاطر درمیاں کر دار ادا کر رہا تھا۔ اسی بہانے اس ڈگڈگی بجاتے والے کو بھی یہ اندازہ ہو جاتا کہ میں خدمتِ خلق کے سلسلے میں ان عاملوں میں شہر نہیں کیا جاتا جو کسی معمولی خطرے کو ہی بہانہ کر درمیان سے ہٹ جاتے ہیں۔

میں تعویذ رقم کرنے میں مصروف تھا جب میرے میں ملک و مہر کی وہ باتوں خوشبو بھٹنے لگی جو حضرت خواجہ کے وجود کا ایک حصہ تھی۔ میں نے قلم روک کر احقر ہمارے جھکا یا اور آنکھیں موند لیں۔ خوشبو آہستہ آہستہ بھٹتی رہی پھر حضرت خواجہ کی نرم اور مسکند کن آواز میرے کانوں میں برس

گھولنے لگی۔

”میاں ولایت حسین۔ تمہیں قدرت نے جس کام پر معبود کیا ہے اس پر قدم قدم پر تمہارا امتحان بھی مقصود ہے۔

ایک معمولی سی تنگی کا ثواب بھی دس سے سات سو روپے ہے لیکن یہ خیال بھی پیش نظر رکھنا کہ اگر کبھی کوئی تعرض ہوگی تو پھر اس مالکِ کلوں مکاں کی امداد سے عدالتِ حسنِ آلود بھی ہو سکتی ہے۔ جو قدم بھی اٹھانا نہایت غور و خوض کے بعد اٹھانا ورنہ تنگی برادر گناہ لازمہ دہائی صورت بھی پیش آ سکتی ہے۔“

”میری آنکھیں بند تھیں لیکن سرمستی کے عالم میں جھوم رہا تھا۔ میری خوش بختی تھی جس نے خدا کے ایک برگزیدہ بندے کو مجھ پر مہربان کر دیا تھا جو پہلے بھی خاص خاص موقعوں پر میری رہنمائی کر چکے تھے۔ ان کی حمایت کر رہا“ حیرتِ سفید دانوں والی تسبیح“ ابھی تک میرے پاس محفوظ تھی۔ خدا کے اس ولی ملت اور مقرب بزرگ کی اس وقت آمد میرے لیے جتنی رہنمائی کا ایک ذریعہ تھی۔

”میں کم نصیب..... آپ کے قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہوں میرے محترم۔“ میں نے حسبِ مراتب اور مقامِ ادب کا خیال ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نہایت ادب سے کہا۔ ”مجھے اس وقت آپ کی رہنمائی کی ضرورت بھی درپیش ہے۔“

”تم نے کیا سوچا ہے؟“ بزرگ نے غلیظ انداز میں دریافت کیا۔

”میں اس وقت جو تعویذ رقم کر رہا ہوں اس کا مقصد نوازش ملی کو ایک ذرا جھکا دینا ہے جو محسوم لوگوں کے درمیان خفاوت کے بیج بونے میں پیش پیش ہے۔“

”جو لوگ جوش میں ہوش سے بیگانہ ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔“

”پھر آپ..... آپ میری رہنمائی کر دیں میرے محترم۔“ بزرگ کے جواب نے میرے دل کی حالت غیر کر دی۔ خسارے والی بات سے یہی مطلب اخذ کیا جاسکتا تھا کہ میں نے نوازش ملی کے لیے جو راستہ سوچا تھا وہ راستہ قدم نہیں تھا۔

”جلد بازی میں فیصلے کرنے سے گریز کی عادت ڈالو

ولایت حسین..... کسی مظلوم کی مدد کرنا خداوند کریم کے

نزدیک یقیناً پند یہ عمل سے مگر کسی کو ایذا پہنچانا بھی اسے

پسند نہیں۔“ بزرگ نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے مخاطب

کیا۔ ”جو نا عاقبت اندیش اپنی شیطانی قوتوں سے وہ تعویذ



مسلم دنیا میں خصوصی توجہ حاصل کرنے والے شعبہ طب یعنی علم چشم اور امراض چشم پر لکھنے والے مصنفین میں حسین ابن الحسن شاید پہلا مصنف تھا جس نے علم چشم پر مکمل تصاویر و اشکال کے ساتھ ایک ہا کا عدد رسالہ تصنیف کیا۔ اس کی تصنیف میں بعد کے لکھنے والوں نے اضافے کیے۔ یہ آج بھی موجود ہے۔

840ء اور 860ء کے مابین لکھے جانے والے دس رسائل ہیں جنہیں اس کے شاگرد اور پیچھے جیش نے مکمل کیا۔ حسین نے آنکھ دماغ اور بصری اعصاب نیز آنکھ کی لطیفات امراض اور علاج پر بحث کی ہے۔ اگرچہ اس نے یونانی کتابوں سے بھی بہت کچھ نقل کیا ہے لیکن متعدد نئے ذاتی مشاہدات کا اضافہ بھی کیا ہے۔ الرازی نے جس کی تصانیف دسویں صدی سے نقل رکھی ہیں غالباً سب سے پہلے عدلی ہسپتال کا تذکرہ و تحریر کی ہے۔

اقبال: تا طمرات اسکی سائنس ازلا اکثر حلقش و روانی

علم کے بغیر ایک قدم بھی اٹھاؤں۔"

نوازش علی میرا جواب سن کر اپنی کامیابی کے خواب دیکھنے لگا۔ میں نے جو تعویذ تحریر کرنا شروع کیا تو اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ دوسرا ہند کو رکھنا تھا کہ اس پر چار دکنوں پر مٹی ہند سے لکھے پھر درمیان میں الٹی سیدھی لکیروں کے جال بنانے لگا۔ اس قسم کے کچھ میں آنے والے تعویذ وہ عالی جاتے ہیں جو شیطانی عمل کا توڑ کرتے ہیں کچھ سیدھے بدھ رکھتے ہیں۔ کاغذ پر لکیروں کے گول مول اور الٹے سیدھے چل بنا کر میں نے اسے بڑی احتیاط سے کٹی تھ کر کے ایک مختصر تعویذ کی شکل دی پھر اسے سیاہ رنگ کا کورا کپڑا چھڑا کر زبرد دعا گے سے خوب اچھی طرح لپیٹا اور نوازش علی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اس تعویذ کو یہاں سے جانے کے دونوں کے اندر احمد قبرستان جا کر کسی پرانی قبر کے سر ہالے سیدھے ہاتھ کی جانب اس طرح دھا دینا کہ کسی اور کی نظر نہ پڑے۔ لوگوں کو دکھانے کی خاطر ہاتھ اٹھا کر قحط بھی پڑھ لیتا تا کہ کسی کو شبہ نہ ہو۔" میں نے بے حد سنجیدگی سے گفتگو چاہی رہی۔ "یہ ایک آزمودہ تعویذ ہے جو عام لوگوں کی کچھ میں نہیں آتا لیکن اس کا نتیجہ چالیس دنوں کے اندر ہی سامنے آ جاتا ہے۔۔۔۔۔ اگر کچھ دیر سویر ہو تو بھی اپنے احباب کو حیرت زدہ ہونے دینا۔"

"آپ نے جیسا کہا ہے میں ویسے ہی کروں گا بزرگو! نوازش علی نے اٹھتے ہوئے پھر اکساری سے دروغ گوئی کی۔ "آپ کے حکم سے اگر میری بیٹی کے خصب جاگ گئے تو تمام زندگی آپ کو دعائیں دوں گا۔"

نوازش علی کے جانے کے بعد بھی میں اس کی خیانت، حضرت خواجہ کی بروقت آمد کے بارے میں غور کرتا

پڑھ سکتا ہے جو تم نے حسد پی پی کو دیا تھا۔ وہ اس تعویذ کو بھی ضرور کھٹکے گا جو تم نوازش علی کے لیے رقم کرنا چاہتے ہو جو قدم بھی اٹھانا بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا۔" خدا کے اس برگزیدہ بندے نے کچھ توقف سے کہا۔ "کوئی ایسا راستہ اختیار کرو جو دشمن کو الجھن میں مبتلا کر دے۔ اس سے زیادہ میں تمہاری رہنمائی کا اختیار نہیں رکھتا۔"

حضرت خواجہ کا ہولنا نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے نظریں کھول دیں۔ نوازش علی کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ نہ جانے وہ بد بخت میری اس خاموشی اور مدہوشی کو کیا تصور کر رہا تھا۔ میں نے ارسلان کی طرف نظر پھیری تو وہ مجھ سے میں موجود نہیں تھا۔ حضرت خواجہ کے آخری جیلے میرے ذہن میں صدائے یادگشت بن کر گونج رہے تھے۔

"بڑے صاحب۔۔۔۔۔" نوازش علی نے ایک بار پھر میری خاموشی کو محسوس کر کے دلی زبان میں عرض کی۔ "اگر آپ کو کوئی مشکل پیش آرہی ہو تو پھر میں اسے اپنی قسمت سمجھ کر گئی اور۔۔۔۔۔"

"تمہارا اندازہ غلط ہے نوازش علی۔" میں نے حضرت خواجہ کی آمد اور ان کی مخصوص رہنمائی کے خوش نظر نوازش علی کو ہلکی ہار بے حد اپنائیت سے مخاطب کیا۔ "میں بطور خاص تمہاری بیٹی کے مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔۔۔۔۔ تم خوش نصیب ہو جو ایک انتہائی مناسب طریقہ میرے ذہن میں آگیا۔۔۔۔۔ میں نے جو تعویذ سوچا ہے وہ تمہارے اور صاحب معاملہ دونوں کے لیے حیرت انگیز طور پر سولہ آنے سود سے ثابت ہوگا۔ شرط یہ ہے کہ میں جو کہوں تم اس پر عمل بھی کرو۔"

"میری کیا مجال ہے بزرگو کہ میں آپ کی مرضی اور







ملی بھائی نے بھی تاکید کی تھی کہ کسی خاص سبب کے بغیر یہ نمبر استعمال نہ کرنا۔

”اب کیا خاص بات ہو گی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”سب سے پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کروں گی کہ آپ کا دیا ہوا تعویذ میرے حق میں بہت کارآمد ثابت ہوا۔“  
 قادر نے اب میرے حق میں بہت نرم پڑ گیا ہے۔۔۔ خوشی کی اُمید کی ایک ٹھکانی کرن بھی نظر آرہی ہے لیکن اس صورت حال کو دیکھ کر دشمنوں کی چھائی پر پھر سانپ لوٹنے لگے ہیں۔ خاص طور پر نور جمال کو جیسے پتے لگ گئے ہیں۔ اس کی ماں بھی اگلے توڑے کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی ہے۔

”جسمیں جو اُمید کی کرن نظر آرہی ہے بی بی وہ میرے تعویذ کا نہیں بلکہ خداوند کریم کی نظر کرم کا اثر ہے۔“  
 میں نے عاجزی سے کہا۔ ”جو لوگ دوسروں کی خوشی پر نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہ بھی سکون سے نہیں رہتے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ اپنے کام سے کام رکھو۔“

”میاں صاحب۔ میں جتنے والوں کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔“ حنہ بی بی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اس وقت آپ کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ ان جل گزری ماں بیٹیوں نے دل کے پھوڑنے کی خاطر مجھے بھی بات بات پر لعن طعن کرنی شروع کر دی ہے اور خاص طور پر گل نور جمال کی ماں نے مجھ سے کل کر ایک بات براہ راست بڑے غصے میں کہی تھی کہ بی بی۔۔۔ تم جس کھوٹے پر اچھل رہی ہو۔۔۔ ہمیں اس کا پتا بھی چل گیا ہے۔۔۔ ہم تم کو اور تمہارے ہوتوں سوتوں کو بھی دیکھ لیں گے کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔“

”ایک خاموشی سو با کوٹالتی ہے بی بی۔“ میں نے استغاثہ کر پوچھا۔ ”اس وقت تمہارے فون کرنے کا مقصد کیا تھا؟“

”میں آپ کو رب نواز کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔“ حنہ بی بی نے تھوڑے توقف سے جواب دیا۔ ”وہی بد ذات ہے جو جو تک کی طرح میری خوشیوں سے چٹ کر رہ گیا ہے۔ سارے فساد کی جڑ بھی وہی ہے۔“

”تم سے اسے کیا پر خاش ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”ہمارے محلے میں رہا کرتا تھا حرام کالج۔“ حنہ بی بی نے حسب عادت لفظ زبان استعمال کی۔ ”مجھ سے شادی کرنے کے خواب دیکھتا تھا اور مجھے شروع سے اس سے

نفرت تھی۔ قادر نے سے شادی کے بعد میرا خیال تھا کہ وہ کہیں اور مٹ کالاکر لے گا لیکن وہ سارے کی طرح میرے پیچھے لگا رہا۔ صرف یہی نہیں میاں صاحب۔ اور ایک ڈیڑھ سال سے اس نے نہ جانے کیسے نور جمال کے باپ سے کہیں دور کا رشتہ جوڑ کر آنا جانا بھی شروع کر دیا ہے۔ قادر نے بھی اسے پسند نہیں کرتا لیکن خالہ کی وجہ سے چپ ہو گیا۔“

”کیا قادر نے کوظم ہے کہ دب نواز تم سے شادی کرنا چاہتا تھا؟“

”نہیں۔۔۔“ حنہ بی بی نے بڑے یقین سے کہا۔ ”میں بھی چپ رہی اس لیے کہ قادر نے مجھے کا بڑا زہر ملا ہے۔ اگر میں اسے بتا دوں کہ اس نے خالہ سے کیوں رشتہ جوڑا ہے تو قادر نے گنڈا سے اس کا قیہ بنا کر خیل کوں کو کھلا دے گا۔“

”میں سمجھا نہیں کہ دب نواز اب تم سے کیا چاہتا ہے؟“

”وہ اب بھی مجھے اپنانے کے خواب دیکھ رہا ہے اسی لیے اس نے نور جمال کی ماں سے رشتے داری نکال لی ہے۔“ حنہ بی بی نے اس بار ذرا تفصیل سے بتایا۔ ”مجھے پہلے بھی شہ تھا کہ نور جمال اور قادر کے کاچکر چلوانے میں تھی اسی کا ہاتھ ہے لیکن دو روز پہلے میں نے چپ کر ان دونوں کی بات سنی تو یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی نے نور جمال اور قادر کے شادی کے سلسلے میں کسی گنڈا اٹھانے والے سے قلیتے لاکر دیئے ہیں جسے ایک ایک کر کے سلامت دن چلانا ہے۔ خدا عاقبت کرے کم ذلت کو۔۔۔ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ میری خوشیاں پوری نہیں ہوں گی۔۔۔ جس نے قلیتے دیئے ہیں اس نے یہ یقین بھی دلایا ہے کہ میری خوشیاں تین ماہ بعد غارت ہو جائیں گی جس کے بعد قادر۔۔۔ خدا نہ کرے۔۔۔ مجھے چھوڑ دے گا لیکن۔۔۔ اگر ایسا ہوا تو میں اپنے ہاتھوں سے قادر کے کو جہنم رسید کر کے خود بھی نیلا تھو تھا کھا کر جان پر کھیل جاؤں گی۔“

”خدا کی ذات سے نا اُمید نہ ہو بی بی۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ وہ قادر مطلق دب نواز کو اس کی گنڈی چال میں کامیاب نہیں ہونے دے گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مہارک کرے میاں صاحب لیکن دب نواز کا باپ بھی بڑا انگیر کا جج تھا۔ اس جہنم رسید نے بھی ایک عورت کو شادی کا جھانسا دے کر اس کی عزت لوٹ



لی تھی۔ عورت نے بدنامی سے بچنے کی خاطر کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دے دی۔ بعد میں جب یہ راز کھلا کہ اس غریب کو بے آب و گرنے والا لوازش علی تھا تو اسے بھی مہر قید ہوگئی تھی جہاں وہ اپنے پاس رکڑ کر جہنم رسید بھی ہو گیا تھا۔“

میں نوازش علی کے حوالے پر چونکا۔ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ رب نواز نے اپنا نام بتانے کی بجائے مجھے اپنے مرحوم باپ کا نام بتایا تھا۔ ارسلان نے دو نمبر کے نوازش علی کی حقیقت ضرور بے غائب کر دی تھی کہ لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اصل نوازش کس قماش کا آدمی تھا۔ حضرت خواجہ کے بروقت آجانے کے بعد میں نے ان ہی کے کہنے کے مطابق ڈگڈگی بجائے (گند اٹھل کرنے) والے کو اندر میرے میں رکھنے کی خاطر ایسا قدم اٹھایا تھا جو اس کی سمجھ میں نہیں آتا ہوگا۔

”نمایاں صاحب.....“ سننے لگی بی بی نے اس ہار پر غمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ کی دعاؤں سے مجھے جو روشنی کی کرن نظر آئی ہے اس کو ہمیشہ قائم رکھنے کی خاطر میرے حق میں ہر اید دعا کرتے رہے گا اور..... کچھ لیا کر دیں کہ کسی طرح رب نواز کا میرے گھر آنا جانا بھی ختم ہو جائے۔“

”نیلی چھتری والے کی ذات پر بھروسہ رکھو جس نے بی بی۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”میں اسی کے بھروسے پر نہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ لوگوں کا انجام بھی اس کے باپ سے مختلف نہیں ہوگا۔ جو لوگ دوسروں کے لیے گڑھا کھودتے ہیں وہ خود اس میں منہ کے بل گر جاتے ہیں۔“

میں حسد بی بی کو تسلیم دے کر گھر آیا تو ارسلان وہاں پہلے سے موجود تھا۔ میں نے اپنی طبیعت کے پیش نظر سکندر علی کو کچھ دوی اور ساگو دانہ تیار کرنے کی ہدایت دی تو وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ارسلان سے دریافت کیا۔

”اس وقت کیسے رمت کی؟“

”میں معذرت خواہ ہوں میرے محترم کہ میں نے آپ کو رب نواز کے سلسلے میں صرف اس کی ذاتی حیثیت سے آگاہ کرنے کا فرض ادا کیا تھا ورنہ حسنه بی بی نے آپ کو اس کے باپ کے بارے میں جو بتایا ہے..... میں اس سے زیادہ بھی بہت کچھ جانتا ہوں مگر آپ کا بھی یہی کہنا ہے کہ خداوند کریم عیب جوئی کو پسند نہیں کرتا۔“

”اگر تمہیں میری اور حنت بی بی کی باتوں کا علم ہو گیا ہے تو اب تم وہ نواز کے سلسلے میں کیا کہو گے؟“

"کل کیا ہونے والا ہے اس کے بارے میں خدا کے  
سوا اور کوئی کچھ نہیں جانتا۔" ارسلان نے پہلو بدل کر جواب  
دیا۔ "جو لوگ مستقبل کا حال بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ خود  
اپنے مستقبل کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے..... عجب  
نواز جس گندامل کرنے والے کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے  
وہ بھی اس بات سے ناواقف ہو گا کہ آج اگر وہ دوسروں کو  
ڈگندگی پر بچانے کی ایسی چوڑی ہاتھیں کر رہا ہے تو ایک روز وہ  
خود بھی اوپر والے کی ڈگندگی پر دیوانوں کی طرح مچتا نظر  
آئے گا۔"

”یہی ایک کچھ کی بات اگر نئی نوع انسان سمجھ لے تو اس کے سارے دلدور دور ہو جائیں۔“ میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا پھر ارسلان سے دریافت کیا۔ ”حتیٰ بی بی کے سلسلے میں قندے عمل کرنے والا خباثتیں کر رہا ہے اس کے بارے میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟“

”پہلے کی بات اور مٹی میرے عزیز۔ اس وقت اگر میں چاہتا تو اس بدکردار کے جسم میں حلول ہو کر اسے دیکھتے بخور میں بھی پھلانگ لگانے پر مجبور کر سکتا تھا مگر جب سے حضرت خواجہ کا دامن تھا، ہے میں نے تمام شیطانوں کو مل سے تو پہ کر لی ہے۔“ ارسلان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”حنہ بی بی ضرور بے قصور ہے لیکن قدیر احمد بھی اگر نور جمال کو قریب آنے کا موقع نہ دیتا تو اس رساکشی کی نوبت ہی نہ آتی جواب درخش ہے۔“

”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں پر خود دہر کر  
نی لوقت جو کروادوب نواز ادا کر رہا ہے اسے نظر انداز بھی  
نہیں کیا جاسکتا۔“

”آپ حکم دیں تو میں اسے تھوڑی بہت سزا دے سکتا ہوں۔ جس سے وہ وقتی طور پر خوفزدہ ہو جائے لیکن سارے نساہ کی جڑ وہ ہے جس نے اب آپ کے لیے بھی قلیتے جانے شروع کر دیے ہیں۔“

”حضرت خوجہ کی دعاؤں سے وہ قہقہے بھی میرا ہال پکا نہیں کر سکیں گے۔۔۔۔۔ ہاں، اگر قدرت کو کچھ اور منظور ہے تو اسے بھی میں اپنے حق میں بہتری ہی سمجھوں گا اس لیے کہ وہ جو بھی کرتا ہے اس میں انسان کی کوئی نہ کوئی بھلائی ضرور تصور ہوتی ہے۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”کوشش کرو کہ کسی طرح رب نواز کا نور جمال کی  
اس سے ملنا جتنا ترک ہو جائے۔“ میں نے پہلو پر ل کر



سجیدگی سے کہا۔ "راحت بی بی کے لیے خوشیوں کے جج  
بولنے کا سہل تو اس کے لیے میں آج ہی سے ایک وظیفہ  
شروع کر دوں گا۔ اور دوائے کی ذات ہمارکات ہے۔ امید  
ہے وہ اس نیک کام میں بھی میری مدد ضرور کرے گا۔"

سکندر علی کے واپس آنے سے ارسلان اور میرے  
درمیان گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ جاتے جاتے ارسلان نے  
دبی زبان میں صرف اتنا کہا تھا کہ وہ رب نواز کو راہ راست  
پر لانے کی خاطر کوئی ایسا ہی سہی دے گا جو اسے ہمیشہ یاد  
رہے۔"

اس رات سونے سے بستر میں نے بطور خاص حنت  
بی بی کے لیے ایک آزمودہ تعویذ رقم کر کے محفوظ کر لیا۔ یہ  
تعویذ اس مقصد کے لیے تھا کہ حنت بی بی کی خوشیاں ضائع  
نہ ہونے پائیں جب کہ رب نواز اور بھول ارسلان کے کوئی  
ڈگڈگی بجانے والا اسی بات کے درپے تھا کہ حنت بی بی کا  
کاشا کسی طرح درمیان سے نکال کر قندیر احمد اور نور جمال کی  
شادی کر دے۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی کسی غرض کو پورا  
کرنے کی خاطر دوسرے کے لیے برا کرنے میں ذرا نہیں  
چٹکتا۔ ہر ممکن طرح سے حریف کو زیر کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی  
نہیں سوچتا ہے کہ ایسا فعل خداوند کریم کے نزدیک ناقابل  
مٹائی ہے۔ اس کے برعکس اگر اس کا کوئی ذاتی کام بگڑ  
جائے تو نہ صرف وہ دوسرے کو مورد اثرام ٹھہراتا ہے بلکہ یہ  
بھی کہتا ہے کہ۔۔۔۔۔ "میں نے برا کرنے والے کو خدا کے  
حوالے کیا۔ اس نے چاہا تو جس نے میرے ساتھ برا کیا ہے  
روزی قیامت اس کا منہ کالا ہوگا اور دوزخ کا کندہ بنے گا۔"

جو لوگ سلی کا ناپاک اور جان لیوا عمل کرتے ہیں ان  
کا کوئی دھرم ایمان نہیں ہوتا، کسی کو اپنے گندے عمل سے  
موت سے ہٹانے کے بعد وہ اس طرح خوشیاں  
مناتے ہیں جیسے انہوں نے کوئی ایسا کام کیا ہے جو دوسرا کوئی  
نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بیکے ہوئے حاقبت نا اندیش لوگ سیاہ  
قلب ہوتے ہیں۔ ان کے لیے سزا اور جزا کا حساب بھی  
اس لیے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ یہ خود اپنے آپ کو نعوذ باللہ  
بھگوان اور اس کا ادا رہی سمجھتے ہیں۔

یہاں میں قارئین کی معلومات کے لیے یہ بھی عرض  
کر دوں کہ ایک وہ بار میں بھی خدا کے حکم سے ایسے شیطان  
صفت لوگوں سے دو دریا تھک کر چکا ہوں لیکن میرے بزرگوں  
نے جن کی جوتیوں کے نیل آج میں داسے، ورے، سننے

ضرورت مندوں کی خدمت کر رہا ہوں انہوں نے مجھے  
ہمیشہ یہی تاکید کی تھی کہ حتی الامکان سلی کا عمل کرنے والوں  
سے بچ کر ان کی غلطی نہ کروں۔

بہر حال رات میں نے حنت بی بی کی خاطر جو تعویذ  
رقم کیا تھا اسے فجر کی نماز کے فوراً بعد ایک پرانے قبرستان کی  
قدیم قبر کے پاس دفن کر دیا۔ یہ ایک آزمودہ تعویذ تھا اور  
مجھے اس جادو مطلق کی ذلت سے اُمید تھی کہ وہ کم از کم حنت  
بی بی کی خوشیوں کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔

تعویذ دفن کرنے کے تقریباً دو ہفتے بعد تک مجھے حنت  
بی بی کا نہ تو کوئی فون آیا۔ نہ خط کے ذریعے کسی صورت حال  
سے آگاہ کیا گیا بہر حال اس روز جمعرات کو عصر کی نماز کے  
بعد جب میں حجرے میں آیا تو سکندر علی نے میری اجازت  
حاصل کرنے کے بعد ضرورت مندوں کو حجرے میں بھیجنا  
شروع کر دیا۔ غالباً تیسرے یا چوتھے نمبر پر ایک پست قد  
اور دوہرے بدن کی عورت حجرے میں داخل ہوئی۔ مجھے  
اشعار سے سلام کر کے وہ چاندنی پر بیٹھ گئی۔ اس نے  
اپنے چہرے کو چوری طرح نقاب سے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ  
کوئی قابل توجہ بات نہیں تھی اس لیے کہ میرے پاس اپنی کسی  
ضرورت کی خاطر بیشتر خواتین ایسی ہوتی ہیں جو اپنے گھر  
والوں، خصوصاً شوہروں سے چھپ چھپ کر کسی مقصد کے  
لیے آتی ہیں لیکن، وہ عورت بیٹھنے کے بعد بھی جس انداز  
میں رو رو کر کسمسار ہی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی نہ  
کسی بات سے خوفزدہ ضرور ہے۔

"خیریت تو ہے بی بی؟" میں نے کچھ دیر خاموشی  
کے بعد اسے از خود مخاطب کیا۔ "یہاں تک آئی ہو تو اس کا  
کوئی مقصد بھی ضرور ہوگا۔"

"مم۔۔۔۔۔ میں آپ سے تجھے میں کچھ ضروری بات  
کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے رک رک کر کہا۔

"پریشان مت ہو۔۔۔۔۔ جب تم یہاں موجود ہو تو کوئی  
دوسرا میری اجازت کے بغیر نقل نہیں ہوگا۔"

میرا جواب سن کر عورت تسخیل کر بیٹھ گئی۔ حجرے سے  
نقاب بھی ہٹا دی۔ میں نے چکی نظر میں اس کی عمر کا اندازہ  
لگایا جو پچیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ اس نے جو  
ہاتھ سگھڑا کر رکھا تھا اس سے غالباً اس کا مقصد دوسروں کو  
متاثر کرنا ہوگا۔ مجھے ان فضولیات سے کوئی غرض نہیں تھی  
البتہ اس کی آنکھوں میں جو چمک مجھے نظر آئی وہ کسی نامکن  
سے مشابہت رکھتی تھی۔ میرے دل نے بھی یہی گواہی دی



”میں تمہاری کس طور مدد کر سکتا ہوں؟“  
”آپ کچھ ایسا کر دیں میں صاحب کہ اس شخص کا  
کاٹنا ہماری زندگی سے نکل جائے۔ میں آپ کو مدد ملے گی نہیں  
دینے کو تیار ہوں۔“

”تم غلط جگہ آئی ہو لی بی۔“ میں نے تہجد بدل کر کہا۔  
”یہاں ضرورت مندوں کو رقم کے ترانہ میں نہیں ٹولا جاتا۔  
سب کچھ فی سکیل اللہ ہوتا ہے۔“  
”اوہ۔۔۔۔۔“ عورت کسمسا کر بولی۔ ”میں معافی  
چاہتی ہوں میں صاحب۔“

”تم جو کاٹنا دو مہمان سے لگوانے آئی ہو۔ اس کا اور  
تمہارے بھائی کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟“

”میں اس معاملے میں اپنی زبان کھول کر منہ پر نہیں  
بنا چاہتی لیکن میرا اندازہ ہے کہ ان کے درمیان کچھ آنکھ دکھا  
بھی ضرور ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک دونوں میں کچھ ان میں  
بھی تھی لیکن اب وہ ایک ہی کمرے میں گھنٹوں بیٹھے نہ جانے  
کیا کانا پھونک کر رہتے رہتے ہیں۔ کل کلاں کو اگر بدنامی ہوئی  
تو دنیا ہم پر بھی تو تھوکر مارے گی۔“ عورت نے گڑگڑا کر کہا۔  
”آپ کے پاس ہی درخواست لے کر آئی ہوں کہ اس سے  
پہلے کہ ہمارے منہ پر لوگ کالک تو ہیں آپ اس بدقماش  
کے لیے کوئی ایسا مل کر دیں کہ وہ کہیں اور چلی جائے۔ میں  
تمام زندگی آپ کا احسان فراموش نہیں کروں گی۔“

میرے دل میں اس عورت کی جانب سے  
شدید نفرت کا بیج پڑا تھا۔ جس انداز میں وہ کسی لڑکی کو مورد  
الزام ٹھہرا رہی تھی اس سے بھی میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ  
انتہائی مکار، جھوٹی اور دغا باز ہے۔ پہلا خیال میرے ذہن  
میں یہی آیا کہ اسے نکالنا جواب دے کر چلا کر دوں لیکن  
اسی وقت ملک و حیر کی تیز خوشبو کا جھونکا میرے وجود کے گرد  
پھیلنے لگا پھر میری قوت سماعت میں حضرت خواجہ کی مانوس  
آواز سرسراتی ہوئی گونگی۔

”خداوند کریم جو کرتا ہے اس میں انسان کی کوئی نہ  
کوئی بھلائی ضرور مضمر ہوتی ہے۔ اچھا ہوا جو یہ عورت خود  
چل کر تمہارے حجرے تک آگئی۔ میں تمہیں مطلع کرنا چاہتا  
ہوں کہ یہی بد بخت نور جمال کی ماں ہے جو حسنہ بی بی کو اس  
کے شوہر تھوڑے عرصے سے طلاق دلا کر اپنی بیٹی کا گھر آباد کرنے  
کے لیے بدکردار کسی رعایت کے مستحق نہیں  
ہوتے جو اپنی خوشی کی خاطر کسی کے آباد آشیانے پر بجلی  
گرانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ انہیں جتنی بھی سزا دی جائے

کہ وہ میرے حجرے تک اپنی کسی دغا بازی یا دستانے کی بجائے  
اپنی بچی چڑی باتوں کے حجر میں جٹا کر کے میرے ہاتھوں  
کسی بے گناہ کو برباد کرانے کے ارادے سے آئی ہے۔ لہذا  
میں غلط ہو گیا۔“

میں نے خاتون کے ہارے میں جو رائے قائم کی تھی  
وہ کچھ غلط بھی ثابت نہیں ہوئی۔ کچھ دیر تک وہ مجھے اپنا زامی  
دکھڑا سنا رہی تو میں نے قدرے اکٹاتے ہوئے لہجے میں  
کہا۔

”بی بی۔۔۔۔۔ میرے پاس وقت کم ہے۔۔۔۔۔ اگر تم براہ  
راست اپنے آنے کا مقصد محل کرنا تو زیادہ مناسب  
ہوگا۔“

”میں صاحب۔۔۔۔۔ میں نے ایک دو نہیں بلکہ اکثر  
لٹے پٹے دالوں سے کچا بنا ہے کہ کوئی سائل آپ کے در  
سے خالی ہاتھ نہیں جاتا چنانچہ میں بھی بہت اس لگا کر آئی  
ہوں۔“

خاتون نے جس انداز میں مجھے رام کرنے کی خاطر  
تہجد باندھی وہ بھی اس کی عیاری کی دلیل تھی۔ میں نے پھر  
درگزر سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”حاجت ردائی کرنا اس مالک دو جہاں کے اختیار  
میں ہے جس کے حکم کے بغیر ایک سوکھا پتا بھی اپنی جگہ سے  
جھنپ نہیں کرتا۔“

”جانتی ہوں میں صاحب اور اسی مالک دو جہاں  
نے آپ کی دعاؤں کو تاثیر بھی عطا کی ہے ورنہ حاجت مند  
دور دور سے چل کر آپ کے پاس نہ آتے۔“

”تم کس مقصد سے آئی ہو لی بی؟“ میں نے اسے  
گڑگڑتے وقت کا احساس دلایا تو وہ ایک لمحہ خاموش رہی پھر  
دلہا زبان میں بولی۔

”میں صاحب۔۔۔۔۔ ایک لڑکی ہے جس نے ہم ماں  
بٹیوں کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ میں اس کے ہارے میں  
اگر زبان کھول دوں تو وہ منہوں میں در بدر ہو سکتی ہے۔ میرا  
بھائی جو کل تک ہمیں پلوں پر بیٹھا تھا وہ بھی اب ہم سے  
کٹرانے لگا ہے۔ ہم پر جو مصیبت لوٹی ہے وہ اسی دو کوڑی  
کی لڑکی کے سبب لوٹی ہے۔“

میں نے اس عورت کے ہارے میں جو سوچا تھا وہ غلط  
نہیں تھا۔ جس انداز میں وہ کسی لڑکی کو مورد الزام ٹھہرا رہی  
تھی اس پر مجھے شہد تھا۔ میں نے اس کے انداز گفتگو کو دیکھتی  
طور پر درگزر کرتے ہوئے سوال کیا۔



”کن لیکن صرف اور صرف اسی خداوند مقدس کے

اختیار کی بات ہے جو درلوں جہانوں کا مالک ہے۔ ہم صرف کشف اور مراقبے کے ذریعے اس کے اشاروں کو سمجھنے کے محتاج ہیں۔ ”میں نے پہلو بدلی کر عورت کو سرزنش کی۔ ”تم میرے مجرے تک آ گئی ہو تو پھر کل کربات کرو لی پی۔۔۔۔۔ لفظ بیانی کرو گی تو اس کا نقصان تمہیں ہی پہنچے گا۔“

”مم۔۔۔۔۔ میں کبھی نہیں یہاں صاحب کبہ کون دشمن ہے جو طارے ساتھ دعا بازی کر رہا ہے۔“ عورت نے تدریجاً ہم کو جواب دیا۔

”میں اس مردود کی بات کر رہا ہوں اپنی جو گتے سے  
 حاصل کرتا ہے۔“ میں نے عورت کو جلالی نظروں سے گھورا۔  
 ”کیا اس نے تمہیں میرے پاس آنے کا مشورہ نہیں دیا ہے۔“  
 ”مم۔۔۔ مم۔۔۔ میں سمجھ گئی میاں صاحب کہ آپ  
 کس کی بات کر رہے ہیں۔“ عورت نے میری نظروں سے  
 مرعوب ہو کر کچھ اٹکل دیا۔

”ایک ہات اور ذہن لٹین کرلو۔۔۔ تم اس وقت میرے حجرے کے حصار میں ہو اس لیے اس بد بخت کی نظروں اور کان بھی یہاں کی سن نہیں لے سکتے مگر۔۔۔ یہاں سے جانے کے بعد تمہیں غلط رہنا ہوگا۔۔۔ اگر اس نابالغ کو تمہارے دل کا حیدر معلوم ہو گیا تو پھر وہ تم کو اور تمہاری بیٹی کو بھی عارت کرنے سے باز نہیں آئے گا۔“

عورت کے چہرے کا رنگ یلکھت خوف سے لرد پڑ گیا۔ بڑی دقت سے گڑ گڑ کر بولی۔ ”آپ نے اگر فساد کی جڑ پکڑ لی ہے تو میری مشکل بھی آسان کر دیں۔ میں آپ کے ہر حکم پر عمل کرنے کا واہدہ کرتی ہوں۔“

میں اسے حریف مرعوب کرنے کی خاطر خلاء میں الٹا  
رہا پھر اسے مخاطب کیا۔ "ایک درنہانی آدمی اور بھی  
ہے..... وہ تو انا..... مجھ سے نوادش ملی کے نام سے ملا تو  
لیکن میں نے اس کی اصلیت بھی جان لی تھی..... وہ بھی ہوا  
آدمی نہیں ہے۔"

حوریت ہونٹ چبا کر چپ رہی تو میں نے اس کے  
جرے کے تاثرات کو بھانپتے ہوئے کہا۔

”میں جس پر بخت کی بات کر رہا ہوں۔ رب توفیق  
اس کے کہنے سے لیتے بھی میری بربادی کے لیے جلاتا رہا  
ہے لیکن خدا کا کرم ہے کہ میں تمہارے سامنے ذمہ سلامت  
پیشا ہوں اور وہ..... وہ بھی.....“ میں نے ویدہ و دانستہ  
خاموشی اختیار کی عورت نے کسمسا کر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

اگست 2014ء

100

کم ہے۔" "تمہارے لیے کیا حکم ہے۔۔۔ میرے معزز۔" میں نے سرشاری کے عالم میں دریا یافت کیا۔

”ایک بات اور لائیں نصیحت کرلو۔۔۔ اس عورت کا تعلق اس طاقتور نا اعلیٰ بدکردار سے بھی ہے جو گندے محل کے دوسروں کا گھر اجاڑتے ہیں۔۔۔ میرا اشارہ اس مردود کی جانب ہے جس کے بارے میں اس سلطان نے بھی تم کو بھی بتایا تھا کہ وہ اپنی ڈگڈگی بجا کر سارے لوح لوگوں کو گناہ گار کر رہا ہے۔ اس کی سرزنش بھی پیش نظر رکھنا۔ یہ عورت بھی ہاسی کے اشارے پر آئی ہے۔“

”آپ نے مجھے نوڑا ہے تو میری مناسب مہیری بھی فرمادیں۔“ میری نگاہیں عورت پر مرکوز تھیں لیکن دل و دماغ غور نہ کر سکا اور یہ کیفیت طاری ہوئی۔

”کوئی ایسا تعویذ رقم کرو جو اس عورت ہی کے ہاتھوں سفل کا عمل کرنے والے کو ہلا دیا جائے۔ اس کا ذکر سن کر پلٹ جانے کے بعد یہ عورت بھی خدا کے حکم سے حسد ہٹا ہلا کے گھر سے دفع ہو جائے گی۔“

خوشبو کا وہ مہولہ جتنی تیزی سے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے دور ہو گیا۔ میرے اوپر طاری ہوئی کیفیت دور ہوئی تو میں نے صبر کو دوبارہ خشک لہجے میں مخاطب کیا۔

”تم جس کا رخ کو درمیان سے نکالنا چاہتی ہو وہ نظر جائے گا۔۔۔ میں نے اس کے راز کو چالیا ہے لیکن اس کے لئے تمہیں رازداری سے میری ہدایتوں پر عمل کرنا ہوگا۔“

”میں گئے گئے تیار ہوں ماما صاحبہ۔“ عورت کی باجیس کھل گئیں۔ ”آپ جیسا کہ گے میں دیا کروں گا۔“

میں نے عورت کو متاثر کرنے کی خاطر دو صفحے کے لیے آنکھیں بند کر کے اپنی ٹھوڑی سینے سے لگا لی۔ اندازاً اب ہی تھا جیسے خدا خواست قیب کی باتیں معلوم کر رہا ہوں دو بارہ آنکھ کھول کر میں نے عورت کو قدموں سے حیرت نظروں سے گھور کر کہا۔

”تمہاری اور تمہاری بیٹی کی خوشیوں کے درمیان کو  
ایسا مردود ہے جو دغا بازی سے اپنا اُلوسیدھا کر رہا ہے  
تمہیں بس کا علاج بھی کرانا ہوگا۔“

جانب ہے؟“ اس عورت نے پھر سب کو کہتے ہوئے کہا۔  
انسان بننے کی اداکاری کی تو میں نے جھجلا کر کہا۔



سے لپک لگائے بیٹھا بڑے سنی خیر انداز میں مسکرا رہا تھا۔  
 ”خیریت تو ہے بر خوردار؟“ اس نے دلوں سے کہاں  
 غائب تھے؟“ میں نے ٹکڑے ہوئے علی اسے مخاطب کیا۔  
 ”آپ کی بزرگی اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھ رہا  
 تھا۔“ ارسلان نے دوزلوں بیٹھے ہوئے جواب دیا۔  
 ”آپ کے حکم کے موجب میں نے رب نواز کی ایسی گوشالی  
 کر دی ہے کہ اب وہ کسی کے رستے میں اثر لگانے کی کبھی  
 بھول... نہیں کرے گا۔ نیلی بھتری والے نے اس مردود کو  
 جس موذی مرض میں مبتلا کر دیا ہے وہ آسانی سے اس مردود  
 سے چھٹکارا نہیں پاسکے گا۔“

”اور کوئی نئی خیر...؟“ میں نے ارسلان کو ٹٹولا تو  
 اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

”حضرت خواجہ کے حکم پر میں نے خود کو ہمیشہ آپ  
 کے قدموں کی دھول ہی سمجھا ہے میرے محترم۔ یہ بھی جانتا  
 ہوں کہ بزرگوں کی دعاؤں نے آپ کو نوازا رکھا ہے۔“  
 ارسلان نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”آپ نے کیا عمل  
 کیا؟... میں اس بات سے ناواقف ہوں لیکن جو مہر اپنی  
 نظروں سے دیکھ کر آتا ہوں اس نے دوسروں کو بھی انگشت  
 بدعاں کر دیا ہے۔... کل تک جو بد بخت دوسروں کو اپنی  
 ڈگڈگی پر بھلا کر رہا تھا آج وہ خود پاگوں کی طرح کلیوں اور  
 ہزاروں میں چلتا پھرتا رہا ہے۔... اس کے علاوہ ایک اہم  
 بات قابل ذکر یہ بھی ہے کہ نور جمال کی ماں اپنی بیٹی کو لے کر  
 فیصل آباد سے اور کئی چلی گئی ہے۔ ان کے چلے جانے کے  
 بعد حسنہ بی بی اور قدیر احمد نے بھی سکون کا سانس لیا ہے۔  
 مجھے معلوم ہے کہ نور جمال کی ماں بھی آپ سے ملی تھی اور  
 اب جو صورت حال سامنے آئی ہے وہ بھی یقیناً آپ کے کسی  
 تعویذ ہی کا کرشمہ ہوگی۔“

”مجھے گنہگار نہ کرو بر خوردار۔... ہوتا ہی ہے جو خدا  
 کو منظور ہو۔ تم نے بھی ایک بار یہی کہا تھا کہ آج جو نا عاقبت  
 اندیش دوسروں کو اپنی ڈگڈگی پر نبھاتے ہیں۔ ایک دن وہ  
 بھی اوپر والے کی ڈگڈگی پر پاگوں کی طرح اچھلتے نظر آتے  
 ہیں۔ انسان اگر صرف اسی ایک کتے کو سمجھ لے تو اس کے  
 دل و دودھ دوسرے ہو سکتے ہیں۔“

ارسلان کچھ دیر بعد چلا گیا تو میں نے اٹھ کر حسب  
 عادت دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی پھر کار خیر میں مصروف  
 ہو گیا۔

”اس بد کردار کو بھی شاید آپ کی بد دعا لگ گئی  
 ہے۔... کھنیا پر پڑا موت کا انگارہ گر رہا ہے۔“

”ایسا مت کہہ بی بی۔... کسی کی موت کی دعا کرنا  
 خداوند کریم کو پسند نہیں۔ زندگی اور موت اسی کے اختیار میں  
 ہے لیکن جو کسی کا برا چاہے ہیں وہ بھی اس کے عذاب سے  
 محفوظ نہیں رہتے بہر حال۔...“ میں نے قدرے توقف  
 سے کہا۔ ”میں نے جس بد کردار کا حوالہ دیا ہے کیا وہ  
 تمہارے ہاتھ سے شریعت یا دودھ کا گلاس پی لے گا؟“

میرا سولہ سن کر عورت کا سر عمامت سے جھک گیا تو  
 مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی وقت نہیں ہوئی کہ ارسلان نے  
 جس ڈگڈگی بجانے والے کا حوالہ دیا تھا اس کے اور عورت  
 کے درمیان ذاتی میل جول بھی شریعت کی حدود پھیلاؤ  
 چکے تھے۔ میں نے اسے شرمندگی سے بچانے کی خاطر  
 تنبیہ کی سے مطلب کی بات کی۔

”میں تمہیں ایک زعفرانی نقش دے رہا ہوں۔ کوشش  
 کرنا کہ اسے پہلی فرصت میں کسی بھی پیٹھے مشروب میں پلا کر  
 اس بد کردار کو پلا دو۔ اس کے بعد خدا نے چاہا تو دودھ کا  
 دودھ اور پانی کا پانی بھی ہو جائے گا مگر۔... یہ خیال رہے کہ  
 اسے تمہارے ارادے کی ہنک بھی نہ ملے ورنہ بازی پلٹ  
 بھی سکتی ہے۔“

”آپ لکھ نہ کریں میاں صاحب۔“ محبت نے  
 سنبھل کر بڑے اصرار سے کہا۔ ”میں گھر پہنچے ہی آپ کا  
 تعویذ اسے گھول کر پلا دوں گی اور۔... آپ کی دعاؤں سے  
 اگر میرا کام ہو گیا تو بڑے بڑے کی نیا بھی ضرور پانٹوں گی۔“  
 ”اس کے بھید ہی جانتا ہے بی بی۔... قسمت میں جو  
 لکھ دیا گیا وہی ملے گا۔“

میں نے حضرت خواجہ کے ارشاد کے مطابق زعفران  
 کا ایک نقش تیار کر کے عورت کے حوالے کرتے ہوئے بے  
 حد سنجیدگی سے کہا۔ ”ایک بات اور یاد رکھنا۔... اب کسی  
 ڈگڈگی بجانے والے کے چکر میں نہ پڑنا ورنہ بھی کبھی یوں  
 بھی ہوتا ہے کہ بزرگوں کے اٹھائے ہوئے کسی ملا قدم کی  
 سزا ان کے بچوں کو بھی چھٹی پڑتی ہے۔“

عورت جو نور جمال کی ماں کے سوا کوئی اور نہیں تھی  
 مجھے دعا نہیں دیتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ میں نے دوبارہ  
 ضرورت مندوں کو گھر سے میں بلانا شروع کر دیا۔

ایک ہفتے بعد میں حسب معمول خدمت خلق کے کام  
 میں مصروف تھا جب میں نے ارسلان کو دیکھا جو ایک دیوار



# Ramadan Ka Maza Shezan Mein Bhara



رمضان کرم



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)